

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

اکتوبر 2017

عقلمانی
معراج رسول



زندگی کے تحریک کی بنیاد پر گہری نظر
رکھنے والے کی ایک پُر فکر تحریر



ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار
انسانوں کے بنی آموز اور عبرت آمیز واقعات

سینس کی مجلس مشاورت دستارین کی تلخ و
شیریں باتیں گلے شکوے اور پر خلوص مشورے



ہاتھوں کی فنکاری اور ذہانت کی
تلوار کے مابین معرکہ آرائی

ایک ماں کی مست کا کڑا امتحان
اور کڑے حقائق کا سامنا

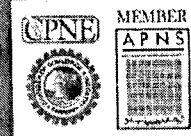
دل میں کسی کو پالینے کی تمنا لیے ایک
زیرک محبوبہ کی بلیک میلنگ

عشق کی جنوں خیزیوں میں پیار بھرے
رشتوں کو روندنے والے ایک باغی کی کٹھا



دل والوں کی دلچسپی کا محور و مرکز
ایک دکھ بھاری کا قصہ

ملک صاحب کی ڈائری سے ایک
سفاکانہ قتل کی واردات کا احوال



مدیر اعلیٰ: عذرار رسول
مدیر: یحییٰ احمد
نائب مدیر: اطہر حسین



مینجرائٹھارات

محمد شہزاد خان 0333-2256789

سرکولیشن مینج

سید میر حسین 0333-3285267

محفل شعرو سخن

قارئین

154

آپ کے ہاتھوں ہی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

ایک عزم بازی گر کی بازی گری..... سننی
خیز واقعات پر مثل ایک دل باطلیل داستان

اپنے کرداروں میں زندہ رہنے
والے ایک لکھاری کا قصہ

وقت

حسام بیٹ

166

157

انکشاف

محمد فاروق انجم

شاہ زین رضوان

جواری

209

203

وسیم بن اشرف

فرض شناس

زندگی کی بساط پر جال بچھانے
والے جواری کا ماحسرا

معاشرتی رویوں کے خلاف ایک لم
ہمت انسان کا جارحانہ انداز

اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی
سوانح حیات کے سبق آموز پہلو

بہت طریقے سے لوٹنے والے
ایک تہذیب یافتہ چور کا قصہ

حضرت یوسف علیہ السلام

رضوانہ ساجد

221

219

قدر دان

محمد الیاس

ڈاکٹر عبدالرزاق بھٹی

یکتارا

244

233

زہر

دلوں پر چائس بن کر کرتاجانے والی..... ایک ایسی
داستان محبت جس کی ہر طرف پھیلنے پر مجبور کر دے

باتوں باتوں میں بات بنانے
والے ایک سراغ رساں کا کارنامہ

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مرگِ ناکہاں نمبر

اس خاص شمارے میں وہ سب کچھ ہے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے۔

ان مشہور و مقبول شخصیات کی روداد جو بے وقت موت کا شکار ہوئے جنہیں عہدِ شباب میں موت اپنے ساتھ لے گئی

جنوری 2018ء کے اس شمارے کو آپ مجلد کرا کر رکھنے پر مجبور ہوں گے

سال کا پہلا شمارہ سب سے اہم شمارہ

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرا لیں

کسی طرح

کیوں یہ میری پیٹھ سے لگا کیا سوچ رہا ہے؟ سامنے آ کے بیٹھ..... کبھی ہی پہلے۔ جانے کیا ہو گیا ہے کہ میری نہیں لگ رہا۔
ہاں بھائی بڑی دشت ہے، بڑی بیزاری ہے۔ ہم اپنے آپ میں بڑی طرح آن پھنسے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں محسوس ہونے اور اپنے آپ سے جھگ آ جانے کا آزار بڑا ہی جان لیوا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ اپنی ہڈیاں پسلیاں ایک کر دوں، اپنا نینٹو اچا جاؤں۔ اپنی ذات کے جس میں سانس لینا تو ایسا ہے جیسے جانتی میں زندہ رہتا۔ او آ زادی آخر تو کس سوچ میں ہے۔ تو بھی تو کچھ بول! یہی کہ اس طرح آخر کیسے گزرے گی؟

یہی تو میں بھی سوچتا ہوں، چاہے ہمارے اندر جنت کی ہوائیں ہی کیوں نہ چل رہی ہوں اور ہمارے وجود میں جنت کے چشمے ہی کیوں نہ بہہ رہے ہوتے پھر میری اپنی ذات کی قید و زنج سے کم نہ ہوتی۔ جبکہ ہمارا اندرون تو خود سب سے بڑا اور زنج ہے۔ آخر وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ذات میں بند رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے باہر سے بھلا کیا سروکار..... اور یہ بڑے جانے ہوئے اور بانے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ ان سے زیادہ یہ بات جاننے والے کم ہی ہوں گے کہ نفس کی سب سے اچھی حالت کون سی ہے اور سب سے بُری حالت کون سی ہے؟ یہ تو ایسا ڈراما ہے کہ اگر آپ نے نہ کہ اس میں کی بات شروع کر دی جو اپنی ذات میں بند رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھلا ہمیں اپنے باہر سے کیا سروکار..... یہ انداز ہوتا ہے کہ اب میں بند رہتا ہوں۔ یہ سب ہیں جو باہر نکلیں۔ کھو گئے تو ان بے حسوں اور بے جاؤں کی باتیں کر کے میرا جی نہ چلا یا کر۔ لیکن وہ جواب اندر دھون کا نام لیا۔ یہ زندگی کے گورستانوں میں منزل لاتے پھرتے ہیں کہ بدی کی کوئی لاش کھود کے نکالیں اور اسے اپنے اوپر منڈ لے کر بیٹوں میں آگیں اور روگ پھیلائیں۔ یہ تو نے ابھی کہی کہ یہ لوگ اپنی ذات میں رہتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ بد ذاتی..... بے ذات ہوتی ہے۔

ہاں یہ ہے کہ یہ باہر سے بھاگتے ہیں اور لاشوں میں اپنے لیے ٹھکانے ڈھونڈتے ہیں۔ ذات میں رہتا بھی کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ کیا یہ کوئی انسان ہے؟ اس سے کڑی آزمائش اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنی پسلیوں میں پھنسا سسک رہا ہو مگر انسانوں میں سے کچھ انسان اس آزمائش میں پڑنے لگے ہوں تو کیا انہیں اس پر خوش ہونا چاہیے؟

جب تو یہ کہتا ہے کہ میں اپنی پسلیوں میں پھنسا ہوا ہوں یا اپنی اوچھڑی میں گھسری بنا پڑا ہوں تو کیا اپنے آپ کو یا کسی اور کو کوئی خوش خبری سناتا ہے؟ کیا بہت دم گھٹ رہا ہے؟ ہاں، سچ جان پر مبنی ہوتی ہے۔ بس یہی میرا بھی حال ہے۔ یہ کہہ ہونا ہے، یہ تو بہت ہی عذاب ناک ہونا ہے۔ نہ ہونے کا آرام شاید بہت بڑا آرام ہوتا ہوگا۔ ہاں شاید..... اتنا نشہ کہ ہوش ہی نہ رہے۔ خون کے گھونٹ پی اور جی نہیں بھائی نہیں۔ اب زبان اور حادوے کی چاشنی کچھ حذر نہیں دیتی۔ میں تو کہتا ہوں کہ بول ہی مت، بس چپکایا رہ۔ ہاں تو نے ٹھیک کہا۔ اب تو اپنی کوئی بات بھی اچھی نہیں لگتی۔ جب اپنا آ پا ہی بُرا لگنے لگے تو پھر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ بھلا تو اپنے آپ کو کیسا لگتا ہے؟ میں اپنی صورت تک سے بیزار ہوں۔ میں اپنے اس گلان تک سے اکتا چکا ہوں کہ میں ہوں جو نہ ہونے کی طرح ہے، وہ آخر ہے بھی کیوں تو نے میرا جی خوش کر دیا۔ اگر جاں کنی، جاں کنی کا جی خوش کر سکتی ہو۔ دس سازی اور غمگساری اسے کہتے ہیں۔ بس یہی کچھ میرا بھی عالم ہے۔ بڑے مارے گئے ہاں بڑے مارے گئے۔ باہر کی ہوا اب یہی ہوگی؟ دیکھی ہی ہوگی جیسی جیسی۔ جیسی چھوڑ کر ہم اپنے اندر بھاگ آئے تھے۔ بھاگ آئے تھے یا کھد بڑے گئے تھے۔

ہاں یوں کہہ لے، ہوا بھی یہی تھا۔ پر ایک بات اور ہے اور وہ یہ ہے کہ باہر کی ہوا کا کیا کہنا۔
ہاں جی! باہر کی ہوا کا بھلا کیا کہنا۔ باہر کی فضا کا بھلا کیا کہنا۔ اندر تو رانگانی ہی رانگانی ہے۔ عداوت ہی عداوت ہے۔ ہم جوتے، ہم میں سے بھلا کون کون رانگاں ہوگا۔ جنہیں رانگاں نہ جانا چاہیے تھا، وہی بڑی طرح رانگاں گئے ہوں گے اور میری کو اپنے رانگاں جانے کا دکھ بھی ہوگا۔ کیسے کیسے لوگ رانگاں گئے۔ رانگانی کے ان شہروں میں کسی کسی انگلیں بچتا دوسل کی سینٹ چڑھ گئیں۔ ایک بات ہے۔ کیا بات؟
باہر کی ہوا بھی کچھ بھاری کر ایسا نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟ باہر کی فضا بھی اندر کی فضا سے کچھ کم تو نہ تھی اور یہ کہ فضا میں تو ہوا میں زہر۔ ہوا کا وہ زہر اور فضا کا وہ توہمصر کی ہلاکت اور ذہن کی ہزیمت تھا۔ ہم نے حکمت کو ہوس ناک بننے دیکھا اور دلیل کو دلائی۔ قیادت نے قرآنی کا پیرا اختیار کیا اور قانون نے نقب زنی شعلہ کی۔ پھر ہو گیا؟ کیا ہم اپنے اندر ہی طرح کر رہے ہیں؟ میں تو کہتا ہوں کہ اندر کی ہلاکت سے باہر کی ہلاکت بڑا کرنا بہتر ہے۔ اندر کی زندگی بھی موت ہے اور باہر کی موت بھی زندگی۔ کسی بھی طرح اپنے آپ سے باہر نکلتا چاہیے، کسی بھی طرح۔

☆☆☆



عزیزان من!
السلام علیکم!

اکتوبر 2017ء..... کا دفتر بشارہ آپ کے ہاتھوں کی زینت ہے۔ پرچہ کی اشاعت تک اسلامی کینڈر کے حساب سے نئے سال کا آغاز عرم الحرم سے ہو چکا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نیا سال اپنے دامن میں تمام عالم کے لیے خیر اور امن و آشتی لے کر آئے (آمین)..... کیسے جناب گزشتہ قیامت خیز موسم برسات میں عید کیسے گزری..... ماشاء اللہ ہمارے ہاں اختیار طبع کے دعوؤں اور وعدوں کی نہ صرف قلعی مکمل ہوئی بلکہ ہر آنکھ نے دیکھ لیا کہ طوفانی بارشوں میں منہدم دیواروں تلے دبے اور کرنٹ لگنے سے کتنے ہی گھر وں میں ماتم ہوا گیا جبکہ گندے پانی سے بھری ان ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور بدانتظامی کے باعث بھرے ہوئے ندی نالوں نے عوام کو کتنی اذیتوں سے دوچار کیا، لیکن جناب یہاں کون ہے ایسا جو عوام کی پریشانیوں اور فکر وں میں دبا ہوا ہوگا..... مگر صد شکر کہ جیسے تیسے کر کے نہ صرف عید منائی گئی بلکہ برسات کے خطرناک تیوروں کا بھی کسی نہ کسی طور سامنا کر لیا گیا۔ جانے آسان تھر و غضب میں گرج برس رہا تھا یا عوام کی بے بسی پر رو رہا تھا یا تو ایک طرف رہا جبکہ دوسری جانب عالمی منظر نامے پر نظر ڈالی جائے تو برما میں بسنے والی روہنگیا کیسٹی پر ہونے والے ظلم و ستم نے ہر حساس دل کو خون کے آنسو روا دیا ہے، جنہیں اپنے ہی وطن میں شہریت سے محروم کر کے یہاں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ جبکہ آزادی 1857ء کے بعد انگریزوں نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو بھی برما میں ہی جلا وطن کیا تھا جہاں ان کی آخری آرام گاہ بھی ہے لیکن اب مقامی برمی اکثریت روہنگیا کیسٹی کو تارکین وطن قرار دیتی ہے۔ صرف مذمتی بیانات اور احتجاجی سیاست سے یہ سنگین مسئلہ حل نہیں ہو سکا بلکہ اس کے لیے انسانی بھرتی پر مشتمل کچھ عملی اقدامات کی بھی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ صرف امت مسلمہ بلکہ تمام عالم پر اپنا رحم فرمائے اور اپنی حفاظت میں رکھے۔ (آمین)۔ اسی فکر و عالم اور دعاؤں کے نیک اب داخل ہوتے ہیں اپنی محفل میں جہاں نئے نئے اذہان اپنے اپنے نظریات لیے حاضر ہیں۔

بلیق خان ناہرہ سے تمبرہ کر رہی ہیں۔ ”والدہ کی طویل ترین بیماری خاندان میں برپا ہونے والی غمی و خوشی، موسم کی گرم نظر ملی اور کچھ ملکی حالات نے تمبروں کی حد تک نا اہل کر دیا۔ کچھ دوستوں کی حاشی نے حوصلہ توڑا جیسے رضوان ٹولی کا قاتل، نادر سیال، معراج محبوب عباسی، سر فرزا چوہدری، سجاد خان، منظر سلیم شامی، انور یونس، حسن علی طالب، پری زے خان، نگلیں کاظمی، سعید بخاری، میوند ہاشمی اور مرزا گل وغیرہ..... اس وغیرہ میں اور بھی بہت سے احباب ہیں، نادر سیال کے لیے از حد پریشان ہوں۔ وہ پہلے بھی اپنے علاقے کے بالادستوں کے جبر کا شکار ہوئے تھے۔ باقاعدہ لکھنے والے قدرت اللہ نیازی بھی اب خال خال نظر آنے لگے ہیں۔ (جی جناب بتائیے اس کی وجہ) ماہ تمبر کے سرورق پر چند سبز ہلائی پرچم تلے انصاف والوں سے انصاف کی منظر نظر آئیں۔ ڈاکٹر صاحب آپ کو عذر آ پنی، معراج رسول صاحب اور ادارے کے تمام مفتی ارکان کو زرا 14 اگست اور آنے والی عید الاضحیٰ مبارک ہو۔ جون ایلیا کے غمزہ سوال کیا شام اداس ہے؟ سے دامن بچاتے ادارے پر طاہرہ نظر ڈالنے ساری باتوں سے اتفاق کرتے جب محفل میں پہنچے تو ڈاکٹر نانکھ لھر کا پہلی ہی بار اٹھ کھڑے ہوئے ”پہلے آئیے اور پہلے پائیے“ کی عملی تفسیر ثابت ہوا۔ تمبرہ مکمل اور منسل رہا۔ مبارک باد۔ ڈاکٹر صاحبہ کے پسندیدہ مصنفین منظر امام، ڈاکٹر شیر شاہ سید، ناہید سلطانہ اختر، اسحاق داری اور طاہرہ جاوید مغل ہمارے بھی پسندیدہ لکھاری ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے اور یہ کارواں یوں ہی چلتا رہے۔ زریان سلطان کی تاکا جھانگی اچھی لگی۔ طاہرہ منظر احسب سابق لیے چوڑے سے ساتھ حاضر تھیں۔ دوست محمد خان ہم دوستوں کے دوست ہیں، آپ نے یاد کیا اور ہم حاضر۔ باغی سے آغاز کیا۔ محمد طاہر عمیر کی دوسری قسط بھی باکمال رہی لیکن آشتی کی بے وفائی نے طبیعت کو کرکری کر دی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کے حاس قلم سے نکلی اور سادہ میرا سے میں بیان کی جانے والی کچھ کہانیاں سید عادل پراثر ڈالتی ہیں۔ جب تک ڈاکٹر صاحب جیسے دروند دھڑلے پر موجود ہیں دروند ہمارے گا۔ چشم زمزم رہے گی، دل دکھتا رہے گا، احساس زندہ رہے گا۔ بے ضمیر میں بیٹا پاپ سے زیادہ بے ضمیر نکلا۔ حامی بٹ کے وقت کی پاکستان شننگ بے مزہ کر گئی۔ اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے؟ غلطی، چھوڑا رویش، بازار حسن، دہشت زدہ، سوانک، آرٹس، اگر خوب تھیں تو آصف ضیا احمدی ہتھدار بہت خوب رہی۔ چند ٹی وی والا تو بڑا اگر بٹ نکلا۔ ناہید سلطانہ اختر کی ذرا سی بات نے یوں جانے دل میں چھید کر دیے۔ لوگ اتنے تنگ دل کیوں آتے ہیں؟ پہلے صفحات پر سانچہ ملی اختر کی بہترین کاوش ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں تمبرہ شائع ہونے سے نہ بچ جائے، سانچہ کے صرف 6 یا 7 صفحات ہی بڑھ چکی ہوں۔ اشعار اور قصہ یوسف علیہ السلام کو اب بھی پڑھتا ہے۔ وزیر محمد خان کی نگارشات اور لطائف دلچپ ہوتے ہیں۔ اطہر نبین اور تمبرہ ماس باہر عالمی معلومات لیے شکر ہے خدا کا، کسی طرح نظر تو آئے۔ (اب آپ کی حاضری بھی تو اتارے ہوئی چاہیے..... یادداشت منظر امام راہنہ کے لیے رابطہ ضروری ہے۔“



* ریاض ہٹ، حسن ابدال سے شامل محفل ہیں۔ ”میں عرصہ تیس سال سے سنسپن پڑھ رہا ہوں۔ کافی عرصے میں خطوط کی محفل میں شریک ہوتا رہا ہوں پھر میں نے اپنے آپ کو صرف محفل شعروِ سخن اور کٹرلوں تک محدود کر لیا۔ اس کی وجہ مصروفیات بھی ہیں اور لگنے لگانے کا مشکل بھی ہے۔ اشعار اور انتخاب تو بندہ جب ناظم ملے لکھ کر ایڈوانس رکھ سکتا ہے لیکن تبصرہ جو پورا رسالہ پڑھ کر ہی لکھا جاسکتا ہے لیکن اس بار سرورق نے مجھے دوبارہ اس محفل کی راہ دکھادی ہے۔ سرورق دیکھ کر خود بخود یوں پر یہ نفاذ کیا۔ اس پر جم کے سائے تلے ہم ایک ہیں۔ سامعی اپنی خوشحال اور ہم ایک ہیں۔ لیکن مجھے بڑے دکھ سے یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ کیا واقعی ہم ایک ہیں؟ ہمیں تو صرف پاکستانی ہونا چاہیے اور اس پر فخر کرنا چاہیے۔ ہمیں آج اس اتحاد کی ضرورت ہے جو حیثیت قومِ متبر 1965ء میں نظر آیا تھا۔ خون وینے والوں کی باتیں دیکھ کر فخر خیز سے بلند ہو گیا تھا۔ اور یہی اس اتحاد کی جذبے کا مال تھا کہ ہماری حق اور جری افواج نے اپنے سے کسی کتا فوج کے روانہ کرنے کو رد کر دیے تھے۔ جولاءِ ہور کو فتح کرنے کا خواب لے کر آئے تھے۔ ہماری نئی پولیس پائلز مکمل تھی۔ وہ یہ تو گنگنائے سے اجتناب کرتے ہیں ہم لانے ہیں طوفان سے شستی نکال کے اس ملک کو رکھنا میرے بچوں سنبھال سکے۔ بلکہ ان کے لبوں پر یہ نغمہ ہوتا ہے۔ دیدی تیرا دیویدر دیوانہ۔ اب تو ہمارے چل چلاؤ کا وقت ہے۔ اس ملک کی ہاک ڈور اب تم نے ہی سنبھالی ہے۔ بہن نانکہ لھر کا خط پہلے نمبر پر ہے۔ واقعی وہ صدارت کی ہی حقدار نہیں۔ گلاب، موتیا، رات کی رائی اور چٹکی کی خوشبو میں بسا ان کا خط قابلِ تعریف بھی ہے اور قابلِ غور بھی۔ آپ نے کہا نیوں کے سلسلے میں جن پوائنٹس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ محمد زبیر ان سلطان کا خط بھی محفل کی جان ہے۔ آپ کی سوچ اور خیالات بہت با وقار و عالی ہیں۔ بہن طاہرہ بھگوانے بھی بڑا مدلل اور سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ تقریباً ہر پہلو کو جا کر کیا ہے۔ ویلڈن ذرین آفریدی، بہن، آپ کا خط بھی کسی نہ کم نہیں ہے۔ کہا نیوں پر تبصرہ اچھا ہے۔ آگے بڑھتے تو بہن اوشارا کشتی کا تبصرہ آیا۔ چلیں آپ کے ہمایئے تبصرہ نہیں لکھا تو کیا ہوا۔ آپ نے کہا کہ میں ہر ماہ دو باب بنتی ہے۔ سارے اشعار اور انتخاب قابلِ تعریف ہیں۔ یہاں دوپٹی کی ایک بات عرض کرنا چاہوں گا کہ اگر آپ کی کتاب میں محفل شعروِ سخن اور محفل نظم نگری کٹرلوں سے آؤت ہوا اور اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔ (ہماری جانب سے ایسا کچھ نہیں ہوا) اس کی بنا پر اس محفل کی رونق، دلچسپی اور دلچسپی میں اضافہ ہوگا۔ بات وہی ہے کہ اگر عمریں برسوں اور ہندوکس کے جنگل سے ہمیں آزادی دینی دے۔ بعض اوقات ایک ہی ماہ میں ہمیں آپ کی طرف سے اقتباسات اور اشعار کے کئی لغائفے موصول ہوتے ہیں تو جناب عرض ہے کہ آپ ایک ہی لغائفے میں رکھ کر بھیج سکتے ہیں۔ کسی تردید میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں وقت پر جو بھی خطوط موصول ہوتے ہیں، کو پیش کرتے ہیں کہ رسالے کی زینت بن جائیں۔“

۱۰ اور ایس احمد خان ناظم آباد کرنا بھی سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”خوبصورت رنگوں سے سجا ستر کا ”دسپنس“ مرمول ہوا۔ غائل بھی بہت فوب تھا جس کے لیے ڈاکر صاحب کو مبارک باد۔ انشاء بھی اپنی اہمیت کا احساس دلارہا تھا۔ سرفہرست ڈاکٹر نائلہ نصیصں و دیگر دوستوں کے ساتھ طاہرہ نگہار کی بھی بھرپور شرکت نظر آ رہی تھی۔ سب سے پہلے ابتدائی اختر کی ”سائنجھ“ سے کی اور جبکہ آزادی کی خوشگیاں داستان سے آگاہی حاصل ہوئی مگر انفسوں صد انفسوں میر جعفروں اور میر صاحبوں نے منافقت کی۔ ہمیں بعد میں جو آزدادی ملی، وہ ہندو پنے اور انگریز مکاروں کی ملی بھگت سے وہ شرات جو فتح معزوں میں مسلمانوں کو ملے، وہ نہ ملے۔ مکارو دھنوں نے راتوں رات پاکستان کے نقشے بدل دیے جس نے نتیجہ میں لاکھوں انسانوں کا قتل عام ہو مگر انشاء اللہ پاکستان رقی دنیا کی قائم و دائم رہے گا۔ آئین۔ چنانچہ تفصیل سے لکھا تاریخ کے گوشہ گوشہ سے روشناس ہوئے۔ اور اور خواب بہتر کہاں تھی۔ اس کے بعد طاہرہ عالمگیر کی ”باغی“ بھی جس نے آخری سطر تک سنسنی پھیلائے رکھی۔ اربہ ہے یہ سلسلہ دوپچی سے چلتا رہے گا اور اپنی اہمیت منوائے گا۔ باغی کے بعد ڈاکٹر شیر شاہ سید کی مکافات پردھی۔ ان کی ہر کہانی منفرد رنگ لیے ہوئی ہے اور دیر تک یاد رہتی ہے۔ ”بے خمیر“ بھی پسند آئی جس میں ماں باپ سے زیادہ بچی بہت حساس تھا جس نے بے کسی کی زندگی کو اچھا نہیں سمجھا اور اپنی نفرت کا اظہار و دخل کو بار کر کیا۔ ”پازار حسن“ اچھی لگی۔ شعرو کثرت کی محفل میں منتخب اور پسندیدہ اشعار نے مزہ دیا۔ شاہ زین رضوان کی کہانی دہشت زدہ بھی بہت پسند آئی۔ حسام بٹ صاحب کی ”وقت“ بھی کامیابی سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ ”آرٹھ“ دوسروں کی نظروں میں کسی بھی بیکار شغلے بھی کارآمد ہو جاتے ہیں جیسا کہ پینک ڈکشن میں بیترائن نے اپنی عادت کی بنا پر ڈاکو کو خطرے سے دو جا کر گرد یا اور اس کا اظہار کیا۔ ”نعلنی“ بھی بہتر کہانی تھی۔ جالاک سے جالاک مجرم بھی کہیں نہیں اٹھیں غلطی کی گرجا تا ہے جو اس کے گلے کا پسندانہ جاتا ہے۔ ہ ف م علیہ السلام کی داستان حیات بھی بہت سبق آموز دل کو ایمان کی روشنی سے منور کرنے والی سوانح حیات ہے۔ ”ھزار“ بھی ایک مں شامل رہی۔ سوانح میں ایک بہرہ وے نے حقیقت کا رنگ بھرا تا مگر حقیقت آشکار ہو گئی جو اس کو باندھ سلاسل کرنے سے نہ روک



سکی۔ آخری صفحات کی کہانی محترمہ ناہید سلطانہ اختر کی ذرا سی بات تھی۔ ذرا سی بات نے بڑے طوفانوں کا درد کیا اور رشتوں کو رشتے داروں سے دور کر دیا۔ سازش کے ذریعے دلوں اور رشتوں کو دور کر دینے والے بھی کبھی خوش نہیں رہتے۔ دنیا میں ذلیل و خوار تو رہتے ہی ہیں، اللہ کے دربار کی حاضری جب ہوتی ہوگی تو اس کا عذاب دنیا سے ہزاروں گنا بدتر ہوگا۔ کترن بھی دلچسپی کا محور ہیں۔ (آپ کی محبتوں کا بے حد شکر ہے)۔“

ظاہرہ گزرائی آمد پشاور سے۔ ”تمام دوستوں اور ادارے والوں کو عید مبارک ہو۔ میری دعا ہے اس عید پر ہمارے لیے خوشیاں نہیں تو کوئی دیکھ بھی نہ آئے۔ 24 جنوری سے نیا اسلامی سال بھی شروع ہوگا۔ میری دعا ہے کہ اللہ اس نئے سال میں تمام مسلمانوں اور خاص کر ہم پاکستانیوں کے لیے بہت بہت خوشیاں، کامیابیاں اور کامراناں لائے۔ آمین۔ انشاء میں اس بار جون ایلیا بیگم کی کے ساتھ ملے۔ واہ جون ایلیا صاحب! کیا کج حقیقتیں سامنے لاتے ہیں لیکن کیا فائدہ یہ بیگم کی در بیگم کی تو ہمارے ساتھ ساتھ قریب جانے گی۔ یہ تو ازل سے ہو رہا ہے کہ ہر مند کا ہر دوسرے کھاتے رہے ہیں۔ واہ اس بار میرے ہی شہر پشاور سے ڈاکٹر نانکھڑی صاحبہ حاضریں۔ ویکم ڈیزینز ریٹیلز۔ صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ ہمارا محاصرہ وہ ہے کہ کوا چلائیں کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ محمد زریان سلطان دعا میں تو بہت لائے ہو بھائی لیکن بھی آپ نے خود اس ملک کے لیے کچھ کچھ کرنے کی ہمت کی ہے؟ شکر ہے کوئی تو ہم سے متفق ہو گیا کہ پہلے کی تحریریں دوبارہ شائع ہوں۔ بہت پیارا اور خوبصورت تبصرہ ویلڈن زریان۔ زرین آفریدی تبصرہ تو اچھا کرتی ہیں لیکن بہت سوں کو کھنکھاتی ہے۔ ایشیا رائی ڈیزینز ویکم اب آتی رہنا۔ اب تو اظہر حسیں بھی آنے لگے ہیں۔ تبصرہ اچھا کرتے ہو، خوشی ہوئی۔ رمضان پاشا بھائی خوشی ہوئی کہ آپ کو میرا بھائی کہنا اچھا لگا۔ آپ بہت اچھا تبصرہ کرتے مونا ہادیہ اللہ آپ کے بیٹے کو جنت میں اعلیٰ مقام دے اور آپ کو بھر عطا کرے، آمین۔ پہلے منظر امام کی تحریر چوتھا اور ویلڈن بڑھی۔ بڑی ہنسی بھی آئی یہ درویش تو اپنے سیاستدانوں سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ہمیشہ ایسے ہی انمول اور حیرت انگیز تحریریں لاتے ہیں۔ مکافات بھی ایسی ہی تحریر ہے۔ پرانے لوگوں کی پاکیزہ کہانیاں بھی پرانے صاف سحرے کراچی کی طرح ہے۔ کیا ہوا کہ نیلوفر پارسی تھی۔ نکاح کے بعد مسلمان ہو جائی لیکن مراد جیسے راء استین کی کا بھلا دیکھ ہی نہیں سکتے اور خود اپنے بیٹے کے ساتھ گھلیا کام میں ایسے ساتھ دیا جیسے بیٹا اب کام تھا اور جنت ملتی تھی۔ سلیم انور اس بار آدھٹ جیسی تحریر لائے جس میں کیتھرائن نے اپنی مصوری کی مدد سے پینک لونے والے کی تصویر بنا کر نشاندہی کی، لا جواب تحریر۔ جمال دقتی کی تحریر سوانک اچھی تحریر ڈاکٹر فشر نے تو چلو ڈاکٹر کاروبار دھارا، ہمارے معاشرے میں لوگ کیا کچھ کرتے ہیں۔ دوسروں کو تکلیف دینے کے لیے کیا سوانک بھرتے ہیں، ویلڈن جمال دقتی۔ ناہید سلطانہ اختر کی تحریر ذرا سی بات اس معاشرے کے منہ پر ملنا ہے۔ سادہ جیسا ہے جس باپ کے بیٹی کو اپنا خون نہ مانا۔ یہ تو اللہ کا کرم کہ علیہ کورائیل جیسا سچا اور کھرا محبت کرنے والا شوہر ملا اور اتنے اچھے سرائی ملے۔ بہت اچھا کیا کہ علیہ نے ڈی این اے کرانے کا کہا اور بے شرم مساجد اور شاہینہ کے رشتے داروں کے منہ پر سچ کا جوتا مارا، ویلڈن ناہید صاحبہ۔ ظاہرہ میر کی تحریر باغی کا مران تو چونکا گیا لیکن کم از کم مجھے نہیں۔ جو ادبی بڑھتی ہوئی کا مران کے لیے محبت نے پہلی قسط میں مجھے چونکا دیا تھا کہ جواد اور آشتی وہ نہیں جو نظر آ رہے ہیں۔ کا مران حد سے زیادہ جذباتی ہے۔ سوچتا ہے کہ اور عمل زیادہ کرتا ہے۔ کا مران بے وقوف ہے۔ ان بڑے مگر بچوں کا کوئی کچھ نہیں گاڑ سکتا۔ حسام بٹ کی تحریر یہ وقت اس قسط میں تو صرف علی کو ایک اچھا دوست عقلم لا جس نے بورے کرائی کی منظر نگاری کی۔ کسانوں سے لے کر پولیس کی جاوہری تک دکھایا۔ عقلم کے گھر ڈونگی کیا بس، آخری خوں میں سپنس بڑھا دیا کہ عقلم نے اس کو خوشخبری دی۔ ایک نمبر کا پتا چلا کہ تم کسی نسلی خاتون کی کنوین میں ہو جاتی آئندہ۔ اس بار تو بیگ صاحب کافی دلچسپ کیس لے کر حاضر تھے۔ مزہ آ گیا کہ آخر قانون بھی کوئی چیز ہے۔ آصف جیسے گھٹیا اور بے حس مرد کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ پلیز ادارے والے میرے یہ الفاظ نہ کاٹیں تمام طوفان اور مجرم دن میں ایک بار درد و مستحاث پڑھے۔ (ہم نے آپ کی بات کا بھرم رکھتے ہوئے آپ کے یہ الفاظ نہیں کاٹے۔۔۔۔۔۔ اب خوش)۔“

ایشیا رائی کا مٹھی سندھ سے تبصرہ۔ ”زندگی دھوپ چھاؤں کا موقع ہے۔ یہ دیکھ سکھ سے عبارت ہے۔ انسان تا حیات کسی بھی صورت خوشی و غم سے دامن بچا سکتا ہے اور نہ ہی ان سے بچنا چھڑا سکتا ہے۔ میری خوشی کا مٹھی ٹھکانہ ناہید صاحبہ اپنا تحفظ کی زینت بنے دیکھا۔ سب سے پہلے تو مجھے ان صاحب یا صاحبہ کا تعارف چاہیے جو ہمارے تبصروں کے جواب میں جملے لکھتے ہیں یا ہمارے خصلوں کا جواب دیتے ہیں۔ (کیوں آپ نے کوئی سزا دی ہے کیا۔۔۔۔۔۔ مدیرہ کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے بھلا)۔ انشاء میں جون ایلیا ہمیں بہت شاندار باتیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ تو باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں، کچھ سرے گزر جاتی ہیں۔ بیگم کی میں بتا کر کہ حق دار کو اس کا حق نہیں ملتا۔ مطلب جس کی لاشی اس کی بھینس۔ ادارہ میں تو یاری یعنی جی لا جواب کر دیتی ہیں۔ ادم ہوتا ہے ادارہ (بہت شکر یہ پسند کرنے کا)۔ ہم بھی اپنے خیالات کے گدھے، واہ سوری گھوڑے دوڑاتے ہوئے بڑم دوستان میں پہنچے تو ڈاکٹر نانکھڑی صاحبہ کو ادبی ڈی میں دیکھا لیکن ڈاکٹر کا گریو کی پیشینوں میں کیا کام۔ شاید بھی ڈاکٹر بننے کے مراحل میں ہیں۔ بہر حال تبصرہ بہر تھا۔ ممدارت مبارک۔ محمد زریان نے بھی اچھا لکھا۔ ظاہرہ گزرائی اپنی ادارے کی فینچی بھی آپ کی ہم عمر ہے اور آپ ہی سے پیار ہے۔ اگر یہ اپنا کام نہ کر تی تو بانی کے تبصرہ نگار بیچارے بلیک لسٹ میں پڑے ہوتے۔ زرین آفریدی جی بھی کلاسک تبصرہ کرتی ہیں۔ ساتھ ناہید یوسف بھی۔ رمضان پاشا انکل اور ادریس احمد خان صاحب کے علاوہ بانی نئے تبصرہ نگار میٹا شرکن لکھ رہے

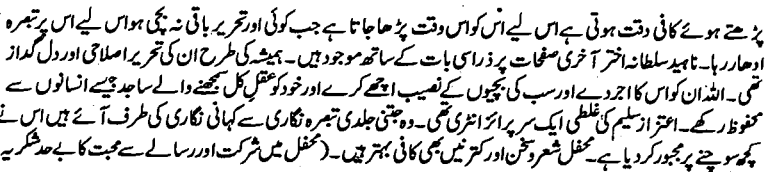
[illegible]



صاحب کی اسی بات کتنی اذیت تاک بات ثابت ہوئی۔ اتنا پرستوں کی ذلالت کی انتہا تھی۔ شاید کا شوہر بھی بہت ہی نیرو مائٹ بندہ تھا۔ بغیر متفق وصفانی کے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔ یہ اچھا ہوا کہ علیہ کو بہت اچھا سرال اور شوہر ملا۔ ملتان ناہید سلطان اختر صاحب۔ اس بار مراسلے تمام نے اور بہترین تھے۔ محفل شعر و سخن بھی عروج پر تھی۔ تینوں اعزازی شعروافی بہت بہت زبردست تھے۔ میرا وٹ بھی سہل کلاسک کے حق میں ہے۔ حج اور عید الاضحیٰ کی بہت مبارک یاد۔ (بہت شکریہ۔ آپ سب کی رائے کا ہم بے حد احترام کرتے ہیں۔ سہل کلاسک کے حوالے سے آپ کا وٹ ہم نے محفوظ کر لیا ہے۔“

مہارمضان پاشا کا خط گلشن اقبال کراچی سے۔ ”ستمبر 2017ء کا سہل کا سرورق بہت خوب تھا۔ یوم آزادی کی مناسبت سے ڈاکر صاحب نے بڑا اچھا ٹائٹل بنایا۔ لہر اتنا ہوا تو ی پرچم اور تو ی ترانہ گائی ہوئی ایک 30 سالہ خاتون کے کان کی پالی میں بھی چاند تارا بہت خوب (اشاء اللہ بہت گہری نگاہ ٹٹائی ہے آپ نے سرورق پر)۔ فہرست بالکل سادہ تھی۔ جشن آزادی کے شایان شان نہیں تھی۔ البتہ انشاء قابل غور اور فکر انگیز تھا۔ اس بار اشعار کی محفل میں چھپے تمام ہی اشعار قابل داد تھے۔ صرف اس عاجز کا شعر نہیں چھپا تھا، خیر کوئی بات نہیں میرا شعر سہل کے مزاج سے متصادم ہوگا! (اشعار اگر معیاری اور اساتذہ کے کلام سے منتخب کریں تو اچھا ہے)۔ منظر امام صاحب کی کہانی چوتھا درویش میں کوئی مزہ نہیں تھا۔ کہانی حقدار نے حق ادا کر دیا یعنی ہمارے پیسے وصول ہو گئے۔ حسام بٹ کی کہانی وقت یہ وقت بتائی گاکہ یہ کہانی لکھ کر بٹ صاحب کو کیا کیا انعام ملے گا۔ باقی نے بھی دل میں تھک چکا تھا۔ ذرا سی بات کہانی بہت ہی دینگ اور پڑا تھی۔ امیدوار بیگ صاحب اس بار بھی اپنا کیس جیت کر ہی رہے۔ وہ ہارنے کب ہیں۔ حسب معمول عدالتی کارروائی میں مزہ آیا۔ دہشت زدہ پسند نہیں آئی۔ مکافات پڑھ کر اپنی جوانی کے دن یاد آ گئے۔ ٹرام، سو بھرا بازار، سیاہی، ماما پاری اسکول وغیرہ، کتنا اچھا تھا اس وقت کراچی اور اب؟ جانے دیجیے! آرٹسٹ بی بی نے جو پورٹ بنایا ہے۔ اس کی کاربن کالی سے ڈاکوؤں کا تپا پانچہ کیا جاسکتا ہے۔ بے شمیر یہ میلی خیرات پر گزارہ کرتی ہے، تعجب ہے امر کی جیسے ملک میں ایسے لوگ بھی رہتے ہیں۔ (ایسے لوگ ہر جگہ ہر معاشرے میں کسی نہ کسی روپ میں موجود ہوتے ہیں)۔ ادھر ادھر خوب لطف بہم پہنچایا۔ غلطی ہائے زود پشیمیاں کاشیاں ہونا، بیگم صاحبہ نے ایسی غلطی کی کہ سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ (آپ کا تمبر من و عن چھپے گا تو پھر باقی قارئین کے سن بھی سن من بھر کے ہوجائیں گے۔ ذرا سوچے تو پھر کیا ہوگا۔“

محمد قدرت اللہ نازی غانیوال سے بھرے کر رہے ہیں۔ ”سرورق پاکستان کے چھٹے سے سچا پیارا لگا تاہم سرورق پر موجود حسینہ کے ناہم تاثرات نے سرورق کی خوبصورتی ماند کر دی۔ انشاء میں جون ایلیا کو زوی حقیقتیں بیان کرتے نظر آئے۔ ہم اپنی ذات میں ایک نہیں رہے، ہم میں دراڑیں پڑ گئی ہیں اور احساس کی ستیں اجڑ گئی ہیں، استعاروں کا استعمال رہا۔ ادارے سادہ الفاظ میں حقیقت بیان کر گیا کہ ہر سال مسائل پر صرف بحث ہی ہوتی ہے مگر نتائج ہمیشہ صفر نکلتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ اخلاص کی کمی ہے۔ کسی کو مسائل کے حل کے لیے عمل کی شرط یاد ہی نہیں رہی۔ ڈائریکٹر ناظر کا تمبر زبردست تھا۔ ان سے متفق ہوں کہ آج ہم نے ٹکڑے ٹکڑے کو دشوار بنایا ہوا ہے جو بے راہروی کی بہت بڑی وجہ ہے۔ ادارے کو نوازے کے مشورے بھی قابل عمل ہیں۔ کرسی صدارت کی مبارک ہو۔ محمد زبیر ان سلطان ناظم کے فرائض سرانجام دیتے نظر آئے۔ ادارے نے پرانی تحریروں میں شائع کرنے کا مندیہ دے کر قارئین کی اکثریت کو پرجوش کر دیا ہے۔ زبیر ان سلطان آپ کی تائید کرتے ہیں کہ مرحوم مصنفین کی تحریروں میں شائع کر کے ان کو خارج حسین پیش کیا جانا چاہیے۔ طاہرہ گلزار کو کوئی بھی تمبر ہلکے ہلکے شکوے کے بغیر پڑھنے میں نہیں آیا۔ اس بار گلے شکوے خوب کام آئے اور ایک مختصر کہانی جتنا تمبر شائع ہو گیا۔ آپ کی نگار میں موجود ترپ مجھ سمیت کئی تمبر نگاروں تک پہنچ گئی ہے اس لیے حاضر ہیں۔ (اشاء اللہ..... سو مت ویکم) ادوار اشعار محفل میں خوش آمدید۔ ناہید یوسف! شوہر بیوی بچوں کی زندگی کے بہرہ ور ہوتے ہیں، اتنی توجہ تو ان کا حق بنتا ہے۔ وقت پر آپ نے بہت تلخ انداز میں لب کشائی کی تاہم آپ سے متفق ہیں کہ لغامی، فلسفہ اور ہروافعی کی غیر ضروری تفصیل زیادہ ہے۔ دوست محمد خان ادا بھی نہیں ہاتھ میں آتے ہی انسان سب مصروفیات چھوڑ کر اس میں گم ہو جاتا ہے۔ محفل میں موجود ہونا بیت تمام قارئین محسوس کرتے ہیں۔ آپ کو سارے ہی تمبرے شاندار لگے حالانکہ ایسا ہوتا نہیں ہے لیکن فیملی کی حمایت تو کرتا ہی ہے۔ نا۔ زاہد احمد خان! آپ کے بیٹے کی ماہنامی موت پر بہت رنجیدہ ہیں۔ اللہ آپ کو صبر جمیل دے۔ عبدالکبیر تو بے شک جنت کا شہزادہ ہی ہے۔ یہ بھی درست فرمایا کہ ایک سے زیادہ ایک غم ہے جہاں میں بس اللہ کی نعمتوں کی شکرگزاری کی جائے تاکہ نعمتوں میں اضافہ ہو۔ نا شکری نعمتوں میں کمی کا سبب بنتی ہے۔ اللہ ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔ عطا اللہ اعوان کے لیے خصوصی شفقت دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ طاہرہ گلزار کی طرح کا شاعر ہر گاہ سب سے پہلے سنے سلسلے باغی نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ باغی کے ڈائریکٹر میں ایک بے ساختہ پن نظر آیا۔ کئی بار ڈائریکٹر غیر راجائی میں محسوس ہوئے جو دلچسپی پیدا کرنے کا باعث بنے۔ جواد پر تو شک پہلے تھا لیکن اشتی جس کو اشتی کہنے کو دل کرتا ہے، اس پر کامران نے اپنی بات میں بھی اندھا اعتماد تھا۔ سچ کہا اشتی نے کہ تم مرد مجی نا کہتے بے وقوف ہوتے ہو۔ کوئی لڑکی تم سے شکر بات کر لے تو تم اس کے ہاتھ پاؤں سے ہو کر خود کو تیار کر لیتے ہو۔ کچھ کچھ ہیروں کے بارے میں محسوس ہوئی کہ کامران صرف بتاتا ہے کہ میرے جوادی کہن نازو نے اپنی اشتی کہتی ہے کہ جواد! ہم نے میرے تو حاصل کر ہی لیے ہیں، سوال یہ ہے کہ میرے کب حاصل کیے؟ دوسرا سلسلہ وقت



۱۵ اشفاق شایین کی لاہور سے آمد۔ ”اس بار سسپنس بہت جلدی مل گیا۔ سرورق ٹھیک ہی تھا۔ پرچم کے ساتھ حسینہ سرورق نہ کھولے شاید عید الاضحیٰ کے گوشت کا انتظار کر رہی ہے۔ خیر ہم بھاگے اپنی غفل کی طرف۔ ایک جھٹکا سا لگا۔ اتنی محنت سے اور بروقت خط لکھ کر سپرد لیٹر نہیں کیا تھا۔ اس بار ٹکڑے ڈاک ہاتھ کر گیا اور اتالیق کہ لیٹ کر زمیں بھی دھو نہنے سے اپنا نام نہل سا۔ سچ اس بار دل بہت رنجیدہ ہوا۔ (یقیناً اس بار آپ کا دل شاد باد ہو گا..... آپ کا خط واقعی بہت دیر سے ملا جس کی وجہ سے غفل میں جبکہ نیا پاکستان میں آپ نے سسپنس کلاس کی حوصلہ افزائی کی۔ شکریہ)۔ ڈاکٹر نانکہ نرشار انداز انٹری کے ساتھ کچھ صدارت پر ابراجاں تھیں، ولیکم اور مہارک باد بھی۔ طاہرہ گلزار، زرین آفریدی، ناہیدہ یوسف، دوست محمد خان اور ذرا خان کے خطوط بہترین تبصروں سے مزین غفل کی رونق بڑھاتے نظر آئے۔ اور یس خان، رمضان پاشا، عطا اعوان، مہتاب احمد، اوشا رنجی اور ذریا سلطان کی حاضری نے بھی غفل میں چار چاند لگا دیے۔ دوڑتے ہیں تبصرے کی طرف۔ سب سے پہلے باغی کی طرف لپکے، شاندار۔ اپنے ٹرانس میں لے لیا باغی نے۔ ایکٹس سے بھر پور کیا کچھ نہ دیکھتا پڑا باغی پتر کو جس پر سب سے زیادہ بھروسہ کیا، انجی نے دغا دی۔ ویسے سچ ہے کہ مرد بہت جلدی بھروسہ کر لیتے ہیں حالانکہ بطور صحافی اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن بھر حال وہ پہلے انسان تھا۔ اب پھر کالی دورا ہے پر ہے کہ کیا کرے۔ مشن پور کرے یا لوٹ جائے دیکھیں..... انتظار رہے گا۔ وقت کی رفتار بہت سست رہی۔ ماں کی تلاش میں لائین واقعات نے دجی بہت گہرا کر دی۔ اینڈ پر ذرا بہتر ہوئی اور امید ہے کہ اس کی تلاش لا حاصل نہیں رہے گی۔ ذرا سی بات ناہیدہ سلطانہ اختر نے آخری صفحات کا حق لے لیا۔ شاہینہ، علیہ اور ان سے بھی بڑھ کر رائل کا والد ایسے بے لوث کردار معاشرے میں نا پید ہیں، بہت پسند آئی۔ باقی کہانیاں ابھی جاتی ہیں غفل شعروجن میں انتخاب لا جواب اور بہترین خصوصاً منظر ہلال، اوشا رنجی اور صاحبہ کا انتخاب کمال تھا۔“



﴿ خلیق ربانی انجم، رجز چار سہ سے شریک محفل ہیں۔ ”ستمبر 2017ء کا سہنس ملا جو بہترین تھا۔ بہت پر نظر ڈال کر آپ کے خط میں چلا گیا کہ کہ خطوط کی محفل میں پہنچے تو صفحہ 14 پر اپنا خط دیکھ کر دل کو خوشی ملی کہ سہنس کے صفحات پر میرا خط بھی اشاعت کے قابل ٹھہرا۔ جس کے لیے شکریہ۔ آپ کے خط کے بعد باغی کے دوسرے حصے میں پہنچے اور ایک باغی کی کٹھا پڑھنا شروع کی۔ پڑھتا گیا اور پڑھتا گیا اور لاسٹ میں پہنچ کر (جاری ہے) کے انتظار کا سولی پر چڑھ گیا۔ اس کے بعد محمد الیاس کے بازار حسن میں پہنچے اور بازار حسن سے دو دو گھنٹہ کرنے کے بعد حوامہ کی وقت سے ہوتے ہوئے رضوانہ ساجد کی حضرت یوسف علیہ السلام پڑھ ڈالی۔ ویسے مجھے طاہر جاوید محفل، الیاس بیٹا پوری، ڈاکٹر ساجد امجد، مرزا امجد بیگ، ملک مفدر حیات بہت پسند ہیں جو سہنس ڈائجسٹ کے پرانے لکھنے والے ہیں۔ یہ بات دل کو کٹی ہے کہ دو تین تین صفحات کا ایک سلسلہ شروع کر دیں جن میں دنیا کی بڑی شخصیات کے متعلق معلومات ہوں یا سہنس ڈائجسٹ کے نگہاریوں کے متعلق باغی گرافی ہو۔ سہنس ڈائجسٹ بلکہ جاسوسی جہلی کیشینز کے تین سلسلے جتنے ڈائجسٹ شائع ہوئے ہیں ان سب کے نگہاریوں کے بارے میں ایک خصوصی نمبر کا اہتمام کرنا چاہیے۔ آپ کی تجویز کو نوٹ کر لیا گیا ہے۔ کہ کوشش کریں گے آپ کی تجاویز پر عمل بھی کیا جاسکے۔ رسالے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔“﴾

۞ انعم کمال کا بچھلے شامے پر تبرہ حیدر آباد سے۔ ”سپنس کا اور ہمارا رشتہ یوں تو کافی پرانا ہے مگر خط لکھنے کی جسارت نہیں کر پاتے۔ پھر سوچا کوشش کر ہی لی جائے۔ سب سے پہلے تمام قارئین و اہل وطن کو ہماری طرف سے جتن آزا دی مبارک اللہ اس پاک وطن کو سلامت رکھے آئین۔ ہمارا فرض جتنا ہے کہ ملک کی ترقی کے لیے ہر شخص خواہ وہ کبھی شیعہ سے تعلق رکھتا ہو، اپنا کردار ادا کرے۔ آج کل ویسے ہی ہمارا ملک مشکلات کا شکار ہے۔ آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ خدا را اس کی قدر کیجیے۔ سپنس میں ہماری سب سے پسندیدہ کہانی تاریخی ہوتی ہے۔ اس لیے ہم بڑے ہی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر مساجد امجدی کی سیوا سے سنبانک پڑھی۔ مہربانوں کے قلم سے غلطی خدا پریشان تھی۔ بالآخر بادشاہ وقت عالمگیر کے ہاتھوں انجام کو پہنچے۔ بہت لا جواب تحریر تھی۔ اس کے بعد فہرست پر نگاہ دوڑائی..... مگر کیا؟ ظاہر جاوید فضل کا نام نہیں نظر

سوشل میڈیا قارئین کے لیے اہم اطلاع

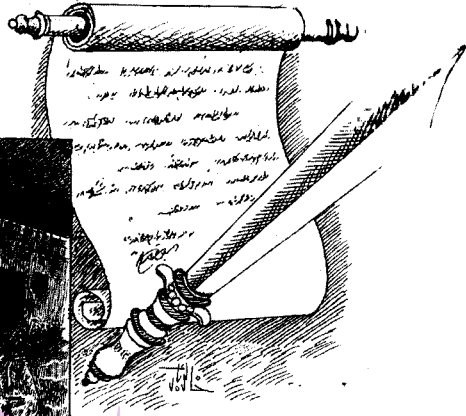
مٹل میڈیا اور انٹرنیٹ وغیرہ پر ادارے کی کوئی OFFICIAL WEBSITE نہیں ہے۔ جو ایڈمن اپنی WEBSITES پر آفیشل کالفظ استعمال کر رہے ہیں، اسے فوری ترک کر دیں تاکہ قارئین کی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ بصورت دیگر ادارہ سائبر کرائم ایکٹ کے تحت کارروائی کرے گا۔

نہیں آیا۔ اچانک ہمیں اداسی نے گھیر لیا۔ طاہر جاوید مٹل کی کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے اعزاز تحریر کا تو ایک زمانہ محترف ہے۔ خیر، اس امید پر کہ آئندہ وہ ان کا نام فہرست میں نظر آئے گا، آگے بڑھے۔ تاہید سلطانہ اختر کی خواب سراب کا مطالعہ کیا۔ تاہید سلطانہ نے صفحات کا حق ادا کر دیا۔ بہت ہی شاندار کہانی تھی۔ اس طرح کی کہانیاں ہمیں ایک سبق دیتی ہیں۔ سطر امام کی سہارا بھی مختصر مگر سبق آموز کہانی تھی۔ نیا سلسلہ باغی یوں تو راتر کا نام جانا بیچنا نہیں مگر کام لا جواب ہے۔ بہت ہی تیز رفتار اسٹوری ہے۔ مگر ان چوہری نے معاشرے کی خرابیوں کو بے نقاب کرنے کا مہم ارادہ کیا ہوا ہے اور اس راہ میں وہ اپنے خوشی رشتوں پر بھی ہاتھ ڈالے سے گریزاں نہیں ہے۔ ویلڈن طاہر عمیر صاحب۔ ملک صفدر حیات کی طاہر کچھ خاص تاثر قائم نہ کر سکی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی سوانح حیات پر مبنی تحریر پڑھ کر روح تروتازہ ہو گئی۔ بے شک ہمیں اسلامی تاریخ کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ راہنمائی حاصل ہو۔ زویا اعجاز کی زندان بھڑکائی تھی۔ محبت کرنے کی پاداش میں چوہریوں نے شاہ سے نہ صرف محبوب جیمین لیا بلکہ اسے دہری اذیت سے دو چار کیا اور وہ ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ کہانی پڑھ کر بہت اداس ہو گئے۔ وقت حسام حیات صاحب کی اچھی کہانی ہے مگر کہانی کی رفتار اچانک سست ہو گئی ہے تاہم لکنا ہے کہ جلد ہی کہانی میں تیزی آنے والی ہے کیونکہ ہمیر صاحب اپنی والدہ کی تلاش میں پاکستان آن پہنچے ہیں اور آتے ساتھ ہی مشکلات نے ان کا استقبال کیا ہے۔ ایڈز بہت زبردست رہا۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے گا۔ تنویر یاسین کی غل و غلو حالات لا جواب کہانی تھی۔ ایک کل کا سراغ لگانے کے چکر میں ان کا کل اسی کے گلے میں پڑ گیا۔ بابر عسکری کا کام کوشش مزہ نہ دے سکی۔ یورنگ کہانی تھی۔ شاکر لطیف کی مغرب و مشرق زبردست کہانی تھی۔ ہمیشہ کی طرح مشرق نے اپنی روایت قائم کر لی اور غلط اقدام اٹھانے سے گریز کیا۔ زبردست شاکر صاحب۔ علی اختر کی احساس بھی اپنا تاثر قائم نہ کر سکی۔ البتہ شیر شاہ سید کی وہ دل کہاں سے لاؤں نے میدان مار لیا۔ محبت کی داستان اور پرانے کرچی کی حشر بھی لا جواب رہی۔ سلیم انوری کی ذہانت بس شیک کی شہر عباس کی دہری خوشی اچھی کہانی تھی۔ سمارہ خان کی تھمہ بھی یورنگ کہانی رہی۔ غلطو کی محفل میں تمام دوستوں کے غلطو اچھے تھے۔ محفل شعرو سخن پڑھ نہیں پائے اس لیے اس پر تو تیرہ۔ مجموعی طور پر سسٹنس نے بہت منظور کیا۔ باقی تیرہ اگلے ماہ کریں گے، امید ہے ہمارا بخورودی کی نوکری کی نذر نہیں ہوگا۔

کرن عمران گلشن اقبال کراچی سے گزشتہ شمارے پر تیرہ کر رہی ہیں۔ ”بہت عرصہ ہوا سسٹنس کو پڑھتے ہوئے مگر کبھی لکھنے کی جرات نہیں کی۔“ (مگر کیوں بھی۔ ہم نے ایسا کیا تصور کر دیا)۔ بہر حال اس بار ایک نئی کہانی باغی پڑی تو سو قائل اٹھاؤں۔ اچھے اعزاز میں شروع ہونے والی ایک خوبصورت داستان ہے جسے محمد طاہر عمیر نے دلچسپ پیرائے میں لکھا۔ دوسری کہانی آخری صفحات پر تاہید سلطانہ اختر کی خواب سراب بہت ہی عبرت انگیز کہانی پڑھنے کو ملی۔ بے شک اب معاشرے میں اتنا نگاہ پیدا ہو گیا ہے کہ والدین جو بھی اپنی اولاد پر آکھ بند کر کے بھروسے کرتے ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کم کرتے ہیں، اب انہیں اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ سخت نگرانی کرنے کی بھی بے حد ضرورت رہتی ہے۔ ایک بات سمجھ نہیں آتی تاہید جی کہ جو بھی اتنی فرمانبردار اور خوش اخلاق تھی، اچانک اس کا ذہن کیسے پلٹا گیا؟ حضرت یوسف علیہ السلام کا سلسلہ اگرچہ سبیل علی پڑھ چکے ہیں مگر ہر بار اچھا لگتا ہے۔ کافی سبق آموز واقعات ہیں۔ تاریخی صفحات پر اب ہر بار ایک نئی اور تازہ کہانی نظر آ رہی ہے۔ بڑے تسلسل سے ڈاکٹر ساجد ساجد کا ساتھ مل رہا ہے۔ سید سناغناک میں بھی ڈاکٹر صاحب نے ان کی زندگی کا منظر نامہ بہت خوب صورت پیرائے میں لکھا۔ ویلڈن۔ اس ماہ کی سب سے خوب صورت اور مختصر کہانی سہارا بہت متاثر کن رہی۔ سطر امام کی کمال ہے کہ مختصر تحریر میں بڑی بات کہہ جاتے ہیں اور پھر ڈاکٹر شیر شاہ سید کا تو کیا کہنا۔ ہمیشہ دل میں بچتی اور کب پیدا کر دینے والی تھیں جیسے پڑھنے کے بعد انسان کافی دیر تک اس کے سحر میں کمر ہوتا ہے۔ وقت بھی حسام بیٹ کا سلسلہ دیر سے دیر سے دیر سے پیدا ہوا ہے۔ علی پاکستان آ گیا ہے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ ملک صفدر حیات کی کفایت طاہر کے عنوان سے پڑھنے کو ملی۔ اگر یونی سنہرے اصولوں کے انصاف بآسانی ملتا ہے تو ہر معاشرہ اپنی مثال آپ بن جاتے۔ زویا اعجاز کی زندان اور شاکر لطیف کی مغرب و مشرق نے بھی کافی لطف دیا اور سلیم انوری کی ذہانت بھی توجہ حاصل کر گئی۔ محفل شعرو سخن اور کتر تین تو سسٹنس کے حسن کو دوبارہ لکھ دیتے ہیں مجموعی طور پر سالہ شاندار رہا۔

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

امیر خان مری بلوچ، میر پور خواص، اطہر حسین، کراچی۔ تاہید یوسف، اسلام آباد۔ مہر خان، حیدر آباد۔ مہتاب احمد، حیدر آباد۔ ثاقب احمد، ناٹورہ۔ رحمان نواب شاہ۔ منسل علی، ملتان۔ عاصمہ، سرگودھا۔ عظیم احمد، جھنگ۔ ٹی۔



شاہ شب

ڈاکٹر ساجد امجد

یوں تو سغلیہ عہد کی تاریخ بہت طویل ہے اور اس کے پر پہلو کا احاطہ کرنا ناممکن نہیں تو آسان بھی نہیں ہے۔ اسی تسلسل کی ایک اور کڑی میں اورنگزیب کے بیٹے اعظم شاہ اور شاہ عالم کے کردار سے بھی انکار ممکن نہیں ہے... اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اقتدار کا فسوس اپنے سحر سے کسی کو آزاد نہیں ہونے دیتا... بس مقدر کی یاوری چاہے پھر... دیکھتے ہی دیکھتے پانسے پلٹتے چلے جاتے ہیں اور کبھی بیٹے باپ کے مقابل، کبھی باپ بیٹوں سے متنفر اور خوفزدہ اپنے ہمدردوں اور مصاحبوں کے درمیان بیٹوں کے خلاف سازشوں اور اندیشوں میں گھرا ہوا... عہد کوئی بھی ہو تاریخی منظر نامہ کرداروں کے رد و بدل کے ساتھ تقریباً یکساں صورت حال دکھاتا ہے۔ تخت و تاج کے لیے سب کی کاوشیں اور رنجشیں ایک جیسی سازشوں کا جال بنتی رہیں اور جب زندگی کی شام ان کے حلوں میں اتری تو انسان کی اوقات وہی دو گز زمین اور کفن کے سوا کچھ نہ

-(۱۰۱)

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

اکتوبر 2017ء

16

سپینس ڈائجسٹ



قید خانے کی بیرونی دیواروں پر ابھی سورج کی کرلوں کا پوری طرح قتل نہیں ہوا تھا کہ چند سواروں کی گھرائی میں اورنگ زیب عالم گیر کا محرم راز خواجہ سرا قید خانے کے بھاری بھر کم دروازے کے سامنے آ کر ٹھہر گیا۔ پہلے دروازے داروں نے شناخت کے بعد دروازہ کھول دیا۔ پہلے دروازہ کھلنے کی آواز آئی پھر سورج کی روشنی نے قید خانے میں قیام کیا۔ قیدی نے اپنی کوشری سے باہر جھانکا اور پھر ایک گوشے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس وقت کون آ سکتا ہے اور اب کیا نئی افتاد آنے والی ہے؟ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ خواجہ سرا اس کے سامنے پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں خوان پوش تھا جو اس نے قیدی کے سامنے رکھ دیا۔ قیدی نے خواجہ سرا کی طرف دیکھا بھی گوارا نہیں کیا اور تھال پر ڈھکے خوان پوش کو الٹ دیا۔ تھال میں ایک قلم دان اور کچھ ضروری سامان رکھا تھا۔ اس نے قلم دان کھولا لیکن گھبرا کر ہاتھ پیچھے ہٹ گیا۔ اس میں اور سامان کے ساتھ ایک چاقو بھی رکھا تھا۔ قیدی کے لیے یہ چاقو بھی گھبراہٹ کا باعث نہ تھا۔

”شاید یہ چاقو غلطی سے آ گیا ہے کیونکہ چھری یا چاقو قیدیوں کے پاس بھیجتا خلاف ضابطہ ہے اور ظاہر ہے میں قیدی ہوں، خواہ میری اصلیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔“ قیدی نے کہا۔

”یہ چاقو غلطی سے نہیں آیا بلکہ ازراہ مہربانی بادشاہ نے یہ چاقو اپنے ہاتھ سے قلم دان میں رکھا تھا اور مجھے بتا بھی دیا تھا۔“ خواجہ سرا نے عرض کیا۔

اس وضاحت کے بعد قیدی نے وہ چاقو اپنے پاس رکھ لیا۔ خواجہ سرا نے اجازت طلب کی اور وہاں سے اٹھ آیا۔ یہ قیدی کوئی اور نہیں بادشاہ اورنگ زیب کا چیتا بیٹا شہزادہ محمد معظم شاہ عالم تھا۔ یہ بد نصیب شہزادہ گولکنڈہ کے محاصرے سے برابر قید میں تھا۔ قلعہ گولکنڈہ فتح ہو چکا تھا لیکن چھ سال گزرنے کے باوجود شہزادے کو رہائی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

اور اب یہ مہربانی! بادشاہ اسے خفہ بھیج رہا تھا لیکن بطور آزمائش۔

بادشاہ نے وفادار خواجہ سرا کو حکم دیا تھا۔

”تم دیکھتے رہنا کہ قلم دان ہانے کے بعد شہزادہ کیا کرتا ہے۔ اگر وہ قلم دان کھولنے کے بعد چاقو رکھنے میں تامل کرے تو تم اس سے کہنا کہ بادشاہ نے عہد یہ چاقو بھیجا ہے اور اگر وہ اس کو بلا تکلف رکھ لے تو تم اس سے پوچھ نہ کہنا اور نہ چاہ لوٹ آنا۔“

خواجہ سرا نے واپس آنے کے بعد ساری کیفیت عرض کی۔ بادشاہ جواب میں صرف یہ کہہ سکا۔

”ہم اپنے فرزندوں کی غیرت کو خوب جانتے ہیں۔“ وہ رات بادشاہ نے ٹپٹلے ہوئے گزاری تھی۔ اسے اب شہزادے کی وفاداری پر کوئی شک نہیں رہ گیا تھا۔ صبح ہوئی اور وہ اورادو و خانقہ سے فارغ ہوا تو اس نے قلم دان طلب کیا اور ایک حدیث جس کا مضمون یہ تھا کہ حافظ قرآن کو اگرچہ وہ جس دوام کا سزاوار ہو، عمر قید نہیں دی جاسکتی..... لکھ کر شہزادے کے پاس بھیج دی۔

شہزادے کو یہ خط موصول ہوا تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بادشاہ اس کی رہائی کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے کوئی بات ظاہر کیے بغیر جواب میں ایک دوسری حدیث لکھ کر بادشاہ کے پاس روانہ کر دی جس کا مضمون یہ تھا کہ حافظ قرآن کو جس دوام کی سزا نہیں دی جاسکتی مگر باپ باوجود احترام حفظ کلام اللہ بیٹے کو ہمیشہ کے لیے قید میں رکھ سکتا ہے۔

شاہ عالم کا جواب پڑھ کر بادشاہ کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اسے بیٹے کی فرمائندہ داری پر فخر ہو رہا تھا۔ یہ احساس بھی شدت اختیار کرنے لگا تھا کہ شاہ عالم پر یہ الزام غلط تھا کہ اس نے مرہٹوں سے ساز باز کر رکھی ہے۔ شاہ عالم کے خلاف سازشوں کا جال بچھایا گیا تھا جس میں بادشاہ الجھ گیا اور شاہ عالم سے ہتھیار رکھوا لیے۔ اس وقت سے لے کر اب تک وہ گرفتار چلا آ رہا تھا۔ اس کی سزائیں روز بروز اضافہ ہوتا چلا آ رہا تھا۔

بادشاہ بے جا پور میں تھا کہ اسے شاہ عالم اور اس کے بیٹوں کی رہائی کا خیال آیا۔ اس نے شاہ عالم سے پہلے اس کے بیٹوں یعنی اپنے بیٹوں کی رہائی کے احکام جاری کیے۔ ان دونوں کے لیے بادشاہی شامیانے سے متعلق خیمے لگائے گئے۔ چند دنوں بعد دونوں کے منصب بحال ہو گئے۔ شہزادہ معز الدین کو فوج اور توپ خانہ دے کر کوکن کے باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا گیا اور شہزادہ عظیم کو بادشاہ نے اپنی پیشی میں متعین و مامور کر کے اسے اختیار دیا کہ وہ بادشاہ کی طرف سے کاغذات پر دستخط کر سکتا ہے۔

بیٹوں کی رہائی کے بعد بادشاہ کا مکمل ارادہ ہو گیا تھا کہ شاہ عالم کی رہائی کا حکم صادر کرے گا لیکن سازشیں برابر کام کر رہی تھیں۔ بادشاہ کے کان بھرے جا رہے تھے کہ اگر شاہ عالم کو رہائی مل گئی تو وہ مرہٹوں سے ساز باز کرے گا۔

اس طرح اس کی رہائی کا وقت ملتا رہا۔ اسی اثنا میں یہ خبر آئی کہ مرہٹوں نے رام راجا کو جو سنبھا کا بھائی تھا اور قید

لشکر میں آنا خلاف مصلحت ہے۔ اس لیے ہم شکار کے لیے نکل رہے ہیں۔ تم بھی چار پانچ سوسواروں کو لے کر نکلو اور حاضر خدمت ہو جاؤ۔“

اس خط کے روانہ ہونے کے بعد بادشاہ نے شکار کے لیے مختصر خیمہ باہر نکالنے کا حکم دیا اور ہدایت کی کہ خیمہ ایسے نشیب میں لگایا جائے کہ وہاں سے لشکر نظر نہ آئے۔ خیمہ آدی بھی مقرر کر دیے گئے کہ راستوں کی نگرانی کریں۔ شہزادے کے لشکر کی ناکا بندی کر دیں اور دولت خانے کی بھی سخت نگرانی کرتے رہیں۔

جب دولت خانہ شانی پر جو شکار کے نام سے نصب کر دیا گیا تھا، سواری پہنچی تو شہزادے کے پاس حکم پہنچا۔ ”دولت خانہ بہت مختصر لگایا گیا ہے اس لیے تم پر لازم ہے کہ تم اپنے ساتھ تین سوسوار سے زیادہ آدمی لے کر نکلا ہی ابھی شہزادہ حسب الحکم تین سوسواروں کو لے کر نکلا ہی تھا کہ ایک اور حکم آ گیا کہ وہ صرف دو سواروں کی بجائے کو لے کر آئے۔ اس نے سو آدمی اور کم کر دیے۔ ابھی کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک چیلان سواروں کو بھی آدھا کرنے کا حکم ملے آیا۔ دولت خانے تک پہنچنے پہنچنے آدمیوں کو کم کرنے کے پیغامات مسلسل آتے رہے، یہاں تک کہ جب وہ دولت خانے کے قریب پہنچا تو شاہی چیلے نے پیغام پہنچایا۔

”شکار نشانے پر ہے، وہ بھڑک کر نکل جائے گا اس لیے شہزادہ زیادہ جھوم کو ساتھ نہ لائے۔ صرف تین محافظوں کو اپنے ساتھ لے لے اور باقی تمام آدمیوں کو لوٹا دے۔“ شہزادہ اعظم شاہ کو خطرے کی بو محسوس ہوئی لیکن اب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے صرف دو محافظ تھے۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا اور وہ خود کو دوام بلا میں گرفتار دیکھ رہا تھا۔ ایک امیر مختار خاں جو بادشاہ کی نظروں میں وفادار کا درجہ رکھتے تھے، آگے بڑھے اور شہزادے کا ہاتھ تھام لیا۔

”عالم پناہ کا حکم ہے کہ آپ محافظوں کو وہیں چھوڑیں اور بادشاہ کے روبرو حاضر ہو جائیں۔“

شہزادے نے ابھی محافظوں کو چھوڑ کر قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ دوسرا حکم آ گیا۔ ”شہزادے سے کہو بھتیار اتار دے اور بادشاہ کے حضور غیر مسلح حاضر ہو۔“

یہ سننے ہی شہزادہ جھجک گیا۔ اس کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے مگر مختار خاں اسے تسلی و لا سادے کر اپنے ساتھ بادشاہ کے حضور لے گیا۔

میں ہڑا ہوا تھا، ہلکی پر ہٹا دیا ہے۔ نہ چہ تو یوں نے اطلاع دی۔

”رام را جانے اپنے سرداروں کی چلی جوئی کر کے اپنے باپ اور بھائی کی روش پر شہر اور قلعوں کی تاخت و تاراج کے لیے انہیں مجبور کیا ہے۔“

عالم گیر اس وقت بے جا پور میں تھا۔ شاہ عالم کا خیمہ قیدیوں کی بارک میں تھا۔ بادشاہ نے اس کا خیمہ بادشاہی شامیانے کے متصل لگانے کا حکم دیا اور اسے مجرا کے... لیے آنے کی اجازت دے دی۔ کبھی کبھی اس کے لیے خاصہ سے ناشا اور پھل بھی بھجواتے رہے۔ بادشاہ کی اس مہربانی نے لشکر میں یہ خبر عام کر دی کہ بادشاہ نے شہزادے کو رہائی بخش دی ہے۔

یہ خبر ایسا فوہا سننے ہی مخالف امراء میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ سازشوں نے زور پکڑا۔ بادشاہ کو ہراساں کرنے کے لیے یہ خبر اڑادی گئی کہ شہزادہ اعظم شاہ، شاہ عالم پر مہربانیوں کو شک کی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور عترب ”بنکا پور“ (جہاں وہ تعینات تھا) میں شورش برپا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ممکن ہے وہ مرہٹوں سے بھی ساز باز کر لے۔

ان خبروں میں کوئی صداقت نہیں تھی لیکن بادشاہ نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ اعظم شاہ کو بنکا پور سے بلا لیا جائے۔ بادشاہ نے ایک حکم نامے کے ذریعے اسے بنکا پور سے دوسرے علاقے ”داکن گیرہ“ جانے کی ہدایت کر دی۔ اعظم شاہ بدیت نہیں تھا اس لیے اس نے فوراً اس ہدایت پر عمل کیا۔ اس دوران اسے یہ خبر بھی موصول ہو چکی تھی کہ شاہ عالم کی رہائی عمل میں نہیں آئی ہے۔

داکن گیرہ کا علاقہ لشکر شاہی کے راستے میں واقع تھا لہذا جب اعظم شاہ اپنی فوج لے کر نکلا اور شاہی لشکر گاہ کے قریب پہنچا تو یہ خبر پھیل گئی کہ اعظم شاہ کے دل میں بے ایمانی آ گئی ہے اور وہ حملہ آور ہونے کے لیے آ رہا ہے۔ اعظم شاہ کے کانوں تک یہ خبریں پہنچیں تو وہ سخت غرمند ہوا۔ اس نے اپنی صفائی کے لیے ایک عریضہ بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔

”میں قدم پوی کے لیے حاضر ہونے کا اشتیاق رکھتا ہوں لیکن لشکر میرے ساتھ ہے۔ اگر آپ میری نیت پر ہراساں کریں تو میں لشکر سمیت لشکر والا میں داخل ہو جاؤں؟“ بادشاہ نے اسے بھی اس کی چال سمجھا اور جواب میں اشارہ فرمایا۔

”ہم بھی تمہیں دیکھنے کا اشتیاق رکھتے ہیں مگر تمہارا

باپ کی خدمت میں پہنچنے کے بعد شہزادہ آداب و تسلیات بجالایا اور بادشاہ کا تین مرتبہ طواف کر کے نذرانے گزارے۔ بادشاہ نے بڑی شفقت اور مہربانی سے شہزادے کو سینے سے لگالیا اور شکار پر تیر اندازی کا حکم دیا پھر شہزادے کو اپنے ساتھ ہی بیچ خانے میں لے جا کر اسے بیٹھنے کا حکم دیا پھر اسے مخاطب کیا۔

”ہم نے تمہیں قید کر لیا تھا مگر اب رہا کر دیا۔ قید کی خبر تمہارے آدمیوں تک پہنچ چکی ہوگی اور وہ سب نہایت مغموں اور مایوس ہوں گے اس لیے اب تم جلد ہی واپس چلے جاؤ۔“

شہزادہ رخصت ہونے لگا تو خلعت اور جوہرات عطا فرمائے۔

☆☆☆

مرہٹہ سردار سنہا کے قتل کے بعد رام راجا کی طرف سے بہت سے نامی گرامی مرہٹہ سردار بادشاہی لشکروں کو تنگ کرنے اور چھاپے مارنے کے لیے چاروں طرف منتشر ہو گئے تھے اور چھاپے مارتے پھرتے تھے۔ ان میں سنہا نامی سردار سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ اس کے پاس پندرہ بیس ہزار جنگی سواروں کی فوج موجود تھی اور دوسرے مرہٹے بھی اس کی مدد کرتے رہتے تھے۔ وہ شہری آبادیوں کو تاخت و تاراج کرتا پھر رہا تھا۔

یہ ساری خبریں بادشاہ کو مل رہی تھیں جن سے بادشاہ سخت کبیدہ ہو رہا تھا۔ اس نے نامی گرامی امرا کو ایک بڑی فوج کے ساتھ روانہ کیا کہ اس کا فرائض سرکوب کریں۔ شاہ عالم جو ابھی رہا نہیں ہوا تھا، چل کر رہ گیا۔ اس نے یہ موقع غنیمت جان کر بادشاہ سے درخواست کی کہ اسے بھی اس معرکے میں بھیجا جائے لیکن شاید ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ اس کی درخواست نامنکور ہوئی۔

امیر قاسم خاں، غنیم سے مقابلے کا ارادہ کر کے فوج کو تیار کر چکا تھا اور اپنا پیش خانہ آگے روانہ کر دیا تھا۔ روح اللہ خاں بھی قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا تھا کہ ہر کاروں نے خبر دی کہ دشمن کی فوج کا ایک دستہ پیش خانہ پہنچ چکا ہے اور لوٹ مار میں لگا ہوا ہے اور بادشاہی فوج کو پریشان کر رکھا ہے۔ قاسم خاں نے یہ خبریں سن کر سرداروں کی کمک پر جانا چاہا مگر ہر طرف لڑائی چھڑ گئی تھی۔ یہ جنگ غروب آفتاب تک جاری رہی۔ بہادر لشکریوں نے مرہٹوں کو بہت دکھائی لیکن بار برداری اور بال و اسباب سب غارت ہو گیا۔

دشمن کا خوف ایسا تھا کہ تمام سرداروں نے شب خون کے خیال سے ہاتھیوں پر رات بسر کی اور فوج کے سواروں نے گھوڑوں کی باکیں تھامے رات گزاری۔

صبح ہوتے ہی مرہٹے بے خوف ہو کر چڑھ دوڑے۔ ادھر بھی کیا کی تھی۔ بادشاہی فوج نے بھی جوہر دکھائے لیکن مرہٹوں کا پلڑا بھاری رہا۔ شاہی فوج کی ایک بڑی جماعت کام آگئی۔

تین دن تک شاہی فوج مرہٹوں کے گھیرے میں رہی۔ نہ کھانے کو کچھ تھا نہ پینے کو۔ ایک میل تک اڑ کر منہ میں نہیں گئی۔ جب حالات بہت تنگ ہوئے تو یہ طے کیا گیا کہ تعلقہ دندیری کی گڑھی میں پناہ لی جائے۔ یہ گڑھی قاسم خاں کی مکمل داری میں تھی۔

رات کے اندھیرے میں سناٹے کی چادر کو تار تار کرتے ہوئے یہ سپاہی گڑھی کی طرف بڑھے۔ یہ دیکھ کر سب حواس باختہ ہو گئے کہ مرہٹوں نے اس گڑھی کو بھی چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ گھوڑوں کی باکیں کھینچ کر جو سپاہی جہاں تھا، وہیں ٹھہر گیا اور دن نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ دن نکلا تو بھوکے سپاہی شیروں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ مرہٹے بھی دانت تیز کیے بیٹھے تھے۔ دن بھر لڑائی ہوئی رہی۔ آخر بادشاہی فوج گڑھی کے نیچے شام کے وقت پہنچ گئی۔ رات ہوئی تو گڑھی والوں نے کھاس اور دانہ بیجا۔ وہ بھی خاص خاص آدمیوں کو مل سکا۔ تین چار درز تک لشکر گڑھی کی دیوار کی پناہ میں مور چاندی کر کے دشمن کے حملوں کو روک رہا تھا۔

گڑھی کے دروازے کھل نہ سکتے تھے۔ قلعے کے نیچے، بقال اور باشندے دیوار پر سے ہی غلہ اتارتے تھے۔ اب جس کے جوہر تھ آجائے۔

چوتھے یا پانچویں روز مرہٹوں کو یہ اطلاع ملی کہ بادشاہ کی طرف سے کمک آنے والی ہے۔ خان جہاں بہادر کا بیٹا ہمت خاں ایک بڑا لشکر لے کر مدد کو آنے والا ہے۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ جس کا انتظار کیا جاتا۔ ہمت خاں کی بہادری سے سب واقف تھے۔ مرہٹہ سردار سنہا نے نصف فوج کو یہاں چھوڑا اور بقیہ نصف کو لے کر ہمت خاں کا راستہ روکنے کے لیے چلا گیا لیکن جب ہر کاروں نے اطلاع دی کہ ہمت خاں کے مقابلے کے لیے رام راجا نے ایک فوج بھیج دی ہے تو وہ مطمئن ہو گیا اور گڑھی کی طرف لوٹ آیا۔

اس کے لوٹنے سے پہلے اس کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر قاسم خاں، روح اللہ خاں اور دوسرے امیروں نے خفیہ مشورہ کر کے گڑھی میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔

”وہ تو سب ٹھیک ہے۔“ روح اللہ خاں نے کہا۔

”گڑھی کے اندر داخل ہونا کچھ اتنا آسان نہیں ہے۔“

کے ساتھ مرہٹہ سرداروں کے پاس جایا جاسکے۔ اتفاق سے ایک دکنی زمیندار فوج میں تھا۔ وہ سنٹا کو جانتا تھا۔ اس نے پیش کش قبول کی اور منسل امراء کو سنٹا کے پاس لے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ روح اللہ خاں اور دوسرے سردار اس زمیندار کے ساتھ باہر نکلے اور مرہٹوں کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ سنٹا محلے میں قیمتی مالا ڈالے، ہاتھوں میں شکن پہنے ننگے بدن ایک شاندار کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے دو چیلے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ بادشاہی وفد کو دیکھ کر سنٹا کے چہرے پر ہنسی مکر اٹھ اُبھرا آئی۔

”آؤ مہاراج! آج ہماری یاد آپ کو کیسے آگئی؟“ سنٹا نے روح اللہ خاں سے پوچھا۔

”مہاراج! انہیں ان کی مجبوری پہنچا سنبھال لائی ہے۔ یہ آپ سے کچھ بات کرنے آئے ہیں۔“ روح اللہ کے بجائے زمیندار نے جواب دیا۔

”ان کی جھگی ہوئی گردن بتا رہی ہے کہ کوئی بات ضرور ہے۔ بہر حال بتاؤ کیا بات ہے؟“ اس موقع پر روح اللہ نے بولنا ضروری سمجھا۔

”آپ مجھے حاصرے کی وجہ سے ہمارے لشکر کی حالت بہت بری ہے۔ میرے لوگ قاتے کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ آپ کا بھی بہت وقت ضائع ہو رہا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ حاصرہ اٹھا لیں تاکہ ہم گڑھی سے نکل جا سکیں۔“

”مجھ پر تو آپ کی اچھی ہے لیکن.....“

”آپ فکر نہ کریں۔ اس کے بدلے آپ جو کہیں گے میں دینے کو تیار ہوں۔“ روح اللہ نے کہا۔

”آپ کے ساتھ جو ہانسی کھوڑے ہیں، ان کے علاوہ میں ایک لاکھ ہون (جو ساڑھے تین لاکھ روپے کے مساوی تھا) کم نہیں لوں گا۔ جی چاہے تو سودا کرو، جی چاہے تو نہ کرو۔“

زمیندار نے اس وقت سخت نمک حرامی کی۔ سنٹا کے کان میں کہا۔

”یہ کیا بات تو نے کہی۔ کوئی اور سخت مطالبہ کر۔“ سنٹا فوراً اپنی بات سے پھر گیا اور معاوضہ بڑھا دیا۔

”تمام سرداروں سے میں سات لاکھ ہون لوں گا۔ ہر شخص جان کی امان کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اپنے حصہ رسدی کے مطابق دستاویز لکھ کر دے دے اور رقم کی وصولی تک اپنے کسی عزیز یا اپنے عہدہ اور معزز آدمی کو بطور پرغال میرے پاس چھوڑ دے۔ میرے آدمی گڑھی کے

”میں کچھ سوچ کر رہا ہوں۔ دروازے سے داخل ہونا آسان نہیں لیکن ایک جگہ میں ایسی دیکھ آیا۔“ یہاں رسیاں ڈال کر اوپر چڑھا جاسکتا ہے۔“

”دروازہ تو پھر بھی کھولنا پڑے گا؟“

”وہ بعد کی بات ہے۔ ہمیں فی الحال یہ کرنا ہے کہ لشکر میں کسی کو خبر نہ ہو کہ ہمارے ارادے کیا ہیں۔“

”وہ کس لیے؟“

”اگر یہ خبر عام ہوگئی تو دروازے پر بے پناہ ہجوم ہو جائے گا۔ اگر دشمن کو خبر ہوگئی تو ہمیں ایک اور جنگ کا سامنا ہوگا۔“

”پھر کیا ہو سکتا ہے؟“

”لشکر میں یہ خبر عام کر دو کہ ہم ساز و سامان اندر بھیج رہے ہیں تاکہ سبک بار ہو کر دشمن پر حملہ کرنے کے لیے باہر نکلیں۔“

یہ سب باتیں ہو چکیں تو قاسم خاں گشت کے بہانے نکلا اور رسیاں ڈال کر دیوار پر چڑھ گیا اور قلعے میں پہنچ گیا۔ اس احتیاط کے باوجود روح اللہ خاں اور صف شکن خاں ہجوم میں دھکے کھاتے ہوئے اندر داخل ہو سکے کیونکہ دروازے پر بے پناہ ہجوم ہو گیا تھا۔

مرہٹوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے گڑھی کا محاصرہ کر لیا۔ اب حال یہ تھا کہ کوئی دروازے سے باہر نہیں آ سکتا تھا۔ محاصرہ اتنا سخت تھا کہ دیوار سے جھانکنا بھی موت کو دعوت دیتا تھا، بندو قوں کو خوراک پہنچانا تھا۔

محاصرہ روز بہ روز سخت ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، غذا کے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ جب اس محاصرے کو ایک ماہ گزر گیا تو حالت بہت نازک ہوگئی۔ غذا کی قلت شدید ہوگئی۔ بار برداری کے جانور ہلاک ہونے لگے تھے لہذا ذبح کر کے کھالیے گئے۔ جو غلہ گڑھی کے اندر لایا گیا اور کنوؤں میں جمع کر لیا گیا تھا، وہ بھی ختم ہو گیا۔

سب سے زیادہ خراب حالت خود قاسم خاں کی تھی۔ وہ انہیں لمانے کا عادی تھا۔ یہاں کھانے کو نہیں تھا، افیون کہاں لائی اس کی حالت بگڑنے لگی اور بالآخر وہ مر گیا۔ اس

بعد سب کے حوصلے جواب دے گئے۔ امراء اور لوگوں کی اپنی موت نظر آنے لگی۔ اب اپنی ضد پر

لہ رہا تھا۔ سب نے یہی طے کیا کہ انہوں نے امان طلب کی جائے۔ اس کے تاوان میں وہ جو

بھگتا رہے، انہیں دے دیا جائے۔ اس کے عوض وہ

”انہوں نے امان طلب کی جائے۔ اس کے تاوان میں وہ جو

دروازے پر متعین ہوں گے جو سرداروں کو تو بدن کی پوشاک اور سواری کے ایک گھوڑے کے ساتھ اور دوسروں کو صرف بدن کے معمولی کپڑوں کے ساتھ چھوڑنے جائیں گے۔ باقی جو کچھ زر نقد، ہاتھی گھوڑے وغیرہ ہوں گے وہ ضبط کر لیں گے۔

حالات ہی ایسے تھے کہ یہ کڑی شرط تسلیم کرنی پڑی۔ بادشاہی خزانے کی ساری رقم جو فوج کے ہمراہ دی گئی تھی اور امیروں کا اپنا روپیہ اور جواہرات تاجت و تاراج ہو گیا۔ اس جنگ اور محاصرے میں سنتقا کے ہاتھوں میں پچاس ساٹھ لاکھ سے زیادہ کی رقم پہنچ گئی۔

اس حادثہ عظیم کی اطلاع جب بادشاہ تک پہنچی تو وہ اتنا رنجیدہ اور کبیدہ خاطر ہوا کہ ان امیروں کو حاضری سے منع کر دیا اور ان میں سے ہر ایک کو مختلف صوبہ جات میں متعین کر دیا تاکہ وہ اس کی نظروں سے دور رہیں حالانکہ اس شکست میں ان امیروں کا کوئی قصور نہیں تھا۔

ابھی سنتقا اس عظیم فتح کا جشن منانے بھی نہیں پایا تھا کہ اسے ہمت خاں کی یلغار کی خبر ملی جو بادشاہی فوج کے محصور ہو جانے کی خبر سن کر یلغار کرتا چلا آ رہا تھا۔ ہمت خاں اس بات سے بے خبر تھا کہ شاہی فوج اور سنتقا کے درمیان معاہدہ طے پا گیا ہے۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ شاہی لشکر کدوئی میں محصور ہے۔

سنتقا نے ہمت خاں کے مقابلے پر پہنچ کر اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصے کو پیچھے چھوڑا اور دوسرے حصے کو لے کر ہمت خاں کے مقابلے پر پہنچ گیا۔ یہ مرہٹوں کا پرانا طریقہ جنگ تھا۔

ہمت خاں کی بہادری ضرب المثل تھی۔ اس وقت بھی اس نے جم کر مقابلہ کیا۔ مرہٹے بڑی تعداد میں جہنم رسید ہوئے اور بالآخر سنتقا کو شکست کھا کر بھاگنا پڑا لیکن اس نے ایک منصوبے کے تحت اس طرف بھاگنا شروع کیا جہاں اس کی بقیہ فوج پھچی ہوئی تھی۔ ہمت خاں اس منصوبے سے بے خبر فتح کے جوش میں سنتقا کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ مرگب ناگہانی اس کی تاک میں تھی۔ سنتقا اسے لے کر دشوار گزار جنگل میں داخل ہو گیا۔ اس نے اس جنگل میں جگہ جگہ درختوں پر اپنے پر قندازوں کو بٹھایا تھا لہذا جیسے ہی ہمت خاں کی سواری اس مقام پر پہنچی، اچانک درختوں سے آگ برسنے لگی۔ ایک گولی اس کی پیشانی پر لگی اور وہ سانس لے بغیر اسی وقت شہید ہو گیا اور تمام بار برداری ہاتھی اور کارخانے جو ہمت خاں کے ہمراہ تھے، سب سنتقا کے ہاتھ پڑ گئے۔

حالات بڑی تیزی سے عالمگیر کے خلاف ہو رہے تھے۔ بے درپے و دشر مناک کا نامیاں ہو چکی تھیں۔ امراء اس کا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ شہزادہ اعظم شاہ پر اسے اعتبار نہ رہا تھا۔ شہزادہ کام بخش بھی شوخیاں دکھا رہا تھا۔ ایسے میں اسے شاہ عالم کی یاد آئی جو سات سال سے قید میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے وفادار امراء کا ایک اجلاس بلایا اور فوری حکم صادر کیا کہ شاہ عالم کی نظر بندی ختم کر دی جائے۔

شہزادہ شاہ عالم کو بہت سی رعایتیں پہلے ہی ملی ہوئی تھیں۔ اسے اجازت تھی کہ وہ کبھی کبھی بحیرے کے لیے حاضر ہو سکتا ہے لیکن رہائی کے بعد جو ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو عالم ہی دوسرا تھا۔ اورنگ زیب نے آگے بڑھ کر اسے بے تابانہ گلے لگا یا اور اپنی مسند پر اپنے برابر بیٹھنے کا حکم دیا۔

”میں تمہارے سامنے تمہارے بھائیوں کی برائی کر کے تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سب میرے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم ان کی حرکتوں سے سبق حاصل کرو گے۔“

جب تک شاہ عالم قید میں تھا، بادشاہ کی تو جیہات شہزادہ اعظم شاہ پر زیادہ رہی تھیں اور اعظم شاہ اپنے آپ کو مستقبل کا ولی عہد سمجھنے کا تھا مگر اب جو بڑے بھائی کی رہائی عمل میں آگئی اور بادشاہ نے اسے مطلق العنان بنا کر پہلے سے بھی زیادہ اس پر مہربانی کا اظہار کیا تو اعظم شاہ کے سینے پر سانپ لوٹنے لگا اور روز بہ روز اس کے غصے میں اضافہ ہوتا رہا۔ شہزادہ کام بخش کے وجود کو تو وہ اہمیت ہی نہیں دیتا تھا لیکن بڑے بھائی کی رہائی نے اسے چونکا کر دیا۔ بڑے بھائی کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ یہ جذبہ ایسا تھا جسے وہ چھپانہ سکا۔ اورنگ زیب اس کی اس کیفیت کو بغور دیکھ رہا تھا۔ دونوں بھائیوں کی اس رقابت کو ختم کرنے کا بس ایک راستہ تھا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے۔ اس نے شاہ عالم کو بہادر شاہ کا لقب عطا فرما کر اکبر آباد کے بندوبست اور وہاں کے مفسدوں کی سرکوبی کے لیے مستقل انتظام کے ساتھ باختیار بنا کر رخصت کر دیا۔

کچھ عرصے بعد شاہ عالم کو صوبہ کامل کے بندوبست پر مامور کر دیا۔

بیٹوں کے نفاق کا سامنا صرف اورنگ زیب کو ہی نہیں تھا، مرہٹہ سردار بھی اسی صورت حال سے گزر رہے تھے۔ ان سرداروں میں بھی نفاق کے آثار تھے۔ اورنگ زیب نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے ایک مشہور امیر غازی الدین خاں فیروز جنگ کو بے جا پور

سے چار پانچ منزل پر سنتقا کی تنبیہ کے لیے مقرر کر دیا۔

غازی الدین خاں بھوکے شیر کی طرح شکار کے انتظار میں دیکا بیٹھا تھا کہ ہر کاروں نے اطلاع پہنچائی کہ سنتقا پچیس ہزار کا لشکر لے کر آٹھ نوکوس پر آ گیا ہے۔

وہ شکار پر جھپٹنے کے لیے تیاری پکڑ ہی رہا تھا کہ اس کا بیٹا اور بعض امیر اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ فوج کا ایک بڑا حصہ ان امیروں کے ساتھ چلا گیا اور اس کے پاس فوج بہت کم رہ گئی۔ سنتقا جیسے بہادر دشمن سے لڑنا کوئی مذاق نہیں تھا۔ اپنے لشکر کی قلت کو دیکھتے ہوئے اس نے لڑائی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس وقت اس نے یہی مناسب سمجھا کہ بے جا پور کی طرف واپس پلٹ جائے۔

یہ وقت بڑا نازک تھا۔ غازی الدین خاں بے جا پور کی طرف واپس جا رہا تھا۔ دوسری جانب سنتقا بے جا پور کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اس نازک موقع پر مرہٹہ سرداروں کے باہمی نفاق نے بازی پلٹ کر رکھ دی۔ سنتقا کا حریف دوسرا بڑا مرہٹہ سردار دہنا جادو موقع کی تلاش میں تھا اور یہ موقع اسے مل گیا۔ سنتقا کسی خطرے سے بے نیاز بے جا پور کی طرف بڑھا جا رہا تھا کہ دہنا جادو کے لشکر نے پشت کی جانب سے اس پر حملہ کر دیا۔

سنتقا نہایت عالم فحش تھا لہذا اس کے بڑے بڑے سردار بھی درپردہ دہنا جادو سے ملے ہوئے تھے۔ جب سنتقا دونوں جانب سے گھر گیا تو بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے جنگ سے ہاتھ اٹھایا اور اپنی کوہستانی پناہ گاہ کی طرف بھاگ گیا۔

غازی الدین خاں قریب ہی تھا۔ اسے جب سنتقا کے فرار کی خبر ملی تو اس نے سنتقا کے تعاقب کے لیے اپنے لشکریوں کا رخ موڑ دیا۔

بد نصیب سنتقا دونوں جانب سے خطرے میں گھر اہوا تھا۔ اس کے تعاقب میں ایک طرف سے بادشاہی فوج بھی تو دوسری طرف سے دہنا جادو کی فوج۔ اس دو طرفہ تعاقب سے گھبرا کر سنتقا کی فوج منتشر ہو گئی اور سنتقا اپنی فوج سے الگ ہو گیا۔ اس وقت رکنا یا اپنی فوج کو تلاش کرنا دانش مندی نہیں تھی۔ اس کا جس طرف منہ اٹھا، بھاگتا چلا گیا۔ اس پریشانی کے عالم میں اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ اپنے دشمن سردار ناکو نامیاں کے علاقے میں ہے۔

وہ اس وقت اس خوش فہمی میں تھا کہ اسے کسی نے پہچانا نہیں ہے۔ وہ بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا۔ اس نے

گھوڑا ایک درخت سے باندھا اور خود درخت کے نیچے لیٹ کر آرام کرنے لگا۔ اسی وقت ایک شخص اس کا اس طرف سے گزر ہوا۔ وہ آدھی اسے دیکھ کر کرک گیا۔

”بھائی تم کون ہو..... پر دیکھی معلوم ہوتے ہو؟“

”ہاں بھائی۔ میں پر دیکھی ہوں، بڑی دور سے چلا آ رہا ہوں۔ ذرا آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا تھا۔“

”یہ تو بڑی بے سروئی کی بات ہے کہ کوئی پر دیکھی ہمارے گاؤں میں آئے اور یوں درخت کے نیچے بھوکا پیاسا لیٹا رہے۔ یہاں سے اشو اور گاؤں کی چوپال میں چل کر لیٹو۔ جل پانی کا موقع تو دو۔“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ میں کچھ دیر آرام کے بعد چلتا ہوں گا۔ میں ذرا جلدی میں ہوں۔“

سنتقا ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اس آدھی کے ساتھ جائے لیکن وہ شخص پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔ سنتقا کو اس کے ساتھ جانا پڑا۔

سنتقا چوپال میں جا کر بیٹھا تو بہت سے لوگ اس سے ملنے آئے۔ ان ملنے والوں میں ناکو نامیاں بھی تھا جو اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ مزید اطمینان اس وقت ہو گیا جب اس نے سنتقا کے ہاتھوں میں چمٹی کڑے دیکھے۔ وہ جن قدموں سے گیا تھا، انہی قدموں سے لوٹ آیا۔ گھر میں گھستے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور بیوی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”مل آئے مہمان سے؟“

”وہ مہمان نہیں، میرا دشمن ہے جسے بھگوان نے خود بخود میرے پاس بھیج دیا ہے۔“

”کیا مطلب؟ کون سا دشمن؟“

”چند سال پہلے اسی سنتقا نے میرے بھائی کو ہاتھی کے نیچے ڈلوادیا تھا۔ میں اس دن سے اس کے لیے دل میں غبار لیے بیٹھا ہوں۔ آج یہ موقع ہے کہ وہ اکیلا ہے اور میرے علاقے میں ہے۔ بس میں تمہیں اطلاع دینے آیا تھا۔ کہیں وہ نکل نہ جائے۔“

”احتیاط سے جانا۔ وہ اکیلا ہے لیکن اس کا نام سنتقا ہے۔ وہ اکیلا بھی بہت سون پر بھاری ہوتا ہے۔“

”میں بھی ناکو نامیاں ہوں۔ وہ اکیلا ہے مگر میں بہت سون کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

ناکو نامیاں نے جلدی جلدی ہتھیار باندھے اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ چوپال میں آ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ نکل چکا ہے۔ ناکو نامیاں نے سر پہنچ لیا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا لیکن غصہ اٹھا تھا کہ اکیلا ہی اس کے تعاقب میں نکل گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اسے سنتقا نظر آ گیا۔

نالو ناماں نے اپنی رفتار دہمی کر لی۔ کچھ دور اور چلنے کے بعد اس نے دیکھا کہ سنٹارک گیا ہے۔ ایک ٹالا قریب بہہ رہا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو درخت کے ساتھ باندھا اور پڑے اتارنے لگا۔ ناکو ناماں حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اب صرف ایک لنگوٹ سنٹا کے بدن پر تھی۔ اب پوری بات ناکو ناماں کی سمجھ میں آگئی۔ سنٹا نہانے کے لیے نالے میں اتر رہا تھا۔ اب وہ نہتا تھا۔ اس کے اتھار کنارے پر رکھے ہوئے تھے۔ ناکو ناماں نے اپنا گھوڑا وہیں چھوڑا اور تگوار ہاتھ میں لے کر دے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ نالے کے قریب پہنچ گیا اور ایک درخت کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔ سنٹا کچھ دیر نہتا رہا اور پھر باہر نکلنے کے لیے نالے کی دیوار کے قریب آ گیا۔ ناکو ناماں آگے بڑھا اور جیسے ہی سنٹا نے نالے سے باہر آنے کے لیے گردن اوپر کی، ناکو ناماں نے ایک ہی وار میں اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس نے سنٹا کی لاش کو تو وہاں چھوڑا اور اس کا سر گھوڑے کے پیچھے ”توبرہ“ (وہ جھیل) میں گھوڑے کا دانہ ہوتا ہے) میں ڈال دیا اور بھاگ بھاگ گھر پہنچا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔

”بھاگ بھری! میں نے اپنے بھائی کا بدلہ لے لیا۔“
 ”خاچیہ موزی کا سر کاٹ کر لے آیا ہوں۔“
 ”تو نے تو یہ کمال کر دیا۔ کہاں ہے اس کا سر؟ میں ہی تو دیکھوں۔ بڑے بڑے سورما جس کا نام سن کر کاچتے ہیں وہ ہے کیسا۔“
 ”گھوڑے کے پیچھے ”توبرہ“ میں پڑا ہوا ہے۔ ابھی لے لیا ہوں۔“

”تم اس کے سر کا کرو گے کیا؟“
 ”دہنا جادو اس کا دشمن بنا ہوا ہے۔ اسی کے پاس بدلہ ملے گا۔“
 ”اس بکھیرے میں کیوں پڑتے ہو۔ اسے یہیں لے آؤ گے میں پیچک دو۔“

”دہنا جادو مجھے اس کا رتا سے پرانعام دے گا۔ اگر میں اس کو لے کر آؤں تو انعام سے محروم رہ جاؤں گا۔“
 ”نہیں! یہی بھی خوش ہوگئی۔ دونوں میاں بیوی لڑ رہے ہیں اور دہنا جادو کی طرف چل دیے۔“
 ”لگتا ہے کہ وہ بڑے چلے جارہے تھے۔ اتفاق سے وہاں پہنچا۔ وہ تو بڑے پر سے گر گیا۔ جب وہ دہنا جادو کے قریب پہنچا تو جیسے مڑ کر دیکھا۔ دیکھتے ہی وہ لڑکھائی کرنے لگا۔“

”بھاگ بھری! سنٹا کا سر کہیں گر گیا ہے۔“
 ناکو ناماں نے گھوڑے کی باگیں کھینچتے ہوئے کہا۔
 ”تو نے یہ کیا کہہ دیا..... کہاں گر گیا؟“
 ”شاید راستے میں۔“
 ”گھر سے لائے بھی تھے؟“
 ”لایا تھا۔“

”یہ تو غضب ہو گیا۔ ہم تو انعام سے بھی گئے۔ اب گھوڑا موڑو۔ شاید کہیں پڑا ہوا مل جائے۔ کتا ہوا سر بھلا کس کے کام کا۔“
 ناکو ناماں نے گھوڑا موڑا اور جس راستے سے آیا تھا، اسی پر چل دیا۔

غازی الدین خاں سنٹا کے تعاقب میں تھا۔ اتفاق سے اس کے سپاہی اسی راستے پر آگئے اور انہیں سنٹا کا کتا ہوا سر پڑا مل گیا۔ انہوں نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور اسے لے کر غازی الدین خاں کے پاس پہنچ گئے۔ جنگ کے بغیر سنٹا کا سر اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اس خدا داد فتح پر شادیاں بجا دیں۔ سنٹا کے سر کو لشکر میں تشہیر کرانے کے بعد بادشاہ کے پاس بھجوا دیا۔

بادشاہ نے بھی اس عطیہ الہی کا شکر ادا کیا اور حکم دیا کہ سنٹا کے سر کو لشکر میں اور دکن کے شہروں میں گشت کرایا جائے۔ سنٹا کا سر کتا تھا۔ مرہٹوں کے تمام سرداروں کے سر نہیں کٹ گئے تھے۔ ان کے تمام سردار جن میں دہنا جادو سب سے پیش پیش تھا، لوٹ مار میں مصروف تھے۔ دکن کے تمام شہر ان کی دست برد سے برباد ہو رہے تھے۔ بادشاہ نے ان کے کامل استیصال کے لیے ضروری سمجھا کہ وہ قلعے جو مرہٹوں کی پناہ گاہ بنے ہوئے ہیں، انہیں فتح کر لیا جائے۔

اس مہم کے لیے بادشاہ نے عام اعلان کر دیا اور سخت سے تاکید کر دی کہ کوئی شخص بھی عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر نہ چلے لیکن اس پر پوری طرح عمل نہ ہو سکا۔ اس لشکر میں چوری چھپے سپاہیوں کے اہل خانہ بھی شامل ہوئی گئے۔

تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ کوچ کا حکم ہوا۔ بیس دن کے سفر کے بعد ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ شہزادہ اعظم شاہ کو بھی طلب کر لیا گیا۔

اس منزل سے مرہٹوں کی پناہ گاہ بہت قریب تھی۔ ارادہ یہی تھا کہ اس قلعے پر قبضہ کر کے رام راجا کو گرفتار کر لیا جائے گا لیکن معلوم ہوا کہ شاہی فوج کے کوچ کی خبر سن کر رام راجا صوبہ برار کی طرف چلا گیا ہے اور وہاں قبضوں اور شہروں کو تاراج کر رہا ہے۔

شاہی لشکر میں دیو گڑھ کا ایک زمیندار بھی شامل تھا۔ یہ زمیندار اپنے ہم وطنوں سے لڑ جھگڑ کر دربار شاہی میں حاضر ہو گیا تھا اور بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور تک زیب نے اس کا نام بلند بخت رکھ دیا تھا۔ اس ہم میں بھی وہ اسے اپنے ساتھ لایا تھا۔

بلند بخت نے جب سنا کہ رام راجا صوبہ برار میں ہے تو اس کی ازلی فطرت پلٹ آئی۔ اس نے بادشاہ کے احسانات کی یہ قیمت چکانی کہ ایک روز لشکر سے چپکے سے فرار ہو گیا اور رام راجا کے ساتھ جا کر مل گیا۔ اسے شاید یہ امید ہو چلی تھی کہ رام راجا کے ساتھ مل کر اپنے مخالفوں سے بدلے لے سکے گا اور اپنی جاگیر پر دوبارہ قبضہ کر لے گا۔

اس کے نکلنے ہی خبر گرم ہونے میں دیر نہیں لگی۔ بادشاہ نے شہزادہ بیدار بخت کے نام حکم جاری کیا کہ وہ زمیندار کی سرکوبی کے لیے ایک فوج لے کر جائے۔

بیدار بخت نے اپنا لشکر چھوڑا اور تیز رفتار سواروں کے ساتھ تعاقب کے لیے روانہ ہو گیا۔

شہزادے کی روانگی کے بعد بادشاہ نے دیر نہیں لگائی۔ اب اسے ان اہم ترین قلعوں پر قبضہ کرنا تھا جو مرہٹوں کی پناہ گاہ کے طور پر کام آتے تھے۔ اس نے پڑاؤ کے مقام سے کوچ کیا اور محض تین چار کوس کے فاصلے پر ایک قلعہ نظر آ گیا۔ بادشاہ نے قلعے کا محاصرہ کرنے کا حکم دے دیا۔

”ہمارا خیمہ اس مقام پر لگایا جائے جو قلعے سے قریب تر ہو۔“ بادشاہ نے حکم جاری کیا۔

”حضور! اس طرح تو آپ کی جان کو خطرہ ہوگا۔ اگر قلعے کے اندر سے گولہ باری ہوئی تو آپ کا خیمہ اس کی زد میں ہوگا۔“

”یہ بھی تو سوچو اس جرات کے دشمن پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ جب ہمارا خیمہ قلعے کے قریب ہوگا تو دشمن پر ہمارا رعب طاری ہوگا۔“

بادشاہ کا یہ قیاس غلط نہیں تھا۔ دشمن نے بادشاہ کی اس جرات کو دیکھا تو محصوروں پر خوف طاری ہو گیا۔ حواس باختہ ہو کر نہایت عاجزی کے ساتھ جان کی امان کی درخواست کی اور قلعہ بند کرنے پر راضی ہو گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ قلعے سے جو بھی باہر آئے اس کے ہتھیار زمین لٹا کر اسے نکل جانے دو۔

یہ قلعہ بادشاہی قبضے میں آ گیا۔ بادشاہ نے اس قلعے کا نام ”کلید خ“ رکھا۔

اب شاہی لشکر کا رخ قلعہ ستارہ کی طرف تھا۔ یہ وہ اہم قلعہ تھا جہاں مرہٹہ سردار رام راجا پناہ لیا کرتا تھا۔ ان

دلوں وہ صوبہ برار میں لوٹ مار میں مشغول تھا لیکن یہ قلعہ ایک اونچی چٹان پر ستارے کی طرح چمک رہا تھا۔ بادشاہی خیمہ قلعہ ستارہ کے مقابل ڈیڑھ کوس کی مسافت پر لگا دیا گیا۔ قلعے کے اطراف دوسرے تمام بادشاہی امیروں نے اپنے مورچے جمادے۔

ابھی گولہ باری سے فرمت نہیں ملی تھی کہ ایک خبر نے اس محاصرے کو جشن میں بدل دیا۔ جاسوسوں نے خبر پہنچائی۔

”رام راجا جو برار کی طرف بھاگ گیا تھا، وہاں سے اپنے کو بہتان میں داپس آنے کے لیے روانہ ہوا تھا کہ راستے میں طبعی موت مر گیا۔ اس کے ہمراہی سرداروں نے اس کی بڑی بیوی تارا بائی کو رام راجا کی جگہ گدی نشین کر دیا ہے۔“

بات خوشی کی تھی۔ ایک بڑا دشمن خود بخود راہ سے ہٹ گیا تھا۔ پورے لشکر میں شادیاں بجا گئے۔ یہ تاثر عام تھا کہ ایک بے دست و پا عورت مرہٹوں کو سنبھال نہیں سکے گی اور مرہٹوں کا قلعہ فتح ہو جائے گا۔

رام راجا کی اچانک موت نے ایسا حوصلہ دیا کہ قلعہ ستارہ کی فتح کی کوششیں اچانک تیز ہو گئیں۔

قلعہ ستارہ کی ایک دیوار کے گر جانے اور ایک بڑی تعداد میں ہلاکتیں ہو جانے کے سبب قلعہ دار پریشان تھا۔ رام راجا کی موت کی خبر سن کر اور بھی بدحواس ہو گیا۔ اس نے درخواست کی کہ اگر جان و آبرو کی امان مل جائے تو میں قلعے کی چابی حوالے کر دوں گا۔

بادشاہ نے اس کی درخواست قبول کر لی۔ اس یقین دہانی کے بعد قلعہ دار نے چابیاں بادشاہ کے قدموں میں رکھ دیں۔ تین ہزار سے زیادہ مرد اور عورتیں قلعے سے نیچے اتر آئے۔

ستارہ کی تسخیر کے بعد بادشاہ نے ایک اور قلعہ ”پرلی“ کے محاصرے کا ارادہ کر لیا۔ ابھی محاصرے کے چند ہی دن گزرے تھے کہ قلعہ دار نے امان طلب کرنے کے لیے برہمنوں کو بھیجا۔ بادشاہ نے ان کی درخواست قبول نہیں کی اور محاصرہ سخت کر دیا۔

لشکر کا سپہ سالار فتح اللہ خاں برابر حملے کر رہا تھا۔ ان حملوں نے محصورین کا ناقلہ بند کر دیا تھا لیکن بدقسمتی سے بارش کا موسم آ گیا۔ یہ علاقہ ایسا تھا جہاں پانچ ماہ تک مسلسل بارش ہوتی رہتی تھی۔ شاہی لشکر کی پریشانیاں روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھیں۔ ندی نالوں کی طغیانی نے رستہ بچنے کے ذرائع بھی مسدود کر دیے۔ پریشانی انتہا کو پہنچ گئی۔ غذائی

کی لوٹ مار ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی لیکن تارا بانی نے ہر خیال کو غلط ثابت کر دیا۔ اس نے اختیارات سنبھالتے ہی اپنے مقبوضہ علاقے کی آباد کاری اور بادشاہی ملک میں لوٹ مار کا پہلے کی طرح سلسلہ شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی دن میں مرہٹے پہلے کی طرح دکن کے چھ صوبوں کو پامال کرتے چلے گئے۔ احمد آباد کی سرحد سے صوبہ مالوہ تک کا علاقہ بالکل پامال ہو گیا۔ احمد آباد اور اجین کے اطراف ایسی تباہی چائی کہ ویرانی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

ان کامیابیوں نے مرہٹوں کے حوصلے بڑھا دیے۔ رام راجا کی بیوہ تارا بانی ان کامیابیوں سے سرشار ہو رہی تھی۔ وہ تاجا دو اس کا دست راست بنا ہوا تھا۔ وہ اس فکر میں تھی کہ قلعہ ستارہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا جائے۔ جب تک ایسا نہیں ہو جاتا اس کا قلعہ ستارہ کے قریب رہنا ضروری تھا۔ اس نے اجین سے چند کوس کے فاصلے پر ایک بلند پہاڑ پر قلعے کی بنیاد رکھ دی۔ تعمیر کا کام تیزی سے شروع ہو گیا۔ کچھ دنوں کے لیے اس نے تمام سرداروں کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اپنے اپنے لشکروں کو ساتھ لے کر حاضر ہو گئے۔ اس تیاری کا مقصد یہ تھا کہ اگر بادشاہ کی فوجیں اس تعمیر کو روکنے کے لیے آگے بڑھیں تو ان کے اس قدم کو روکا جاسکے۔

بادشاہ اپنے بکھیر میں گھرا ہوا تھا۔ شہزادوں کی رقابتیں سامنے آ رہی تھیں۔ لشکر کے لوگ بھی دکن میں رہتے رہتے تنگ آ گئے تھے۔ بادشاہ کا اپنا بڑھا پا بھی ان تکالیف سے گھبرانے لگا تھا۔ البتہ یہ اطمینان تھا کہ مرہٹوں کی تباہ کاریاں اب کم ہو گئی تھیں لیکن اس کا سبب کسی کو معلوم نہیں تھا۔ دروازہ مقام پر بلند پہاڑوں کے پیچھے کیا ہو رہا ہے، کوئی نہیں جانتا تھا۔

اس ویرانے میں مرہٹہ سرداروں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ انجی میں ایک ہونٹ رائے بھی تھا۔ یہ سردار نوجوان بھی تھا، خوب صورت بھی اور بہادر بھی۔ اسی لیے رام راجا کی بیوہ تارا بانی جواب مرہٹہ سرداروں کو نکجار کھے ہوئے تھی، ہونٹ رائے کو بہت عزیز رکھتی تھی اور اکثر اس کے مشوروں پر عمل کرتی تھی۔ اس روز بھی اسے کسی شورے کے لیے بلایا تھا۔ اس وقت کوئی اور سردار وہاں موجود نہیں تھا اس لیے اسے خلوت ہی میں بلایا اور باتیں کرنے لگی۔

”یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ قلعہ ستارہ جو ہمارا حاکم نہیں قلعہ تھا، مظلوم کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ اب اطلاع ملی ہے کہ قلعہ پر لی پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا ہے۔ اب وہ یقیناً قلعہ پر نالہ کی طرف بڑھیں گے۔“

ایسی قلت ہوئی کہ آدمی اور مویشی سب جاں بلب ہو گئے۔ حالت دیکھ کر اہل قلعہ کے حوصلے بڑھ گئے۔ وہ اکل کر حملے کرنے لگے لیکن شاہی لشکر نے بھی ہمت نہ ہاری اور بے در پے حملے کر کے محصورین کا نقطہ بند کر دیا۔ انہیں اتنا مجبور کر دیا کہ وہ امان طلب کرتے ہوئے قلعے سے نکل آئے۔

قلعے کے لوگ ڈیڑھ ماہ کے محاصرے کے بعد اہل و عیال کے ساتھ بدن کے کپڑوں میں قلعے سے نکل گئے۔

☆☆☆

مرہٹوں کی طرف سے بے فکر ہو جانے کے بعد اور تک زیب و بکر علاقوں اور قلعوں کی فتح میں مشغول ہو گیا۔ اس کی راہ میں اب کوئی رکاوٹ نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے نئی اہم قلعے فتح کر لیے۔

اس وقت وہ قلعہ راج گڑھ کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ قلعہ مرہٹوں کی پہلی پناہ گاہ تھا اور دشوار گزار پہاڑی پر بنا ہوا تھا۔ پھر یہاں درندے زہریلے جانور اور سانپ بہ کثرت پائے جاتے تھے۔ قلعے کی وسعت ناقابل بیان تھی۔ نیا لکھ کرانے پر معلوم ہوا کہ بارہ کوس تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا ہر طرف سے محاصرہ ناممکن تھا۔ یہ انتظام ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ محصورین کو کسی راہ سے بھی غلہ پہنچ سکے۔

قلعے کے اطراف دو پہاڑیاں اور بھی تھیں۔ ان پر بھی ہاندھار تیں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں جنگ کا ساز و سامان بھی تھا۔ محصورین نے ان پہاڑیوں پر سے گولہ باری شروع کر دی۔ بھاری بھاری پتھر بھی گرانے لگے۔ مرحلہ دشوار تر تھا لیکن فتح اللہ خاں کی بہادری اور لشکر کی ثابت قدمی نے یہ مشکل آسان کر دی۔ مسلسل حملوں اور قلعہ شکن توپوں کی مدد سے بادشاہی نشان قلعے کے پہلے دروازے پر بلند کر دیے گئے۔ مرہٹوں کی ایک بڑی تعداد فرار ہوتے ہوئے ماری گئی۔ عاجز آ کر قلعے کے نگہبان نے جان کی امان کی درخواست پیش کر دی۔

شاہی لشکر کسی روک ٹوک کے بغیر قلعے میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

رام راجا کی بڑی بیوی تارا بانی نے رام راجا کی موت کے بعد اپنے تین سالہ بیٹے کو باپ کا جانشین بنا کر سارے بادشاہ سنبھال لیے۔ خیال یہ تھا کہ ایک کمزور عورت رہ کر، وہ سرکش مرہٹوں پر قابو نہیں پاسکے گی اور مرہٹوں

”اطلاعات اسی طرح کی مل رہیں۔“

”اسی لیے میں نے تمہیں بلا یا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ ایک ایک کر کے ہمارا ہر قلعہ دشمن کے قبضے میں چلا جائے۔ اب تم بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”ہماری غلطی یہ تھی کہ ہم نے اس قلعے کی تعمیر کے لیے اپنی سرگرمیاں وقتی طور پر روک دیں۔ اس سے شاہی لشکروں کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔“

”پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا؟“

”اپنے پرانے قلعوں میں سے کسی ایک کو اپنی قوت کا مرکز بناتے۔ اب تو ہم منتشر ہو کر رہ گئے ہیں۔ سرداروں میں نا اتفاقی کی کہانیاں بھی سننے میں آ رہی ہیں۔“

”میں نے بہت سے نااہل سرداروں کو تہدیل کر دیا ہے۔“

”یہ بھی آپ کی غلطی تھی۔ وہی نااہل سردار اب ہم سے انتقام لینے کے لیے سازشوں کے حال بن رہے ہیں۔ اپنے چھوٹے چھوٹے جتے بنالے ہیں اور لوٹ مار کرتے پھر رہے ہیں۔“

”اب تو خیر جنہیں نکال دیا انہیں واپس نہیں لیا جاسکتا۔ کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ ہم مغضوں کے بڑھتے ہوئے قدم روک سکیں۔“

”اس کی ترکیب یہی ہے کہ ایک معمولی سی جمیعت اس قلعے کی حفاظت کے لیے رکھیں، باقی سب کو قلعہ پر نالہ بھیج دیں کیونکہ ”پرلی“ کی فتح کے بعد مغض لشکر پر نالہ کی طرف بڑھے گا۔“

”ایک خبر یہ بھی آئی ہے کہ بادشاہ نے اپنے چھوٹے بیٹے اعظم شاہ کو اجین کی صوبہ داری پر مقرر کر کے رخصت کر دیا ہے۔“

”یہ کوئی ایسی بری خبر نہیں۔ بادشاہ نے اسے انتظامی سہولت کے لیے وہاں نہیں بھیجا ہے بلکہ بادشاہ اس سے ناراض ہے۔ اسے خود سے دور رکھنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔“

”وجہ کوئی بھی ہو۔ اجین میں اس کا رہنا ہمارے لیے خطرناک ہے۔“

”بالکل نہیں۔“

”وہ کیسے؟“

”وہ ایسے کہ ہم باپ سے اس کی ناراضی کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ چالپوسی اور خوشامد سے ہم اسے اپنا ہمارا بنا سکتے ہیں۔ اگر ہم اسے بادشاہت کی امید دلا دیں تو وہ باپ کے خلاف ہی تلوار اٹھا لے گا۔“

”تمہیں یقین ہے؟“

☆☆☆

اکتوبر 2017ء

28

سپینس ڈائجسٹ

”بادشاہ کی عمر آتی (80) سال سے اوپر کی ہو چکی ہے۔ شہزادے اس کی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے مرنے کے بعد شہزادوں میں رسا کشی شروع ہو جائے گی۔ بڑا بیٹا تو کامل میں ہے۔ قریب تر اعظم شاہ ہے۔ اگر ہم اس کی طرف ہاتھ بڑھائیں تو وہ اپنی قوت میں اضافے کے لیے ہمیں خوش آمدید کہے گا۔“

”لیکن یہ مشکل کام سرانجام کون دے گا؟“

”اس کے لیے میں حاضر ہوں۔“

”ہم تمہیں کسی مشکل کام میں الجھا کر خود سے دور کرنا نہیں چاہتے۔“ یہ کہتے ہوئے تارابائی کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جسے کوئی مرد بھی بہ آسانی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہنوت رائے بھی ایک لمحے کو شبہ کے رہ گیا تھا۔

”میں بہت دن سے باہر نہیں نکلی ہوں۔ تعمیراتی کام کا جائزہ بھی نہیں لیا ہے۔ آؤ باہر چل کر دیکھتے ہیں، کام کتنا ہو گیا ہے۔“ تارابائی نے کہا۔ ”تم بیٹھو میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔“

اسے گئے ابھی چند ہی لمحے ہوئے تھے کہ رام راجا کی چھوٹی بیوی چندابائی کمرے میں داخل ہوئی۔ ہنوت رائے نے اسے بھی نہیں دیکھا تھا لیکن یہ سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی کہ یہ رام راجا کی دوسری بیوی ہے۔ کم سن اتنی تھی کہ اسے بیوی یا بیوہ کہتے ہوئے سوچنا پڑے۔ حسین اتنی کہ تارابائی اس کے پاؤں کی گرد بھی نہیں تھی۔ وہ اسے دیکھ کر بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”رانی جی! میرا نام ہنوت رائے ہے۔ مجھے یہاں تارابائی نے بلا یا ہے۔“

”آپ کو جو بلاتا ہے چلے آتے ہیں؟“ چندابائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تارابائی رام راجا کی نشانیاں ہے۔“

”نشانیاں تو میں بھی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کی جوانی تارابائی کے لائق نہیں۔“ چندابائی یہ کہہ کر غائب ہوئی۔ ہنوت رائے اس پر اسرار جیلے کا مطلب سوچتا رہ گیا۔ تارابائی اسے لے کر باہر نکلی۔ شیب میں ایک طرف دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ایک پر تارابائی سوار ہو گئی دوسرے پر ہنوت رائے سوار ہو گیا۔

وہ راستے بھر گلاؤں کی باتیں کرتی رہی لیکن ہنوت رائے کا ذہن چندابائی کے جیلے میں اٹکا ہوا تھا۔ ”جمہاری جوانی تارابائی کے لائق نہیں۔“

ہنوت رائے ہر دوسرے تیسرے دن تارابائی سے ملنے آ رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں چندابائی کو ڈھونڈتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی اسے کامیابی بھی ہوجاتی تھی اور چندابائی کی ایک جھلک دیکھنے کو مل جاتی تھی لیکن وہ اس سے زیادہ کاہنتی تھا۔ تارابائی کی موجودگی میں اسے یہ موقع نہیں مل سکتا تھا۔ وہ چندابائی کے بارے میں کچھ پوچھ کر تارابائی کو کسی شک میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایک خاص منصوبے کے تحت تارابائی کو ترغیب دلائی کہ وہ اپنے مقبوضہ قلعوں کا دورہ کر کے مرہٹہ سرداروں کی ہمت بڑھائے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ گزرنے والے قاتلوں سے جو چوتھ وصول کیا جاتا ہے، وہ بھی آپ تک پورا نہیں پہنچ رہا ہے لہذا سرداروں کو اس کے بارے میں بھی سرزنش کرے۔ تارابائی نے اس خیال سے کہ وہ بھی اس کے ہمراہ ہوگا، فوراً ہی بھری۔

”تم میرے ساتھ رہو گے، میری اس سے زیادہ خوش قسمتی کیا ہوگی۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں لیکن مصلحت اس کی اجازت نہیں دیتی۔“

”کیوں..... ایسا کیا ہے؟“

”آپ کے بہت سے سردار مجھ سے پُر غاش رکھتے ہیں۔ مجھے آپ کے ساتھ دیکھ کر طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ اس کام کے لیے جو ہتاجاد بہت مناسب رہے گا۔ وہ آپ کا وفادار بھی ہے۔“

”ہنوت رائے!“ تارابائی کی آواز جذبات سے مغلوب ہو رہی تھی۔ ”میں تم سے جویم کرنے لگی ہوں۔ تمہیں دیکھ کر بنائیک دن بھی نہیں رہ سکتی۔ تم کو پا کر تے ہو کہ دوسرے تیسرے دن آ جاتے ہو۔ تم ساتھ نہ گئے تو نہ جانے کب دیکھنے کو ملو۔“

”میں آپ کے لائق تو نہیں لیکن پریم کا تیر میرے سینے میں بھی جیوست ہے۔ مجھے اظہار کی جرات نہیں ہوتی تھی اور آپ نے کہہ دیا۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں؟“

”اس کے لیے ہمیں کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہوگی اور وہ ہے شہزادہ اعظم شاہ۔ آپ مجھے موقع دیں کہ میں اسے شیشے میں اتار سکوں۔ آپ سے شادی کرنے کی صورت میں پوری مرہٹہ برادری ہمارے خلاف ہو جائے گی۔ ایسے میں شہزادہ اعظم شاہ ہمیں پناہ دے سکے گا۔“

”میں راج پاٹ سب چھوڑنے کو تیار ہوں۔“

قلم کی فتح کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے مارہالی ہم کا قصد کر لیا تھا لیکن مفتوحہ قلعوں پر فوج کشی کے وقت بے شمار آدمی تلف ہو گئے تھے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اورنگ آباد، حیدر آباد، احمد آباد اور مرہٹوں کو حکم دیا گیا کہ ان میں سے ہر ایک کم از کم ایک ہزار سواروں کو بھرتی کر کے حضور شاہ میں روانہ کرے۔

ان سواروں کے آنے تک بادشاہ کو انتظار کرنا تھا۔ بادشاہ نے یہ وقت گزارنے کے لیے ایک مقام کو اس پورہ کا رخ کیا۔ یہ نہایت سرسبز علاقہ تھا۔ پھل دار درخت تھے اور پانی بھی وافر مقدار میں تھا۔ اجازت ملنے پر شاہی لشکر نے خواص پورہ پہنچ کر خیمہ گاہ قائم کر دی۔ خواص پورہ میں لشکر ایک کم آب نالے کے کنارے ٹھہرا تھا جس کے اطراف خشک ریگ زار نکل آ رہا تھا۔ اس کا موسم گزر چکا تھا اس لیے یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ نالے میں طغیانی آ سکتی ہے۔ یہاں غذائی اشیاء کی ادائیگی بھی لہذا آرام سے ہر ہونے لگی لیکن طوفان بلا تا کہ نہ لگتا۔ دور دراز کے پہاڑوں میں سخت بارش ہوئی اور نالے سے پانی اتر کر سیلاب کی شکل میں بڑھا۔

رات کا کچھ حصہ گزرا تھا کہ نالے نے دریا کی شکل اختیار کر لی۔ کنارے جھلک اٹھے۔ نالے کے کنارے پر لاکھ لاکھ آدمی نالہ کب بھر گیا، کب اس نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی، کچھ پتا نہ چلا۔ آنکھ تو اس وقت کھلی جب یہ خوفناک لاکھ لاکھ گاہ پر پہنچ گیا۔ لوگ نیند میں تھے۔ جب تک پہاڑ پانی سر سے گزر گیا۔ خیمے پانی میں تیر رہے تھے۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ بادشاہ نے یہ شور سنا تو ناگہاں یہ خیال آیا کہ ان کے لشکر گاہ پر شب خون مارا ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور اس پر ہٹ گیا اور ایسی سخت چوٹ آئی کہ اٹھنے کے قابل نہ رہا۔ چوٹ ایسی سخت تھی کہ آخر تک پاؤں میں لنگ رہا۔ پھر لوگ ہارے پھرے سرداروں نے بادشاہ کو باہر لانے کے لیے بھانے کے لیے اندر جھانکا تو اسے زمین پر لٹا ہوا دیکھا۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔

بادشاہ کو سیلاب کی بابت بتایا گیا۔

اب دولت خانہ شاہی تک پہنچ گیا تھا کہ اچانک بادشاہ کو اطلاع ملی کہ صبح ہوئی تو پانی اتار چکا تھا لیکن اس تباہی کے بعد بڑے نامی گرامی امراء کا سارا مال و اسباب غرق ہو گیا تھا۔

”آپ اپنے مقبوضہ قلعوں کے دورے پر نکل جائیں اور میں اجمین جا کر اعظم شاہ کے چرنوں میں بیٹھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جیسے ہی بات بنتی ہے، میں آپ کو لے کر یہاں سے نکل جاؤں گا۔“

اسے واقعی یہاں سے نکلنا تھا لیکن تارا بانی کے ساتھ نہیں، چند بانی کے ہمراہ۔ رانی تارا بانی قلعہ پر نالہ کی طرف نکل گئی۔ اس کے ساتھ مرہٹوں کا ایک بڑا لشکر اس کی حفاظت کے لیے تھا۔ ہنوت رائے دو تین دن کا وقفہ دے کر نو تعمیر قلعے میں تھا جہاں تارا بانی نہیں بلکہ چند بانی اس کے استقبال کے لیے موجود تھی۔

”واہ جی! تم تو بڑے چلتر نکلے۔ تارا بانی کو کس ترکیب سے یہاں سے چلنا ہے؟“

”میری جوانی اس کے لائق نہیں تھی۔“ ہنوت رائے نے آنکھ دبا کر کہا۔

”اور نہیں تو کیا۔ میں نے غلط سوچ کر کہا تھا۔“ چند بانی نے بھی اٹھلاتے ہوئے جواب دیا۔

”اب کم از کم مہینے بھر تک ہمیں کوئی ملنے سے نہیں روک سکتا۔“

”اس کے بعد کیا ہوگا؟“ چند بانی نے اس کے گلے میں بائیں ڈالنے ہوئے کہا۔

”میں اس کا بھی انتظام کر رہا ہوں۔ تارا بانی کے آنے سے پہلے میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ باہر پہرا موجود ہے۔ تارا بانی یقیناً پہرے داروں سے کہہ کر گئی ہوگی کہ مجھ پر نظر رکھیں۔“

”سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔“

”اگر ہم یہاں سے نکل بھی گئے تو ہم ہنتوں چلے رہیں گے مگر مرہٹوں کے علاقے سے نہیں نکل سکیں گے۔ پکڑے گئے تو مجھے اپنا نہیں تمہارا دکھ ہوگا۔ یہاں سے نکلے تو مغلوں کا ڈر..... آخر ہم جائیں گے کہاں؟“

”اور تک زیب کا بیٹا شہزادہ اعظم شاہ اجمین کا صوبہ وار ہے۔ بادشاہ سے اس کی ناراضی ہے۔ وہ یقیناً مرہٹوں سے دوستی کا خواہاں ہوگا۔ میں اس کے قریب جانے کی کوشش کروں گا۔ وہ ہمیں پناہ دے گا۔“

”اس کے صلے میں وہ کیا کچھ طلب کرے گا، جانتے ہو؟“

”تمہاری خاطر اگر چند قلعوں پر اس کا قبضہ کر دیا جائے تو سودا بڑا نہیں۔“

”پھر جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو وقت ہاتھ سے نکل جائے۔“

اس نے وہ رات وہیں گزاری اور صبح ہوتے ہی اجمین کا کہہ کر قلعے سے نکل گیا۔

☆☆☆

بادشاہ نے صحت یاب ہوتے ہی قلعہ پر نالہ کی مہم پر جانے کا ارادہ کیا۔ اس کی صحت اب بھی ٹھیک نہیں تھی۔ وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اس کے مشیروں نے اسے ابھی مزید انتظار کرنے کو کہا لیکن اس نے کسی کی نہیں سنی۔

ایک مرتبہ پھر زمین دہلنے لگی۔ شاہی لشکر رواں دواں تھا۔ راستے میں کئی جگہ مرہٹوں نے چھاپے مارے لیکن شاہی فوج نے انہیں مار بھجایا۔

اس قافلے نے ایک مقام مرتضیٰ آباد پہنچ کر قیام کیا۔ صوبہ داروں کی جانب سے کمک ابھی تک نہیں پہنچی تھی پھر رفتہ رفتہ یہ کمک پہنچنے لگی مگر احمد آباد کے صوبہ دار شجاعت خاں کی طرف سے معذرت کا خط آ گیا۔ اس نے صاف لکھ دیا تھا کہ احمد آباد کے لوگ دور دراز کی مہم پر جانے سے معذور ہیں۔

شجاعت خاں کو یہ گھمبڑ تھا کہ وہ اپنی خدمات کی بدولت بادشاہ کی نظر میں قدرو منزلت اختیار کر چکا ہے اس لیے بادشاہ اس کا عذر قبول کر لے گا اور شاید ایسا ہو بھی جاتا لیکن اتفاق سے اسی روز صوبہ احمد آباد کے قلعے گودرہ کے فوج دار کا خط پہنچ گیا۔

”اس وقت جبکہ بادشاہ اسلام جہاد پر کمر بستہ ہیں اور کفار کے قلعوں کی تخریب کا ارادہ کر چکے ہیں، اس خاندان کے لیے جہنم سے بیٹھنا دشوار ہے۔ میں آپ کے حکم کے بغیر تو کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر آپ حکم فرمائیں اور مجھے اس لائق سمجھیں تو جتنی بھی جمعیت اکٹھی ہو سکے، لے کر حاضر ہو جاؤں۔ اس طرح جہاد کا ثواب بھی مل جائے گا اور حضور کی قدم بوسی کا اعزاز بھی۔“

بادشاہ نے دونوں عریضوں کو پڑھا۔ اسے شجاعت خاں پر بڑا غصہ آیا۔ جب مراد خاں آ سکتا ہے تو شجاعت خاں کیوں نہیں؟ اس نے شجاعت خاں کے نام عتاب نامہ روانہ کر دیا۔

”افسوس صد افسوس کہ ہم نے تم پر بے پایاں عنایات کیں اور تمہیں ادنیٰ مراتب سے اعلیٰ مراتب پر پہنچایا۔ اس کے باوجود تمہارا رویہ یہ ہے کہ اس وقت جبکہ مابعد دولت جہاد اور کافروں کی سرکوبی کے لیے تیار ہو گئے ہیں، تم ایک ہزار سواروں کو بھی سرکاری خرچ پر روانہ کرنے میں لالچائی عذر اور لیت و لعل کر رہے ہو۔ تم غضب سلطانی سے

چھوڑا۔ اس راہ میں کئی لوگ شہید بھی ہو گئے لیکن تعاقب جاری رہا اور وہ پورش کرتے ہوئے پہاڑی چوٹی پر پہنچ گئے اور وہاں بادشاہی لشکر کے چھنڈے گاڑ دیے۔ یہ منظر ایسا تھا کہ کوئی شخص بھی آفرین کے نعرے بلند کرنے سے باز نہ رہ سکا۔

بادشاہ نے فتح کے نشاںوں کا پہاڑی پر خود مشاہدہ کیا۔ اسی اثناء میں محمد رادخاں کا پیغام پہنچا کہ مزید ملک اور مورچا بندی کا سامان پہنچایا جائے۔ اس پیغام پر بادشاہ نے اپنے دو امیروں روح اللہ خاں اور حمید الدین خاں کو کمک پر جانے کا حکم دیا۔

محمد رادخاں کی اس کامیابی پر امرائے شاہی حسد سے جلنے لگے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کامیابی کا سہرا مرادخاں کے سر بندھے اور وہ بادشاہ کی نظروں میں سرخرو ہو۔ ان میں روح اللہ خاں اور حمید الدین خاں بھی شامل تھے۔ یہ دونوں بادشاہ کے حکم کے مطابق پہاڑی کے دامن میں پہنچے ضرور تھے مگر انہوں نے وہاں ٹھہر کر مرادخاں کے نام پیغام بھیجا۔

”تم نے بے جا اقدام کیا اور جلد بازی سے کام لیا ہے۔ اب تم ہمیں اپنی مدد کے لیے بلارہے ہو۔ اب ہم کسی بھی مدد سے قاصر ہیں۔ اگر تم اور تمہارے ہمراہی از خود مورچے قائم کر سکتے ہیں تو مبارک ورنہ مورچے قائم نہ ہونے کا عذر کر کے نیچے اتر آؤ۔ سب کو مصیبت میں نہ ڈالو۔“

مرادخاں کی صورت نیچے اترنے کو تیار نہیں تھا۔ پیغام آتے رہے، پیغام جاتے رہے۔ روح اللہ خاں نے اس کی طرف سے مایوس ہو کر بادشاہ کی خدمت میں لکھا۔

”اگرچہ مرادخاں نے حق ٹمک ادا کیا ہے۔ اس کی بہادری کو سلام لیکن اس جگہ مورچا بندی ممکن نہیں۔ رات کے وقت وہاں ٹھہرنا ممکن نہیں رہے گا۔ اگر وہاں کیپ لگا تو بڑے نقصان کا اندیشہ ہے۔ ان سب مشکلات کے باوجود مرادخاں نیچے اترنے کو تیار نہیں۔ اس سے کہیں نیچے اتر آئے اور شاہی لشکر کو بدنامی و رسوائی سے بچالے۔ اس کی ضد سب کو لے ڈوبے گی۔ فتح کے لیے مناسب وقت کا انتظار کیا جائے۔“

بادشاہ اس خط کی عمارت سے متاثر ہو گیا اور محمد رادخاں کے نام اپنے ہاتھ سے خط لکھ کر بھیجا۔

”ایسی بے جا جرأت جس سے ندامت اٹھانی پڑے، آخر کیوں کی جائے۔ جلد پہاڑ سے اتر آؤ۔“ مرادخاں کی جاں نثاری بادشاہ کی نظروں میں قابلِ اعتراض

نہ تھی بلکہ خوب معلوم ہوتے ہوئے اس روئے کو یہ جڑ بے معالی آفریں بات پر محمول کیا جائے۔ جو لوگ اس بارگاہِ دولت یافتہ اور خانہ زاد ہیں اور اس آستانے سے دور رہتے ہیں (مراد خاں) وہ از خود اس بارگاہ پر مامور نہیں دینے کے لیے التماس کر رہے ہیں۔ تمہیں بھی ہمارے لیے ایک فوج حضورِ معنی میں روانہ کرو۔“

ایک دوسرا خط مرادخاں کے نام تحریر ہوا۔ ”تم ایک ہزار سواروں کو اس وعدے پر کہ ان کو اسی بے بیہوش منصوبہ اور جاگیر عطا ہوگی، تیار کر لو اور چھ ماہ کی فوج بھیج دے کر اپنے ہمراہ لے آؤ۔“

محمد رادخاں نے خط موصول ہوتے ہی گزر بردار کو انعام دے کر رخصت کیا اور فوج ترتیب دینی شروع کر دی۔ جب شجاعت خاں کو اس کا علم ہوا تو اس نے ان ہمداروں کو جو بھرتی کر رہے تھے، دھمکی آمیز پیغام دے کر بھرتی سے روک دیا لہذا مرادخاں بہ مشکل پانچ سو سوار بھرتی کر سکا۔

جب یہ افراد مرتضیٰ آباد پہنچ گئے تو بادشاہ نے شہزادہ بہادر بخت اور دوسرے امیروں کو قلعے کا محاصرہ کرنے کے لیے آگے بڑھایا۔

انہی دنوں یہ خبر آئی کہ رام راجا کی بیوہ تارا بانی قلعہ ہمالہ میں موجود ہے۔ اس پر جوش مزید بڑھ گیا۔ ہر امیر چاہتا تھا کہ اس کی بہادری کی شہرت بادشاہ کے کانوں تک پہنچے۔

بادشاہی فوج نے محاصرہ کرنے کے بعد مورچا بندی اور گولہ باری کے انتظامات کر لیے۔ گولہ باری سے قلعے کے بعض حصے منہدم ضرور ہو گئے مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔

قلعے والے کچھ دنوں تو برداشت کرتے رہے پھر انہوں نے بھی گولے برسانے شروع کر دیے۔ بادشاہی لشکر ان گولوں کی آڑ میں مورچے آگے بڑھا تا رہا۔

ایک روز کہ ابھی سورج نکلنے کو تھا، بھڑوں نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ وہ پہاڑی سے اترے اور لشکر کے اگلی انارے پہنچ کر موہنٹیوں کو جو وہاں چر رہے تھے، چرا لیا اور ان کو پہاڑی پر لے جانے لگے۔ بس یہی قدم ان کے لیے مصیبت بن گیا۔ محمد رادخاں کا بیٹا اور ہمارا بھائی جو اس وقت جاگ رہے تھے اٹھے اور ایک جماعت ساتھ لے کر قلعہ پہنچ گئے۔ مرہٹے یہ دیکھ کر گھبرا گئے اور بھاگ

نے ہوئے۔ شاہی بہادروں نے ان کا تعاقب شروع کیا۔ قلعے والوں نے گولیوں کی پوجھاڑ کر دی اور بڑے بہتر پھینکنے لگے لیکن بہادروں نے ان کا تعاقب نہیں

وہی اور اسے پہاڑ سے نیچے اترنا پڑا۔

جلد ہی بادشاہ کو فتح صورت حال کا علم ہو گیا تھا لیکن اس نے صرف اتنا کیا کہ مراد خاں کو تسلی دلا سادے کراس کے مراتب میں اضافہ کر دیا۔

اس عارضی فتح پر قلعے کے کینوں کو تشویش تھی۔ وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ کسی دن قلعہ فتح ہو جائے گا۔ تارابائی قلعے میں موجود تھی۔ اس کی موجودگی مرہٹوں کی ڈھارس بندھائے ہوئی تھی لیکن یہ خدشہ بھی تھا کہ تارابائی کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ بعض کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ بھی مصالحت پر تیار نہیں ہوگی۔ مسلسل محاصرے نے مرہٹوں کو عاجز کر دیا تھا اور اب وہ صلح کی راہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ تارابائی کا حال یہ تھا کہ وہ برجوں اور فصیلوں کا جائزہ لیتی پھرتی تھی۔ اس کی وجہ سے سپاہیوں کو بھی جاگنا اور چوکنا رہنا پڑتا تھا۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اس صورت حال سے خود بھی تنگ آ چکی ہے لیکن اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بالآخر ایک روز اس کا پناہ ممبر لبریز ہو گیا۔ اس نے قلعے میں موجود تمام اہم لوگوں کو طلب کیا اور انہیں خطرے سے آگاہ کیا۔

”محاصرے کو ڈھائی ماہ گزر چکے ہیں۔ شاہی لشکر کھلے میدان میں ہیں اور ہم پہاڑ پر محصور ہیں۔ اب تک ہمارے پاس رسد پہنچ رہی تھی۔ لشکر کے چھاپا ماروں نے رسد کے راستے بھی مسدود کر دیے ہیں۔ اب ہمارے سامنے صرف ایک راستہ ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم بھوک سے مرنے لگیں، باہر نکلیں اور پہاڑ سے نیچے اتر کر شاہی افواج سے مقابلہ کریں۔ مجھے تم لوگ خود سے الگ نہیں پاؤ گے۔ میں سب سے آگے رہوں گی۔“

ہر طرف سے اس کی بہادری پر تعریفوں کے ڈونگرے برسنے لگے لیکن قلعہ دار نے ہاتھ جوڑ لیے۔

”رانی جی! اگر آپ کی یہی صلاح ہے تو ہم سب کٹ مرنے کو تیار ہیں لیکن آپ کی زندگی ہمیں عزیز ہے۔ آپ مرہٹوں کا مان ہیں۔ ہم قلعے سے باہر نکلیں گے ضرور لیکن آپ ہمارے ساتھ نہیں ہوں گی۔“

”تمہاری رانی تمہیں اکیلے نہیں چھوڑے گی۔“

”آپ کے آنجنابی پتی رام راجا نے کئی مرتبہ یہ طریقہ اپنایا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے میں قلعے میں تنہا بیٹھی رہوں اور غنیمت قلعے پر قبضہ کر لے۔“

”آپ قلعے میں نہیں ہوں گی۔“

”یہ بھی تم نے خوب کہی۔ یہ کیونکر ہوگا؟“

”آپ کو قلعہ پون گڑھ میں منتقل کر دیا جائے گا۔ اگر قلعہ پر نالہ پر قبضہ ہو گیا تو شاہی فوجیں اس میں کھن ہوں گی۔ قلعہ پون گڑھ کی طرف ان کا دھیان بھی نہیں جائے گا۔“

قلعہ پر نالہ اور قلعہ پون گڑھ دونوں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان محض ایک پہاڑ تھا۔ اس پہاڑی کے حصے کا حقیقی حال معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ شاہی فوج اس سے بالکل بے خبر تھی۔ شاہی فوج کا ساری توجہ قلعہ پر نالہ کی جانب تھی۔

قلعہ پر نالہ کے محاصرے کو دو ماہ سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ اب آریابائی گھڑی تھی۔ شاہی لشکر نے ایک زبردست حملہ کیا۔ زینے لگا کر لوگ قلعے پر چڑھ گئے لیکن اتنا آسان نہیں تھا۔ اس راہ میں یہ کثرت لوگ شہید ہو گئے اس کے باوجود کامیابی نہ ہو سکی۔ کامیابی ہوئی تو صرف اتنا کہ محصورین پر خوف طاری ہو گیا۔ یہی وقت تھا جب تارابائی کو قلعہ پون گڑھ میں منتقل کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ اسے ایک سفید گھوڑے پر بٹھایا گیا اور سفید جھنڈا اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا تاکہ اگر کسی کی نظر پڑ بھی جائے کوئی یہ سمجھے کہ امان طلب کرنے کے لیے کوئی قلعے سے باہر آیا ہے۔

تارابائی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر قلعے کی عقبی دیوار تک گئی۔ اس کے بعد اسے سیڑھی کے ذریعے دیوار پر چڑھنا تھا۔ اس سے پہلے دوسرے جاننا دیوار کے اوپر چڑھ گئے۔ تارابائی کے اوپر پہنچنے ہی ان دونوں جاننا زوں۔ سیڑھی اور پہنچنے کی اسی سیڑھی کے ذریعے تارابائی دوسری طرف اتر گئی۔ دونوں مرہٹہ جاننا بھی اس کے ساتھ پہاڑ سے اترے۔ اب تارابائی قلعے کے باہر تھی لیکن پہاڑ سے نہیں اتر سکتی تھی کیونکہ اس جگہ سے پہاڑی کٹی ہوئی تھی اور ایک گہری کھائی کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ وہ تینوں دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ ایک جگہ پہنچ کر پہاڑی کٹاؤ ختم ہو گیا اور ڈھلان آگئی۔ یہاں سے نیچے اتر جاسکتا تھا۔ اس میدان کے دوسرے کنارے پر پہاڑ تھا، اس پہاڑی کے اوپر قلعہ پون واقع تھا۔

”رانی جی! آپ یہاں ٹھہریں۔ ہم میں سے ایک جائے گا اور قلعے سے آپ کے لیے تازہ دم گھوڑا لے آئے جو آپ کو اوپر تک پہنچنے میں مدد دے گا۔“

اس مرہٹے کو ایک ایسے راستے کا علم تھا جس سے ذریعے پہاڑی پر آسانی سے چڑھا جاسکتا تھا۔ اس کے

ماہنامہ سوسٹی ڈائجسٹ



اکتوبر 2017ء

کے شمارے کی
سحر انگیز کہانیاں

اہلہ پیا

ایک سرکش تنہا اور بے حسین روح
کا ماجرا۔ سنسنی خیز رفتار مغربی ناول کی تلخیص

امجد ونیس کے قلم سے

انگاریے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فصاحت میں آگے بڑھتا
طاہر جاوید مغل کے ماڈگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلیاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت
سے برسر پیکار نوجوان کی سرگزشت.....
عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

کبیر عباسی اور محمد فاروق انجم
کی سرورق پر قیامت خیز کہانیاں

ان کے علاوہ

منظر امام، تنویر ریاض، سلیمہ انور،
امرشد بیگ، جمال دستی، تمکین رضا
اور عکس فاطمہ کی طبع زاد وتر جملہ کہانیاں

چینی ٹیکہ چینی

آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

ماہی پر پڑنے اور واپس آنے میں آدھا گھنٹا
بھی زیادہ وقت لگ گیا وہ واپس آیا تو اس کے
اتھ مارا۔ لاش مل گھوڑا تھا۔

”ام قلعے سے باہر نکل آئے ہیں۔ ہمارے پاس
بھی لوں تو کیوں نا میں پون گڑھ کے بجائے اپنے قلعے
پر ہلی جاؤں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، وہ قلعہ یہاں سے
اور دور نہیں۔“ تارا بابائی نے ان مرہٹوں سے کہا۔

”رانی جی! ہم قلعے کی پشت پر ہیں۔ یہاں سے کچھ
الٹا سارے پردھن کی فوج ہے۔ سامنے کی پہاڑیوں کی وجہ
سے ہم انہیں نظر نہیں آ رہے ہیں لیکن جونہی ہم آگے بڑھیں
کہہ ان کی گولیوں کی زد پر ہوں گے۔“

”پھر تو ہم پون گڑھ سے کبھی نہیں نکل سکیں گے۔“
”پون گڑھ سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہو سکے گی۔
مارٹن محاصرہ اٹھا کر چلا جائے یا قلعہ پر نالہ کی فتح کی
مدد میں اس طرف سے غافل ہو جائے۔“

تارا بابائی کے سامنے اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں
بھاڑا۔ منسوبے کے مطابق قلعہ پون گڑھ میں پناہ لے۔

ایک گھوڑے پر وہ دونوں مرہٹے سوار ہوئے،
وہ گھوڑے پر تارا بابائی اور پہاڑی عبور کر کے قلعہ پون
آگے بڑھ گئے۔

تارا بابائی کہہ کر مٹی تھی کہ مقابلہ کرتے رہتا۔ میں قلعہ
پون گڑھ پہنچتے ہی ہوتا جاؤ سے رابطہ کروں گی۔ مکمل پہنچتے
ایماندار افغان مضبوط ہو جائے گا۔

تارا بابائی کے جاتے ہی قلعہ دار نے اس کی نصیحت
سنا لی اور نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس مراسلت کا
اہم یہ تھا کہ قلعہ دار نے شہزادہ محمد کام بخش سے خفیہ طور پر
ایماندارم وصول کر کے امان کا قول نامہ طلب کر لیا اور جواب
میں وہ لوں قلعوں کی چابیاں بھجوا دیں اور قلعوں کو خالی کرنے
کی اہمیت طلب کر لی۔

وہ لوں مسلح قلعہ بادشاہ کے ہاتھ آ گئے۔

تارا بابائی کو اس ہزیمت کا علم ہوا تو نہایت سچ باہوئی
انہوں نے اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ
پناہ لے۔ قلعہ میں جا کر پناہ گزین ہو جائے۔

اس نے اہل آدمی دہتا جاؤ کی طرف دوڑایا اور خود
پناہ لے کر طرف لوٹ گئی۔

☆☆☆

نورانیات محرم خاں، شہزادہ کام بخش کا اتالیق رہ
وہ لوں کے درمیان کشیدگی اور محسوس رہتی تھی۔

اکتوبر 2017ء

33

سپینس ڈائجسٹ

ایک واقعے نے اس رنجش کو طول دے دیا۔ شہزادہ بادشاہ سے ملاقات کر کے واپس ہو رہا تھا۔ محرم خاں اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا کہ اچانک ایک تیر کی طرف سے آیا اور محرم خاں کے پیٹ میں بیہوش ہو گیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ محرم خاں کا ہاتھ اس کے پیٹ پر تھا جس کی وجہ سے تیر خطرناک ثابت نہ ہو سکا۔ صرف اتنا ہوا کہ ہاتھ زخمی ہوا اور تیر کی نوک سے پیٹ بھی زخمی ہو گیا۔ پورا تیر پیٹ میں بیہوش نہیں ہوا۔ محرم خاں اسی زخمی حالت میں بادشاہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے چھا ہوا تیر بادشاہ کو دکھایا۔

”محرم خاں! تمہاری یہ حالت کس نے بنائی؟“

”شہزادے کے ہمراہیوں میں سے کسی ایک نے۔“

”محرم خاں، تم جانے ہو کیا کہہ رہے ہو۔“

”حضور! شہزادہ کام بخش اور میں ایک ساتھ باہر نکلے تھے۔ شہزادے کے ہمراہی ان کے ساتھ تھے اور پھر یہ تیر چل گیا۔“

”یہ کیسے مان لیا جائے کہ یہ حرکت شہزادے کے ساتھیوں کی ہے اور شہزادہ یہ کیوں چاہے گا؟“

”شہزادہ حضور مجھ سے پر خاش رکھتے ہیں اور میری ہنک کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا اوپاشوں میں ہے۔ ان کے دوستوں سے یہی توقع ہو سکتی ہے۔“

بادشاہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر محرم خاں کو شاہی طبیب کے حوالے کر کے اس معاملے کی تحقیق کے لیے آ دی مقرر کر دیے۔

نقیض کے بعد معلوم ہوا کہ شہزادے کے ساتھ پانچ لوگ تھے۔ ان میں ایک شہزادے کا دودھ شریک ”ہدو“ بھی تھا۔ ان پانچوں کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ جب انہیں پوچھ کچھ کے لیے بلایا گیا تو وہ چار تو بے آسانی حاضر ہو گئے لیکن ہدو نامی شہزادے کا دودھ شریک بھائی گستاخی اور بدتمیزی پر اتر آیا۔ شہزادہ بھی بڑھ چڑھ کر اس کی پشت پٹائی کرنے لگا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہی قصور وار ہے۔ یہ تمام باتیں بادشاہ تک پہنچ رہی تھیں، بالآخر بادشاہ نے حکم دیا کہ ”ہدو“ کو گرفتار کر کے ہمارے حضور پیش کیا جائے۔ بادشاہ کے اس حکم کی تعمیل نہ ہو سکی کیونکہ ”ہدو“ بھاگ کر شہزادے کی پٹائی میں چلا گیا۔ شہزادے نے بھی اسے خود سے جدا کرنا مناسب نہ جانا اور لیت و لعل سے کام لینے لگا۔ بادشاہ نے شہزادے کے نام حکم روانہ کیا کہ ”ہدو“ کو فوراً خود

سے جدا کر کے کوتوال کے حوالے کر دو اور اسے اپنے سے خارج کر کے اس کا گھر بار ضبط کر لو۔

شہزادہ نے تو بادشاہ کا حکم ٹال سکتا تھا اور نہ ہدو کو حوالے کرنے کو تیار تھا۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ اسے یہاں سے فرار کرادے۔ اس نے خفیہ طور پر یہ منصوبہ بنایا کہ ضرور ساز و سامان دے کر اسے اپنی کسی جاگیر پر بھیج دیا جائے۔ محرم خاں کے کانوں میں اس کی ہنک پڑی اور اس نے یہ بات بادشاہ تک پہنچا دی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ باہر نکلتے ہی اسے گرفتار کر لو اور شہزادہ ہر روز کی طرح بھر تسیلات کے لیے حاضر ہو جائے۔ کام بخش نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیغام بھجوایا۔ ”میں اپنے بھائی ”ہدو“ کو خود سے ہرگز جدا نہیں کروں گا۔“ یہ ایسا گستاخانہ جملہ تھا کہ اگر معاملہ شہزادے کا نہ ہوتا تو وہ ملزم کے قتل کے احکام بھیجتا۔ معاملہ شہزادے کا تھا اس کے باوجود بادشاہ نے حکم دیا کہ کوئی بھی صورت ہو، ہدو کو شہزادے سے جدا کر کے کوتوال کے حوالے کر دو۔ بادشاہ نے ایک امیر حمید الدین خاں کو شہزادے کے پاس بھیجا۔ حمید الدین خاں نے وہاں پہنچ کر حکم کی تعمیل کرنی چاہی تو شہزادے نے اپنی کمر سے کنار نکالی اور حمید الدین خاں پر حملہ کرنا چاہا۔ حمید الدین خاں نے کمال ہوشیاری سے یہ وار بچا لیا اور اپنے آدمیوں کو آواز دی جو باہر کھڑے تھے۔ ان کے آتے ہی شہزادے پر قابو پایا گیا اور ”ہدو“ کو اس سے جدا کر کے قید خانے میں بھجوا دیا گیا۔

بادشاہ نے دوسرا حکم جاری کیا کہ شہزادے کو ایک خیمے میں قید کر دیا جائے اور اسے اس کے منصب سے بھی معزول کر دیا گیا۔

☆☆☆

قلعہ پر نالہ فتح ہو چکا تھا۔ مرہٹہ سرداروں کی فتح کئی کے لیے انہی مزید فتوحات کی ضرورت تھی۔ قریب تر قلعہ ”قلعہ کھیلنا“ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ قلعہ قریب ضرور تھا لیکن دشوار گزار راستے کے سبب وہاں تک پہنچنا امر محال تھا جبکہ اب شہزادہ کام بخش بھی خنجر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کمزوری کے باوجود بادشاہ بغد تھا کہ قلعہ کھیلنا کو فتح کیا جائے۔ اس نے قابل اعتبار امراء کا اجلاس طلب کیا۔ ان امراء میں شیخ اللہ خاں سب سے نمایاں تھا۔ بادشاہ نے یہ ہم اسی کے حوالے کی۔

اس سفر پر روانگی کے وقت کسی کو گمان تک نہیں تھا کہ کسی جان لیوا دشواریاں پیش آ سکتی ہیں۔ اونچے نیچے

لشکر کے عام آدمیوں کے لیے کوئی ذریعہ نہیں تھا، بادشاہ نے حکم دیا کہ امراء کے ہاتھی نالے پر ستر کر دیے جائیں۔ یہ لوگ اللہ اللہ کر کے پار اتر تو گئے لیکن دوسرے کنارے پر چپا بھر زمین بھی ایسی نہیں تھی جہاں خیسے لگائے جاسکیں۔ کھلے آسمان تلے پڑے رہے۔ جو نالا عبور نہ کر سکے تھے، ان کا بھی یہی حال تھا جنہوں نے نالا عبور کر لیا تھا، وہ بھی مشکل میں تھے۔ سورج کا نام نشان نہیں تھا جو کچھ خشک ہوتی۔

کافی دنوں بعد سورج نے صورت دکھائی۔ خوشی ایسی تھی کہ پورا لشکر چیخ اٹھا۔ اتنا غل جاکہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

جب سورج نکلے کئی دن ہو گئے تو بادشاہ نے کوچ کا ارادہ کیا۔ لشکر نے چودہ کوس کا فاصلہ طے کیا اور قلعہ پر نالہ پہنچ کر چھاؤنی ڈال دی۔ اب لشکر کو آگے بڑھنا تھا لیکن خبروں نے دل دہلا دیا۔ اطلاع ملی کہ دریائے کرشا میں زبردست طغیانی آئی ہوئی ہے پھر بھی امید پر سفر طے کرتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر ایک نئی آفت سامنے تھی۔ یہاں کشتی کی چند ٹوٹی چھوٹی کشتیاں کھڑی تھیں۔ انہیں کشتیوں کا نام دینا بھی زیا نہیں تھا۔ چند تھنے تھے جنہیں جوڑ دیا گیا تھا۔ ڈوبنے کو بچنے کا سہارا، یہ تو پھر کشتیاں تھیں۔ ان تختوں پر لوگ ٹوٹ پڑے۔ ہر شخص سوار ہونے کے لیے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کوشش میں بے شمار لوگ غرق ہو گئے۔ کئی کشتیاں ڈوب گئیں۔ کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ رک کر کسی کو ڈوبنے سے بچاتا۔

اٹھارہ دن میں دریا عبور کیا اور لشکر بہادر مگرہ پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر قیام کرنا ضروری تھا تا کہ لشکر آرام کر کے آسودہ ہو جائے اور ضروری ساز و سامان تیار کر لیا جائے۔ لشکر کے لوگ خوش تھے کہ اب مصیبتیں رفع ہوئیں لیکن بادشاہ کی طرف سے حکم جاری ہو گیا۔

بادشاہ نے قلعہ کندانہ کی تعمیر کے لیے کوچ کا حکم دے دیا۔ لشکر جس مصیبت سے گزر کر یہاں تک پہنچے تھے، اس کے بعد یہ حکم ان کے لیے قابل قبول نہیں تھا لیکن بادشاہ کے حکم سے روگردانی بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ مرتے کیا نہ کرتے، کوچ کرنا پڑا اور قلعہ کندانہ پہنچ گئے اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

یہ محاصرہ تین ماہ تک جاری رہا۔ بادشاہی لشکر کے امیروں اور افسروں نے آخر کار قلعہ دار کو کافی رقم دے کر قلعہ خرید لیا اور کندانہ بادشاہی قبضے میں آ گیا۔

لشکر کے لیے مذاہب بنے ہوئے تھے۔ ہر طرف لہو لہاں اور جھاڑیوں کی موجودگی نے چلنا دو بھر کر پانی پانیوں سپاہیوں کے بدن پر بڑے بڑے آبلے گئے جن میں ناقابل برداشت سوزش اور جلن ہو رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کا بدن میں طے ہوا اور یہ قافلہ ایک گھائی پر پہنچا۔ اسی گھاٹی میں ہزاروں بیدار بخت بھی اپنے لشکر کے ساتھ آ گیا۔ ہزاروں بیدار بخت غنیوں کی سرکوبی کے لیے گیا ہوا تھا۔ انہیں شاید کچھ اور مشکلیں انتظار کر رہی تھیں۔ ایک روز آسمان پر کھربے بادل اٹھے کہ دن میں رات ہو گئی اور پھر رات شدید بارش ہوئی۔ پانی اتنا جمع ہو گیا کہ ایک خیسے دوسرے خیسے تک جانا دشوار تھا۔

لشکر خشک ہونے تک کوچ کرنا محال تھا۔ یہ لشکر ایک ماہ تک یہیں پڑا رہا۔ لشکر نے علم بلند کیا اور کوچ کرنا ہوا ایک سرسبز علاقے میں پہنچا۔ یہاں درخت بہ کثرت تھے جو ہلوں سے لدے ہوئے تھے۔ کھیتا پہاڑ اس مقام سے تین دنوں کے فاصلے پر تھا۔ فتح اللہ خاں کو حکم ہوا کہ اس مقام پر پہاڑ پہاڑ کے دامن تک کا راستہ ہموار کرادے۔

فتح اللہ خاں راستہ ہموار کرنے نکلا اور ایک ماہ کا کام اٹھانے میں مکمل کر دیا۔ راستہ ایسا ہموار ہو گیا کہ سوسوار ایک ماہ گزر سکتے تھے۔

سلطنت محنت کے بعد قلعہ کھیتا بھی فتح ہو گیا۔ قلعہ کھیتا فتح اس حال میں ہوئی تھی کہ سخت بارش ہو رہی تھی۔ ندی نالے خوب چڑھے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے توجہ دی تھی کہ برسات کا موسم یہیں گزرا جائے اور بارش کے بعد یہاں سے رخصت ہوا جائے مگر بادشاہی امراء ہاں مزید قیام پر راضی نہیں تھے۔ بالآخر امراء کے ارادے پر بادشاہ نے بھی کوچ کے لیے قدم اٹھا دیا۔ یہاں پہنچنے ہی اندازہ ہو گیا کہ غلطی ہوئی ہے۔ ندی نالے بہہ رہے تھے۔ پہاڑوں سے پانی اس شدت سے بہہ رہا تھا کہ کھوڑے ڈوب ڈوب جاتے تھے۔ اس پر بادشاہ نے راستے دلدل بن گئے تھے۔ دس دن میں تین دنوں کا فاصلہ طے ہوا اور وہ بھی اس حال میں کہ اسی کچھڑوں میں گھبراتے گھبراتے بھر ہو جاتی۔

اس تباہی بھی غنیمت تھا۔ اب ایک ایسا نالا سامنے تھا جس پر لہو لہاں بھی بہہ رہا تھا۔ جتنے ہاتھی تھے، انہیں امراء کی باربرداری میں لگا دیے گئے تھے۔

قلعہ پر نالہ کی تسخیر کے بعد تارباکی اپنے نوجوہر قلعے کی طرف روانہ ہوئی تھی اور یہ دیکھ کر حیران بھی ہوئی تھی کہ پہاڑ کی چوٹی پر یہ قلعہ ”تاربا“ بنا چک رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں چاند بن کر چمکنے لگیں۔ اب صرف اسے یہ دیکھنا تھا کہ اس کے بنائے ہوئے منصوبے پر عمل ہو سکا یا نہیں۔ ایک چھوٹا سا لشکر اس کے ساتھ تھا جس کی راہنمائی دہنا جادو کر رہا تھا۔ اس نے لشکر وہیں چھوڑا اور دہنا جادو کے ہمراہ قلعے میں داخل ہوئی اور ایک یقین کے ساتھ قلعے کے اس حصے کی طرف گئی جو رام راجا کی دوسری بیوی چندا بانی کے استعمال میں تھا۔ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ چندا بانی اس قلعے کے لیے خواب بن گئی ہے۔ تصدیق ہوتے ہی وہ لوٹ آئی اور دہنا جادو کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

”تیرا بالکل صحیح نشانہ پر لگا ہے۔ جو میں نے سوچا تھا وہی ہوا۔“

”کیا کہہ رہی ہو رانی جی۔“

”چندابانی قلعہ چھوڑ کر چلی گئی ہے اور یہی میں چاہتی تھی۔“

”چندابانی کہاں چلی گئی ہے اور آپ یہ کیوں چاہتی ہیں؟“

”وہ یقیناً ہنونت رائے کے ساتھ گئی ہے۔ اب رہا

سوال یہ کہ میں کیوں چاہتی تھی کہ وہ چلی جائے، اس کا جواب مشکل نہیں۔ دہنا جادو! چندابانی کوئی اور نہیں رام راجا کی دوسری بیوی تھی۔ کسی بھی وقت میرے مقابلے میں آ سکتی تھی۔ میں نے اسے راستے سے ہٹا دیا۔“

”اب میں سمجھا۔“

”تم اب بھی کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ میں نے ایک تیرے دو شکار کیے ہیں۔ چندابانی سے میری جان بھی چھوٹ گئی اور مرے اس کے دشمن بھی ہو جائیں گے۔ جہاں ملے گی ماری جائے گی۔“

”تم نے یہ معرکہ سر کیسے کیا؟“

”ہنونت رائے ایک ہوشیار سردار ہے۔ میں اسے مشوروں کے لیے طلب کیا کرتی تھی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ آتا میرے پاس ہے لیکن اس کی آنکھیں چندا بانی کو ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ انہی دنوں اس نے مجھے قلعہ پر نالہ جانے کا مشورہ دیا۔ میں یہ مشورہ بھی نہ مانتی لیکن میں سمجھ گئی کہ وہ قلعہ کو خالی دیکھنا چاہتا ہے تاکہ چندابانی سے آسانی سے مل سکے۔ جب ہنونت رائے نے میرے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تو مجھے پورا یقین ہو گیا کہ وہ چندابانی سے

ملنے آیا کرے گا۔ اسی لیے قلعہ خالی کرنا چاہتا ہے۔ میں قلعہ پر نالہ چلی گئی۔ اس کے بعد کیا ہوا، وہ تم دیکھ ہی رہے ہو۔ چندابانی قلعے میں نہیں ہے۔ وہ اسے لے کر بھاگ گیا ہے۔ مجھے فکر ہے تو میں یہ کہ چندابانی اتنی بھولی نہیں ہے۔ اس نے قلعے میں رکھا خزانہ خالی کر دیا ہوگا۔ مجھے سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ قلعے میں سے مال و دولت اپنے ساتھ لے کر نہیں گئی۔ اب دیکھتی ہوں کہ کیا لے کر گئی، کیا چھوڑ گئی۔ اس نے مرہٹوں کی عزت کو ہانکا دیا ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔“

”سوال یہ ہے کہ ہنونت رائے کہاں گیا ہوگا؟“

”وہ شہزادہ اعظم شاہ کی باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ یقیناً اسی کے پاس اجین گیا ہوگا۔ اس کی وہاں موجودگی مرہٹوں کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ کسی طرح بھی ہوا سے تلاش کرو۔“

”رانی جی! آپ نے چندابانی سے انتقام لینے کے لیے مرہٹوں کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔“

”میں اس خطرے سے نمٹنا جانتی ہوں۔“

”مرے اس وقت منتشر ہیں۔ ہمارے بہت سے قلعے ہمارے ہاتھ سے چلے گئے ہیں۔ ایسے میں ہنونت رائے کا شاہی حلقے میں شامل ہو جانا فکر مندی کی بات ہے۔ وہ چندابانی کو رام راجا کا جانشین بنانے کا اعلان کر سکتا ہے۔ بہت سے سردار اس کے ساتھ مل سکتے ہیں۔“

”تم کس دن کام آؤ گے۔ تمام سرداروں کو پیغام بھجوادو کہ چندابانی باغی ہو گئی ہے۔ اس کا کھوج لگاؤ اور رانی بانی کے سامنے پیش کرو۔“

دہنا جادو یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ وہ ویسا ہی کرے گا جیسا رانی بانی نے کہا ہے۔

شجاعت خاں صوبہ دار احمد آباد کو بادشاہ نے معاف کر دیا تھا لیکن اپنی بے عزتی کا شدید صدمہ تھا۔ یہ بات اس وقت کی ہے جب قلعہ پر نالہ کی فتح کے موقع پر بادشاہ نے تمام صوبہ داروں کو ایک ایک ہزار سوار ملک کے طور پر بھیجے کا حکم جاری کیا تھا۔ شجاعت خاں نے معذرت کر لی تھی۔ بادشاہ نے اس کے نام عتاب آمیز خط تحریر کیا تھا۔ بعد میں غلط فہمی دور ہونے پر اسے معافی مل گئی تھی۔

اسی صوبے میں شجاعت خاں کا انتقال ہو گیا۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی کہ اسے شجاعت خاں کا جانشین بنادیا جاتا۔ بادشاہ نے احمد آباد کا صوبہ شہزادہ اعظم شاہ کے سپرد کر دیا۔

ہی اسے بعض لوگوں نے پہچان لیا اور جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ اس نے درخواست کی کہ اسے نائب صوبہ دار خواجہ حمید الدین کے پاس لے جایا جائے۔ وہ اپنے آنے کا مقصد اسی کے سامنے بیان کرے گا۔ اسے غیر مسلح کر کے خواجہ حمید الدین کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

ہنوت رائے نے اقرار کیا کہ وہ مرہٹہ ہے۔ یہ بھی بتایا کہ ان دنوں وہ اعظم شاہ کی ملازمت میں ہے۔

”شہزادہ اعظم شاہ بھاری ساز و سامان کے ساتھ احمد آباد سے چل پڑا ہے لیکن اسے آنے میں کچھ دیر لگے گی۔

شہزادے نے پیغام بھجوایا ہے کہ اس کے آنے تک دہنا جادو کو مصالحت کی پیشکش میں الجھائے رکھو۔ اگر وہ فوری مصالحت کرتا ہے تو ٹھیک ورنہ نوؤد کے تباہی کے ذریعے اتنا طول دے دو کہ میں وہاں پہنچ جاؤں۔ میرے ساتھ ایک چھوٹا سا لشکر بھی ہے جسے میں کسی وقت لشکر گاہ تک پہنچا دوں گا۔ اپنے ساتھ اس لیے نہیں لایا کہ غلط فہمی میں کوئی جنگ چھڑ سکتی تھی۔“

خواجہ حمید الدین نے اس کی باتیں غور سے سنیں۔ مزید سوالات بھی کیے اور مطمئن ہو کر ایک امیر سلطان حسین کو طلب کیا۔ اس وقت جنگ کرنے کی طاقت ہی کہاں تھی۔ سلطان حسین فوراً مصالحت کے لیے تیار ہو گیا۔

دہنا جادو اپنے پڑاؤ سے ایک سوار کو شاہی لشکر گاہ کی طرف جاتا ہوا دیکھ چکا تھا۔ وہ یہ سمجھا کہ شہزادہ اعظم شاہ اکیلا چلا آیا ہے اور اس کا لشکر بس آتا ہی ہوگا۔ اس میں یہ تاب نہیں تھی کہ شہزادے کا مقابلہ کرتا۔ ممکن تھا کہ وہ خود مصالحت کے لیے ہاتھ بڑھاتا کہ سلطان حسین خاں اس کے کیمپ میں پہنچ گئے اور مصالحت کی درخواست کی۔ وہ حیران تھا کہ شہزادے کے آجانے کے باوجود مصالحت کی باتیں کی جارہی ہیں۔ اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ صلح کر لی جائے۔ سلطان حسین نے شرط رکھی کہ وہ مذاکرات کے لیے لشکر میں آئے اور نائب صوبہ دار سے ملاقات کرے۔ اس نے اس وقت تو یہ بات مان لی لیکن دوسرے دن خطرے کا احساس کر کے اپنے وعدے سے منکر گیا۔ اب اس نے یہ شرط رکھی کہ شہزادے کی طرف سے تمام صاحب اختیار مرہٹہ سرداروں کے نام تہنیتی آمیز پیغام جاری کر کے انہیں شہزادے کے حضور طلب کیا جائے۔ ہمارا لشکر آپ کی چھاؤنی کے قریب رہے گا اور شہزادہ یا اس کا نمائندہ پانچ چھ کوس کے فاصلے پر ان سرداروں سے ملاقات کرے۔ جب گفتگو طے ہو جائے گی تو ہم شہزادے کے توسط سے بادشاہ

اعظم شاہ کا اتنی جلدی احمد آباد پہنچنا مشکل تھا۔ اس نے احمد آباد میں اپنا نائب مقرر کر دیا اور خود چلنے کی تیاری لے لی۔

دہنا جادو اور مرہٹوں کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ انہوں نے یہ تمام صورت حال دہنا جادو تک پہنچائی۔ دہنا جادو پندرہ سولہ ہزار مرہٹے لے کر احمد آباد کے قریب آٹھ کوس کے فاصلے پر آ کر ٹھہر گیا۔ احمد آباد کا نائب صوبہ دار کسی صوبہ دار کے بغیر خالی پڑا تھا۔ اس وقت مالدارانہت آسان تھا۔

دہنا جادو نے اپنے طریقہ جنگ کے مطابق دو تین ہزار اسپہ سواروں کو آگے بڑھایا اور باقی فوج کو ان کی حمایت کے لیے تیار رہنے کا حکم دے دیا۔

احمد آباد کی فوج نے آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کیا۔ اس وقت اعظم شاہ کا مقرر کردہ نائب احمد آباد میں موجود تھا۔ لشکر بھی کوئی بڑا نہیں تھا لیکن مقابلے پر آنے والے سپاہیوں کو بار بھگایا۔

ان کے بھگتے ہی فوج نے فتح کا فائدہ بھوایا اور واپس ہو گئے۔ لشکر گاہ پہنچتے ہی سب نے ہتھیار اتار دیے۔

باقی ماندہ مرہٹہ فوج جو ٹیلوں اور غاروں میں چھپی ہوئی تھی، شاہی فوج کو بے خبر دیکھتے ہی حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا طاقتور تھا کہ شاہی لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ لڑے بغیر ہی ہمارا گنا شروع کر دیا مگر بھاگتے تو کہاں؟ دریائے نرید میں ملائی آئی ہوئی تھی۔ کوئی گھاٹ بھی پایاب نہیں رہا تھا۔ آگے پانی تھا پیچھے مرہٹے۔

اسی وقت ہنوت رائے ایک چھوٹے سے لشکر کے ساتھ احمد آباد کی حدود میں داخل ہوا اور اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ احمد آباد پر حملہ ہوا ہے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ ایلوں اور غاروں میں چھپ کر موقع کا انتظار کرے۔ دراصل وہ ان دنوں اعظم شاہ کی پناہ میں تھا اور اعظم شاہ نے اسے بطور ہر اول احمد آباد کی طرف بھیجا تھا اور خود دھم دھم چلا آ رہا تھا۔

دہنا جادو شاہی لشکر گاہ کے باہر پڑاؤ ڈالے بیٹھا تھا۔ فوج رائے نے صرف ایک دن انتظار کیا۔

ان کا سورج طلوع ہونے سے قبل اس نے اپنی فوج کو انارمی تاکہ دور سے یہ نہ پہچانا جائے کہ وہ کوئی مرہٹہ ہے۔ اس پر سوار ہو کر لشکر گاہ کی طرف دوڑ پڑا۔ اس وقت بھی سخت افراتفری مچ چکی ہوئی تھی۔ اس نے پکڑی اتار دی تھی لیکن لشکر گاہ میں پہنچتے

لے، منہ رسلا م کے لیے حاضر ہوا جائیں گے۔

سلطان حسین نے جان بوجھ کر یہ ظاہر نہیں کیا کہ شہزادہ ابھی احمد آباد پہنچا ہی نہیں ہے۔ یہ بہانہ کر کے لوٹ آنے کی شہزادے سے مشورہ کر کے جواب دس گئے۔

مشورہ طویل پکڑتا رہا اور دو دن گزر گئے۔ بس اتنا وقت بہت تھا۔ شہزادہ اعظم شاہ اجین سے احمد آباد پہنچ گیا۔

دہنا جادو یہ خبر ملتے ہی ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے سہری موقع ہاتھ سے نکال دیا۔ وہ یہ سمجھتا رہا کہ اعظم شاہ لشکر میں ہے اور وہ مصالحت کے لیے تیار ہو گیا۔

اب مصالحت کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔

شہزادے کے احمد آباد پہنچنے ہی اس کے سامنے دہنا جادو کی شرط رکھ دی گئی۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ وہ مخالفت کرے گا لیکن اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اس وقت جنگ کو ٹال دیا جائے۔ اس نے یہ شرط مان لی لیکن سرداروں کے نام خط لکھنے کے لیے بادشاہ کی منظوری ضروری تھی۔ دہنا جادو سے کہہ دیا گیا کہ حتیٰ جواب بادشاہ کی منظوری کے بعد دیا جائے گا۔

بادشاہ نے بھی اس تجویز کو پسند کیا اور شہزادے کو سرداروں کے نام خطوط لکھنے کی منظوری دے دی لیکن ابھی یہ خطوط تحریر بھی نہیں ہوئے تھے کہ بادشاہ کا دوسرا حکم آ گیا۔

”مرہٹوں سے کچھ بعید نہیں کہ کسی سازش کے تحت پچاس ساٹھ ہزار سرداروں کو جھاڑنی کے قریب لے آئیں اور مذاکرات کے لیے شہزادے کو بلا کر اغوا کر لیں لہذا سلطان حسین کو تارابیائی کے پاس بھیج کر مصالحت کی اس شرط کو پس پشت ڈال دو۔“

بادشاہ کا یہ اندیشہ اس وقت درست ثابت ہوا جب سلطان حسین تارابیائی کو جواب پہنچا کر آ رہا تھا اور مرہٹوں نے اس کا راستہ روک لیا اور نہایت سخت لڑائی لڑنی پڑی۔ اگرچہ مرہٹوں کی تعداد بہت زیادہ تھی مگر سلطان حسین نے ان کو مار بھگا لیا اور ہر جگہ مرہٹوں سے لڑتا بھرتا لشکر گاہ میں حاضر ہو گیا۔

یہ وہ وقت تھا جب بادشاہ بے جا پور میں بیٹھا قلعہ تورنا کی فتح کے لیے کوچ کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ یہ قلعہ راج گڑھ سے چار کوس کے فاصلے پر تھا۔ راج گڑھ فتح ہو چکا تھا۔ اب قلعہ تورنا باقی تھا۔

سلطان حسین نے لشکر میں حاضر ہوتے ہی بادشاہ کے حضور درخواست بھیجی کہ تارابیائی کی اجازت دی جائے، بادشاہ کی طرف سے جواب آ گیا کہ پہلے وہ قلعہ تورنا میں مورچائی میں حصہ لے اور کچھ کارگزاری دکھانے کے بعد خاضری کے لیے آئے۔

بادشاہ نے سلطان حسین کو پیغام بھیجنے کے بعد تورنا کی تحصیل کے لیے لشکر روانہ کر دیا۔ حکم ملتے ہی لشکر نے کوچ کیا اور قلعہ تورنا سے دو کوس کے فاصلے پر قیام کیا۔

شہزادہ اعظم شاہ احمد آبادی میں رہا کیونکہ مرہٹوں کی طرف سے اب بھی خطرہ تھا۔ اس نے ایک چھوٹے لشکر کے ساتھ سلطان حسین کو قلعہ تورنا کی طرف روانہ کر دیا۔

جب تک وہ پہنچا، محاصرے کے احکام صادر ہو چکے تھے۔ سلطان حسین نے تورنا پہنچنے ہی اپنے مورچے قائم کر لیے۔ اس کے کانوں میں اب تک بادشاہ کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ”قلعہ تورنا پر مورچائی میں حصہ لے کچھ کارگزاری دکھانے کے لیے اس کے بعد تارابیائی کے لیے حاض ہو۔“ اسی کارگزاری کو دکھانے کے لیے اس نے اپنی جگہ اپنے مورچے قائم کیے جہاں مسلسل گولہ باری ہو رہی تھی اس نے اس گولہ باری کی پروا نہ کرتے ہوئے بیس گز تک اپنے مورچے آگے بڑھالیے۔ اس کوشش میں اس نے بہت سے آدمی کام آگئے۔ اسی وقت بہادری دکھانے اور بادشاہ کی نظروں میں سرخرو ہونے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا دشمن کے کم از کم اسی (80) آدمی غلہ لے کر پہاڑ پر جا۔

کی فکر میں تھے۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اس جگہ سلطان حسین اپنے مورچے قائم کر چکا ہے۔ وہ لوگ جیسے تو مورچوں کے قریب آئے، سلطان حسین کے آدمیوں۔ ان لوگوں کو گرفتار کر لیا اور غلہ ضبط کر لیا۔

اس کارنامے کی خبر ہر کاروں کے ذریعے فوراً بادشاہ تک پہنچ گئی۔ بادشاہ نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا اور حکم دیا کہ یہ غلہ اپنے آدمیوں میں تقسیم کر دے پھر اسے حضور میں طلب کر کے سرحدی منصب پر درجہ کا اضافہ عطا کیا۔

ابتدا میں یہی سوچا گیا تھا کہ اکثر قلعوں کی طرح اگر قلعہ کو بھی خرید لیا جائے اور وعدہ وعید کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا جائے لیکن بعض امراء اور خاص طور پر امان اللہ خاں اور سلطان حسین کی رائے سے یہ طے کیا گیا کہ قلعہ کو لڑ کر حاصل کیا جائے۔ امان اللہ خاں کی دلیل نہایت مضبوط تھی۔

”اب مرہٹے کمزور پڑنے لگے ہیں۔ اگر اس وقت ہم نے بات چیت سے مسائل حل کرنے کی کوشش کی

مرہٹے اسے ہماری کمزوری سمجھیں گے۔ اس وقت ہمیں
انہیں شدید زخمی کر دینا چاہیے۔“

”یہ نہ ہو کہ مرہٹے ہم پر حاوی ہو جائیں؟“
”ہنوت رائے ہمیں پہلے ہی بتا چکا ہے کہ سرداروں
میں بھوت پڑ چکی ہے۔“

”آپ لوگ ماؤلیہ قوم کی بہادری سے واقف ہوں
گے۔ اس قوم کی ایک جماعت جو قلعہ گیری کے فن میں بڑی
شہرت رکھتی ہے، ہمارے ساتھ مل گئی ہے۔ اس میں بھی
ہنوت رائے کی کوششوں کا دخل ہے۔ یہ قوم ہماری مدد
کرے گی۔“

سلطان حسین نے بھی امان اللہ خاں کی تائید کی اور
حملہ کرنے کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا۔

رات کا ابتدائی حصہ تھا۔ چاند ابھی طلوع نہیں
تھا۔ طرفین میں شدید گولہ باری ہو رہی تھی۔ ہر طرف دھواں
پھيلا ہوا تھا۔ ایسی خطرناک صورت حال میں کوئی یہ سوچ
بھی نہیں سکتا تھا کہ امان اللہ خاں ماؤلیہ قوم کی جماعت کے
ساتھ آگے بڑھنے کی جرأت کرے گا لیکن یہ لوگ توپوں کی
گھن گرج میں دبے پاؤں اس راستے پر چلتے رہے جس کی
نشاندہی ہنوت رائے نے پہلے ہی کر دی تھی۔ وہ اس
علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا اور اب شاہی لشکر کی مدد
کر رہا تھا۔

امان اللہ خاں اور ان کے ساتھی پہاڑ کے اوپر پہنچ
گئے اور مقررہ اشارہ اور علامت دکھا کر دوسروں کو بھی اوپر
بلالیا۔ اس کے بلاوے پر پچیس مسلح جوان اور ایک نفر نواز کو
لیے ہوئے وہاں جمع ہو گئے۔ جب حملہ آور دستے کے آدی
اور پہنچ گئے تو..... نفر نواز نے نفیری بجا کی۔ اس کے ساتھ
یہ یہ بہادر دوڑتے ہوئے قلعے کی فصیل پر چڑھ گئے اور
محصورین پر اچانک حملہ کر دیا۔

نائب صوبہ دار حمید الدین خاں بھی رسیوں اور
زیروں کی مدد سے اوپر پہنچ گیا۔ محصورین اس اچانک حملے
سے ایسے حواس باختہ ہوئے کہ اپنا دفاع کرنا بھول گئے۔
حملہ آور فوج نے ان کو تلوار کی دھار پر رکھ لیا۔ اتنا خون بہا
کہ مرہٹے امان امان چلاتے ہوئے بھاگ گئے۔ بعض تو
پہاڑ سے گرے اور دم توڑ گئے۔ آہوں اور سکیوں کے
درمیان فتح کے نکل بننے لگے، شادیاں بجا جانے
لگے۔ مرہٹے بھاگ رہے تھے۔ جو نہیں بھاگ سکتے تھے،
ہتھیار پھینک کر عاجزی سے اطاعت قبول کرنے لگے۔
قلعہ تو رانا رسل سے نہیں، تلوار کی نوک پر فتح ہوا۔

☆☆☆

رانی بائی اپنے کمرے میں اس طرح ٹہل رہی تھی
جیسے جنگل کی آزاد شیرنی کو بچرے میں بند کر دیا گیا ہو اور
اسے ابھی بچرے میں رہنے کی عادت نہ پڑی ہو۔ یہ تاثر
بھی ملتا تھا کہ اسے کسی کاشت سے انتظار ہے۔ اسے واقعی
کسی کا انتظار تھا۔ یہ اس وقت مکمل کیا جب اسے دہتا جادو
کے آنے کی اطلاع ملی۔ اس کے آتے ہی تارا بائی اس پر
برس پڑی۔

”کیا اس لیے میں نے تمہیں مرہٹوں کا سردار بنایا تھا۔
کہ تم نے احمد آباد کو ہاتھ سے نکال دیا؟“

”یہ آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں۔ میں نے تو
مصالحت کے لیے ایسی شرط رکھی تھی کہ لڑے بغیر ہم اپنا
مقصود حاصل کر سکتے تھے۔ اب یہ ہماری بد قسمتی کہ مظلوم
کے بادشاہ نے ہماری تجویز کو رد کر دیا۔“

”تمہارا پلہ ہماری تھا۔ اس کے باوجود تم نے
مصالحت کے لیے وقت کیوں دیا؟“

”ہمیں یہ غلط فہمی ہوئی کہ شہزادہ اعظم شاہ لشکر میں پہنچ
چکا ہے۔“

”میری اطلاع کے مطابق وہ بعد میں وہاں پہنچا تھا۔“
”ایک سوار وہاں آیا تھا۔ اس سے ہمیں دھوکا
ہو گیا۔“

”قلعہ تو رانا بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ مرہٹوں
نے وہاں بھی بڑی دلکھائی۔“

”جب گھر کے لوگ ہی گھر کے بھیدی بن جائیں تو
بہی ہوتا ہے۔“

”نکل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“
”آپ نے چندا بانی کو یہاں سے فرار کر کے سخت
غلطی کی ہے۔“

”وہ عورت ذات کیا کر سکتی ہے؟“
”آپ یہ کیوں بھولتی ہیں کہ اس کے ساتھ ایک مرد
بھی ہے جس کا نام ہنوت رائے ہے۔“

”ہنوت رائے! تارا بانی یوں چونک گئی جیسے کوئی
بھولی ہوئی آفت یاد آگئی ہو۔“

”جی ہنوت رائے۔ قلعہ تو رنا کے محاصرے میں
اسے دیکھا گیا ہے۔ لشکر والوں کو وہی خفیہ راستوں سے
آگاہ کر رہا تھا ورنہ ان کا اوپر پہنچنا مشکل تھا۔“

”تم اب بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو۔ اس کا
مطلب تو صاف ظاہر ہے کہ جس ہنوت کو تم ڈھونڈتے پھر

”کنکیر“ پہنچے ہی مستقل ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔ واپسی کا ارادہ ترک کر دیا اور پہلے سے بنے ہوئے احاطے کو مضبوط کر کے اچھا خاصا قلعہ بنالیا۔ کافی سامان جنگ بھی جمع کر لیا اور چودہ پندرہ ہزار پیادوں کی فوج منظم کر لی۔

اس علاقے کے لوگوں کی تیر اندازی بہت مشہور تھی۔ ضروری ہندوستان کے بعد وہ دور وازدیک کی آبادیوں میں لوٹ مار مچانے لگا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو پہلے تو اسے خطوط لکھ کر باز رہنے کی تلقین کی لیکن جب وہ باز نہ آیا تو ایک فوج اس کی طرف بھیجی۔ آدی ہوشیار تھا۔ اس نے مقابلے پر آنے کے بجائے عاجزی کا مظاہرہ کیا اور بھاری مال و دولت دے کر فوج کو واپس کر دیا اور بدستور لوٹ مار میں مشغول رہا اور فاصل کو مستحکم کرنے، فوج جمع کرنے اور چھوٹی بڑی توپیں فراہم کر کے اپنی طاقت میں اضافہ کرنے لگا۔

بادشاہ مرہٹوں سے ششے میں مشغول تھا اس لیے اس طرف پوری توجہ نہ کر سکا۔

حالات نے ایک کروٹ اور بدلی۔ ہیمنٹ ایک کا بیٹا جتنا جو اس علاقے کا وارث تھا، بادشاہ کے حضور میں آ گیا۔ بادشاہ نے اسے منصب عطا کیا اور حق وراثت کی بنا پر اسے زمیندار کی کی سند عطا کر دی۔ اس نے سند حاصل کرتے ہی ایک فوج لی اور پرانا ایک چڑھلہ کر دیا تاکہ علاقہ اس سے خالی کرالے لیکن شکست کھا گیا اور قلعے میں داخل نہ ہو سکا۔ اس کے بعد بادشاہ نے شہزادہ محمد اعظم شاہ کا تقرر کیا۔ جب بادشاہی فوج نے اس کے اطراف کے سارے علاقے کو تاخت و تاراج کر دیا تو وہ شہزادے کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور نہایت عاجزی سے امان طلب کی اور بادشاہ کے حضور نذر کے سات لاکھ روپے کی پیشکش کی۔ شہزادے کو بھی نقد رقم پیش کی اور وعدے و وعید کر کے بادشاہی غضب سے نجات حاصل کر لی مگر شہزادے کے رخصت ہوتے ہی پھر وہی حرکتیں شروع کر دیں۔

اس کے بعد بھی اسے راہ راست پر لانے کے لیے کوششیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ قلعہ تورنا کی فتح کا وقت آ گیا۔

قلعہ تورنا کی فتح کے بعد جب بادشاہ قلعوں کی فتوحات کے لیے یونا کی طرف آیا ہوا تھا، ایک مقام پر چھاؤنی قائم کر دی اور یہاں تقریباً سات ماہ تک قیام کیا۔ اس اثنا میں اس ضلع کے دو تین غیر معروف قلعے بھی فتح کرنے تھے۔ یہاں رہ کر اس کے کانوں میں پرانا ایک کی فتنہ پرداز کی خبریں کثرت سے پڑنے لگیں۔ آخر بادشاہ

اعظم شاہ کے پاس ہے۔ چندا بائی بھی وہیں۔“

”میر ابھی یہی خیال ہے۔“

”میں ہنوت رائے کی بربادی دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہنوت رائے کو لابل نہیں چھوڑوں گا کہ وہ سازشیں کرتا پھرے۔ اسے اعظم شاہ کی نظروں سے گرا دوں گا۔“

”یہی ہم سب کے حق میں اچھا ہوگا۔ جال پھیلا دو۔“

دہنا جاو یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ اب مغل بادشاہ عالمگیری کی طرف بڑھے گا۔ اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ دوسری قوم کا علاقہ ہے لیکن اس وقت اگر ہم نے ان کا اٹھ دیا تو یہ اتحاد مغلوں کی آئندہ ناکامی کی صورت میں اٹھ کا لیکن اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ ہنوت رائے کا تذکرہ آیا۔ رانی بائی کا مزاج اتنا بگڑ گیا کہ وہ ہر تجویز کی مخالفت کر سکتی تھی۔ اس نے اس تذکرے کو چھوڑا اور قلعے میں اٹھ آیا۔

☆☆☆

ایک سال گزر گیا تھا۔ مرہٹوں کی اب کمر ٹوٹ گئی تھی۔ لوٹ مار کے چند واقعات کے سوا اب کوئی بڑا واقعہ نہیں پیش آیا تھا کہ چانک ایک نیا محاذ کھل گیا۔ اس پر لڑی طور پر قابو پانا ضروری تھا ورنہ ڈر تھا کہ مرہٹے اس سے لاہور اور دہلی کی طاقت ورجو ہوجائیں گے۔

برسوں پہلے بیدرتو قوم کا زمیندار ہیمنٹ ایک شاہی حملوں کا باز ہو کر امان طلب کر کے حاضر دربار ہو گیا تھا اور پھر اہل و عیال کو کنکیر کے مقام پر منتقل کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس کا بھیچیا پرانا ایک حاضر دربار ہو کر ملا۔ ہالایا تھا۔ اس نے مختلف فتوحات میں شاہی لشکر کو راہ رہ کر اعتبار پیدا کر لیا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کا شمار پیدا ہو گیا ہے تو اس نے بادشاہ سے عارضی جہازت چاہی۔

”اگر اجازت ہو تو اپنے آباؤ اجداد کے مسکن کنکیر میں آکر رہنا ساز و سامان درست کر لوں پھر جہاں بھی طلبی ہو وہاں جاؤں گا۔“

”یہ دل میں اس کا اعتبار قائم ہو گیا تھا لہذا اس کے دل میں کچھ اور تھا۔ اس نے

نے سارے کام چھوڑ کر پیش خانہ شاہی کو کنکیر کی طرف نکالنے کا حکم دیا۔

☆☆☆

اعظم شاہ نے ہنوت رائے کی خدمات کے صلے میں چندا بانی اور ہنوت رائے کو ایک شاندار رہائش گاہ عطا کر دی تھی۔ ہنوت رائے کو مہربوں سے خطرہ ضرور رہتا تھا لیکن اعظم شاہ کی پناہ میں آنے کے بعد وہ مطمئن بھی ہو گیا تھا۔ وہ چندا بانی کے ساتھ ہنسی خوشی رہ رہا تھا۔ اس کے گھر کے سامنے ہر وقت پہرا رہتا تھا۔ اس پہرے کے باوجود ایک دن ایک درویش آیا جس کے ہاتھ میں عصا تھا۔ ایک چادر اس کے کندھے پر پڑی ہوئی تھی۔

پہرے داروں نے اسے دروازے پر ہی روک دیا لیکن وہ بے ہمت تھا کہ ہنوت رائے سے مل کر جائے گا۔ آخر بہت حکمران کے بعد ہنوت رائے کو خبر پہنچائی گئی۔ ہنوت رائے جو گیوں اور فقیروں کا بہت معتقد تھا۔ اس نے جوسنا تو بے قرار ہو گیا اور اس فقیر کو طلب کر لیا۔

وہ فقیر، درویش یا جوگی جو کوئی بھی تھا، خاموشی سے آ کر بیٹھ گیا۔ پوچھنے پر بھی کچھ نہ بولا پھر خود ہی گویا ہوا۔

”مجھے میرے گردے نے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ میں تمہیں کیسا کاظم سکھا دوں تاکہ تمہاری امارت میں اضافہ ہو اور بھی کچھ علوم ہیں جو تمہیں سکھاؤں گا۔“

”میں پوچھ سکتا ہوں تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟“

”ہمدردی مجھے نہیں میرے گردے کو ہے۔ انہوں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ ان پر سب روشن ہے۔ وہ تو یہ بھی جانتے ہیں کہ تمہارے آنگن میں کھیلنے کے لیے کوئی بالک بھی نہیں ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“

”تو پھر تم یہ علم کیسے کے لیے تیار ہو؟“

”میرے فائدے کی بات ہے تو میں کیوں تیار نہ ہوں گا۔“

”تمہارے پاس کچھ اشرفیاں اور سونا ہے؟“

”کتنی اشرفیاں اور سونا درکار ہوگا۔“

”یہ تو تمہارے اوپر ہے۔ جتنا مال دو گے اس کا پچاس گنا بنادوں گا اور تمہیں بھی سکھا دوں گا۔ اکیلے میں بناتے رہتا۔ خبردار اپنی بوی کو کچھ نہ بتانا۔ عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔ اس راز کو راز نہیں رہنے دیں گی۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ میں اس پر ظاہر نہیں ہوں دوں گا۔“

”تو پھر شک ہے، ہم کل سے یہ کام شروع کر دیں گے۔ ایک چھوٹی دیک منگوا کر کل کی چھت پر پہنچا دو۔ یہ کام وہیں مناسب رہے گا۔“ ہنوت رائے نے دیک چھت پر

پہنچا دی اور فقیر کے رہنے کا بندوبست کر دیا جہاں اسے رات گزارنی تھی۔ دوسرے دن اس نے اشرفیاں اور سونا طلب کیا اور دیک میں ڈال دیا۔ اسی کے ہم وزن تانبے کے پیسے اور ٹکڑے اس دیک میں ڈال دیے اور بھی کچھ سامان اور مسالے منگوا لیے۔ ہر چیز اس کے اشارے پر حاضر کر دی گئی۔ اس نے تمام چیزیں دیک میں ڈال دیں اور دیک کا منہ مٹی سے بند کر دیا اور ایک ٹکڑا کھود کر بہت سے کوئلے دیک کے ساتھ دفن کر دیے۔ مغرب سے پہلے آگ جلائی گئی۔ جب رات کا ایک حصہ گزر گیا تو اس دیک سے بڑی ہیٹ ناک آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ جیلہ باز درویش نہایت گھبراہٹ کے عالم میں ہاتھ ملنے اور افسوس کرنے لگا۔

”خیر تو ہے، آپ اتنے پریشان کیوں ہو گئے اور یہ دیک سے آوازیں کیسی آ رہی ہیں۔“

”اس عمل میں کوئی فرق رہ گیا ہے۔“

”اب کیا ہوگا؟“

”اب اس کا توڑ یہی ہے کہ اس پر کسی کم سن لڑکے کا خون چھڑکا جائے۔“

ہنوت رائے یہ سنتے ہی گھبرا گیا۔ ”اس وقت یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی لڑکا مل جائے اور اگر مل بھی جائے تو میں اسے ہرگز قتل نہیں کروں گا۔“

”تمہیں بچ لانے کو کون کہہ رہا ہے۔ بچ میں لاؤں گا لیکن اس کے لیے کچھ رقم درکار ہوگی۔“ ہنوت رائے نے کچھ زر سرخ نکال کر فقیر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے رقم جیب میں ڈالی اور فقیر کو پچھلے دروازے سے باہر نکال دیا۔ کچھ دیر بعد وہ فقیر ہانپتا کانپتا ایک بچے کو لے کر آ گیا۔ اس عالم لے

اس معصوم کو دیک پر ذبح کر دیا۔ جب اس کے خون کے قطرے آگ پر پڑے تو دیک سے آوازیں نکلنا بند ہو گئیں۔ اس نے بچے کی لاش کو کوڑے کرکٹ میں چھپا دیا کہ کل اسے ٹھکانے لگا دے گا۔ فقیر نے کہا۔ ”اب سب شک ہو گیا۔ صبح تک دیک سونے سے بھر جائے گی۔“ وہ دونوں

نیچے اتر آئے۔ ہنوت رائے اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ ابھی دن پوری طرح نکلا نہیں تھا کہ کوئوال کے آدلی

نقارہ بجاتے ہوئے دروازے پر آ گئے۔ ہنوت رائے نے کوئوال کے آدمیوں سے آنے کا سبب پوچھا۔

”تمہارے پاس جو فقیر ٹھہرا ہوا ہے اسے ہمارے

اکتوبر 2017ء

اس پر غنودگی طاری تھی۔ کوئی اسے آواز دے رہا تھا۔ اس نے ہمت کر کے آنکھ کھولی۔ چند باہی اس کے سر ہانے کھڑی تھی۔

”سرکاری کارندے آئے تھے۔ شہزادہ حضور نے آپ کو طلب کیا ہے۔ شاہی فوجیں کسی مہم پر جانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ شاید اسی لیے بلائے آئے ہوں۔“

”تم میری حالت دیکھ رہی ہو۔ میں کس طرح جاسکتا ہوں۔“

”میں نے آپ کی بیماری کا کھہ دیا تھا لیکن ہمت کر کے آپ چلے جائیں تو اچھا ہے۔“

”میرے لیے پاکی کا بندوبست کرو۔ پیدل تو میں نہیں جاسکتا۔“

چند باہی اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ چلا گیا پاکی کا بندوبست کرنے کی بھی لیکن جاتے ہی پلٹ آئی۔

”کوئی فقیر باہر کھڑا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

پہرے دار اجازت مانگ رہے ہیں۔

”کہاں ہے وہ؟ اسے جلدی میرے پاس بھیجو۔“

”اس وقت ٹال دیتی ہوں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر بھی آجائے گا۔“

”نہیں، یہ غضب مت کرنا۔ وہ میرے لیے بہت اہم ہے۔ اسے جلدی بلاؤ۔“

”آخر یہ ہے کون؟“

”تمہیں اس سے کیا سروکار۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ اسے جلدی بلاؤ۔“ وہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چند باہی چلی گئی۔

چند باہی کے چلے جانے کے کچھ دیر بعد وہ فقیر کمرے میں داخل ہوا اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ ہنونت رائے کے دل میں کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے ہونٹ سل گئے ہیں۔ آخر اس خاموشی کو فقیر نے توڑا۔

”تمہیں یقیناً یہ دکھ ہے کہ تمہاری دولت ضائع ہو گئی۔“

”نہیں۔ مجھے یہ دکھ ہے کہ میں نے تم پر اعتبار کیا اور تم نے مجھے دھوکا دیا۔“

”میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا۔ تمہاری دی ہوئی اشرفیوں سے دکانداروں کا سونا بن چکا ہے اور محفوظ ہے۔“

”میں نے دیگ دیکھ لی ہے۔ اس میں تانبے کے کلروں کے سوا کچھ نہیں۔“

”تمہیں دیگ چاہیے تھی یا سونا؟“

”لیونکہ وہ ایک بچہ اٹھا کر لے آیا ہے۔ اس کے والدین تالش کر رہے ہیں۔“ ہنونت رائے یہ سن کر کھلم کھلا ہنسا۔ خوشامد وراثت پر اتر آیا۔ رشوت کی پیشکش بھی کی اس طرح معاملہ دب جائے لیکن فقیر باہر نکل آیا اور ہنونت رائے کو ڈانٹنے لگا۔

”تم کیوں رشوت دے کر گناہ گار ہوتے ہو۔ انہیں ادا نہ ملے گی۔ سزا بھی نہ دو اور مجھے ان کے حوالے کر دو۔“

ہنونت رائے اسے روکنا رہ گیا لیکن اس نے خود کو باہر کے حوالے کر دیا۔

”جہاں لے جانا چاہتے ہو لے جاؤ۔ میں جواب دوں گا۔“ سیاہی اس فقیر کو لے کر چلتے بنے۔

فقیر کے چلے جانے کے بعد ہنونت رائے کو تو الی گما کہ جا کر دیکھے تو ہنسی کہ فقیر پر کیا گزری۔ وہاں جا کر ہنونت رائے یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نہ کوئی فریادی نظر آیا نہ ظلم۔ ابھی کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعے کا وہاں کوئی کوٹم تک نہیں تھا۔ وہاں کوئی یہ ماننے کو بھی تیار نہیں تھا۔

الوتال کے آدی ہنونت رائے کی ڈیوڑھی پر گئے تھے۔ ہنونت رائے حیران پریشان وہاں چلا گیا۔ راستے بھر وہ ہناتا رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ جادو تھا شہیدہ تھا یا کیا تھا۔

”پتے سوچتے دکھ گمراہ کیا۔ گھر پہنچتے ہی اسے دیگ کا مال آیا۔ اس بچے کا خیال آیا جس کا خون دیگ پر چھڑکا گیا تھا اور لاش کوڑے کرکٹ میں چھپادی گئی تھی۔ وہ سیدھا“

”ہاں ہاں۔ کوئلے ہٹا کر دیگ نکالی۔ دیگ میں تانبے کے کلرے اور کلروں پڑے ہوئے تھے۔ سونا اور اشرفیاں“

”ہاں ہاں۔ ہنونت رائے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ“

”خود فقیر شہیدہ باز تھا۔ مجھے بے وقوف بنا کر میری ساری دولت لوٹ کر چلتا بنا۔“

”ہات ہی ایسی تھی کہ کسی کو بتا نہیں سکتا تھا۔ چند باہی“

”لوٹا اسے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دولت جانے کے لیے اسے بیمار کر دیا۔ دو تین دن تک شہزادے کو سلام“

”اس لیے نہ جاسکا۔ کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا اس لیے کسی کو کچھ بھی نہیں کی۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے سوچتا رہتا تھا“

”اوہ اوہ! کون تھا۔ کوٹالی سے آنے والے آدی کون تھا۔“

”اوہ اوہ! حاکس کے ساتھ چلا گیا اور کہاں چلا گیا۔ یہ“

”الوتال ہی تھی جس نے مجھے برباد کر دیا۔ وہ سوچتا تھا“

بندھا ہوا تھا جس پر سوار ہو کر وہ درویش آیا تھا۔ وہ درویش کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ درویش ایک ماہر گھڑ سوار ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بظاہر درویش نظر آنے والا محض گھوڑے کو نہایت مہارت سے دوڑا رہا تھا۔ اس تبدیلی پر اس کے کان کھڑے ہوئے تھے لیکن کیا کر سکتا تھا۔ خاموش بٹھا رہا۔

شہر سے نکل کر چند کوس چلنے کے بعد جنگل شروع ہو گیا۔ ہنوت رائے کے لیے یہ راستہ اجنبی نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس جنگل میں ذرا آگے جا کر مرہٹوں کا ایک قلعہ ہے جو اب ویران پڑا ہے۔ شاید درویش کی منزل وہی ہو کیونکہ وہ کہہ چکا تھا کہ کچھ مرہٹہ سردار اس سے ملنے کے لیے بے قرار ہیں۔ اس کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ وہ اس قلعے کے سامنے جا کر رک گیا اور ایک مخصوص آواز نکالی۔ اس آواز کے جواب میں دوسری جانب سے بھی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی چار مرہٹہ سردار قلعے سے باہر آ گئے۔ یہ چاروں ہنوت رائے کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہ ان کے ناموں سے واقف تھا۔ ان چاروں نے بڑے تپاک سے ہنوت رائے کو گلے لگایا۔ ہنوت رائے کا دل اس وقت بڑا ہو گیا کہ یہ اہم ترین سردار اس کے زیر نگرانی رہیں گے اور وہ ان کے لشکر کو ساتھ لے کر تارابیائی کا تختہ الٹ سکتا ہے۔ اس کی بیوی چندا بائی، رام راجا کی بیوہ ہونے کی حیثیت سے مرہٹوں کی سردار اعلیٰ ہوئی۔ ابھی اسے خوش ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس نے دہنا جادو کو قلعے سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ کیا وہ بھی تارابیائی کے خلاف ہو گیا ہے؟ ہنوت رائے ایک لمحے کو خوش ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ دہنا جادو کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ دیکھ کر اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

”سو بھان! لے آئے ہنوت رائے کو۔“ دہنا جادو کی آواز گونجی۔

سو بھان کے نام پر ہنوت رائے نے درویش کی طرف چونک کر دیکھا اور اپنی عقل پر ماتم کرنے لگا۔ سو بھان کو وہ جانتا تھا لیکن اس نے حلیہ ایسا تبدیل کر لیا تھا کہ وہ اسے پہچان نہ سکا۔ اب سب کچھ اس کی سمجھ میں آ چکا تھا۔ اسے لالچ کے جال میں پھنسا کر اغوا کر لیا گیا تھا۔ اسے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا لیکن آدمی جی دار تھا، آگے بڑھا اور سو بھان کے منہ پر ایک زناتے وار تھپڑ رسید کر دیا اور پھر دوسرے ہی لمحے سب نے مل کر اسے رسیوں سے جکڑ دیا اور گھوڑے کی پیٹھ پر لا دیا۔

”مجھے سونا درکار ہے۔“
”تمہاری کسی سے دشمنی ہے؟“
”تارابیائی میری سب سے بڑی دشمن ہے مگر اس معاملے سے دشمنی کا کیا تعلق ہے؟“

”ہے ہنوت رائے ہے۔ تارابیائی نے کئی مرہٹہ سرداروں کو تمہارے خلاف کر دیا ہے۔ یہ اسی دشمنی کی وجہ ہے کہ تمہاری دولت بھی تم سے دشمنی کر گئی لیکن میرے قابو میں ہے۔ مخالف سردار بھی تم سے معافی مانگتے اور تمہارے ساتھ مل کر تارابیائی کا اقتدار ختم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اب چندا بائی رام راجا کی جانشین ہوگی۔“

”یہ سب کچھ میری سمجھ سے تو باہر ہے۔“
”ابھی یہ سب کچھ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ بس تم میرے ساتھ چلو۔ تمہاری دولت تمہاری ہنوت ہے۔“

”مجھے کہاں جانا ہوگا؟“
”کہیں دور نہیں، احمد آباد سے باہر ایک جنگل میں۔“
”یہاں کیوں نہیں؟“

”تم کیا سمجھتے ہو، مرہٹہ سردار یہاں آ کر تم سے ملیں گے۔ وہ سب تم سے مل کر تارابیائی کو راستے سے ہٹائیں گے اور تم تمام مرہٹہ سرداروں کی راہنمائی کرو گے۔ تمہاری راہنمائی میں ان قلعوں کو دوبارہ حاصل کیا جائے گا جو ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔“
”میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں لیکن میں سخت بیمار ہوں۔“

”اب تم بیمار نہیں ہو۔“
ہنوت رائے نے واقعی محسوس کیا کہ اس کے بدن میں جان آ گئی ہے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
”میں تیار ہوں۔“

”واپسی میں سونا لے کر آنا ہے۔ کیسے لاؤ گے؟“
”میں نے پالکی منگوائی ہے۔ دو کے بجائے چار مزدور لگائوں گا۔ سونا آ جائے گا۔“

”مزدور بھروسے کے ہیں؟“
”مزدور بے زبان ہوتے ہیں۔ انہیں کسی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔“

”پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔ اس وقت تم میرے ساتھ چلو۔ واپسی میں کرائے کی کوئی گاڑی کر لیتا۔ کسی کو معلوم ہی نہیں ہوگا کہاں گئے تھے اور کیا لے کر آ گئے۔“
ہنوت رائے حیران پریشان اس کے ساتھ چل پڑا۔ سوچ رہا تھا کہ شاید پیدل جانا پڑے لیکن باہر وہ گھوڑا

”جلدی چلو۔ تاربابی کے لیے اس سے بڑی خوش
نہی اور کہا ہوتی ہے۔“

☆☆☆

شاہی افواج قلعہ کلکیر کی طرف رواں دواں تھی۔ اس
شاہی افواج کی صوبہ داری پر فیروز جنگ کا بیٹا بیج خاں مامور
تھا۔ اظہار کے لواحق پر گئے اسی کی جاگیر میں تھے مگر ان پر گنوں
پر پانا یک کی تاخت و تاراج کی وجہ سے اس کا عمل دخل
نہیں رہا تھا۔ بادشاہ نے اسے بھی طلب کر لیا۔ دوسرے فوج
داروں کے نام بھی طلبی کے احکام صادر ہوئے۔ شہزادہ اعظم
شاہ بھی اپنے لشکر کے ساتھ روانہ ہوا لیکن ہنوت رائے اس میں
شامل نہیں تھا۔ اعظم شاہ نے اسے مفروضہ قرار دے کر اس کی
تلاش میں گرز بردار روانہ کر دیے تھے۔

قلعے کے اطراف لشکر جمع ہو گیا۔ خود عالمگیر بادشاہ نے
قلعے سے ایک کوس پر اپنی خیمہ گاہ قائم کر دی۔

دونوں طرف سے تیاریاں ہونے لگیں۔ شاہی لشکر نے
قلعے پر فوج کشی کے لیے تیاریاں کیں اور پریارج اور فصیل کو
مستحکم کر کے اپنی فوج کو اکٹھا کرنے میں مشغول ہو گیا۔

پریانا یک نے اپنی مدد کے لیے تاربابی کو بھی خطوط
لکھے تھے لیکن مرہٹوں کی آمد سے پہلے ہی (جن سے اس کا
اتحاد ہو چکا تھا) چند ہزار سواروں اور توپ خانہ لے کر قلعے
سے نکلا اور بادشاہی لشکر کے مقابلے پر آ گیا۔ دونوں طرف
سے توپوں کے دہانے کھل گئے۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی۔
طرفین سے کافی آدمی مارے گئے۔

اس روز طلوع آفتاب کے وقت شاہی فوج کے چند
امیر طلبہ گروہ پر نکلے ہوئے تھے۔ وہ ایک ٹیکری کے
قریب سے گزر رہے۔ یہ ٹیکری اسی آباد قلعے کا ایک حصہ تھی
اور اس وقت وہاں کوئی محافظ نہیں تھا۔ ان بہادروں نے
بڑی تیزی سے حملہ کیا اور ٹیکری پر قبضہ کر لیا اور وہاں مورچے
قائم کر لیے۔ اسی وقت قلعے کے اندر اور باہر سے دشمن کی
فوجیں سیلاب کی طرح بڑھیں اور بہادروں کے قدم اکھاڑ
دے مگر اسی وقت ملک پہنچ گئی اور جم کر لڑائی ہوئی اور
بالآخر اس ٹیکری پر قبضہ ہو گیا۔

اب قلعہ فتح کرنا آسان ہو گیا تھا لیکن اسی وقت
مرہٹوں کے ایک زبردست لشکر کے آنے کی اطلاع ملی۔

دوسرے دن دہتا جادو دو تین سرداروں کے ساتھ
آٹھ نو ہزار سوار اور بے حد دھار پیادہ فوج لے کر نمودار ہوا۔
یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ دہتا جادو اور دوسرے
سرداروں نے اس قلعے کو محفوظ سمجھ کر اپنے اہل و عیال اور

مال و اسباب کو یہاں پہنچا دیا تھا۔ اب ان کو قلعے سے نکالنے
اور ملک کا احسان جاننے کے لیے پہنچ گیا تھا۔ جب پہنچ ہی
گیا تھا تو حق اتحاد تو ادا کرنا تھا۔ آتے ہی بادشاہی فوج کے
سرداروں کو اپنی طرف متوجہ کر کے لڑائی شروع کر دی۔ اس
لڑائی کی آڑ لے کر دہتا جادو نے دو تین ہزار سواروں کو قلعے
کے قریب پہنچا دیا۔ قلعے سے مرہٹوں کے اہل و عیال قلعے کی
پیدل فوج کے ساتھ باہر نکل آئے۔ مرہٹے ان کو تیز رفتار
ٹھوڑوں پر سوار کر کے وہاں سے نکال لے گئے۔

مرہٹوں کی اصل غرض پوری ہو گئی تھی۔ ان کے افراد
صحیح سلامت نکل آئے تھے۔ اب وہ بادشاہی فوج سے
بڑی جنگ کر کے خود کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔

دہتا جادو پریانا یک کے پاس پہنچ گیا۔
”ہم دونوں متحد ہو کر بھی شاہی فوجوں کا مقابلہ نہیں
کر سکتے لہذا مصلحت اسی میں ہے کہ تم اطاعت کر لو اور
موروثی ملک کو بچا لو۔“

پریانا یک غرور کے نشے میں مست تھا۔ اس نے اس
کی بات نہیں مانی۔

”تمہارا مشورہ یقیناً میری بھلائی کے لیے ہوگا لیکن
یہ قبل از وقت ہے۔ میں اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں جبکہ
بہادر مرہٹ میرے ساتھ ہیں۔“
”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میرے ساتھ جو
دوسرے سردار ہیں، وہ نہیں مانیں گے اور مجھے مجبوراً ان کا
ساتھ دینا پڑے گا۔“

”اس کی تم فکر مت کرو۔ میں انہیں منالوں گا۔“
پریانا یک نے بڑی ہوشیاری سے ان کے پاس نقد
رقم اور کھانے پینے کی چیزیں سیافنت کے طور پر بھجوائیں اور
مدد زانہ کا خرچ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد بھی منت ساجت
سے مرہٹوں کو ساتھ دینے پر آمادہ کرتا رہا۔

مرہٹوں نے بھی سوچا کہ مفت کا مال مل رہا ہے۔ ہمارا
کیا جاتا ہے، پڑے رہتے ہیں۔

لاچی مرہٹے لشکر و لشکر آتے رہے۔ جہز ہیں ہوتی
رہیں۔ لوگ شہید اور زخمی ہوتے رہے۔ جب پریانا یک
عاجز آ گیا تو اس کے شیطانی دماغ نے ایک سازش تیار کی۔
اس کی نظر تاجر عبدالغنی کشمیری پر گئی۔ یہ وہ شخص تھا جس کا
تجارتی سلسلہ مرہٹوں کے لشکر سے بادشاہی لشکر تک پھیلا ہوا
تھا۔ یہ شخص دونوں لشکروں تک سامان تجارت پہنچایا کرتا
تھا۔ پریا سے بھی اس کے روابط تھے۔ اسی خرید و فروخت
کے سلسلے میں اس کی آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ ایک دن

جو تاجر عبدالغنی قلعے میں آیا تو منصوبے کے مطابق پر یا نے اسے ایک خط دیا کہ یہ خط واقعہ نگار ہدایت کیش کو جا کر دے۔ اس خط میں ندامت کا اظہار کر کے مصالحت کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ عبدالغنی قلعے سے نیچے آیا اور وہ پرچہ واقعہ نگار کے حوالے کر دیا۔

”میں ایسے ہی چکر لگاتے ہوئے قلعے کے نیچے چلا گیا تھا اور وہاں نماز پڑھنے لگا تھا کہ قلعے والے مجھے گرفتار کر کے اندر لے گئے۔ پر یا نے حالات دریافت کرنے کے بعد یہ کاغذ مجھے دیا کہ آپ کو پہنچا دوں۔“ واقعہ نگار نے یہ پرچہ بادشاہ کے پاس پہنچا دیا۔ بادشاہ نے پرچہ دیکھ کر حکم دیا کہ پر یا سے کھواہی شرائط پیش کرے۔ تاجر قلعے کے اندر گیا اور شرائط لے کر آ گیا۔

”میرا بھائی سوم شکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گا۔ اسے خلعت، گھوڑا اور ہزار منصب سے نوازا جائے اور اسے یرغمالی کے طور پر رکھ لیا جائے اور اپنا قلعہ دار مقرب کر کے چند آدمیوں کے ساتھ قلعے میں بھیج دو۔ وہ یہاں آ کر بندوبست سنبھال لے۔ میرے قلعہ دار کو قلعے سے نکلنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت دے دی جائے۔“ بادشاہ نے یہ شرائط قبول کر لیں اور تمام کام حسب شرائط انجام دے دیے۔

بادشاہ کے نمائندے کے قلعے میں داخل ہونے کے بعد شادیانے بجائے گئے۔ اس کے ساتھ ہی قلعے والے بادشاہی قلعہ دار کی تسلی کے لیے ناکارہ سامان اور عورتوں کو باہر لے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ سہ پہر تک قلعہ دار کو پر یا کے حاضر ہونے کی اطلاعات دیتے رہے مگر شام ہوتے ہوتے یہ اطلاع دی کہ پر یا کو سخت بخار چڑھ گیا ہے۔ تیسرے دن یہ خبر اڑادی کہ پر یا کا بخار ہذیان میں تبدیل ہو گیا ہے اور وہ اول فول بک رہا ہے۔ چوتھے دن یہ خبر اڑادی گئی کہ پر یا نے خودکشی کر لی ہے یا وہ مرہٹوں کے لشکر میں چلا گیا۔ بہر حال وہ قلعے میں نہیں ہے۔ اس کی ماں سب کو دکھانے کے لیے آہ و زاری کرنے لگی۔ پھر اس نے بادشاہ کے پاس درخواست بھیجی کہ بیٹے کے بارے میں تحقیق ہونے تک مجھے قلعے میں رہنے دیا جائے۔ تحقیق ہونے کے بعد وہ قلعہ خالی کر دے گی۔ میرے چھوٹے بیٹے سوم شکر کو جو آپ کے پاس یرغمال ہے، قلعے میں بھیج دیں کیونکہ جہاں جہاں خزانہ دفن ہے، اس کا علم سوم شکر کے سوا کسی کو نہیں۔ وہ آپ کے بھیجے ہوئے قلعہ دار کو بتادے گا اور میں باقی مال و اسباب کے ساتھ قلعے سے نکل جاؤں گی۔

بادشاہ اس کرد فریب میں آ گیا اور سوم شکر کو قلعے میں ماں کے پاس بھیج دیا۔ جب سوم شکر واپس آ گیا تو کچھ دن تو ٹال مٹول کرتا رہا اور پھر شاہی قلعہ دار کو قید کر لیا۔ بادشاہ سے یہ حال چھپا نہ رہا۔ مگر اس نے نہایت تحمل سے کام لیا اور کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اسی اثنا میں چند بہادر امراء کے آنے کی اطلاع ملی جو اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ آ رہے تھے۔

اس دوران بہادروں کے لشکر پہنچ گئے۔ جلدی اتنی تھی کہ تسلیات بجالائے بغیر محاذ پر پہنچ گئے۔ پہلے وہ اس مقام پر پہنچے جہاں پر یا کے آدمیوں نے شاہی لشکر کو محسوس کر رکھا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی انہوں نے دشمن پر حملہ کر دیا۔ تازہ دم فوج آتی رہی اور دشمن پر حملے کرتی رہی۔

یہ حملے جاری تھے کہ عقب سے گرداڑی نظر آئی۔ خبر اڑ گئی کہ مرہٹوں کی فوج قلعہ داروں کی مدد کو آ گئی۔ ایک امیر نصرت جنگ اس خبر کو سن کر اپنی فوج کو مرہٹوں کو روکنے کے لیے نکال لے گیا۔ بس اتنی مہلت بہت تھی۔ دشمن نے اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے قدم جما لیے۔ پھر ایسی جنگ ہوئی کہ طرفین کے ہزاروں لوگ کام آ گئے۔ چار پانچ دن تک یہ معرکہ کارزار گرم رہا۔

شاہی لشکر نے چند کنوؤں اور باؤلیوں پر جن سے دشمن کے آدمیوں اور جانوروں کو پانی پہنچتا تھا، قبضہ کر لیا۔ اب تک بادشاہی لشکر پیاسا مر رہا تھا اب دشمن کی فوج پانی کے لیے ترے لگی۔

دشمن کا زور کچھ ٹوٹا تو شاہی لشکر نے عمارتی ٹکڑیاں اور درختوں کے تنے کاٹ کاٹ کر جمع کیے اور ان کی آڑ لے کر آگے بڑھتے چلے گئے۔ چوٹی کی چال چلتے چلتے شیر بن گئے اور ان کے مورچے قلعے کی فصیل کے نیچے تک پہنچ گئے۔

میدان جنگ کا حال دیکھ کر آرزوئے شہادت لیے بادشاہ بھی میدان جنگ میں پہنچ گیا۔ یہ ایک غیر معمولی صورت حال تھی۔ بادشاہ کی موجودگی میں جہاں لشکر شاہی میں نیا دلولہ آ گیا، وہیں دشمن پر لرزہ طاری ہو گیا۔

بادشاہ کی سواری گولہ باری کی زد میں پہنچ چکی تھی۔ وہ بڑی پامردی سے فوجوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

شاہی لشکر میں ایسا جوش تھا کہ جانوں کی پروا کیے بغیر قلعے پر چڑھ دوڑے۔ محصورین بھی غافل نہیں تھے۔ انہوں نے بھی اندر اور باہر سے لشکر پر حملہ کر دیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ طرفین میں سے ایک آدمی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ بید وقوم کی بہادری کا سکہ بیٹھا ہوا تھا لیکن شاہی لشکر کی جی داری بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ شاہی سواروں کو گھوڑوں کے ساتھ اوپر

☆☆☆

تارابائی کسی زخمی ناگن کی طرح پھنکار رہی تھی۔ دہتا جادو فاتحانہ انداز میں بھل رہا تھا۔ ہنوت رائے کسی مجرم کی طرح زمین پر دوڑا نو بیٹھا تھا۔ پھر اچانک تارابائی نے دہتا جادو کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔ تارابائی ہنوت رائے سے مخاطب ہوئی۔

”ہنوت رائے!“ تارابائی زور سے دھاڑی۔

”جی رانی جی۔“

”میں نے تجھ سے کہا تھا، میں تجھ سے پریم کرتی ہوں۔“

”ہاں کہا تو تھا۔“

”کہا تھا تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ مرہٹہ عورت جب کسی سے پریم کا اقرار کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے خود کو برہنہ کر دیا۔ میں نے تیرے سامنے خود کو برہنہ کر دیا۔ اب میں تجھے یہ کہنے کے لیے زندہ نہیں چھوڑوں گی کہ تو نے مجھے برہنہ دیکھا ہے۔“

”رانی جی! میں قسم کھاتا ہوں کہ کسی کے سامنے یہ ذکر نہیں کروں گا کہ آپ نے مجھ سے یہ بات کہی تھی۔“

”تو نہ کہہ مگر جب تجھے دیکھوں گی تو مجھے لگے گا تیرا رُواں رُواں چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں بھی آپ کے سامنے نہیں آؤں گا۔“

”یہی تو میں کرنے جا رہی ہوں کہ تو کبھی میرے سامنے نہ آئے۔“

”رانی جی! میں آپ سے رحم کی بھیک ماننا ہوں۔“

”رحم کی بھیک اس چندابائی سے مانگو جسے تم نے میری جگہ دی ہے۔ اسے آواز دو کہ مرہٹہ سرداروں کو لے کر میرے مقابلے پر آئے۔“

”اے تو معلوم بھی نہیں کہ میں کہاں ہوں۔“

”اے یہ تو معلوم ہوگا کہ تم اسے لے کر بھاگ گئے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ بھاگنے والی اور بھاگنے والے کی سزا کیا ہے۔“

”میں اس کے جواب میں یہی کہوں گا کہ ہم دونوں پر رحم کرو۔“

”میں اتنا رحم ضرور کروں گی کہ تمہیں آسان موت دوں۔“

تارابائی نے کہا اور اسے تنہا چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔ غالباً دہتا جادو سے مشورے کے لیے گئی تھی۔ اس کے ٹپکے ہی ہنوت رائے نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اسے اپنے مطلب کی چیز نظر آگئی۔ میز پر ایک خنجر رکھا ہوا

ہاں! میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ گھوڑوں سے کود پڑے اور اٹھل ہو کر ان پر پورش کر دی۔ آخر کار فروس کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ لشکریوں نے ایک کوس سے زیادہ فاصلے تک ان کا تعاقب کیا۔ جو میدان جنگ میں بچ گئے تھے وہ بھاگتے ہوئے مارے گئے یا زخمی ہوئے۔

قلعہ نکلیں اب اورنگ زیب کے قدموں میں تھا۔ بہادروں نے آگے بڑھ کر پہاڑ کے اوپر قلعے کے دروازے کے قریب اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔

امیدیں ختم ہوئیں تو بچاؤ کی فکر ہوئی۔ قلعے والوں نے قلعے کے دروازے اور اطراف میں بندوبست مقرر کر دیے تاکہ کچھ دیر کے لیے لشکر کی پیش قدمی رک جائے اور انہیں فرار کا موقع مل جائے۔ جلدی جلدی زیورات سیٹھے، بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور خفیہ راستوں سے باہر نکل گئے۔ ان لوگوں نے نکلنے وقت مندر اور قلعے کی اکثر عمارتوں کو آگ لگا دی۔

جب آگ کے شعلے بلند ہوئے تو ظاہر ہو گیا کہ قلعے والے فرار ہو گئے ہیں لیکن آگ کی شدت انہیں اندر جانے سے روک رہی تھی۔ جب آگ کی شدت میں کچھ کمی آئی تو امیر داؤد خاں ایک جمیعت کو لے کر آگے بڑھے اور اوپر چڑھ گئے۔ قلعہ خالی پڑا تھا۔ چند زخمی جو بھاگ نہیں سکے تھے، ادھر ادھر پڑے تڑپ رہے تھے۔

داؤد خاں نے ایک زخمی کی گردن پر تلوار کی نوک رکھ کر پوچھا۔ ”شاہی قلعہ دار تختہم خاں کہاں ہے؟“

”آپ اگر وعدہ کریں کہ مجھے بچالیں گے تو میں بتاتا ہوں۔“ اس زخمی نے کہا۔

”ہم اتنے ظالم نہیں کہ تمہیں یہاں مرنے کے لیے چھوڑ دیں۔ بس یہ بتاؤ کہ تختہم خاں کہاں ہے، زندہ ہے یا شعلوں کی نذر ہو گیا۔“

زخمی نے ایک عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ابھی اس عمارت تک آگ نہیں پہنچی تھی اگر ذرا بھی دیر ہو جاتی تو تختہم خاں جل کر خاک ہو جاتا۔ سپاہی اندر داخل ہوئے تو تختہم خاں وہاں موجود تھا لیکن اس حال میں کہ اس کا ایک پاؤں زنجیر کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ کسی سپاہی کی تلوار کے ایک ہی وارے نے زنجیر کاٹ دی اور وہ ادھوری زنجیر لیے باہر نکل آیا۔

اسے اور چند زنجیروں کو برقت بچالیا گیا۔ قلعے کی فتح اور وہاں کے زمینداروں کو تسلی دینے اور اپنی وفاداری کی تحریر لینے کے بعد برسات کا موسم بسر کرنے اور فوج کے آرام کے لیے قصبہ دیوگانو کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ قصبہ دریائے کشنا کے کنارے واقع تھا۔

کر رمضان کی وجہ سے چالیس دن کے قیام کی منظوری دے دی۔

رمضان کا مہینا گزرا تو اس نے لشکر کو قلعہ بخشہ کی تسخیر کے لیے روانہ کیا اور خود احمد نگر کی طرف کوچ کر گیا۔ یہیں اسے قلعہ بخشہ کی فتح کی خبر ملی۔

شہزادہ اعظم شاہ جو احمد آباد میں تھیں تھا، باپ کی بیماری کی خبر سن کر پریشان ہو گیا۔ اس نے عرضداشت بھیجی کہ وہ بیماری کا سن کر پریشان ہو گیا ہے اور اس نے حضور میں پہنچنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ مجھے بھی احمد آباد کی ہوا موافق نہیں آرہی ہے۔

بادشاہ اس کی نیت کو سمجھ گیا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا ہے کہ میں اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں وہ اس وقت میرے قریب رہنا چاہتا ہے تاکہ تخت پر قبضہ کر سکے۔

بادشاہ نے اس کی عرضی کے جواب میں لکھا۔ ”انسان کو ہر جگہ کی آب و ہوا موافق آ جاتی ہے، جو ہوائے نفس۔“ اس تبلیغ جملے میں بہت کچھ چھپا ہوا تھا لیکن اعظم شاہ اپنی ضد پر ڈٹا رہا اور عرضی پر عرضی بھیجتا رہا۔ جب بادشاہ بہت تنگ آ گیا تو اس نے شہزادے کو صوبہ مالوہ پر تبدیل کر دیا۔ حکم نامہ اتنا سخت تھا کہ اسے قلعہ کرنا پڑی۔

شہزادے نے ایمین جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اس تیاری میں وہ ہنوت رائے یا چندا بانی کو بھول ہی گیا۔

چندا بانی نے سنا کہ شہزادہ مالوہ جا رہا ہے تو وہ گھبرا گئی۔ اس نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ وہ شہزادے سے مل کر اپنی پٹا سنا لے لیکن اسے نہیں ملنے دیا گیا۔ شہزادہ مالوہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

چندا بانی کی عجیب دورا ہے پر کھڑی تھی۔ مرہٹوں کے پاس جاتی۔۔۔ تو ماری جاتی۔ اعظم شاہ کی پناہ بھی چھن گئی تھی۔

شہزادے کے رخصت ہوتے ہی اس سے اس کا مکان خالی کر لیا گیا۔ وہ سڑک پر کھڑی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کہاں جائے۔

وہ اپنی دانست میں پیدل ہی مالوہ کی طرف چل دی۔ عرصہ دراز بعد اجمین میں ایک بڑھیا نظر آئی جو خود کو رام راجا کی بیوی کہتی تھی اور لوگ ہنستے ہوئے گزر جاتے تھے۔

تھا۔ تارابیائی کی نظر نہیں پڑی تھی ورنہ وہ اسے کبھی وہاں نہیں رہنے دیتی۔ ہنوت رائے خاموشی سے اٹھا، خنجر اٹھایا اور اپنے سینے میں اتار لیا۔ ایک دلی سی چیخ نکلی اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ تارابیائی واپس آئی تو اس نے ہنوت رائے کو خون میں لت پت فرش پر پڑے دیکھا۔ اس کے پیچھے پیچھے دھنجا دھبی آیا تھا۔ وہ بھی اس منظر کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

”رائی جی! یہ آپ نے کیا کر دیا؟“
”میں تو اسے اچھا خاصا چھوڑ کر گئی تھی۔ میرا خنجر یہاں رکھا تھا۔ یہ خنجر اس نے خود اپنے سینے میں اتارا ہے۔ یہ ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ اب اس کی لاش ٹھکانے لگانے کا انتظام کرو۔“

دھنجا دھو نے جبکہ کر اس کی بغلی دیکھی اور مایوسی سے گردن جھٹک دی۔

”دیکھ کیا رہے ہو۔۔۔ ٹھٹھا اور اس کی لاش کو قلعہ کی دیوار سے نیچے پھینک دو۔“

تارابیائی کو اس کی موت کا افسوس نہیں تھا۔ دکھ تھا تو یہ کہ وہ اپنے ہاتھ سے اسے موت کی نیند نہ سلا سکی۔ اب اس کی سب سے بڑی دشمن چندا بانی بھی لیکن وہ اس کی دسترس سے دور تھی۔

یہ کام بھی دھنجا دھو ہی کر سکتا تھا اور اس وقت وہ اسے یہی سمجھا رہی تھی۔

☆☆☆

بادشاہ دریائے کشن کے کنارے دیوگانو کے مقام پر ٹھہرا ہوا تھا کہ بیماری نے اس کے بدن کو جکڑ لیا۔ جوڑوں کے درد شدت سے اٹھا۔ یہیں اسے خبر ملی کہ اس کا ایک قلعہ ”کندانہ“ مرہٹوں کے قبضے میں چلا گیا ہے لیکن اس وقت وہ ملنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ اس ہم کو اس نے کچھ دنوں کے لیے نال دیا۔

وہ اپنی بیماری کو چھپاتا رہا تا کہ انتشار پیدا نہ ہو لیکن ایک بار غشی طاری ہوئی تو قریبی لوگوں پر بیماری ظاہر ہو گئی لیکن اس سے پہلے کہ انتشار پھیلتا، اس کے بدن میں رفتہ رفتہ جان آتی گئی اور وہ رو بہ صحت ہو گیا۔

جب اچھی طرح صحت مند ہو گیا تو کوچ کیا اور ایک پرمشقت سفر کے بعد پیرگاؤں پہنچ گیا پھر بہادر گڑھ پہنچ

ماخذات

مغلیہ دور حکومت، خافی نظام الملک، منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر ہدایونی، طبقات ناصری (اردو) قاضی منہاج تاریخ ہندوستان، ذکا اللہ

میں داخل ہو گئی۔ دروازہ بند کر کے جب اس نے گہرا سانس لیا تو ایک ناگوار بو اس کے نفعوں میں اتر گئی جو یقیناً چوہوں اور خشک پتوں کی تھی۔ لکٹ گھر کے دروازے کے ساتھ ہی بجلی کا سوئچ تھا۔ اس نے نیم تاریکی میں ٹول کر اسے تلاش کیا

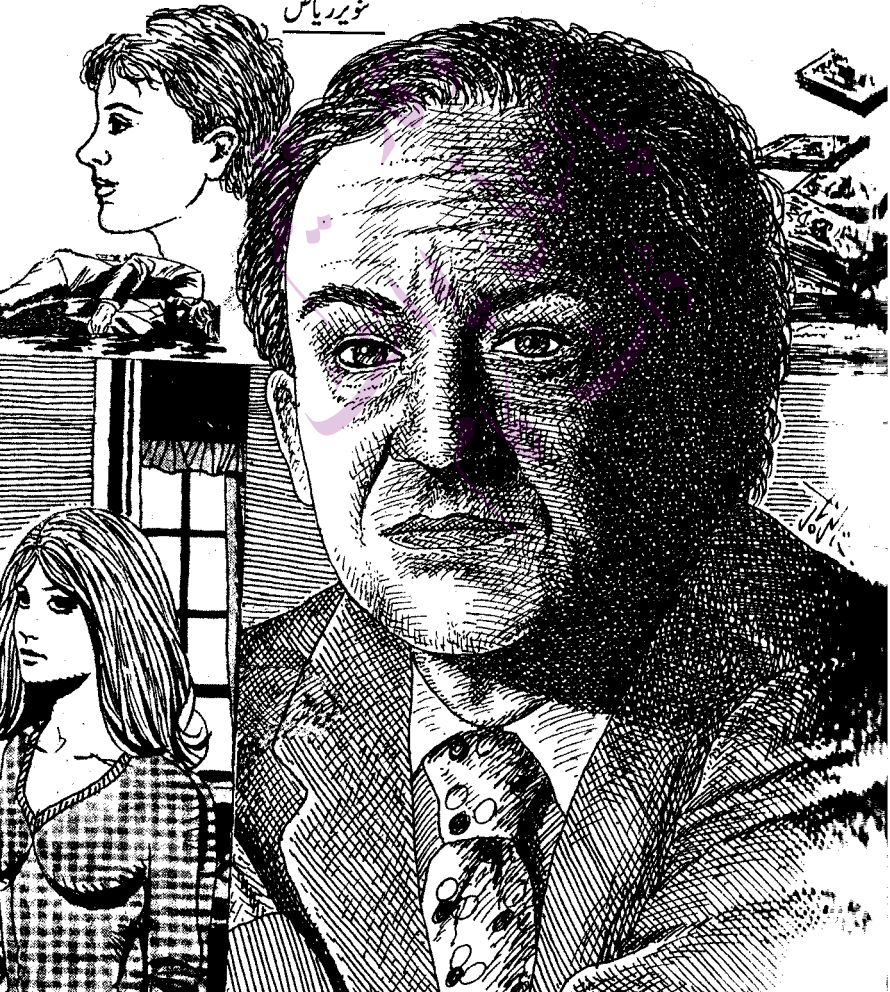
انتقالیہ کالج میں بیٹھے ہوئے شخص سے اس نے کہا کہ میں اور باقی راستہ گاڑی چلاتے ہوئے طے کرتا ہوں۔ اس وقت وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے بیرونی دروازے کا تالا کھولا اور لکڑی کی بنی ہوئی چھوٹی سی عمارت

ایک ماں کی ممتا کا کڑا امتحان اور کڑے حقائق کا سامنا

یوں تو انسان تمام عمر سفر میں ہی رہتا ہے لیکن زندگی کے سفر اور زمین کے سفر میں تھوڑا فرق ہوتا ہے۔ زندگی کے گزرتے لمحات کا نہ تو شمار ممکن ہے اور نہ ہی تعین لیکن کبھی کبھی زندگی کی حفاظت کی خاطر انسان ہجرت ضرور کرتا ہے۔ اس کے لیے بھی یہ بہت مشکل تھا لیکن اپنے لخت جگر کے لیے اسے اس مشکل سے گزرنا ضروری تھا۔

مشکل فیصلہ

تنویر ریاض



دوسرے لوگ بھی اپنا کام کر رہے تھے لیکن وہ کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے شو شروع ہونے سے پہلے انتظامات کا جائزہ لینے خود ہی چلی آئی۔

”سب کچھ ٹھیک ہے؟“ استقبال پر بیٹھے ہوئے شخص نے پوچھا۔

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔ ”بہترین..... میں سات بجے پہنچ جاؤں گی۔“

اس نے استقبال پر بیٹھے ہوئے شخص کو تھیرکی چایاں دیں اور وہاں سے روانہ ہوئی۔ شو شروع ہونے میں اب بھی چار گھنٹے باقی تھے اور اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ اپنی عارضی رہائش گاہ پر سام کے ساتھ وقت سے پہلے کھانا کھا لیتی۔

”میڈم!“

یہ آواز سن کر وہ دروازے پر ہی رک گئی اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دروازے کے کنارے پر جھکا ہوا شخص اب سر مار رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ اس سے کسی پوسٹر پر دستخط کرنے کے لیے کہہ گا۔ اگلا رڈ نے پہلے ہی کافی تعداد میں پوسٹر بھیج دیے تھے جو چھ مختلف ڈیزائنوں میں تھے لیکن اس کا پسندیدہ پوسٹر وہ تھا جس میں وہ ملکہ بھی سینٹ میڈیلین ایک پشٹے پر گھڑی ہوئی تھی اور اس کے عقب میں جہازوں کا قافلہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہو رہا تھا۔ یہ پوسٹر اس نے تین سال پہلے شگنائی میں بنوائے تھے اور اس کے بعد ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

”آخری دو گھنٹے باقی بچے تھے۔“ اس آدی نے کہا۔ ”وہ میں نے خرید لیے لیکن یقین سے نہیں کہہ سکا کہ اپنی بیوی کو یہاں آنے پر آمادہ کر سکوں گا یا نہیں۔“

اس نے اس کے علاوہ بھی کچھ کہا تھا جس پر میڈیلین نے دھیان نہیں دیا۔ اس کے شو کی نوعیت ہی ایسی تھی جسے زیادہ تر عورتیں دیکھنا پسند نہ کرتیں لیکن وہ اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

اب وہ شخصی اس کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے فون پر بوکلا ہٹ میں کچھ بول رہا تھا لیکن وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ وہ کیا جانا چاہ رہا ہے۔

”تم نہیں جانتے کہ وہ اسے پسند بھی کر سکتی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اگر وہ اسے مناسب لگے۔“

اس شخص نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں ہے۔“

”بہت سے مرد اپنی بیویوں یا دوست لڑکیوں کو

اور لائٹ جلا دی۔ اب وہ تنگ لابی اور دیواروں پر لگے ہوئے پرانے پوسٹرز دیکھ سکتی تھی۔

وہ بائیں ہاتھ کے دروازے سے آؤٹوریم میں داخل ہوئی۔ اس میں تین سوئیں، تین تھیں جنہیں تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ان کے درمیان دو راستے بنادیے گئے تھے۔ پہلی قطار کا کٹ پچاس اور تیس نشستوں کا بچھیں ڈالر تھا۔ آج اور کل میں ہونے والے دونوں شوزز کے کٹ پہلے ہی فروخت ہو چکے تھے۔ اسے حساب کتاب کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ یہ کام اس کے منیجر اگاڈ کا تھا جو ہر شوز کے موقع پر کہتا کرتا تھا۔

وہ پہلی بار ہوائی آئی تھی۔ ہبلو ائر پورٹ سے باہر آتے ہی اسے اور سام کو بارش کا سامنا کرنا پڑا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف جنگلات تھے۔ درختوں کی جھلکی ہوئی شاخوں کے درمیان وہ سڑک ایک سرنگ کے مانند معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بہت قدیم جگہ لگ رہی تھی جو اسے بالکل ناموس لگی۔ اس سے پہلے اس نے صرف صحرا دیکھے تھے۔

وہ سیزمیاں بھلائی ہوئی اسٹج پر چڑھ گئی اور وسط میں پہنچ کر بچوں کے ٹل گھومی پھر اس نے خالی نشستوں پر نظر دوڑائی۔ آخری قطار کے اوپر پرڈیجیشن روم تھا۔ اسے وہاں جا کر یقین کرنا تھا کہ اسپاٹ لائٹ صحیح کام کرتی ہے لیکن فی الوقت وہ غصی پردہ ہٹا کر اسٹج کے پیچھے چلی گئی۔ یہ بہت اہم تھا کہ وہ اندھیرے میں وہاں کاراستہ جان لے۔

جب وہ ڈریسنگ روم میں پہنچی تو دروازے پر ایک خیر مقدمی کارڈ لگا ہوا تھا۔ اس نے وہ اتارا اور کھول کر پڑھنے لگی۔

”مس میڈیلین۔ کلاویا ملٹری کیمپ میں خوش آمدید، یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔“

اس کے سامان میں دو بڑے سوٹ کیس اور ایک کٹڑی کا صندوق شامل تھا جس میں اس کے ملبوسات اور دیگر ضروری اشیاء محفوظ تھیں۔ وہ جس شعبے سے وابستہ تھی، اس میں ظاہری نمود و نمائش اور اچھا نظر آنے کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ کوئی الہڈ و شیز نہیں بلکہ آٹھ سالہ بیٹے کی ماں تھی اور اس کے بیٹے کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنی ڈھلتی ہوئی جوانی کو پُرکشش بنانے کے لیے ہر ممکن طریقہ استعمال کرے۔ جب اس کا سامان ڈریسنگ روم میں پہنچا جا رہا تھا تو وہ رات کے شو کے بارے میں تمام تفصیلات پر غور کر رہی تھی۔ یہ شو اس کا تھا اور اسے کامیاب بنانے کی ذمہ داری بھی اسی پر تھی گوکہ

”ہاں، یہ تو ہے لیکن وہ بہت زیادہ قدامت پرست ہے۔“
”مجھ کو ریش خود بھی آ جاتی ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اور وہ“

”مجھ کو مردوں سے زیادہ پسند کرتی ہیں۔“
اس شخص کے کان لوؤں تک سرخ ہو گئے۔ وہ اس کی حالت پر مسکراتی ہوئی کانچ سے باہر آگئی اور دھماکا اتر کر کار کی طرف چل دی۔ ملٹری ٹیکہ سے اٹھ کر وہ آتش فشاں کے ساتھ والی سڑک پر چل دی۔ اس کے دونوں طرف سرخ پھولوں سے لدے ہوئے درخت تھے جو دیکھنے میں ہی بہت کمزور اور نازک لگ رہے تھے کیونکہ آتش فشاں کے قریب ہونے کی وجہ سے وہاں کی مٹی بھر بھری تھی۔ وہ جنگل کے درمیانی خلا سے آتش فشاں کا نظارہ کر سکتی تھی۔ اسے سیال چٹان کی سیاہ پرت صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کے سوراخوں سے دھماکا نکل رہی تھی۔ جب میڈیٹین نے کھڑکی کا شیشہ پرچہ کرایا تو کھرا لوہا بارش میں گندھک کی پورچی ہوئی محسوس ہوئی۔

گاؤں پہنچ کر اس نے ایک جزل اسٹور کے پاس گاڑی روکی تاکہ ڈنر کے لیے کچھ چیزیں خرید سکے پھر وہ اپنی عارضی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوئی اور تمام راستے مسٹر اگاڑ کی بتائی ہوئی ہدایات کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ اس شو کو ہر صورت میں کامیاب دیکھنا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میڈیٹین اس بارے میں بھرپور تعاون کرے۔

وہ گھر پہنچی تو سام آتش دان کے سامنے کرسی پر سو رہا تھا لیکن آتش دان میں آگ روشن نہیں تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر ہوسہ دیا لیکن وہ پھر بھی نہیں اٹھا۔ میڈیٹین نے مناسب نہ سمجھا کہ اس کی نیند خراب کرے اور اس کے لیے کھانا بنانے میں مصروف ہوگئی۔ جیسے ہی وہ فارغ ہوئی، سام بھی نیند سے بیدار ہو گیا۔ میڈیٹین نے اسے آواز دے کر کھانے کے لیے بلایا۔ وہ چاہتی تھی کہ تھیر جانے سے پہلے اسے کھانا کھلا دے ورنہ وہ ایسے ہی سو جائے گا۔

جب سام کھانے کی میز پر بیٹھا تو وہ سوچنے لگی کہ اس کا بیٹا کتنا لمبا ہو گیا ہے۔ اب اسے پہلے کی طرح کرسی پر چڑھنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ وہ اس پر آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔

”کیا تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”تھوڑی سی۔“

”تمہیں یہ گھر پسند آیا؟“

”ہاں۔ میں نے کھڑکی سے باہر پرندے دیکھے تھے۔ ان میں ایک سنہری رنگ کا پرندہ بہت خوب صورت تھا۔ اس کی چمکیلی سفید آنکھیں تھیں۔“
”تمہیں رات کو ڈر تو نہیں لگا؟“ اس نے پوچھا۔
”مسٹر اگاڑ نے مجھے ایک عورت کا نمبر دیا ہے۔ وہ بہت اچھی ہے اور وہ تمہارے ساتھ یہاں ٹھہر سکتی ہے۔“
”مجھے اب ڈر نہیں لگتا۔“

”بہتر ہوگا کہ تم اسے آنے دو۔“ وہ اس کے لیے پلیٹ لے کر آئی اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”کبھی کبھی سب کو ڈر لگتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات میں بھی ڈر جاتی ہوں۔“

سام اسے یوں دیکھنے لگا جیسے وہ مذاق کر رہی ہو۔

”بالکل..... میں بھی ڈر جاتی ہوں۔“

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ گزشتہ شب ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ ہولو لولو چائنا ٹاؤن میں واقع ہوئی تھیر میں شوکر رہی تھی۔ جب وہ اسٹیج پر آئی تو اسپاٹ لائٹ کی روشنی اس پر پڑی۔ اس کی نظر حاضرین پر پڑی۔ ہزاروں مردوں اور عورتوں کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ ایک شخص کے بغیر اسے تھیر خالی خالی لگتا۔ وہ دس قطاریں چھوڑ کر ہال کے وسط میں بیٹھا ہوا تھا۔ آخری بار اس نے اسے آٹھ برس قبل دیکھا تھا۔ اس وقت وہ تھوڑا بڑا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسپاٹ لائٹ کی روشنی ایک بار پھر اس پر پڑی اور وہ اس میں پوری طرح نہائی۔ اس کے گرد روشنی کا ہالا تھا اور تماشا کی دم بخود یہ منظر دیکھ رہے تھے لیکن وہ اس شخص کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی تھی۔

اس کے بعد اس نے دو مرتبہ اس آدمی کی نشست پر نظر دوڑائی لیکن اب وہاں ایک دوسرا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ وہاں پورے وقت رہا ہوں، ممکن ہے کہ اس نے کسی مختلف چہرے کا تصور کیا ہو۔

وہ شو ختم ہونے کے فوراً بعد سیدھی ہوٹل آئی۔ اس نے سام کو سوتے میں بستر سے اٹھایا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگئی۔ دوسری صبح آٹھ بجے اس نے دیکھا کہ یہ وہ جگہ نہیں ہے جہاں وہ گزشتہ شب سویا تھا لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ ان باتوں کا عادی ہو چکا تھا۔

کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے برتن دھوئے۔ سام

ابھی اندازہ تھا جو اپنی بیویوں اور دوست لڑکیوں کے ساتھ آئے تھے اور جنہیں بالکل بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اس حد تک بھی جاسکتی ہے۔

وہ چلتی ہوئی اسٹیج کے کنارے پر آئی اور اچانک ہی اس کی نگاہ دائیں کوٹنے میں کھڑے ایک شخص پر گئی۔ جب ان کی نگاہیں ملیں تو اس نے تعظیماً سر ہلایا، جواب میں اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ ایک عام سی بات تھی لیکن اچانک ہی اس کے کھٹنے تقریباً مڑ گئے اور اسے اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک افسر کے کندھوں کا سہارا لینا پڑا۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں اور اس افسر کی بیوی نے اسے گھورا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ لی سیٹ میڈیلین بھی نہیں پہنچ سکتی اور نہ ہی وہ بے ارادہ کوئی ایسی حرکت کرتی پھر ایسا کیوں ہوا؟ اس نے اپنا ہاتھ اس افسر کے بالوں پر پھیرا، انگلیوں سے اس کے گال چھوئے، واپس مڑی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اسٹیج پر آ گئی۔

وہاں موجود ہر آنکھ اس پر جرمی ہوئی تھی لیکن وہ صرف ان دو آنکھوں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس کر سکتی تھی۔ اس بار اس نے اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش نہیں کی کہ یہ اس کا تصور تھا بلکہ یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ وہاں موجود تھا۔

وہ سڑھیاں چڑھ کر اسٹیج پر پہنچی۔ موسیقی کی آواز آہستہ ہو گئی تھی اور اس کے ہر قدم کے ساتھ اسپاٹ لائٹ کی روشنی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اب شو ختم ہونے کا وقت قریب آ رہا تھا اور اسے آخری جھلک دکھانا تھی۔ وہ اسٹیج کے وسط میں کھڑے ہو کر اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے سامنے جھک کر دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ وہ سانس روکے یہ منظر دیکھ رہے تھے پھر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ سیدھی ہوئی۔ دونوں بازو سینے پر باندھ کر پیچھے مٹی اور آہستہ آہستہ تاریکی میں گم ہو گئی۔

اسپاٹ لائٹ جھج چکی تھی اور اس سے پھونکنے والی سفیدی کی جگہ زردی نے لے لی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر ایک بار پھر اس کوٹنے پر نظر ڈالی۔ وہاں کوئی نہیں تھا اور صرف لکڑی کی دیوار نظر آ رہی تھی۔ لابی کا دروازہ جھول رہا تھا جیسے وہ چند سیکنڈ پہلے ہی باہر نکلا ہو۔ بالیں تاریکی چھائی تھی اور اسے صرف تالیوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ تیزی سے پردے کے پیچھے چلی گئی۔

ڈریسنگ روم کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور سامنے آنے کے بجائے دیوار سے پشت لگا

کو بستہ میں لٹایا اور اس کے کمرے کا نائٹ بلب جلادیا۔ اب وہ ایک بار پھر گاڑی چلا رہی تھی۔ ایک بار پھر وہی مناظر اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ بارش، آتش فشاں سے اٹھتی ہوئی بھاپ اور سڑک کے دونوں اطراف درختوں کا جنگل۔ اس کی منزل تھیں جہاں اسے آج رات اور اگلے روز شو کر کے پیسے بنانے تھے۔ اس کا دماغ چار بجوں پر تھا لیکن دل صرف ایک ہی میں پڑا ہوا تھا جو یہاں کرائے کی گاڑی میں موجود نہیں تھا۔ وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کیا وہ یہاں بھی آ سکتا ہے؟ اس خیال کے آتے ہی اس کے دل میں غمخشاں سر اٹھانے لگے۔

اس مرتبہ میٹر کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اسی راستے سے کسی کوٹے بغیر اندر داخل ہوئی۔ وہاں پہلے ہی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ان میں افسران، نچلے درجے کے افسر اور دوسرے لوگ شامل تھے جو اس جزیرے اور کیمپ میں آرام و تفریح کی غرض سے آئے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کیا دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ کیسے انہیں کچھ دے سکتی ہے۔ اسی لیے وہ عقبی دروازے سے آئی تاکہ کوئی اسے پردہ اٹھنے سے پہلے نہ دیکھ سکے۔

وہ تحلیلیں پردے کے پیچھے تاریکی میں کھڑی ہوئی لباس تبدیل کر رہی تھی۔ اس نے پورے جسم پر فریوم چھڑکا اور مخصوص انداز میں بال بنانے جن میں نواچ گئی جو اہرات سے مرصع پیمیں لگی ہوئی تھیں۔ روشنیوں کا رخ دوسری جانب ہوا تو حاضرین کی بے چینی بڑھ گئی اور وہ دھیمے لہجے میں بڑبڑانے لگے۔ جب روشنیاں وہاں اسٹیج اور پردے کے درمیانی خلا پر پڑیں تو لوگوں کی بڑبڑاہٹ بھی ختم ہو گئی اور وہ پردہ اٹھنے کا انتظار کرنے لگے پھر سیکس فون پر ایک دھن سنائی دی اور پروجیکشن روم میں بیٹھے ہوئے شخص نے مائیکروفون پر اس کا نام پکارا جو یقیناً فرضی تھا۔

اس نے اپنے لباس پر سامنے کی جانب ہاتھ پھیر کر چوٹی کے نیچے بندھی ہوئی سنہری جھار کو دیکھا پھر اس نے زپ چیک کی۔

جب تماشاویوں نے تالیاں بجانا شروع کیں تو وہ پردہ ہٹا کر اسٹیج پر آ گئی۔ اسی وقت سیکس فون پر ڈرم کی آواز گونجی اور اس نے سنسکرا کر اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ وہ چلتی ہوئی اسٹیج کے ایک سرے تک گئی اور دوسرے گھوئی تاکہ لوگ اسے ہر زاویے سے دیکھ سکیں۔

وہ ان کے جذبات محسوس کر سکتی تھی۔ مردوں کی آنکھیں پتھر اکڑ رہی تھیں۔ اسے ان مردوں کی بے چینی کا

کونسا بھائی

کلاس میں ٹیچر نے بچے سے پوچھا۔ ”اگر تمہارے پاس کیک کے دو پیسے ہوں، ایک بڑا اور ایک چھوٹا پیسہ تو تم اپنے بھائی کو کون سا پیسے دو گے؟“
بچہ بولا۔ ”پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ کون سے بھائی کی بات کر رہے ہیں۔ بڑے بھائی کی یا چھوٹے بھائی کی.....؟“



خواب حالات

ایک صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت اچھا خط لکھ کر دیتے ہیں۔ ایک ان پڑھ بوڑھا شخص ان کے پاس جا کر کہنے لگا۔ ”صدر صاحب کے نام میری طرف سے خط لکھو اور انہیں میری بری حالت سے آگاہ کرو۔“
وہ شخص خط لکھ چکا تو بوڑھے شخص نے کہا۔ ”ذرا پڑھ کر سناؤ۔“ اس نے پڑھ کر سنایا تو بوڑھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس شخص نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے تم رو کیوں رہے ہو؟“
تو بوڑھا شخص بولا۔ ”مجھے خود معلوم نہ تھا کہ میرے حالات اتنے خراب ہیں۔“



دولت

آج کل لوگ کہتے ہیں کہ دولت سے سب کچھ خریدا جاسکتا ہے..... لیکن کبھی کبھی دولت بھی بے کار ہوتی ہے۔ پڑھ کر اندازہ لگائیے۔ یہ انتخاب شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایات سے ہے۔
کہتے ہیں کہ ایک فقیر ایک وسیع و عریض صحرا میں راستہ بھٹک گیا۔ اس دوران اس کے پاس کھانے پینے کا سامان نہ رہا۔ آخر سفر کی تکلیف اور بھوک پیاس سے وہ ہلاک ہو گیا۔
کچھ عرصے بعد وہاں سے فقیروں کے ایک ٹولے کا گزر ہوا۔ انہوں نے اس کی لاش کو وہاں پڑے دیکھا۔ اس کے پاس چند روپے پڑے ہوئے تھے اور انگی سے لکھا ہوا تھا۔
”اگر کسی کے پاس بہت سا خالص سونا بھی ہو تو بھی وہ بغیر توشہ کے ایک قدم بھی سفر نہیں کر سکتا۔ جنگل میں ایک خستہ حال فقیر کے لیے ابلے ہوئے شلیم بھی خالص سونے چاندی سے بہتر مفید ہیں۔“
(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

”الہامات ہے؟“
”مس لی؟“ ایک نوجوان شخص کی آواز آئی۔ ”سب جا چکے ہیں۔ اب ہم صفائی کر رہے ہیں۔“
”فیک ہے۔“
”تم کل کے لیے اپنا سامان یہیں چھوڑے جا رہی ہو؟“
”ہاں۔“
”ٹھیک ہے۔ میں اس کا خیال رکھوں گا۔“
”شکریہ۔“

وہ یونہی کھڑی اس کے جانے کا انتظار کرتی رہی پھر اس نے سلک کا لباس اور ایک لمبا کشمیری کوٹ اور چھوٹی اڑی کے جو تے پہنے۔ اس کے بال ابھی تک اسی انداز میں رہے ہوئے تھے اور اس نے جیولری بھی نہیں اتاری تھی۔ وہ اپنی کارٹھیئر کے عقبی دروازے پر چھوڑ کر آئی تھی اور اس کا ارادہ تھا کہ وہ مزید رے کے بغیر سام کے پاس چلی جائے گی۔ اس نے کسی سے ملنے کا پروگرام نہیں بنایا تھا لیکن اتفاق سے پیش آنے والے واقعات کے بارے میں وہ کوئی منصوبہ بندی نہیں کر سکتی تھی۔ جب تک وہ اپنے گھر میں داخل ہو کر دونوں دروازے اندر سے مقفل نہ کر لیتی، اسے لٹی سینٹ میڈیلین کے روپ میں ہی رہنا تھا۔

تھیٹر کے باہر موسم سرد اور مطلع صاف تھا۔ بادل چھٹ چکے تھے اور آسمان پر ستارے جھمک رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس کا استقبال کیا تو اس نے کوٹ کے بٹن بند کر کے کار کھڑے کر لیے۔ چاند کی روشنی میں وہ پہاڑ کی چوٹی پر برف کی ہلکی تہ دیکھ سکتی تھی۔ ایسے موسم میں اسے زکام ہو جاتا تھا اور فی الوقت وہ اس سے بچتا چاہ رہی تھی ورنہ اس کے لیے اگلے دن شوکرنا مشکل ہو جاتا۔ اسی لیے اسے جلد از جلد گھر جانے کی جلدی تھی تاکہ بیماری سے محفوظ رہ سکے۔
”تم آج بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔“

اسے چیخنے کی بھی مہلت نہ مل سکی۔ اس سے پہلے ہی وہ گھوما اور اس نے لٹی کے پیٹ پر ریوالت رکھ دیا۔ اس نے پلٹ کر عقبی دروازے کی طرف دیکھا تو اس شخص نے لٹی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”محافظ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے اور اگر انہوں نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو یہ ان کے حق میں بھی برا ہوگا۔ گاڑی کی چابی مجھے دو۔“

لٹی نے خاموشی سے چابی اس کے حوالے کر دی۔ اس شخص نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے ہوئے تھے۔ اس نے

لیے کہا۔

”یہاں سے بائیں جانب موڑ لو۔“

وہ ایک پتھر لیے راستے پر مڑ گئی جو ایک خالی پارکنگ لائٹ کی طرف جاتا تھا۔ اس نے آخری سرے کی جانب اشارہ کیا تو اس نے وہاں جاکر کار روک لی۔ اس شخص نے انٹیشن سے چابیاں نکالیں اور انہیں اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”باہر آ جاؤ۔“

وہ گاڑی سے باہر نکلے اور دروازے سے لگ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ اس شخص نے لٹی کا بازو اوپر اٹھایا اور کوٹ کے اندر بائیں جانب ریولیور کی نال پوری قوت سے پھوست کر دی۔ نال کے اوپر ابھرے ہوئے دھاتی ٹکڑے نے گردے کے اوپر اس کا لباس پھاڑ دیا اور وہاں سے خون رسنے لگا لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔

”آؤ اوپر چلتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہاں سے اس جگہ کا نظارہ کریں گے۔“

وہ پتھر لی سڑک پر چلتے رہے۔ اس کا بازو لٹی کی کمر کے گرد تھا اور ریولیور بدستور اس کے پہلو سے لگا ہوا تھا۔ اس جگہ درخت چھوٹے اور اونچائی میں کم تھے۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ جب وہ اونچائی پر پہنچے تو اس نے ایک میل کے فاصلے پر سوراخ سے نارجی رنگ کا لاوا نکلنے دیکھا۔ اس سے نکلنے والا دھواں تیز ہوا کی وجہ سے آسمان کی جانب پانچ سو فٹ کی بلندی تک جا رہا تھا۔

”تم نے مجھے کیسے تلاش کر لیا؟“ لٹی نے پوچھا۔

”اس لیے کہ تم مجھ سے نہیں چھپ سکتیں۔“ اس نے کہا۔ ”تم نے اپنا نام اور بالوں کا رنگ تبدیل کر لیا پھر ایک نئے چہرے اور شناخت کے ساتھ منظر عام پر آئیں لیکن اس کے باوجود بھی بہت کچھ ظاہر ہو رہا تھا اور جب میں نے تمہیں دیکھنا شروع کیا تو مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ لٹی سینٹ میڈیٹیلین کے نقاب کے پیچھے کون ہے۔“

اس نے گھوم کر پتھول کی نال اس کے چہرے کے سامنے کر دی اور گولی چلانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اسے یہ اطمینان تھا کہ اس ویرانے میں فائر کی آواز سننے والا دور دور تک کوئی نہیں۔ اس کے باوجود اس نے گولی چلانے میں توقف کیا کیونکہ اس نے ابھی تک لٹی سے گمشدہ رقم کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔

”تمہیں یاد ہے کہ تم پہلی بار مجھے کب ملے تھے؟“ لٹی نے اس سے پوچھا۔

”دسٹین میں۔ تم ان دنوں رقص و موسیقی کے

ارائیٹنگ سائڈ کا دروازہ کھول کر سر ہلایا اور وہ سمجھ گئی کہ آج رات کیا ہونے والا ہے۔ یہ مسئلہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہا، وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور اپنی طرف کا دروازہ بند کر لیا۔ اب وہ اس کے بیٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ چابیاں اس شخص کے پاس تھیں۔

”تم نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ دوبارہ مجھے دیکھ سکو گی۔“

”نہیں۔“

”گاڑی اسٹارٹ کرو۔ ہمیں اس کیپ سے نکلتا ہے۔“ وہ تنگ و تاریک سڑکوں پر گاڑی چلاتی رہی۔ وہ تفریحی مرکز سے گزر کر کانجیو کی قطار کے ساتھ چلتے رہے۔ جو وارنٹ آفیسر سے کم درجے کے لوگ کرائے پر لے سکتے تھے۔ جب وہ ہاف مون ڈرائیوے پر آئے اور میٹل پارک پہنچے تو اس نے کار روک دی۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اور سڑک پر کوئی دوسری کار نہیں تھی۔

”دائیں جانب موڑ لو۔“

اس نے گاڑی موڑی اور ہیڈ لائٹس کی روشنی میں آگے بڑھتی رہی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ سڑک کہاں تک جاتی ہے اور کتنے فاصلے تک سیاہ چٹانوں کے ساتھ ساتھ چلتی رہے گی، جب تک کہ وہ اگلی آبادی تک نہیں پہنچ گئے۔

”تم سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ میں تمہیں تلاش کر لوں گا بلکہ تمہارا اندازہ تھا کہ بھی دیکھ بھی نہیں پاؤں گا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری بلکہ بھی سوچا بھی نہیں کہ تم مجھ سے جدا ہو گئی ہو۔“

اس نے تائید میں سر ہلادیا۔ اس سے اختلاف کرنا خطرناک ہوتا۔ بالخصوص اس صورت میں جبکہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر اس تک پہنچنے میں اسے آٹھ برس لگے تو اسے یہ جاننے میں بھی بہت وقت لگا ہوگا کہ وہ کس دولت سے محروم ہو گیا ہے۔

”بہت سی دوسری لڑکیاں تھیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم سے پہلے اور تمہارے بعد اور یہ تم بھی جانتی ہو۔ ممکن ہے کہ میں کسی کو بھی مورد الزام ٹھہراتا۔“

”تھوڑی دیر کے لیے یہ بات میرے دماغ میں آئی تھی۔“

”لیکن میں تمہارے بارے میں ہمیشہ سوچتا رہا۔“

”میں نہیں جانتی۔“

”اور تم ہی میرے ساتھ والٹ تک گئیں۔ میں تمہارے علاوہ کسی کو ساتھ لے کر نہیں گیا۔“

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ لٹی نے بات بدلنے کے

پاکیزہ

جنگلاتی جھلساتی تحریریں لیے ستمبر 2017ء کا دلہن نمبر

پاکیزہ

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے خوب صورت سلسلے وار ناول..... نئی اقساط لیے

سیما رضا ردا نے اپنے مٹی ناول ہم کو عبث بدنام کیا میں دکھائے کرداروں کے نت نئے رنگ

سدرش فاطمہ کے سحر انگیز بیان کا ترجمان مکمل ناول..... میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں

عالیہ درا کی نفسیاتی تحقیق کا نچوڑ ایک جاندار ناول..... اشک، جگنو اور ستارے

نگفت اعظمی، سعدیہ رئیس اور فرح طاہر کی خصوصی کہانیاں

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی قرآنی تحقیق اور ج کی باسعادت مناسبت سے اختر شجاعت کا پُر شکوہ مضمون

وہ آنے بزم میں.....

ہماری سینئر رائٹر صبیحہ شاہ

کی صباحت بھری آمد

شانستہ زریں کا سنہرا رو پہلا روپ لیے ایک جامع سروے

اس کاغذ پر

دلہن نمبر کے لیے شوخ و شنگ اور کہیں سنجیدہ رنگ لیے فوزیہ احسان رانا، المیس جبار، بہالہ احمد، امہ ثمامہ، ضادیہ احمد، دانیہ آفرین، نگفت غفار و دیگر ہنرمند لکھاریوں کی حسین تحریریں

اس کے ساتھ، ساتھ دلچسپ اور پُر تحقیق کارنرز، سحر انگیز شاعری، خوش ذائقہ پکوان، قابل عمل نسخے اور بہت بہت پُر لطف احوال..... صرف آپ کی اعلیٰ ذوق کی نذر

پروگراموں میں حصہ لیتی تھیں۔ میں نے تمہاری مدد کی تھی۔“ وہ شوگرل نہیں بلکہ بیوسات کی ڈیزائنر تھی لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ دونوں صورتوں میں اسے اپنے آپ کو نمایاں کرنا ہوتا تھا۔

”تم مجھے اپنے کمر لے گئے تھے جو شہر سے باہر پہاڑیوں پر واقع تھا۔ رات کا وقت تھا۔ یاد ہے تم نے مجھ سے کیا کہا تھا؟“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں نے کیا کہا تھا۔“
 ”تم نے جو وعدہ کیا، وہ پورا نہیں ہوا۔ میں ایک آوارہ
 عورت ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ میں اس سے زیادہ
 کچھ نہیں کر سکتی تھی۔“

”اسی لیے تم نے یہ حرکت کی؟“
 ”وہ پوری رقم میرے حصے میں نہیں آئی۔ میرے
 ساتھ کوئی اور بھی تھا۔“

للی نے دیکھا کہ اس نے اپنی انگلی ٹریگر پر رکھ لی ہے اور وہ کسی بھی لمحے گولی چلا سکتا ہے۔ اس نے قدم آگے بڑھایا اور اس کے قریب ہوتے ہوئے اس طرح دھکا دیا کہ لروہ فائر کرے تو گولی اس کے سر پر سے گزر جائے۔ وہ پہلے ہی اپنے بالوں میں سے ایک ہیئرپن نکال چکی تھی جو ایک نو بچے کی لمبی سوئی کے مانند تھی۔ وہ اس سوئی سمیت اس سے غمراہی پر رہا۔ اس کے جسم میں اتار دی۔ اس نے اسے قفس کے انداز میں پیچھے سے پکڑ رکھا تھا پھر اس نے اس کے جسم میں ٹراپسٹ محسوس کی اور وہ بے جان ہو گیا۔ ریوالورز مین پر کمر گیا۔ اس نے اسے پیچھے کیا اور اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ہیئرپن اس کے نتھنے میں اتر گئی تھی۔ اس نے وہ نکالی اور اس میں لیس سے اس پر لگا ہوا خون صاف کرنے لگی۔

اس نے اپنے مکان کے باہر گاڑی کھڑی کی اور کافی
 اسی میں بیٹھی رہی۔ بارش دوبارہ شروع ہو چکی تھی اور
 گہراج کی نالی دارین کی چھت پر بارش کے قطرے گرنے
 لگے۔ آواز سن سکتی تھی۔ وہ کار سے باہر آئی اور کوٹ کے کنار
 مضبوطی سے پکڑ لیے۔ باہر کی بھیگی اور معطر فضا میں سانس لینے
 سے اس کے حواس بحال ہوئے۔ اس جنگل میں اور بھی مکان
 لیکن بارش اور تاریکی کی وجہ سے نظر نہیں آ رہے تھے
 سن وہ ان کی چمنیوں سے نکلنے والے دھوئیں کو محسوس کر سکتی
 تھی۔ اس کے علاوہ تاریکی میں اسے مینڈکوں کے بڑانے اور
 ندوں کے بر پھر پھرانے کی آواز سن بھی آ رہی تھیں۔

سام گیسٹ روم میں سو رہا تھا۔ وہ اس کے بستر کے
س رکھی ہوئی کرسی پر کچھ دیر کے لیے بیٹھ گئی۔ کھلی کھڑکی

اور لانا مائیں کی سانسیں رک گئیں۔ وہ آگے کی طرف جھکے اس پر نظر نہیں جمائے ہوئے تھے۔ پھر روشنیاں بجھ گئیں اور اس نے تاریکی میں شوکا آخری حصہ پیش کیا۔ بے اختیار اس کی نظری کو نے پر گئی۔ وہاں دیوار کے ساتھ ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس نے سفید قمیص کے ساتھ سیاہ رنگ کا جیکٹ سوٹ پہن رکھا تھا اور دونوں بازو سینے پر باندھے ہوئے تھے۔ روشنیاں بجھ گئیں اور وہ پردے سے گزر کر واپس اسٹیج کے عقب میں چلی گئی۔ وہ اس شخص کو نہیں جانتی تھی لیکن اسے یہ معلوم تھا کہ وہ وہاں کیوں آیا ہے۔ وہ لباس تبدیل کر رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو اس کے سامنے وہی سوٹ والا کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بھی کندھوں کی طرح چوڑا تھا اور صرف سفید بالوں سے ہی اس کی عمر کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔

”تھامس کوٹلی۔ ایجنٹ ایجنٹ۔“

”مس میڈیلیں۔“ وہ بولا۔ ”تم جانتی ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟“

”یہی نہیں جانتی۔“ اس نے کہا۔ ”کیا تم اندر آنا پسند کرو گے؟“

اس نے دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا پھر دروازہ بند کر کے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اس کے سامنے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔

”میں نے تمہارا شو دیکھا۔ امید ہے کہ تم کچھ خیال نہیں کر دو گی؟“

”شکریہ۔“

”میں نے ٹکٹ نہیں خریدا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن میں تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ کیا تم کارلوس ڈالٹرن نام کے کسی شخص کو جانتی ہو؟“

”نہیں۔“

اس نے جیکٹ کی جیب سے ایک تصویر نکالی اور ڈیریٹنگ نیبل پر رکھ دی۔ وہ کم از کم دس سال یا اس سے بھی زیادہ پرانی تھی۔ اس وقت کارلوس کے چہرے پر ڈاڑھی نہیں تھی اور اس کا چہرہ بھی کافی دبلا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ گزشتہ شب شو دیکھنے آیا تھا۔“

”تم نے اسے دیکھا تھا؟“

”اگر وہ کسی نشست پر بیٹھا ہوتا تو شاید میری نظر اس پر نہ جاتی۔ وہ پیچھے کو نے میں دیوار کے ساتھ کھڑا ہوا تھا

جہاں آج تم تھے۔“

”کیا تم نے اس پر توجہ دی؟“

”ہاں جیسے میں نے آج تمہیں دیکھا اور اس کی وجہ ایک ہی ہے جو میں بتا چکی ہوں۔۔۔۔۔ اگر کوئی شخص میرے شو میں نشست پر بیٹھنے کے بجائے کھڑا ہوا ہو تو وہ میری توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔“

”اوہ، میں سمجھا۔“ ایجنٹ کوٹلی بولا۔ اس نے تلی کے ہاتھوں کی طرف دیکھا جو اس نے اپنی رانوں پر رکھے ہوئے تھے۔ ”وہ دو دن پہلے ہونولولو میں بھی تمہارا شو دیکھنے آیا تھا؟“

”میں نے اسے وہاں نہیں دیکھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن شاید تم نے اسے دیکھ لیا؟“

”میں وہاں موجود نہیں تھا لیکن ہم نے اسے پہچان لیا ہے۔“

وہ بولا۔ ”کیا اس نے تم سے بات کرنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔“

گزشتہ شب یا دو دن قبل؟“

”نہیں۔“

وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اس سے نظر بچا کر اپنا ہاتھ سر تک لے جائے اور پنوں کو بالوں کے اندر گہرائی تک کھینچ کر دے تاکہ وہ نظر نہ آسکیں۔ وہ اپنے چہرے کی پیش کو چھپانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ گالوں پر رکھنا چاہ رہی تھی لیکن اس کے بجائے اس نے ڈیریٹنگ نیبل سے کارلوس کی تصویر اٹھائی۔ پہلے اس کا چہرہ دیکھا پھر اسے پلٹ کر دیکھنے لگی۔ وہاں کچھ نہیں لکھا ہوا تھا۔

”یہ کون ہے؟“

”ایک خطرناک شخص۔“ ایجنٹ کوٹلی نے کہا۔ ”ایک ایسا شخص جس سے تم بھی ملنا نہیں چاہو گی۔ ہم کافی دنوں سے اسے تلاش کر رہے ہیں۔“

”کیا وہ تمہیں مل گیا؟“

”ہاں۔ ہم نے اسے تلاش کر لیا۔“ وہ بولا۔

یہ کہہ کر اس نے ڈیریٹنگ روم کا جائزہ لیا۔ وہاں وہ سب چیزیں موجود تھیں جو اس نے گزشتہ شب پہن رکھی تھیں۔ لباس، ہتھیاری کوٹ جس کے کف پر خون کا ایک بہت ہی چھوٹا سا دھبہ لگا ہوا تھا۔ ہیرے، پتیلیں وغیرہ وغیرہ۔

”جہیں نقیض ہے کہ تم نے ہونولولو میں اسے نہیں دیکھا؟“

”ہاں۔ میں نقیض سے کہہ سکتی ہوں۔“

”گزشتہ شب وہ کسی کے ساتھ آیا تھا۔ کیا اس کے برابر میں کوئی اور موجود تھا؟“

”وہ اکیلا ہی تھا۔“ اس نے کہا۔ ”وہ پروگرام ختم ہونے سے پہلے ہی چلا گیا تھا۔ جب روشنیاں گل ہوئیں تو وہ

بغلی دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ایجنٹ کوٹلی نے کہا۔

”لی چاہ رہی تھی کہ وہ اٹھ جائے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اب بھی کمرے کا جائزہ لے رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ گزشتہ شب اس سے کہیں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی، وہ خوفزدہ تھی۔ اس کے ہاتھ سردی کی وجہ سے سُن ہو گئے تھے۔ کارلوس کو وہاں سے ہٹانا ناممکن تھا۔ اس نے اسے وہیں چھوڑ دیا جہاں وہ گرا تھا لیکن کیا ہوگا اگر اس نے اس کی قمیص کے بٹن کو چھو لیا ہو یا قمیص سے ہیز پن پر سے خون صاف کرتے ہوئے اس پر انگلیوں کے نشانات آ گئے ہوں۔“

”صرف ایک بات اور۔“ کوٹلی اس کے بائیں کولہے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے شو میں تمہیں ماڈرن لباس میں دیکھا۔ تمہارے بائیں جانب ایک خراش ہے جسے تم نے میک اپ سے چھپایا ہے۔“

اس نے بے خیالی میں اس جگہ کو چھوا۔ ابھی تک اسے جھن محسوس ہو رہی تھی۔ اگر انہیں کارلوس کا ریوالور چیک کرنے کا خیال آ گیا تو وہ جائے وقوعہ پر اس کی موجودگی ثابت کر سکیں گے۔ اس کے بعد سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ وہ اس کی ہیز پنیں تلاش کر لیں گے اور انہیں ان میں سے وہ پن بھی مل جائے گی جس سے کارلوس کو قتل کیا گیا۔ انہیں وہ چھوٹی سی جینس کی جابی بھی مل جائے گی جس سے سیف ڈیپازٹ بکس کھولا جاسکتا تھا اور جو اس نے اپنی کمرے کے ساتھ باندھ رکھی تھی اور جب وہ کارن سٹی جا کر بینک کے والٹ میں اس کا سیف ڈیپازٹ بکس کھولنے تو انہیں پوری بات سمجھ میں آ جاتی۔ اس قتل کا ایک محرک تھا۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ کارلوس اس کا پیچھا کیوں کر رہا تھا اور اس نے ناک میں نوائج لمبی پن کیوں تھمیزی جو اس کے دماغ تک چلی گئی۔

”مس میڈیلین! تم اس خراش کے بارے میں کچھ بتاؤ گی؟“

”میرا بیٹا..... اسے سوتے میں ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔ اسی لیے میں گزشتہ شب اس کے ساتھ سوئی تھی تاکہ اسے پرسکون رکھنے کی کوشش کر سکوں۔“

”کیا تم یہ کہہ رہی ہو کہ یہ خراش اس کی وجہ سے آئی ہے؟“

”ہاں۔“

”اس کی کیا عمر ہے؟“

”آٹھ سال۔“

”اس وقت وہ کہاں ہے؟“

”میں نے ایک مکان کرائے پر لیا ہے۔ وہ وہیں ہے۔ اس کے پاس ایک آبا جی ہے اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چل کر اس سے بات کر سکتے ہو۔“

کوٹلی نے کچھ دیر کے لیے سوچا پھر اس نے تصویر اٹھا کر جینٹ میں رکھی اور کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”مس میڈیلین! تمہارے وقت کا شکریہ۔“

اس کے جانے کے بعد لیلی نے دروازہ بند کیا، چند لمحوں کے بعد اس کی تاب پکڑے کھڑی رہی پھر چلتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل تک آئی۔ اس نے اپنا سامان اٹھا لیا اور کمرے کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہاں کوئی آبا جی نہیں تھی۔ اس نے شرمندگی سے بچنے کے لیے ایجنٹ سے جھوٹ بولا تھا ورنہ وہ یہی سمجھتا کہ وہ بچے کو گھر پر اکیلا چھوڑ کر آئی ہے۔ اس نے... بلا سوچے سمجھے ایف بی آئی ایجنٹ کو گھر چلنے کی پیشکش کر دی تھی، اگر وہ مطمئن نہ ہوتا اور انٹرویو ختم کر کے نہ چلا جاتا تو ظاہر ہے کہ کیا ہوتا تھا۔ سام کو دیکھتے ہی وہ جینٹ کی جیب سے کارلوس کی تصویر نکال لیتا۔ دونوں چہروں کی مماثلت اسے بہت کچھ بتا رہی تھی۔ اس کے بعد وہ جو کچھ بھی کہتی، اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ وہ جان جاتا کہ آج رات اس نے جو کچھ کہا، وہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ درحقیقت لیلی سینٹ میڈیلین نہیں بلکہ کارلوس کی سابق محبوبہ تھی اور یہ حاکمت اسے جیل پہنچا سکتی تھی۔

اس نے ایک نظر سوئے ہوئے سام پر ڈالی۔ اس کا باپ دنیا میں نہیں رہا تھا لیکن اس کا ترکہ محفوظ تھا۔ اس نے سام کے محفوظ..... مستقبل کی خاطر یہ جوا کھلیا تھا۔ کارلوس کے ساتھ مل کر بینک میں ڈاکا ڈالا اور اسے چمکادے کر ساری رقم لے کر فرار ہو گئی۔ اس نے اپنا نام، شخصیت، پیشہ سب کچھ بدل ڈالا اور ایک نئی شکل لے کر شہر شہر خانہ بدوشوں کی طرح پھرتی رہی کارلوس بھی پیچھا کرتا ہوا اس تک پہنچ گیا اور پھر وہ ہو گیا جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس بار تو وہ ایجنٹ کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئی لیکن اب اسے کوئی مستقل حل تلاش کرنا ہوگا تاکہ کوئی سام کو دیکھ کر کارلوس کے ساتھ اس کے تعلق کو نہ جان سکے۔ بہت سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے بیٹے سے جدائی کا کڑوا گھونٹ پینا ہوگا۔ وہ سام کو بورڈنگ اسکول میں داخل کرادے گی اور خود میڈیلین کے بھیس میں شہر گھومتی رہے گی۔ یہ ایک مستقل فیصلہ تھا لیکن اسی میں اس کی بہتری تھی۔



فنکار

اساتادری

یہ کیسی عجیب بات ہے جب یہ کہا جائے کہ ہنرمند کو اس کی ہنرمندی کھاگئی... تو ایک لمحے کے لیے انسان سنپنا کر رہ جائے۔ کچھ ایسا ہی منظر یہاں بھی منتظر تھا... وہ جو اپنے فن میں یکتا تھے... ایک دوسرے کے دوست اور غم گسار تھے کہ اچانک سیرے کے مانند محبت سے چمکتی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں کیونکہ... ایک کافن دوسرے کی فنکاری پر کاری ضرب لگا رہا تھا مگر... قسمت کی بساط پر اچانک بازی پلٹی اور دونوں نے اپنا فن ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ دفن بھی کر دیا کیونکہ ہنرمندوں کو ان کی ہنرمندی کھاگئی تھی۔

ہاتھوں کی فنکاری اور ذہانت کی تلوار کے مابین

معرکہ آرائی

میں ایک فنکار ہوں..... میری اپنے بارے میں بھی اسے ہے اور میں اس رائے سے دوسروں کا متفق ہونا چاہتی ہوں۔ میں ایک حقیقت پسند انسان ہوں اور اظہار رائے کی آزادی سے کسی فرد کو محروم نہیں دیکھنا چاہتا۔ مسئلہ صرف دوسروں کے اتفاق کرنے کا ہے ورنہ سچ بتائیے کہ آج کے دور میں دوسروں کی جیب سے پیسا نکلوانا اور اس فنکاری کے باوجود پولیس کی نظر میں آنے سے محفوظ رہنا کوئی آسان بات تو نہیں ہے۔ میں ان اونچے درجے کے فنکاروں



کی بات نہیں کر رہا جنہیں بڑے بڑے وزیروں، سفیروں اور مشیروں کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے یا وہ خود کسی اونچی کرسی پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے مجھ جیسے معمولی فنکار کا ان اعلیٰ فنکاروں سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ وہ تو دھڑلے سے لوگوں کا مال تو کیا، مال اور بال کی کھال بھی نکال کر معصوم ہی رہتے ہیں اور پولیس سمیت کسی بھی قانون لاگو کرنے والے یا احتسابی ادارے کی یہ ہمت نہیں ہو پاتی کہ ذرا گرم نظر سے ہی ان کی طرف دیکھ لیں۔

میں نے بتایا کہ میں ایک حقیقت پسند آدمی ہوں اور میری اپنے بارے میں یہ حقیقت پسندانہ رائے ہے کہ میں ایک چھوٹا فنکار ہوں جنہیں ہمیشہ معاشرے میں بڑی ناقدری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی ناقدری کے سبب لوگ مجھ جیسے فنکاروں کو چور اچکا کہہ کر پکارتے ہیں۔ ان ناشائستہ القابات کے باوجود میں اپنے فنکار ہونے کے دعوے سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوں کیونکہ میں وہ عام سا چور اچکا نہیں ہوں جو کچھ چرانے کے پکر میں کبھی پکڑا جاتا ہے اور پبلک کے ہاتھوں ”چندے کی مار“ کھانے کے بعد پولیس کے ریکارڈ میں ہمیشہ کے لیے مشکوک افراد کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ مجھے بڑے قابلِ رحم محسوس ہوتے ہیں کیونکہ ان بے چاروں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ جیسے ہی علاقے میں کوئی واردات ہوتی ہے اور پولیس پر مجرم کی گرفتاری کے لیے کہیں سے دباؤ پڑتا ہے تو وہ سب سے پہلے ان افراد پر ہی ہاتھ ڈالتی ہے اور انہیں پولیس کے ہاتھوں اچھی طرح ”لٹنے“ اور ”پٹنے“ کے بعد ہی تھانے سے باہر آنا نصیب ہوتا ہے۔ میں ان بیوقوفوں اور مظلوموں میں شامل نہیں ہوں اس لیے خود کو فنکار کہنے میں حق بجانب محسوس کرتا ہوں۔

میں کوئی بھی شے حاصل کرنے کے لیے پوری منصوبہ بندی اور احتیاط سے کام کرتا ہوں اور اس بات کا خیال رکھتا ہوں کہ جس مال پر میں ہاتھ ڈال رہا ہوں وہ اتنا بھی زیادہ قیمتی نہ ہو کہ مالک اس کی واپسی کے لیے ”غل“ چاکر کر دے اور بے چارے پولیس والوں کو اپنا آرام ختم کر کے خواہ مخواہ حرکت میں آتا پڑے۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی خیال رکھتا ہوں کہ کسی بہت پیچھے والے آدمی کے مال پر ہاتھ نہ ڈالوں۔ اس طرح کے لوگ معمولی نقصان کو بھی اتنا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور خود کو لوٹنے والے پر اپنی حیثیت اور اختیارات ثابت کرنے کے لیے ہاتھ دھو کر پولیس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ وہ مجرم کو تلاش کر کے حاضر کریں چنانچہ بے چارے پولیس والوں کا جینا دو بھر ہو جاتا ہے چنانچہ جب پولیس کی دم پر چیر پڑتا ہے اور

مجبوراً وہ ڈسے دار تک پہنچ جاتی ہے تو اسے اس جرم میں بڑی بری طرح رگڑا لگا یا جاتا ہے۔ میں کیونکہ ایسی کوئی حماقت نہیں کرتا اس لیے پولیس والوں کو مجھ سے اور مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں تھی اور ہم اپنی اپنی دنیا میں بڑے سکون سے جی رہے تھے لیکن اپنی تازہ ترین فنکاری کے بعد میں بڑے عذاب میں ہوں اور میری حالت اس بے چارے چھوٹے اور گمنام فنکار کی سی ہے جس سے اتفاق سے کوئی بہت بڑا شاہکار تیار ہو گیا ہو اور وہ انگشت بدنداں ہے کہ کوئی اس شاہکار کو اس کی کارگیری تسلیم بھی کرے گا یا نہیں۔

میرے خیال میں مجھے اپنے بارے میں کچھ اور تفصیل سے بتانا چاہیے۔ میرا نام صادق احمد ہے اور میں مناسب حد تک تعلیم یافتہ بھی ہوں اسی لیے میرے پاس ایک چھوٹی سی فیکٹری میں اسٹور کیپر کی ملازمت بھی موجود ہے جس میں تنخواہ نہایت نامقول ملتی ہے اور اس تنخواہ میں دل کے ارمان پورے کرنا تو دور کی بات، ضروریات زندگی پوری کرنا بھی سخت دشوار ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ میں ایک چھڑا چھانٹ آدمی ہوں اور ایک دو کمرے کے ڈبے بنا کمرائے کے فلیٹ میں تنہا رہتا ہوں۔ اس ڈبے کے کرائے، بجلی، گیس و پانی کے بلوں کی ادائیگی، ملازمت پر جانے کے لیے استعمال ہونے والی اپنی کٹھاراسی بائیک کے بیٹریول اور اعلیٰ درجے کے کھٹیا ہوٹلوں سے کھائے جانے والے کھانے کے بلوں کی ادائیگی میں اٹھنے والے اخراجات پورے کرنا بھی میری تنخواہ میں ممکن نہیں ہے اسی لیے میرے اندر سوچا ہوا فنکار جاگا اور میں نے پارٹ ٹائم کے طور پر اپنے اس فن کا استعمال شروع کر دیا۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ دوست، احباب اور آس پاس والوں کو اپنی تنخواہ میں ہی یہ مشکل گزراہ کرنے والا آدمی نظر آؤں لیکن موقع مل کر دیکھ کر اپنے دل کے ارمان اپنی فنکارانہ کمائی سے پورے کرنا رہتا ہوں۔ دن میں ایک آدھ ٹائم اچھا کھانا، کسی چھٹی والے دن اچھے لباس میں معیاری تفریح گاہ کی سیر، گھر میں بہت چھپا کر رکھے گئے قیمتی اسمارٹ فون سے فرضی آئی ڈی پر سوشل میڈیا پر ماہ جینیوں سے دوستیاں، میرے وہ مشاغل ہیں جو میری کلاس کے نا آسودہ فرد کو بڑی آسودگی بخشتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں بہت سمجھداری سے کچھ رقم بھی پس انداز کرتا رہتا ہوں جس کے بارے میں میری پلاننگ ہے کہ مناسب وقت آنے پر اس سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دوں گا اور اپنی بلیک مٹی کو ہائٹ بنانے کا انتظام کرنے کے بعد فیکٹری کی نوکری چھوڑ کر بیوی کی چاکری اختیار کر لوں گا۔ ہر نوجوان کی طرح میرے دل میں بھی شادی

کر واپس اپنے دڑ بے میں جا پہنچا۔

گھر پہنچ کر میں نے کچھ کھول کر دیکھنے میں کسی بے تابی سے کام نہیں لیا اور اطمینان سے کھانا کھا کر اور ایک پیالی چائے بنا کر یوں کچھ کو کھولنے بیٹھا جیسے کوئی شخص آفس میں ادھوری رہ جانے والی فائل کا مطالعہ کرنے بیٹھا ہو۔ کچھ کھولنے پر اس میں سے دو ڈھائی ہزار کی رقم برآمد ہوئی جو میں نے ایک طرف رکھ دی اور رقم ہی کے ساتھ برآمد ہونے والی اس چھوٹی سی مجلس خلی کو کھول کر دیکھنے لگا جس میں میرے اندازے کے مطابق کوئی چھوٹا موٹا طلائی زیور موجود ہو سکتا تھا لیکن خلی کو اٹھتے ہی میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے ہی رہ گئی۔ وہ جگر جگر کرتے سات عدد ہیرے تھے جو میری توقع کے بالکل برخلاف اس خلی سے برآمد ہوئے تھے۔ میں نے خود کو غلط فہمی کا شکار محسوس کرتے ہوئے انہیں ہاتھ میں لے کر قریب سے دیکھا اور مجھے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ وہ بالکل اصلی ہیرے تھے اور میں اس لیے اتنے ڈوٹق سے یہ بات کہہ سکتا تھا کہ اوائل جوانی میں، میں نے ایک جیولر کے ہاں بھی کام کیا تھا اور اچھا خاصا کام سیکھ چکا تھا۔ بعد میں وہ جیولر کسی معمولی بات پر مجھ سے ناراض ہو گیا اور نوکری سے نکال دیا تو میں نے بھی دوبارہ کسی اور جیولر کی دکان کا رخ نہیں کیا اور کسی اور کام دھندے میں لگ گیا۔ اصل میں اوائل جوانی میں، میں نے جواتنے بہت سے متفرق کام کیے تھے انہوں نے ہی مجھ جیسے آدمی کو فنکار بنایا تھا لیکن اس وقت سے فنکار اس طرح حیران پریشان بیٹھا تھا کہ جیسے اس نے مائیکل اینجلو یا پیکاسو کے درجے کا کوئی شاہکار تخلیق کر ڈالا ہو اور اب اس انجمن میں ہو کہ اس کی اس تحقیق کو تسلیم کون کرے گا۔

میرے جیسی حیثیت کا آدمی بھلا کیسے کسی کو یقین دلا سکتا تھا کہ یہ سات عدد بیش قیمت ہیرے میری ذاتی ملکیت ہیں۔ میں تو ایسا کوئی دعویٰ کرنے کی کوشش بھی کرتا تو دھریا جاتا۔ میرے ہاتھ بالکل اچانک لکشی آگئی تھی لیکن میری یہ اوقات نہیں تھی کہ لکشی کا مالک ہونے کا دعویٰ کر پاتا اور یہی میری سب سے بڑی پریشانی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اگر یہ ہیرے اپنی صحیح قیمت پر بیک گئے تو میرے سارے دلدرودرو ہو جائیں گے اور میں جو قطرہ قطرہ کر کے دریابانے کی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں، بڑی آسانی سے میری کلاس بدل جائے گی لیکن بات وہی تھی کہ میں ان ہیروں کو کس کے ہاتھ فروخت کرنے جاتا۔ میں چوری شدہ مال فروخت

لے امان بھلتے رہتے ہیں لیکن میں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ اپنے ہاتھ کسی اور کو غربت کی چکی میں پینے کے لیے اس تنگ و تنار ایک قلت میں نہیں لاؤں گا اور اسی وقت شادی کروں گا اب میرے شانے ایک فیملی کا بوجھ اٹھانے کے لائق ہو گئیں گے۔

میں آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا کہ مجھ سے وہ فنکاری سرزد ہو گئی۔ اس روز میں نے اچھا بھلا تفریح کے موڈ میں ایک تفریح گاہ کا رخ کیا تھا اور وہیں قائم ریٹورنس میں سے کسی میں اچھا ڈنکر کرنے کا بھی ارادہ رکھتا تھا کہ پارکنگ میں چھوٹی سی مہمان سے اترتی اس خوبصورت عورت کو دیکھ کر میری نیت بدل گئی۔ ادہ! شاید میں کچھ غلط کہہ گیا ہوں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اس خوبصورت عورت کے ہاتھ میں موجود خوبصورت سے کچھ کو دیکھ کر میری نیت بدل گئی۔ عورت ایک تھی اور خاصی مقبولیت سے تیار نظر آ رہی تھی۔ اس کی گاڑی اور شخصیت بہر حال ایسی نہیں تھی کہ میں اسے کسی بہت ہائی کلاس خاندان کی فرد سمجھتا اس لیے میں نے اسے اپنا شکار سمجھنے میں زیادہ پس و پیش سے کام نہیں لیا اور اپنی کسی حس کے تحت اس کے کچھ میں سے مقول رقم برآمد ہونے کی امید پر اچانک ہی اس پر حملہ آور ہو گیا۔

وہ بہت وسیع و عریض پارکنگ تھی جہاں روشنی کا زیادہ اچھا انتظام نہیں تھا۔ میں نے اپنے رد مال سے اپنے آدمے چہرے کو ڈھانپا اور عورت کی پشت پر پہنچ کر اچانک ہی اس کا منہ دبوچ لیا۔ یوں اسے چیخنے کا ذرا بھی موقع نہ ملا اور میں نے پھرتی سے اس کا چھوٹا سا کچھ جھپٹنے کے بعد اپنی بڑی سی جیب میں منتقل کر لیا۔ میرے اس عمل کے دوران وہ بری طرح پھڑکی اور تڑپتی تھی لیکن میری آہنی گرفت سے چھٹکارا پانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے اس کی مزاحمت پر سرکوشی میں اسے یہ بات بھی سمجھا دی تھی کہ میرے ہاتھوں اس کی جان بھی جاسکتی ہے اور ظاہر ہے جان جانے کے بعد اسے نہ تو میری گرفتاری سے کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا تھا اور نہ ہی اپنے کچھ کی واپسی سے۔ عورت سمجھ رہی تھی۔ اس نے میرا یہ نکتہ سمجھ لیا اور میں نہایت اطمینان سے اس کے منہ میں اس کا دو پٹا ٹھونس کر اور اسے اس کی ہی گاڑی میں مقفل کر کے وہاں سے نکل گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر وہاں پارکنگ میں کبیرے ہوئے اور... خوش قسمتی سے ورننگ کنڈیشن میں ہوئے تب بھی اتنی کم روشنی میں میری شکل واضح نہیں ہو سکے گی، چنانچہ میں اطمینان سے وہاں سے رخصت ہو گیا اور راستے میں ایک معمولی ہوٹل سے کھانا لے

کرنے کے چکروں میں نہیں پڑتا تھا کیونکہ اس میں پڑے جانے کا بہت زیادہ امکان ہوتا ہے۔ کسی بھی شکار پر ہاتھ ڈالتے ہوئے میری پہلی ترجیح کیش ہوتا تھا۔ موبائل فون چھیننے یا خواتین کے زیورات اتارنے کے تردد میں، میں کبھی نہیں پڑا تھا۔ البتہ بعض اوقات خواتین کے پرس سے یہ چیزیں بھی نکل آتی تھیں جن میں سے موبائل فون سے تو میں فوراً ہی جان چھڑا لیتا تھا۔ البتہ چھوٹی موٹی جیولری کا میرے پاس اچھا خاصا ذخیرہ ہو چکا تھا جن میں سے ایک آدھ چیز میں وقتاً فوقتاً نہایت مہذبانہ حلیے میں مختلف جیولرز کے ہاتھوں فروخت بھی کرتا رہتا تھا۔ معزز حلیے میں چھوٹی موٹی چیزیں فروخت کرنے والوں سے نہ تو کوئی جیولر سید کی فرمائش کرتا ہے اور نہ ہی شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لیے میرا کام آرام سے چل رہا تھا اور میں کبھی شک و شبہ کی زد پر نہیں آیا تھا لیکن ان ہیروں کا معاملہ مختلف تھا۔ کوئی چھوٹا موٹا جیولر تو ان کی خرید میں دلچسپی ہی نہیں رکھ سکتا تھا اور بڑے جیولر کے پاس جانے کی میری اپنی ہمت نہیں تھی کیونکہ مجھے اس صورت میں اپنے دھریے جانے کے پورے پورے امکانات نظر آرہے تھے۔ یوں میں اتنی بڑی دولت کا مالک بن کر بھی پریشان تھا اور میرے دن رات عجیب سی پریشانی میں گزر رہے تھے۔ دولت واقعی اپنے ساتھ بے سکونی لاتی ہے۔

☆☆☆

میں ایک سپر اسٹور کے پرفیومز والے سیکشن میں کھڑا غور و فکر کر رہا تھا۔ اصولاً اس جگہ کھڑے ہو کر مجھے پرفیوم کے انتخاب کے سلسلے میں غور و فکر کرنا چاہیے تھا لیکن ان خوبصورت چمکتی دھتکی اور شفاف و رنگین شیشیوں کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کیسے میرا دھیان خود بخود ان خوبصورت پمپکٹے دھتکتے اور تراشیدہ ہیروں کی طرف چلا گیا جو میں نے اپنے گھٹیا سے فلیٹ کی ایک بوسیدہ سی الماری میں بڑی حفاظت سے رکھے ہوئے تھے اور جن کے بارے میں، میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے ان ہیروں کا کیا کرنا چاہیے لیکن وہ ایسی چیز بھی نہیں تھے کہ میں انہیں فراموش کر دیتا۔ وہ ہیرے ہر وقت میرے ذہن پر سوار رہتے تھے اور کسی بھی چیز میں مجھے ان کا عکس دکھائی دے جاتا تھا جیسے کہ کسی سچے عاشق کے ساتھ، جس طرف آنکھ اٹھاؤں تیری تصویریں ہیں والا معاملہ ہوتا ہے تو میں بھی اس وقت پرفیومز کی نازک اور خوبصورت بوتلوں کو دیکھتے ہوئے اپنی ملکیت میں آنے والے ان ہیروں کو یاد کرتے ہوئے دل ہی دل میں ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا کہ اچانک ہی میری نظر اس

خوبصورت عورت پر پڑ گئی۔ عورت کی شکل اور عقل دونوں نے مجھے بھرے لیے مجھے مبہوت کر دیا۔ شکل نے اس لیے کہ یہ وہی عورت تھی جس سے چھینے گئے گچ میں سے وہ سات بیس قیمت ہیرے برآمد ہوئے تھے اور عقل نے اس لیے کہ میں نے اس بھرے پُرے اسٹور میں، جہاں ہر طرف کیمروں کی موجودگی بھی یقینی تھی، اسے نہایت صفائی سے ایک قیمتی اپورٹ پر فیم کی بوتل کو اپنے شولڈر بیگ میں منتقل کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے یہ کام اتنی صفائی سے کیا تھا کہ مجھے یقین تھا انسان تو کیا کیمرے کی آنکھیں بھی دھوکا کھا گئی ہوں گی اور کہیں اس کی یہ حرکت گرفت میں نہیں آئی۔ میں خود اگر ایک فنکار نہ ہوتا تو اس کی فنکاری کو کہیں پکڑ نہ لیتا۔ بہر حال میں نے اس کی اس حرکت کو کسی پر عیاں نہیں ہونے دیا اور خود اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ جس حلیے میں تھی، اس پر کسی بہت امیر کیر خوشحال عورت کا گمان ہو رہا تھا حالانکہ اس سے قبل میں نے اسے جس حلیے میں دیکھا تھا، وہ مجھے قدرے خوشحال تو محسوس ہوئی تھی لیکن اتنی امیر نہیں جتنی آج محسوس ہو رہی تھی۔

میں عجیب تجسس میں پھنس گیا تھا کہ اس کی کلاس کے بارے میں کیا تین کروں۔ اس سے چھینے گئے گچ میں سے جو ہیرے برآمد ہوئے تھے، وہ بھی ایک طرح سے اس کی امارت کے گواہ تھے لیکن جو حرکت کرتے ہوئے میں نے اسے دیکھا تھا، اس کی کسی امیر عورت کو ضرورت نہیں تھی۔ دنیا کی ہر شے جن کی رسائی میں ہو، انہیں اس طرح چھوٹی موٹی چوریاں کرنے کی بجائے ضرورت ہوتی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنی کسی نفسیاتی گرہ کی وجہ سے ایسی حرکتیں کرتے پھریں۔ اس عورت کی حقیقت جاننے کے لیے میں نے اس کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا اور خود کو خریداری میں مصروف ظاہر کرتے ہوئے تھوڑے فاصلے سے اس کی نگرانی کرتا رہا۔ میں سپر اسٹور میں خریداری سے زیادہ مشکل کے لیے جانے والا بندہ تھا اور دو ڈھائی گھنٹے کی مٹرگشت کے بعد وہاں سے مشکل سے دو چار چیزیں ہی خریدتا تھا لیکن اس روز مجبوراً مجھے اپنی ٹرائی میں چند چیزوں کا اضافہ کرنا پڑا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرا نوٹس لے اور میری خالی ٹرائی دیکھ کر اسے یہ شک گزرے کہ میں اس کے پیچھے ہوں۔ بظاہر تو وہ بڑی بے نیازی دکھا رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں عجیب سی چوکی اور مستعدی تھی اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ وہاں موجود ہر شخص کو اندر تک ٹول رہی ہے۔ میری طرف بھی اس نے نگاہ ڈالی تھی لیکن میرے عام سے پکڑوں اور شخصیت کی وجہ سے

۱۹۱ میں اسے کچھ ایسا قابل توجہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ جسے ہم کے لائق سمجھ رہی تھی اسے بھی میں نے تاڑ لیا تھا۔ وہ ایسا لہا چوڑا اور سرخ و سفید آدمی تھا جس کی خوشحالی اس کے ہارے اور لباس سے لپکی پڑ رہی تھی۔ وہاں ایسے کئی لوگ موجود تھے لیکن وہ شخص اس کے لیے یقیناً اس لیے قابل توجہ طہر تھا کہ اس کا بنوا ٹوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ کارڈ سے اٹائی کرنے والوں کی بھیڑ میں ایسے دولت مند بھی بہر حال موجود ہوتے تھے جو اپنے ساتھ خاصا کیش رکھ کر لاتے تھے۔ اس موٹے کے پاس رقم کی جھلک میں نے اس وقت ابھی تھی جب وہ بیکری والے پورشن میں نقد ادائیگی کر رہا تھا۔ اس سپراسٹور کا اصول تھا کہ ساری خریداری کا بل تو آخر میں مین کاؤنٹر پر ہی بنتا تھا لیکن بیکری کے آئٹموں کی ادائیگی وہیں قائم کیے گئے کاؤنٹر پر کرنی پڑتی تھی۔ اس خوبصورت عورت نے بھی یقیناً میری طرح وہیں پر مرد کے پاس رقم کی جھلک دیکھی تھی اور کسی لومڑی کی طرح اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔ فردزن آئٹموں والے پورشن میں مرد کے بہت قریب رہتے ہوئے وہ ڈیپ فریزر میں سے ٹکٹس کا پیکٹ نکالتے ہوئے کچھ اس طرح سے لڑکھرائی جیسے اس کا توازن بگڑ گیا ہو اور یہ حرکت کرتے ہوئے گویا اس نے غیر ارادی طور پر سہارا لینے کے لیے مرد کو تھامنے کی کوشش کی۔ اس کوشش کے شاندار نتیجے کے طور پر مرد کا بنوا اس کی پتلون کی پچھلی جیب سے نکل کر عورت کے شولڈر بیگ میں منتقل ہو چکا تھا لیکن مرد کو ہرگز بھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آچکا ہے۔ عورت اپنی بے ساختہ حرکت کے لیے اس سے معذرت کر رہی تھی اور وہ نہایت خوش خلقی سے اس کی معذرت کے جواب میں ”کوئی بات نہیں“ کہہ کر اسے تسلی دے رہا تھا۔ اتنی خوبصورت اور حلیمے سے معزز نظر آنے والی جوان عورت کا بے ساختگی میں ہی سہی، سہارا لینا اس کے لیے یقیناً ایک خوشگوار تجربہ رہا ہوگا اور وہ دل ہی دل میں اس اتفاق پر مسرور ہو رہا ہوگا۔ یہ اور بات کہ اپنے بنوے کی غیر موجودگی کا علم ہونے پر اس کی ساری خوشی کا نور ہو جاتی اور رقم سے زیادہ اپنے بے وقوف بنائے جانے کا احساس اسے شاید کئی دنوں تک اہانت کے احساس میں جھلارہتا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے دولت مندوں کی جیب سے بھرا ہوا پرس نکل جانے کی صورت میں ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ ایسی رقم تو شاید ان کے لیے دریا میں ایک قطرہ پانی کے برابر ہوتی ہوں۔ میں صرف عورت کی فنکاری کی طرف متوجہ تھا اور اس کے لیے

میرے دل میں جس پلہ اور بڑھ کھانا ۱۹۱ میں اس نے لیے عورت کا لفظ بھی کچھ غلط ہی استعمال کر رہا تھا۔ ۱۹۱۔ ۱۹۱۔ بڑی عمر کی لڑکی تھی جس کی عمر تیس کے ہندے سے تھوڑی اور یا دھرم معلوم ہوتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ دہائی کی جیب بھلی کرنے کے بعد زیادہ دیر وہاں نہیں رکی اور ادائیگی والے کاؤنٹر کا رخ کیا۔ بہر حال اس کے انداز میں کسی قسم کی غلط یا گھبراہٹ نہیں تھی اور وہ بڑی حکمت سے کاؤنٹر کے سامنے لگی قطار میں اپنی ٹرائی کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ میں اس سے پہلے ہی ایک دوسرے کاؤنٹر کی قطار میں لگ چکا تھا اور اس سے پہلے ہی فارغ بھی ہو گیا تھا۔ میری کل خریداری ایک بڑے سے شاپنگ بیگ میں سما گئی تھی اور میں آرام سے اسے جھلاتا ہوا باہر نکل کر پارکنگ میں کھڑی اپنی کھٹارا موٹر سائیکل پر جا بیٹھا تھا۔ شاپنگ بیگ میں نے پینچل پر لٹا لیا تھا اور اطمینان سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اس سپراسٹور سے باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا اس لیے مجھے اس بات کا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ میں اسے کھو بیٹھوں گا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد میں نے اسے ٹرائی سمیت باہر نکلتے دیکھا۔ اس نے میرے مقابلے میں کافی خریداری کی تھی اور اب اس کی ساری خریداری تین چار بڑے بڑے تھیلوں کی شکل میں ٹرائی میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ ٹرائی کھینچتی ہوئی پارکنگ میں موجود مہران تک گئی اور ٹرائی میں رکھے تھیلوں کو عقبی سیٹ پر رکھنے کے بعد خود ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھی۔ اس کی پارکنگ میں چھوڑی گئی ٹرائی کو شاپنگ سینٹر کا ایک باروہی ملازم منہج کر لے گیا تھا۔ وہاں یہی سلسلہ چلتا تھا۔ خریدار اپنا خریدار ہوا سامان گاڑیوں میں منتقل کر کے ٹرائی پارکنگ میں ہی چھوڑ دیتے تھے جنہیں مستعد ملازم فوراً اندر پہنچا دیتے تھے۔

گہرے سرمئی رنگ کی مہران پارکنگ سے نکل کر ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہوئی تو میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ کئی مصروف سڑکوں سے گزر کر مہران ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوئی تو میں نے اس سے اپنا فاصلہ کچھ بڑھا لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے اپنے تعاقب میں آتا محسوس کرے۔ رہائشی علاقے کا رخ کرتے دیکھ کر مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ وہ اپنے گھر جا رہی ہے۔ وہ متوسط طبقے کی آبادی والا علاقہ تھا اور اس علاقے میں کسی امیر کبیر عورت کی رہائش کے امکانات نہیں تھے۔ اس کے پاس سے براآمد ہونے والے ہیروں اور اس کے آج کے حلیمے کی وجہ سے اس پر امیر ہونے کا گمان کیا جاسکتا تھا لیکن اس سے سابقہ گھراؤ والا حلیہ، اس کی عام سی

گاڑی اور آج کی حرکتوں نے مجھے یقین سادلا دیا تھا کہ وہ تھوڑی سی خوشحال ضرور ہے لیکن اسے امیر کبیر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی رہائش گاہ دیکھ کر اور اس کے بارے میں ادھر ادھر سے معلومات جمع کر کے میں اپنے اندازے کی مزید تصدیق کر سکتا تھا لیکن میری یہ خواہش اس وقت ادھوری رہ گئی جب میں نے مہران کو کسی نئی وغیرہ میں مڑنے کے بجائے ایک پبلک پارک کے سامنے رکھتے ہوئے دیکھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاڑی سے اترتی اور اس کا دروازہ متقل کر کے ادھر ادھر دیکھے بغیر بڑے اطمینان سے پارک کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔

وہ تقریباً دو ڈھائی بجے کا وقت تھا۔ اس بھری دوپہر میں اس کا پارک میں جانا میرے لیے حیرت کا باعث تھا اور تجسس میں مزید اضافہ ہو گیا تھا کہ وہ نہ جانے کس مقصد کے لیے پارک میں گئی تھی۔ ابھی تک میں نے اسے جتنی عجیب و غریب عورت پایا تھا، اس سے یہی گمان کر سکتا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت ہی پارک میں گئی ہوگی۔ اس مقصد کو جاننے کے تجسس میں، میں نے اپنی موٹر سائیکل اس کی مہران سے کافی فاصلے پر پارک کی باؤنڈری کے ساتھ کھڑی کی اور محتاط قدموں سے پارک میں داخل ہو گیا۔ وہاں ایک بیچ پر بیٹھ کر سگریٹ کے کش لگاتے دو لڑکوں کے سوا مجھے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ وہ لڑکے بھی جس تجویز سے اور فلسفیانہ انداز میں سگریٹ کے کش لگا رہے تھے اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ ان کے سگریٹ بھرے ہوئے تھے اور اس وقت وہ بظاہر بیچ پر بیٹھے ہونے کے باوجود کہیں نفاذ میں اڑ رہے تھے اس لیے ان سے بتو ق نہیں رہی جاسکتی تھی کہ انہوں نے وہاں کی لڑکی وغیرہ کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہو۔ انہوں نے شاید مجھے بھی نہیں دیکھا۔ مجھے ان کے دیکھنے کی پروا بھی نہیں تھی۔ میں تو اس کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا جس کے پیچھے یہاں تک آیا تھا۔

آخر کار میں نے شمالی سمت لگے درختوں کی اوٹ میں اس کے فیروز کی دوپٹے کی جھلک پائی۔ وہ جھلک بھی بس چند سیکنڈ کی تھی۔ البتہ اس نے میرا تجسس سوانیز سے پرہیز کیا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مجھ پر کوئی بہت بڑا انکشاف ہونے والا ہے۔ میں کسی ماہر جاسوس کی طرح ان درختوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کس درخت کے پیچھے ہو سکتی ہے، اس لیے اسی کو درمیان میں رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اتنی ہوشیاری سے یہ کام کر رہا ہوں کہ کسی کی مجھ پر نظر نہیں پڑی ہوگی۔ درختوں کے اس سلسلے

میں آگے بڑھتے ہوئے یکدم ہی میری یہ خوش فہمی دھری کی دھری رہ گئی اور دوسری چیزوں نے مجھ پر انکشاف کیا کہ ہوشیار میں نہیں، ہوشیار وہ تھی۔ ان دوسری چیزوں میں سے ایک میری گردن سے لگنے والی ریوالتور کی ٹال اور دوسری اس کی آواز تھی۔ وہ اپنی سرد آواز میں مجھے سے کہہ رہی تھی۔

”شاپنگ بیگ نیچے رکھ دو اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔“ میں جوابی شاپنگ کو کسی چوراہے کی بھینٹ چڑھنے سے بچانے کے لیے ہاتھ میں اٹھائے پارک میں چلا آیا تھا، اس نادار شاہی حکم کو سن کر ایک سرد آواز بھر کر اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ اس کے سوا کوئی چارہ جو نہیں تھا۔

☆☆☆

”تم میرا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟“ ہم دونوں سگی بیچوں پر ایک دوسرے کے آنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے حکم پر میں اسے اپنی ساری جیمیں الٹ کر اور پتلون کے پانچ اٹھا کر دکھا چکا تھا کہ میں نے اپنے پاس کوئی ضرر رساں شے چھپا کر نہیں رکھی ہوئی ہے۔ اس اطمینان کے بعد اس نے مجھے اپنے سامنے ایک بیچ پر بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی اور خود بھی میرے مقابل دوسری بیچ پر اس طرح بیٹھ گئی تھی کہ اس کا ریوالتور والا ہاتھ اس کی گود میں دھرا تھا اور اس ہاتھ پر دوپٹے کا پلو ڈال کر اس نے ریوالتور کو چھپانے کا اہتمام کر لیا تھا۔ اب دور سے کوئی ہمیں دیکھ کر یہی گمان کر سکتا تھا کہ ہم کوئی الوکی دم اور شبلی قسم کے عاشق تھے جنہیں ملاقات کے لیے ہمیری دوپہر کا یہی ”سہانا“ وقت ملا تھا۔ یہ تو بس میں ہی جانتا تھا کہ وہ طرح دار حسینہ کتنے خطرناک موڈ میں مجھ سے ہم کلام تھی۔

”میں نے تم سے پوچھا ہے کہ تم میرا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟“ میری طرف سے پہلی بار میں اپنے سوال کا جواب نہ پا کر اسے کچھ اور غصہ آ گیا تھا۔

”وہ..... میں بس ایسے ہی آپ کے پیچھے آ گیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اتنی خوبصورت خاتون اس سناٹے کے وقت پارک میں کیوں جا رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہم فرزند ان ملت کو خوبصورت خواتین کی فکر ذرا زیادہ ہی دامن گیر رہتی ہے۔“ میں نے مصمصیت کا مظاہرہ کر کے اس خطرناک حسینہ سے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی لیکن میری یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی اور اپنے خوبصورت ہونٹوں سے خوفناک غراہٹ سی برآمد کرتے ہوئے وہ طنز یہ لہجہ میں بولی۔

”پارک میں تو میں اب داخل ہوئی ہوں لیکن آپ

ابھن زدہ سوچتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ میری طرف سے ابھن کا شکار ضرور ہے لیکن اس کا تناؤ کم ہو چکا ہے اور وہ پہلے کی سی چوکنی کیفیت میں اپنا روالہ ورتاؤ قائم کر نہیں بیٹھی ہوئی ہے۔

”میرا نام افتخار ہے۔ ماضی میں قریبی لوگ اتنی کہہ کر بھی پکارا کرتے تھے لیکن حال میں کوئی مجھ سے اتنا قریب نہیں ہے کہ مجھے اس تک نیم سے پکارے اس لیے اب میں صرف افتخار ہی کہلاتا ہوں۔“ میں نے اس سے اپنا تعارف کر دیا۔

”کام کیا کرتے ہو؟“ اس نے مزید تفتیش جاری رکھی۔

”ایک فیکٹری میں اسٹور کیپر ہوں۔“ میں نے اختصار سے جواب دیا جس پر اس کی تسلی نہیں ہوئی اور وہ گہری نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

”بس.....؟“

”کیا مطلب؟“ میں اس کے انداز پر ذرا سا گڑبڑا گیا۔

”مطلب یہ کہ کسی فیکٹری کا اسٹور کیپر تو اتنی گہری نظروں کا مالک نہیں ہو سکتا کہ مجھ جیسی بقول تمہارے ”فکار“ کی فنکاری نوٹ کر پاتا اس لیے میرا اندازہ ہے کہ تم اس کے سوا بھی کچھ اور ہونے شاید میری ہی طرح کے کوئی فنکار..... کیوں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟“ اس نے تائید طلب نظروں سے میری طرف دیکھا اور میرا سر خود بخود ہی اثبات میں ہل گیا۔ اپنے اندازے کی درستی پر وہ مسکرائی اور بولی۔

”اتفاق سے ہم، ہم پیشہ نکل آئے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہمارے درمیان دوستی ہو سکتی ہے۔“ میں اس بار بھی احمقوں کی طرح سر ہلا کر رہ گیا اور وہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

”اب جبکہ ہمارے درمیان دوستی ہو چکی ہے تو میں تم سے اپنا تفصیلی تعارف کروا دیتی ہوں۔ میرا نام ٹائٹل عرف مخفی ہے۔ میں اندرون سندھ کے ایک چھوٹے سے شہر کی رہنے والی ہوں اور یہاں ملازمت کی غرض سے ایک وین ہاسٹل میں رہتی ہوں۔ میں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی ہوئی ہے اور اس تعلیم کے بل بوتے پر صرف ایلی فون آپریٹری ملازمت حاصل کر سکی ہوں۔ اس ملازمت سے ملنے والی تنخواہ سے میں کراچی جیسے بڑے شہر میں اپنی اکیلی ذات کا خرچہ ہی اٹھاؤں تو بہت بڑی بات ہے لیکن میں یہاں اس لیے ملازمت کر رہی ہوں کہ مجھے اپنی فیملی کو سپورٹ کرنا ہے۔ مجھ

ہاں تو سہرا اسٹور سے ہی میرے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ ہاں میرے علاوہ اور بھی کئی خوبصورت خواتین موجود تھیں۔ لہذا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کی نظر کرم مجھ حقیر پر ہی کیوں پڑی اور آپ نے تعاقب کے لیے میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟“ اصولاً تو اس کے گلابی ہونٹوں سے پھول جھڑنے جا رہے تھے لیکن وہ مسلسل مجھ پر طنز کے تیر بر سائے جاری تھی۔ آخر کار مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے اسے اسی کے انداز میں جواب دینے کا ارادہ کرتے ہوئے پہلے تو اسے ایک گہری معنی خیز مسکراہٹ سے نوازا پھر نہایت شیریں لہجہ میں بولا۔

”اس بات سے تو انکار کی آپ نے گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے کہ میں سہرا اسٹور سے آپ کے پیچھے ہوں۔ یقیناً آپ کا کافی ہوشیار خاتون ہیں اور اپنے ارد گرد پر گہری نظر بھی رکھتی ہیں لیکن معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ اس ناچیز کے معاملے میں آپ سے تھوڑی سی چوک ہو گئی اور آپ اندازہ نہیں لگا پا گئیں کہ میری عقابی نظروں نے آپ کی فنکاری کو تار لیا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اگر میں اس وقت جبکہ آپ وہ اپورنڈ پر فیمو اپنے شوئڈر بیگ میں منتقل کر رہی تھیں یا اس موٹے کی جیب سے اس کا بٹوا نکال رہی تھیں، ذرا سا بھی شور مچا دیتا تو کیا ہوتا۔ میرے خیال میں تو آپ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہتیں۔ آج کے دور میں تو ویسے ہی ہر چھوٹے سے چھوٹا واقعہ ٹیلی ویژن یا سوشل میڈیا کے ذریعے منٹوں میں ہر ایک کے علم میں آ جاتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اگر ایسا ہو جاتا تو کیا ہوتا۔“ میرے الفاظ سے اس کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدل رہا تھا اور میں اس کی کیفیت سے حظ اٹھا رہا تھا لیکن اس نے بہت تیزی سے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے، تم نے میری چوری پکڑ لی اور خاموش رہ کر مجھ پر ایک احسان کیا لیکن یوں تعاقب کی تمہیں کیا ضرورت تھی؟ کیا تم مجھ سے اپنے اس احسان کا کوئی بدلہ چاہتے ہو؟“ اس کی نظروں میں شک تھا۔ میں اس کے انداز پر آہستہ سے ہنسا پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

”اپنی فنکاری کے لیے چوری کا لفظ استعمال کر کے آپ نے اپنے فن کی توہین کی ہے۔ اتنی ہنرمندی سے لوگوں کے بجوم میں اپنا کام کر جانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ میں تو آپ سے بے حد متاثر ہوا ہوں اور آپ کو آپ کی ہنرمندی کی داد دینے آپ کے پیچھے کھینچا چلا آ رہا تھا۔“

”کیا تم مجھ سے اپنا تعارف کرواؤ گے؟“ اس نے

سے چھوٹی تین بہنیں اور ہیں۔ بھائی کوئی نہیں ہے اس لیے میں ہی اپنے ماں باپ کا بیٹا بن گئی ہوں۔ ویسے بھی میں بچپن سے ذرا مختلف مزاج کی اور جرات مند لڑکی تھی۔ دوسال کی کمی کو میں نے کبھی اپنے لیے مسئلہ نہیں بنے دیا۔ ضرورت کی کوئی بھی چیز جو میرے پاس نہیں ہوتی تھی، میں بڑے آرام سے اپنی ہم جماعتوں اور آس پاس رہنے والی سہیلیوں سے حاصل کر لیتی تھی اور وہ بھی اتنی تمہارت سے کہ کبھی کسی کو مجھ پر چوری کا الزام لگانے کی جرات نہیں ہو سکی۔ بچپن کی یہ ہنرمندی میرے بہت کام آئی اور یہاں آ کر میں نے اپنی صلاحیت کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ شروع میں، میں ذرا چٹکی تھی اور تمہاری ہی طرح کے ایک نظر شاس نے مجھے عین موقع پر تازہ لیا تھا۔ اس نے بھی تمہاری طرح شور نہیں مچایا اور مجھ سے مل کر میری غلطی کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ میری تربیت کی ذمہ داری بھی سنبھال لی۔ اس کی تربیت نے مجھے اتنا ماہر کر دیا تھا کہ میں کبھی پکڑی نہیں گئی لیکن آج تم نے احساس دلایا کہ ابھی مجھ میں ایک آج کی کسرباتی ہے اور مجھے مزید تربیت حاصل کرنی چاہیے۔“

وہ یوں بول رہی تھی جیسے واقعی کسی اہم پیشے سے وابستہ ہو اور اپنے پیشے کے حساب سے مزید اعلیٰ تربیتی کورس کرنے کے بارے میں غور کر رہی ہو۔ میں اس کے انداز پر ہنسا اور دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تو اب تم کیا کرو گی؟ کیا دوبارہ اپنے استاد محترم سے رجوع کرو گی اور اسے بتاؤ گی کہ جناب ابھی مجھے مزید اعلیٰ تربیتی کورسز کی ضرورت ہے۔“

”میں چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتی۔“ میری بات پر وہ افسردہ سے انداز میں مسکرائی اور وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے اتنا ہنرمند بنانے والا شخص اپنی ذرا سی غلطی سے اپنی جان کھو چکا ہے۔ جلد از جلد زیادہ دولت کے حصول کے چکر میں اس نے ہتھیار کا استعمال شروع کر دیا تھا اور ہتھیار کے زور پر لوگوں سے ان کی قیمتی چیزیں جھیننے لگا تھا۔ ایک رات وہ ایک گاڑی والے کو روک کر اس سے اس کا موبائل اور نقدی وغیرہ جھین رہا تھا تو اسی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لیٹے ہوئے شخص کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس شخص کے لیٹنا ہوا ہونے کی وجہ سے اند میرے میں اسے آخر تک اس کی موجودگی کا اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا۔“

”اوہ.....“ اس کی افسردگی پر میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اس

طرح کے لوگوں کے مرنے پر عموماً لوگوں کو افسوس بھی نہیں ہوتا لیکن مجھے اس کے مرنے کا دکھ ہوا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کے علاج کے لیے جس کے دل میں سورما تھا، یہ سب کر رہا تھا۔ اس کے مجھ پر بہت سے احسانات تھے اور میں اس کے بعد اس کے بیٹے کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن حالات نے مجھے اجازت نہیں دی۔ اس کی موت سے مہینہ بھر پہلے ہی میں نے ایک ساتھ اپنی دو بہنوں کی شادی نمٹائی تھی اور میں تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ میرے والدین اور جاننے والوں کی نظر میں، میں ایک اچھی فرم میں اچھی ملازمت کرتی ہوں۔ دوست کی فیملی کی مدد کے لیے میں کوئی اندھا قدم اٹھا کر خود مشکل میں پڑنا یا بدنامی مول لینا انورزا نہیں کر سکتی تھی اس لیے مجھے اپنے دل پر جبر کرنا پڑا۔ میں اس کی تربیت اور بتائے ہوئے راہوں کے ذریعے اب بھی اپنا کام کر رہی ہوں لیکن اس کے بیٹے کے علاج کے لیے ابھی کچھ کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ میرے والدین میری سب سے چھوٹی بہن کا رشتہ بھی طے کر چکے ہیں اور ایک سال کے اندر مجھے اس کی شادی کے اخراجات کے لیے بھی رقم جمع کرنی ہے۔ کہنے کو میں نے اپنے والدین سے یہی کہا ہے کہ میں بہن کی شادی کے لیے اپنی فرم سے لون لے لوں گی لیکن تم ہی بتاؤ کہ کسی پرائیویٹ کمپنی میں ایک ٹیلی فون آپریٹر کو کون لون دیتا ہے۔ دے بھی تو چند ہزار سے زیادہ کی رقم ملنا مشکل ہے اور شادی پر لاکھوں کا خرچ آتا ہے۔ یوں میں بس اپنی ہی فکر میں لگی ہوئی ہوں۔ کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کی میرے پاس گنجائش ہی نہیں ہے۔“ اس کے چہرے پر گہری سوگوار تھی اور وہ یوں مجھے سب کچھ بتاتی جا رہی تھی جیسے میں اس کا کوئی بہت ہی قریبی اور رازدار دوست ہوں۔ شاید عرصے سے اسے کسی کو اپنے دل کی باتیں بتانے اور سنانے کا موقع نہیں ملا تھا جو وہ یوں اچانک ایک اجنبی کے سامنے دل کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

”پچھلے دنوں اتفاق سے میرے ہاتھ ایک ایسی چیز لگ گئی تھی کہ مجھے لگا کہ میں سارے مسائل سے غصے کی اہل ہو جاؤں گی لیکن جیسے وہ چیز اچانک میرے ہاتھ آ گئی تھی ویسے ہی اچانک ہاتھ سے نکل گئی اور یوں جو ایک امکان پیدا ہوا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔“ خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد وہ دھیمی سی آواز میں بولی تو میرا دل دھڑک اٹھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ان ہیروں کے بارے میں بات کر رہی ہے جو اتفاقاً میرے ہاتھ لگ چکے ہیں لیکن اس نے کل کر کچھ نہیں بتایا اور میں بھی چپ رہی رہا۔

تھے انہیں میں نے پہلے اپنا پرائیویٹ ٹکٹنے کی خوشخبری سنائی اور پھر یہ اطلاع دی کہ میں ملنے والی رقم شیئرز کے کاروبار میں لگا رہا ہوں۔

میں نے سچ سچ بھی تمہاری بہت رقم اس کام میں لگائی لیکن اصل مقصد دکھا دیا تھا اور اس دکھاوے کے ذریعے میں اپنا طرز زندگی دھیرے دھیرے تبدیل کر رہا تھا۔ میں نے اپنی رہائش تبدیل کر لی تھی اور موٹر سائیکل بھی دوسری لے لی تھی۔ اس کے بعد میں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنے پر غور کر رہا تھا۔ شاید کبھی مستقبل میں ایک ہوٹل کھولنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن فی الحال اسے اپنی بہن کی شادی کے لیے رقم جوڑنے کی فکر تھی۔ ہم دونوں ہی کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ہم جو کام کر رہے ہیں، اس میں ہماری تمام تر جسامت کے باوجود بہر حال پڑے جانے کے امکان کو یکسر مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے ہمیں کسی اور طرح اپنے قدم جمانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

چند مہینوں کے ساتھ میں ہی ہم اچھے دوست بن گئے تھے لیکن ابھی تک میں ان ہیروں کے متعلق شائلہ سے بات نہیں کر سکا تھا جو مجھے اس سے چھینے گئے سچ میں سے ملے تھے۔ حقیقت میں اس سے اس موضوع پر بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا اس صورت میں وہ مجھ سے ہیروں کی واپسی کا مطالبہ کرے گی یا کم سے کم بھی مجھے اسے حصہ تو دینا ہی پڑے گا۔ اس نے بھی اپنے حلق بہت کچھ بتانے کے باوجود بھی ان ہیروں کے سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ دوستی ہو جانے کے باوجود ہم دونوں اپنی اپنی جگہ تھوڑے سے محتاط بھی تھے۔ ہماری ملاقات ہمیشہ کسی پبلک پلیس پر ہوتی تھی۔ وہ تو خیر رہتی ہی ہاسٹل میں تھی لیکن میں نے بھی بھی اسے اپنے فلیٹ پر آنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ اس نے بھی مجھے اپنے ہاسٹل کا پتا نہیں بتایا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ہیرے بھی اسی جیولر کے ہاں فروخت کرتی جہاں ہم دوسری چیزیں بیچتے تھے۔ وہ بڑا خبیث آدمی تھا۔ شہر کے بڑے جیولر میں شمار ہونے کے باوجود چوری شدہ مال کئی گنا کم قیمت پر خرید کر بھاری منافع کمانے میں کوئی عار نہیں سمجھتا تھا اور چالاک اتنا تھا کہ کبھی خود براہ راست معاملہ نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے ایک ملازم کو اس کام کے لیے استعمال کرتا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اگر کبھی کوئی گڑبڑ ہوئی بھی تو وہ بے چارے ملازم کو قربانی کا بکرا بنا کر خود کو صاف بچالے گا۔ بہر حال یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ میں صرف اس بات پر غور کر رہا تھا کہ مجھے ہیرے اس شخص کو فروخت کر دینے چاہیے یا پھر

”تو پھر اب کیا کرنا ہے؟ تم مجھ سے مل لیے، میرے اے میں بہت کچھ جان بھی گئے پھر اب..... اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟“ اس نے اچانک ہی موضوع بدل لیا اور کھوجنے والی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”میرا خیال ہے کہ ہم اچھے دوست اور پارٹنر بن سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کا ساتھ یقیناً ہمیں فائدہ دے گا۔ تم اسے بہری خوش فہمی یا تکبر نہ سمجھو تو میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں تم سے بڑا فکرا ہوں لیکن میرے پاس ایسے رابطے نہیں ہیں کہ میں حاصل کی گئی ہر شے کی قیمت حاصل کر سکوں اس لیے مجھے کافی محتاط رہنا پڑے گا اور محدود دائرے میں کام کرنا پڑتا ہے۔ تم نے بتایا کہ تمہارے پاس رابطے ہیں تو ہم کچھ دواور کچھ لوٹی پالسی پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ پارٹنرشپ کر سکتے ہیں۔ تم بتاؤ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“ میں ایک دم ہی آپ جناب کا تکلف چھوڑ کر اسے تم کہہ کر مخاطب کرنے لگا جس پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور ایک لمحے کے لیے مجھے جا بھتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد بولی۔

”میں اس بارے میں غور کرنا چاہتی ہوں۔ دو دن بعد شام ساڑھے چھ بجے تم اسی جگہ آ جانا۔ میں نے تمہارے حق میں فیصلہ کیا تو میں بھی آ جاؤں گی ورنہ تم سمجھ لینا کہ میری طرف سے انکار ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ دو دن بعد میں تمہارے اقرار کے یقین کے ساتھ یہاں ضرور آؤں گا۔“ میں نے اسے جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دوپٹے کے نیچے چھپا اس کا رول اور کب کا بے مصرف ہو گیا تھا اور وہ بس بے نیالی میں اسے تھامے بیٹھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

میری توقع کے مطابق شائلہ نے میری پیشکش قبول کر لی تھی اور اب ہم پارٹنرز کی طرح کام کر رہے تھے۔ شائلہ میرے ساتھ رہ کر بہت سے گر سکے رہی تھی اور میں اس کے تعلقات کا فائدہ اٹھا کر اب ایسی چیزوں پر بھی ہاتھ ڈالنے لگا تھا جن کی طرف پہلے صرف اس لیے نظر کر نہیں کر پاتا تھا کہ انہیں ٹھکانے کیسے لگاؤں گا۔ اب قیمتی موبائل فون بھی بک جاتے تھے اور سونے کے زیورات کا بھی کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ آمدنی بڑھ جانے سے ہم دونوں اپنی اپنی جگہ خوش تھے۔ اس کے مشورے پر میں نے بھی اپنا لائف اسٹائل تبدیل کرنے کے لیے دھیرے دھیرے منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ یوں تو میرا کوئی بہت قریبی دوست نہیں تھا لیکن ملازمت کے حوالے سے جن چند گئے چنے لوگوں سے تعلقات

کوئی اور پارٹی تلاش کرنی چاہیے۔ میں غلبت میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک بہت بڑی رقم ہاتھ آ جانے کا خیال اگرچہ مجھے اچھا لگتا تھا لیکن میں ٹھنڈا کر کے کھانے کا قائل تھا۔ شاید یہ میرے مزاج کا مظہر اُدبی تھا کہ میں ابھی تک اپنے کام میں بہت کامیاب تھا اور بھی کسی مصیبت میں نہیں پھنسا تھا لیکن پھر ایک روز مصیبت خود ہی میرے گھر چلی آئی۔ اس روز فیکٹری سے آ کر ابھی میں منہ ہاتھ ہی دھو رہا تھا کہ کال بیل بجی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا تو سامنے شاملہ کوکھر بے دیکھ کر اچھل پڑا۔

”نہی..... تم یہاں؟“

”ہاں بھئی۔ اندر آنے کا راستہ تو دو۔ کیا دروازے پر ہی کھڑا رکھو گے؟“ اس نے مسکرا کر مجھے ٹوکا تو مجبوراً مجھے اسے اندر بلانا پڑا لیکن میں اپنی حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا اور اس سے بولا۔

”تمہیں میرے قلیت کا پتا کیسے چلا؟“

”بس اتفاق سے راستے میں میری تم پر نظر پڑ گئی اور میں نے اپنی گاڑی تمہاری موٹر سائیکل کے پیچھے لگا دی۔ اصل میں آج میں بہت اداس تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ کسی سے اپنا دکھ شیئر کروں بس اسی لیے میں تمہارے پیچھے چلی آئی۔“ اس نے بہت سادگی سے بتایا اور سچ سچ دیکھ کر نظر آنے لگی۔

”مظہر وہ میں تمہارے لیے کوئی کولڈ ڈرنک وغیرہ لاتا ہوں پھر ہم بات کرتے ہیں۔“ وہ میرے خوابوں کی شہزادی تو نہیں تھی لیکن بہر حال ایک خوبصورت لڑکی تھی جسے اداس دیکھنا مجھے اچھا نہ لگا اور اس کی اچانک آمد پر مجھے جو حیرت اور ناگواری محسوس ہوئی تھی، اسے بھول کر اس کی دل جوئی کے لیے کمر بست ہو گیا۔ ہم دونوں نے ساتھ پیٹھ کر کولڈ ڈرنک پی پھر وہ میرے پوچھنے پر اپنی اداسی کی وجہ بتانے لگی اور بولی۔

”میں نے تمہیں اپنے حسن کے بیٹے کے بارے میں تو بتا رکھا ہے تاکہ وہ شدید بیمار ہے اور اس کی ہارٹ سرجری ہونی ہے لیکن رقم کا بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک کچھ نہیں ہو پا رہا ہے۔“

”ہاں، اس بارے میں تو تم نے ابھی ہماری آخری ملاقات میں بھی مجھے بتایا تھا۔ واقعی یہ افسوس ناک بات ہے لیکن ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں ہی فی الحال ایسی پوزیشن میں نہیں کہ اتنی بڑی رقم کا بندوبست کر سکیں گے۔“ میں نے اپنے چہرے پر مصنوعی افسردگی طاری کر لی۔ حقیقتاً مجھے اس موضوع سے کوئی خاص دلچسپی نہیں

تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس شہر میں ہزاروں افراد ایسے ہوں گے جو صرف رقم نہ ہونے کی وجہ سے بے بسی سے موت کے میں جانے والے ہوں گے اور وہ بچہ بھی ایسے ہی افراد میں سے ایک تھا تو جیسے میں دوسرے لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر رہا تھا، ویسے ہی اس بچے سے بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”تم ایسی بات مت کرو افتخار! تم یہ مت کہو کہ تم نہیں کر سکتے۔ تم بہت کچھ کر سکتے ہو اور میں اتنے عرصے۔ اسی بات کا انتظار کر رہی تھی کہ شاید تمہارے اندر انسانیت کوئی ذوق جاگ جائے اور تم کچھ کر لو لیکن تم نے ثابت کرنا کہ میرا انتقال حاصل تھا اور اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ اس کا بوجھ اچانک ہی بدل گیا اور آنکھوں میں تپش سی محسوس ہونے لگی۔

”کیا مطلب..... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“ میں اس سے اس انداز پر ٹھوڑا سا ٹھٹھا کر گیا۔

”میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے تمہیں 11 روز پارک میں ہی پہچان لیا تھا کہ تم ہی وہ شخص ہو جس نے؟“ سے میرا دلچسپ تھا اور مجھے ان ہیروں سے محروم کر دیا تھا جو کا سودا کرنے کے لیے اس روز میں نے اس تقریبی مقام کسی سے ملاقات طے کر رکھی تھی۔ تمہارے دائیں ہاتھ میں چھ انگلیاں ہیں اور یہ بات میں نے کلچ چینیے جانے کے دوران ہی نوٹ کر لی تھی۔ جس روز تم نے میرا تعاقب کیا اور پھر میں نے پارک میں تم سے ملاقات کی تو میں نے دیکھ لیا کہ تمہارے دائیں ہاتھ میں چھ انگلیاں ہیں۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایسے تو میرے علاوہ کئی اور افراد بھی ہوں گے۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

”سچ میں مت بولو، ابھی میری بات ختم نہیں ہو رہی ہے۔“ اس نے گویا میرے بات کاٹنے پر براہمان کر مجھے ٹوکا اور بولنے لگی۔

”تمہارے دائیں ہاتھ کی چھ انگلیاں دیکھ کر مجھے ج شک ہوا تھا وہ تمہاری آواز سن کر اور بھی پختہ ہو گیا۔ میں ایک ٹیلی فون آپریٹر ہوں اور مجھ میں آوازوں کو پہچاننے کی غیر معمولی صلاحیت ہے اس لیے تمہاری آواز کے سلسلے میں میرے دھوکا کھانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر اگر

پر سے تمہارا اپنے بارے میں فنکار ہونے کا دعویٰ..... تم قبول کرنے کے لیے کن کن دلیلوں کو رد کر دو گے ڈیزرائی فنکاروں پر اتنا جھوٹ نہیں چٹتا میرے دوست۔ فنکارا بڑے سچے لوگ ہوتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں طنز کا زہر اور اب میں اس ریوالور کو بھی دیکھ سکتا تھا جو اس نے جاسا

’ کمال کر مجھ پر تان لیا تھا۔ آج اس ریوالور پر سائیکلنسر لگا ہوا تھا۔

”میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، امیرے پاس کوئی ہیرے نہیں ہیں۔“ میں نے اپنا لہجہ نرم کر کے اسے قائل کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ ساتھ ہی میری طرف اس کے ریوالور پر جرحی ہوئی تھیں۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل جاتا تو وہ میرے لیے مسئلہ نہیں تھی۔ میں آرام سے اسے قابو میں کر لیتا۔

”تم بڑے ڈھپٹ آدمی ہو! ایسے لوگ اپنا اور دوسروں کا وقت ہی ضائع کرتے ہیں۔ میں پہلے ہی تم پر اپنا غاص وقت ضائع کر چکی ہوں اس لیے تمہیں مزید مہلت نہیں دے سکتی۔ میں صرف دس تک گنتی گنوں گی اور تمہیں گولی مار دوں گی۔ تمہارے مرنے کے بعد میں آرام سے تمہارے اس فلیٹ کی تلاشی لے سکتی ہوں۔“ اس کے لہجے کی سفاکی نے مجھے دلا دیا اور میں نے اس سے کچھ اور کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا لیکن وہ گنتی شروع کر چکی تھی۔

ایک..... دو..... تین..... چار..... معمولی سے وقفے وقفے گنتی کا سلسلہ جاری تھا۔ اب میرے پاس حرکت میں آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کا گلاس اب بھی موجود تھا۔ میں نے اپنے اور اس کے درمیان فاصلے کا تعین کیا اور اس کے پانچ کہنے سے پہلے ہی ناک کر گلاس اس کے ریوالور والے ہاتھ پر دے مارا۔ اگلے لمحے میں اپنا پیٹ پکڑے ہوئے تھا اور خون کے اس دھبے کو پھینک پھینک آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جو بہت تیزی سے بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی میرے پیٹ میں لگ چکی تھی۔

”تم اتنے بڑے احمق ہو کر فنکار ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں تمہیں سچ سچ گولی مارنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی لیکن تمہاری حرکت کی وجہ سے اضطرابی طور پر مجھ سے گولی چل گئی۔ بہر حال، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب تم اپنے انجام کا انتظار کرو۔“ اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی لیکن اس نے حیرت انگیز طور پر عملیت پسندی کا مظاہرہ کیا اور میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر میرے ہاتھ جیر بھی اسی کرسی پر باندھ دیے جس پر میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پورے انتظام کے ماتھے آئی تھی اور میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ آج اتفاقاً میرے گھر آئیں آئی ہے بلکہ اس نے پہلے ہی سے شاید میرا پیچھا کر کے ابھرنا شروع کیا تھا۔ وہ اتنی محتاط تھی کہ جس گلاس میں اس نے کولڈ ڈرنک پی تھی، وہ اٹھا کر اپنے بڑے سے شولڈر بیگ میں

ڈال لیا تھا اور باقی کی کارروائی اسی بیگ سے نکالے گئے ربر کے دستانے پہن کر کر رہی تھی۔ میں بے بسی سے اپنے پیٹ سے اپنا خون اور اس کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی مہارت سے میرے فلیٹ کی تلاشی لے رہی تھی۔ آخر کار اس نے وہ ہیرے دریافت کر لیے جو حالات کو اس فوج تک لے آئے تھے۔ ہیرے حاصل کرنے کے بعد وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہوئی اور ہونٹوں پر سفاکی میں مسکراہٹ بھرا کر بولی۔

”کسی مرتے ہوئے آدمی سے تھوڑا سا سچ بول دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اس لیے میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میں ٹیلی فون آپریٹر ضرور ہوں لیکن کسی پرائیویٹ فرم میں نہیں بلکہ پولیس کی انجیل کرائم برانچ میں اور میرا محزن بھی وہیں ہے تعلق رکھتا تھا لیکن ہم دونوں ہی کی ضرورت پانچ بجے کی دی ہوئی خواہ سے پوری نہیں ہو سکتی تھیں اس لیے ہم تم جیسے فنکاروں میں شامل ہونے پر مجبور ہو گئے۔ تم بہت بڑے فنکار ہو لیکن آج مرتے مرتے تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ملی بہر حال شیر کی خالہ ہوتی ہے۔“ اس نے کہنے کے بعد وہ نہایت اطمینان سے باہر کی طرف بڑھ گئی۔ میں بھی دھندلائی ہوئی نظروں سے لحد یہ لحد قریب آتی موت کا انتظار کرنے لگا لیکن کیا ایک فنکار ایسا ہی بے بسی کی موت مر سکتا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا قاتل قاتل عیش کرتا پھرے؟

ہرگز نہیں..... شاید عرف شی کو فنکار سے فنکاری کی پوری قیمت ادا کرنی پڑتی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس فلیٹ میں ایک خفیہ کیمرا نصب تھا۔ یہ کیمرا میں نے حال ہی میں نصب کیا تھا اور باہر جاتے ہوئے اسے آن کر دیتا تھا تاکہ میری غیر موجودگی میں اگر فلیٹ میں کوئی گڑبڑ ہو تو مجھے پتا چل جائے۔ شاید میری واپسی کے بعد اتنی جلدی وہاں آگئی تھی کہ مجھے کیمرا آف کرنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس بعد میں میرے فلیٹ کی تلاشی لیتی تو اسے سارے ثبوت مل جاتے اور شاید اپنی تمام تر چالاکی کے باوجود پکڑی جاتی۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں ایک فنکار ہوں اور کسی فنکار کا خون بھلا کیسے رانگاں جاسکتا ہے۔ کچھ نہیں تو یہ پولیس کی ایک کالی بیٹھ پکڑوانے میں ہی کام آجائے گا۔ پھر تو آپ مائیں گے تاکہ میں ایک فنکار ہوں۔ یہ بھی محض شاید حسین اتفاق تھا کہ میرا ایک دوست مجھ سے ملنے آپہنچا اور پھر وہ ہوا جس کا شاید اس کالی بیٹھ نے سوچا بھی نہ ہو گا اور آج میں..... آپ کو اپنی فنکاری کے بارے میں بتانے کے لیے زندہ ہوں۔



تیسرا اور آخری حصہ

باغی

محمد ہر میر

ضد ہویا بغاوت... ہمیشہ غیر متوقع حالات اور نظریات کے خلاف جنم لیتی ہے۔ جہاں بے اصولی کا راج پروہاں بغاوت جنگ کرتی ہے اور جنگی صورت حال میں پھول نہیں بنتے بلکہ زخم لگتے ہیں... کبھی اپنوں کو اپنوں کے ہاتھوں اور کبھی دشمن کو دشمن کے ہاتھوں مگر... مشترکہ مفاد دشمن کو بھی دوست بنا کر خونی رشتوں میں دراڑیں ڈال دیتا ہے... جس طرح وہ باپ اور بیٹے ایک دوسرے کے مقابل اپنے حصے کا کردار ادا کر رہے تھے... وہ جو معاشرتی ناسوروں کا علاج کرنے نکلا تھا جب جانے پہچانے رستوں پر چلتے چلتے اپنے ہی پیروں کے آبلوں کو دیکھا تو روح تک زخمی ہو گئی اور پھر اندر کی وحشتوں نے اسے باغی بنا کر اپنوں کی نظروں میں ہی مجرم ٹھہرا دیا جبکہ دوسری جانب اس کا دل اس نازک اندام حسینہ کی ادائوں پر اس طرح آیا کہ اس کے کردار کی کالک اس کی گھنی زلفوں میں مدغم ہو کر رہ گئی مگر... کب تک... پھر وقت کا وار ایسا چلا کہ ہر رنگ اپنی الگ شناخت کر گیا۔

مشق کی جتوں خیر لیں میں پیار میرے رشتوں کو دہراتے واسے ایک باغی کی کشتا



میں جن کے خلاف اٹھنے والا تھا، ان کے خلاف تو کوئی آواز بھی اٹھتی تو دبا دی جاتی۔ وہ اس ملک کے طاقتور ترین لوگ تھے۔ حکومتیں ان جیسوں کی مدد سے نہیں بلکہ ان کی مرضی سے چلتی تھیں۔۔۔۔۔ میں اکیلا ان کا مقابلہ کہاں تک کر پاؤں گا۔ پھر میرے خیال کی رد دوسری سمت بہہ نکلی اور اگر سب کچھ دیا نہ ہوا جیسا میں نے چاہا تب۔۔۔۔۔ تب کیا ہوگا؟ کیا ہوگا اگر میری رپورٹ پڑھ کر رودی کی نوکری میں پھینک دی گئی اور کسی نے کوئی ایکشن نہ لیا۔۔۔۔۔؟ میں نے ایک طویل سانس بھرا اور دل ہی دل میں خود سے کہا۔

”اب تو جو ہوگا دیکھا جائے گا لیکن ایک بات طے ہے۔ میں اس سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا کیونکہ اب مجھے اس دنیا میں کسی کی پروا نہیں رہی تھی۔۔۔۔۔“ اور یہ ایک ایسا احساس ثابت ہوا کہ چانک ہی آشتی کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ شدت کرب سے میں ہونٹ پیچھے کر رہ گیا اور اٹھ کر چھت کی منڈیر کے پاس آ گیا۔

”تمہارا خیال میرے لیے سوہان روح ہے لیکن اس کرب سے میں اذیت نہیں کشید کروں گا۔ میں تمہارے کردار کی کالگ سے اب بھی نفرت نہیں کروں گا۔ لیکن میری محبت پر اب تمہارے نام کا سایہ بھی نہیں پڑے گا۔ میں تمہاری یاد سے جان نہیں چھڑا سکتا لیکن تمہاری یاد کو ایک غصہ بنا کر رکھوں گا جو کبھی میرے قدم ہلکے نہیں دے گا۔ کبھی میرا عزم ٹوٹنے نہیں دے گا۔“

☆☆☆

میری رپورٹ دو حصوں میں شائع ہوئی۔ پہلا حصہ نوادرات کی اسمگلنگ سے متعلق تھا جس میں چودھری حشمت علی اور مراد آباد کے اس خفیہ راستے کا ذکر تھا جو پاکستان اور انڈیا کے بارڈر پر تھا۔ دوسرے حصے میں قومی میوزیم کے پیش۔۔۔۔۔ نوادرات کی کشمگی اور انہیں تحائف کے ذریعے استعمال کرنے کا ذکر تھا جس میں اہم سرکاری عہدیداران ملوث تھے۔ ان رپورٹ پر پہلے دن کچھ زیادہ پانچل نہیں بپا ہوئی لیکن دوسرے دن ایک ٹی وی چینل نے اسے بریکنگ نیوز کے طور پر پیش کر دیا۔ رات ہونے تک یہ ”نوادرات اکیڈمیل“ میڈیا پر ہاٹ ٹکیک بن گیا۔

مجھے گیارہ بجے پہلا فون آیا۔ یہ ایک پوزیشن لیڈر کی طرف سے تھا جس نے مجھے اس ”کارنامے“ پر مبارک باد دی تھی۔ دوسرا فون دھمکی آمیز تھا، اس نے اپنا نام تو نہیں بتایا لیکن اس کے لہجے کی پیش بتا رہی تھی کہ اس کا نام میری رپورٹ میں ضرور ہوگا۔۔۔۔۔ اور پھر کالز کا تانتا بندھتا چلا گیا۔

ٹی وی چینل میری رائے جانتا چاہتے تھے کیونکہ اس سے پہلے جب میں نے اسٹاک ایکس چینج کا مینی اکیڈمیل اور ایس بی جینڈ کے جعلی مقابلے کے بارے میں ایوٹی ٹیو رپورٹس پیش کی تھیں تو ان کا کافی چرچا ہوا تھا۔ ایس بی والا کیس تو سپریم کورٹ میں چلا گیا تھا جس میں میری رپورٹس نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ لہذا صحافت میں میری کریڈیٹبلیٹی تو پہلے ہی بن چکی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میڈیا کو اس میں زیادہ دلچسپی اس لیے ہے کیونکہ یہ رپورٹس ایک بیٹے نے اپنے باپ کے خلاف لکھی تھیں۔ پوزیشن کا دلچسپی لیتا بیٹا مجھے میں آتا تھا۔ حکومت کے خلاف وہ ایسی محاذ آرائیوں کو استعمال کرنے کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ میں نے برکت صدیقی صاحب کو کال کی۔ ان سے رابطہ کافی دیر بعد ہوا۔

”دفتر کے سبھی فون مصروف ہیں، ہر طرف سے کالیں آرہی ہیں۔۔۔۔۔“ وہ کہہ رہے تھے۔ ”ٹی وی دیکھ رہے ہو؟ ہر نیوز چینل پر تمہاری رپورٹ کے تذکرے ہیں۔۔۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم سے رابطہ نہ کیا گیا ہو لیکن تمہارا موقف کہیں نظر نہیں آ رہا۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرا موقف یا میری رائے اتنی مختصر نہیں کہ فون پر لی جاسکے۔ مجھے ٹاک شو میں بلائیں گے تو جاؤں گا۔“

”تمہیں ضرور جانا چاہیے ورنہ تمہارے خلاف ایسی لابی بن جائے گی جو الٹا تمہیں اس معاملے میں پھنسا دے گی۔۔۔۔۔ تم جانتے ہو میڈیا جتنا بھی آزاد ہے لیکن کئی چینل اور صحافی حکومت کے پیسوں سے چلتے ہیں۔ تمہیں اپنا موقف پہلے سے ہی واضح کر دینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ اسے اتنا بگاڑ دیں کہ بعد میں تم اسے سلجھانہ سکو۔۔۔۔۔ میری بات سمجھ رہے ہونا؟“ وہ کہہ رہے تھے۔

”آپ کی بات ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میں سوچتا ہوں اس بارے میں۔۔۔۔۔ اوکے خدا حافظ!“ میں نے فون بند کر دیا اور ٹی وی آن کر دیا۔ ہر طرف اسی کے تذکرے تھے۔ کوئی اسے سچ مان رہا تھا اور کوئی مفروضہ قرار دے رہا تھا۔ ایک چینل تقسیم کے بعد دریافت ہونے والے ایسی کئی رازوں کا ذکر کر رہا تھا جنہیں بند کر دیا گیا تھا۔ جہاں ہر نیوز چینل پر میری رپورٹ کے تذکرے تھے وہیں میڈیا پر وہ لوگ بھی موجود تھے جو میری رپورٹ کی زد میں آچکے تھے۔ ساری رپورٹس کو مسترد کرتے ہوئے میرے خلاف باتیں کی جارہی تھیں کہ میں انہیں بلیک میل کر رہا ہوں اور وہ بہت جلد میرے خلاف چٹک عزت کا دعویٰ دائر کرنے والے ہیں۔ میں خاموشی سے ٹی وی

تھوڑی دیر بعد ہی مجھے عمران بھائی کی کال موصول ہوئی۔ ”تم نے اچھا نہیں کیا چھوٹے..... پتا نہیں میں اسے تمہاری بے وقوفی سمجھوں یا کچھ اور.....“ ان کا اشارہ میری رپورٹ کی طرف ہی تھا۔

”چودھری صاحب کا ری ایکشن کیا ہے؟“ میں نے ان کی بات پر دھیان نہ دیتے ہوئے پوچھا۔

”انہوں نے ہی فون کرنے کو کہا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ کای سے کہو کہ اپنی رپورٹ کو مجھ تک محدود رکھے۔ باقی لوگوں کو اس میں ملوث نہ کرے۔ اور یہ بھی کہہ رہے تھے کہ کای نے اچھا نہیں کیا..... میں نے پہلی بار اباجی کو اتنا خاموش دیکھا ہے۔ بھائی شفیق تو بہت غصے میں تھے کہہ رہے تھے کہ اباجی شہر جاؤں گا اور کای کو کان سے پکڑ کر واپس لاؤں گا..... اباجی کے سامنے پیش کروں گا اور جو اباجی فیصلہ کریں گے کای سے زبردستی اس پر عمل کرواؤں گا لیکن اباجی نے انہیں روک دیا.....“ وہ بولتے جا رہے تھے۔

”اچھا..... اور تم نے بھی کچھ کہا ہو تو کہہ لو، میں سن رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں نے کیا کہا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سب جانتے ہیں کہ تم کرو گے وہی جو تمہارا دل چاہے گا۔ میں جانتا تھا کہ کبھی نہ کبھی تم ایسا بے وقوفانہ کام ضرور کرو گے جسے حماقت کی اعلیٰ مثال کہا جاسکے گا..... لیکن یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ تم اپنے باپ کی ہی مخالفت شروع کر دو گے۔“ وہ طنز کرتے ہوئے بولے۔

”میں ایک صحافی ہوں عمران بھائی..... حقائق کو عوام کے سامنے لانا میرا کام ہے۔ یہ میری ذاتی جنگ نہیں ہے..... یہ میرا کام بھی ہے اور میرا فرض بھی۔“

”فرض تو تمہارا بیٹے ہونے کا بھی ہے۔ بہر حال اباجی والا معاملہ تو ایک طرف رہا، تم نے تو بھڑوں کے پورے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ تم نے جن لوگوں سے پنگا لیا ہے وہ عام لوگ نہیں..... اگر تم اپنی پکی صحافت پولیس اور پرنسپلینوں کی کرپشن تک محدود رکھتے تو تمہارے لیے اچھا تھا۔ اب کی بار جنہیں تم نے چھیڑا ہے، وہ تمہاری سوچ سے زیادہ طاقتور ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ تم قانونی طور پر انہیں ان کی غلطیوں کی سزا دلو اور گے تو یہ تمہاری بھول ہے چھوٹے..... میری مانتو تو اب بھی وقت ہے اس معاملے کو سلجھا لو۔“ عمران بھائی کہے جا رہے تھے۔

”سزا دلوانا میرا کام نہیں اور اس معاملے کو اگر سلجھانا ہی

”تم پاگل ہو..... بالکل پاگل۔“ وہ جھنجھلا کر بولے۔
 ”شاید واقعی میں ہوں..... یا پھر ہو رہا ہوں۔“
 ”تم جیسے باغی اکیلے ہی انقلاب کے نعرے لگاتے ہیں اور پھر منظر سے ایسے غائب ہوتے ہیں کہ نشان تک نہیں ملتا۔ بہر حال اپنا خیال رکھنا چھوٹے.....“ انہوں نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

اگلے دن میں نے ایک نیوز چینل کے ٹاک شو میں صاف صاف بتا دیا کہ میری رپورٹ حقائق پر مشتمل ہے اور میرے پاس ان تمام لوگوں کی کرپشن کے مکمل ثبوت بھی موجود ہیں اور اس بات کی سچائی کے لیے میں نے کچھ تصاویر بھی شو کر دیں جس میں ایم اطہر جیسا بڑا عہدیدار بھی نظر آ رہا تھا۔ اس شو کے بعد ”نوادرات اسکینڈل“ کی گونج سرکاری ایوانوں میں بھی سنائی دینے لگی۔

”کہاں ہو تم؟“ صدیقی صاحب فون پر پوچھ رہے تھے۔
 ”گھر میں ہوں اور بی بی دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔
 ”اکیلے؟“ وہ چونکے۔

”نہیں..... میرے ساتھ ایک عدد دوطوطا اور ایک عدد بلی بھی ہے۔“ میں نے گود میں بیٹھی سیامی بلی کو سہلاتے ہوئے کہا۔

”اچھا تیار ہو جاؤ، میں گاڑی بھیج رہا ہوں۔“ انہوں نے فون بند کیا تو میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد میں ان کے آفس میں ان کے سامنے بیٹھا کافی کی چنگیاں لے رہا تھا۔
 ”اپوزیشن لیڈر خالد شیخ نے مجھ سے ملاقات کی ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتے تھے تاکہ وہ یہ کنفرم کر سکیں کہ اگر تمہارے پاس اہم ثبوت ہیں تو وہ پریمریم کورٹ میں یہ کیس دائر کرنے کو تیار ہیں۔“

”اور یقیناً آپ نے مجھے ان کے جانے کے بعد بلوایا ہے؟“ انہوں نے طویل سانس لیا اور کہا۔ ”صحافت حقائق کا پردہ اٹھاتی ہے۔ مجرموں کے ساتھ لڑتی نہیں ہے۔ تمہاری رپورٹ چونکہ حکومتی عہدیداران کے خلاف ہے لہذا اپوزیشن تو اسے استعمال کرے گی لیکن تم صحافی ہو۔ تمہاری عزت ایک نیوزل صحافی کے طور پر ہے۔ تم نہ تو سیاست دان ہو اور میں چاہتا ہوں کہ نہ ہی تم ان کے آلہ کار بنو۔ تمہیں اقتدار کی جنگ کا حصہ نہیں بننا چاہیے۔“

میں نے پرسوج انداز میں کہا۔ ”میرا بھی یہی خیال

ہے لیکن دوسری طرف میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں ملوث افراد کو سزا بھی ملے۔“

”چاہئے کی بات مت کرو۔ چاہتے تو ہم بہت کچھ ہیں لیکن زمینی حقائق اور اپنی حدود کو بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔“

”لیکن میرے پاس ایک اور طریقہ بھی ہے۔ آپ خالد صاحب سے کہیے کہ وہ اپنے طور پر سپریم کورٹ میں کیس دائر کر دیں۔ میں اپنے تمام تر ثبوت اور شہادتیں کورٹ میں پیش کروں گا۔“

”لیکن وہ تمہاری اس بات پر یقین کیوں کرنے لگے؟“

”انہیں یقین دلانے کے لیے میں ان کے وکیل سے بات کر سکتا ہوں اور انہیں اپنے تمام تر ثبوت بھی دکھا سکتا ہوں اور اس اسکیٹزل کے متعلق اور بھی بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن یہ ملاقات آف دی ریکارڈ ہوگی۔“ میں نے کہا تو وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔

”یعنی تم پس منظر میں رہ کر ان لوگوں کے خلاف کام کرنا چاہتے ہو لیکن یہ بہت خطرناک ہے کامران۔“ لمحہ بھر کا توقف لیتے ہوئے وہ مزید بولے۔

”تم جانتے ہو بیورو کیسی اور حکومت کا آپس میں ایسا ہی رشتہ ہوتا ہے جیسے کہ ہمارے ہاں خاندانی نظام ہوتا ہے۔ فلاں کی خالد فلاں کی ہو ہوئی ہے، اور فلاں کی ممائی بھی فلاں کی جمائی بھی اور فلاں کی کزن بھی۔۔۔۔۔ ایسے ہی کچھ بیورو کیسی اور حکومت کا نظام ہوتا ہے۔ ایک بیورو کریٹ کی وزیر کا بیٹا بھی ہوتا ہے، کسی جنرل کا داماد بھی اور کسی دوسرے سول آفیسر کا سالابھی۔۔۔۔۔“

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔؟“ میں نے اس کرپوچھا۔

”تمہاری رپورٹ کی زد میں آنے والے افسران بھی تنہا نہیں ہیں۔ اپنے اپنے طاقتور رشتے داروں کو حرکت میں لارہے ہیں۔ سیم اطہر کا سر سینیئر فارن آفیسر ہے۔ حکومت اور اپوزیشن ہی نہیں، ملک کے کئی طاقتور اداروں میں بڑی اپروچ ہے اس کی۔۔۔۔۔“

”یہ بات میں پہلے سے جانتا ہوں۔۔۔۔۔ اور اسی طرح اگر مزید جائزہ لیا جائے تو ان سب کے ان جیسے بے شمار طاقتور عہدوں والے رشتے دار نکل آئیں گے لیکن مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔۔۔۔۔ اگر مجھے ان کے عہدوں سے ڈرنا ہی تھا تو یہ رپورٹ کیوں تیار کرتا۔“ میں نے سر دلچے میں کہا تو جانے کیوں وہ چوک گئے۔ ان کی جہان دیدہ نگاہیں مجھے ٹول رہی تھیں۔

”تم سر پھرے تو تھے لیکن اتنے نہیں۔۔۔۔۔ میں

نہیں جانتا کہ تمہارے ساتھ پچھلے چند دنوں میں ایسا کیا ہو گیا ہے کہ تمہارے رویے اور انداز میں ایک ”بے پروائی“ کی جھلک لگتی ہے۔ تمہارا بزرگ ہونے کے ناتے یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ جلد بازی مت کرنا۔ مجھے خبر ملی ہے کہ تمہارے ساتھ وہ لوگ بات چیت کرنا چاہتے ہیں جن کے خلاف تم نے لکھا ہے۔ اسے میری درخواست سمجھو یا نصیحت۔۔۔۔۔ ان کی بات سننا اور اپنی کہنا۔۔۔۔۔ لیکن دونوں صورتوں میں جذباتیت سے گریز کرنا۔“

”ٹھیک ہے، میں ایسا ہی کروں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ کافی اور باتیں ختم ہو چکی تھیں، میں گھر واپس آ گیا۔

رات تقریباً دو بجے کا وقت تھا۔ میری آنکھیں آسٹریلیا میں طوطے کے شور سے کھلیں جو چلا رہا تھا۔ لاؤنج میں رکھے فون کی بیل بھی بج رہی تھی۔

☆☆☆

”دیکھو بیٹا۔۔۔۔۔ صحافت انتقامی حملوں یا جذباتی رپورٹنگ کا نام نہیں ہے۔ ایک صحافی حکومت اور سماج کی خوبیوں و خامیوں کی حقیقت آمیز تصویر دکھاتا ہے لیکن اس کے بعد وہ اس سے اپنا تعلق ختم کر لیتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ تمہارے گھر میں تمہارے اور تمہارے باپ کے درمیان کیا چل رہا ہے لیکن اگر تم اس لڑائی کو گھر تک محدود رکھتے تو زیادہ بہتر تھا۔۔۔۔۔ مگر اب تو جو ہوتا تھا وہ ہو چکا۔ اب آگے اس معاملے کو مزید بگاڑنے کے بجائے مصالحت کی جانب چلنے کی کوشش کرو تو بہت اچھا ہوگا۔“

وہ ہاریش شخص جو مجھ سے یہ سب کہہ رہا تھا، میں صحافت کی دنیا میں بر ملا انہیں اپنا استاد کہا کرتا تھا۔ رات کے اس تیسرے پہر مجھے چک شہزاد کے اس فارم ہاؤس میں بلوایا گیا تھا جو رونگ پارٹی کی ایک اہم شخصیت سے منسوب تھا۔ فون آنے کے بعد میں نے سب سے پہلے صدیقی صاحب سے رابطہ کیا اور پھر انہی کے مشورے سے یہاں پہنچا تھا۔ اس وقت یہاں ان سینئر صحافی تد رائل کے علاوہ چار آدمی اور مجھ بیٹھے تھے۔ میرے باکل سامنے گرے سفاری سوٹ میں بیٹھ وہ ڈشنگ سائینڈ سکندر رنجت تھا۔ سیم اطہر کا سر۔ اس کے پرفیوم اور اٹلیوں میں دبے کیوبن سگار کی مہک سارے گھرے میں پھیل رہی تھی اور وہ بڑی بے نیازی کے ساتھ اپنے موبائل فون پر مسلسل ٹائپنگ کر رہا تھا۔ اس نے اب تک ایک بار بھی نظر اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ میرے دائیں جانب رکھے صوفوں میں سے ایک پر تہہ۔۔۔۔۔ ہر مسکراہٹ سجائے سلیم قریشی بیٹھا تھا جس سے میری ایک

”کوشش کر کے دیکھ لیں۔ ہو سکتا ہے میری اوقات کی یاد دہانی کروا تے ہوئے آپ کو اپنی حیثیت کا پتا چل جائے۔“
 میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
 ”دیکھو..... تم اپنی حد سے آگے بڑھ رہے ہو۔“
 خورشید انور بول پڑے۔

”نسیم..... کامران..... ہم یہاں مصالحت کے لیے بیٹھے ہیں.....“ قدیر بابا نے میرے جواب دینے سے پہلے ہی ٹوک دیا پھر میری طرف مڑے۔

”یہ جو تم باتیں کر رہے ہو یا جو ہم تم سے کہنا چاہتے ہیں، تم اس سے اچھی طرح واقف ہو۔ یہ صحافی سچائیاں، عوام کا درد، کرپشن کا دکھ، ضمیر کی آواز وغیرہ وغیرہ..... یہ سب ٹیکنیکل ٹرم تک محدود ہیں۔ انہیں بول کر یا لکھ کر استعمال کیا جائے تو خوبصورت لگتی ہیں لیکن حقیقت کی دنیا میں ان کا کوئی کام نہیں۔ ان سب بہانوں کو جانے دو۔ بہتر ہوتا کہ اس رپورٹ کو شائع کرنے سے پہلے تم یا تمہارے ایڈیٹر صدیقی صاحب چند لوگوں سے مشورہ کر لیتے تو صورت حال اتنی خراب نہ ہوتی۔ لیکن اب بھی کھیل تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ابھی معاملہ اتنا آگے نہیں گیا۔ اصل چیز وہ شہادتیں ہیں جو تمہارے پاس ہیں۔ ہمیں ان پر بات کرنی ہوگی اور اس معاملے کا کوئی بہتر حل تلاش کرنا ہوگا کامران بیٹے۔“

”حل تلاش کیا کرنا ہے، وہ تو آپ کے نسیم صاحب بتا چکے ہیں۔ مجھے یہاں رات گئے اس لیے بلوایا ہے کہ میری قیمت طے کی جائے.....!“ میں نے برہمی سے کہا۔ ”ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ میں چودھری شمس علی کا بیٹا ہوں جس سے وہ لاکھ ڈھکی کر س لیں ان کی وراثت میں کروڑوں کا حصہ ہے میرا۔ میں کوئی ٹٹ پونجیا نہیں اور نہ ہی یہ رپورٹس میں نے ان لوگوں کو بلیک میل کرنے کے لیے لکھی ہیں۔“

”دیکھو کامران! نسیم نے غلط لفظ استعمال کیا۔ اس کے لیے میں معافی مانگتا ہوں۔“ خوش شکل سلیم قریشی نے گفتگو کی لگام خود تھام لی۔ ”تمہیں بابا قدیر کی باتوں کو ٹھنڈے دماغ سے سوچنا ہوگا۔ اپنی فیملی ورلڈ سے تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلو پلیز..... حقیقت کی دنیا کا سامنا کرو۔ یہاں کے حقائق کچھ اور ہیں..... تمہارے لیے یہ محض ایک رپورٹ ہے۔ لیکن تمہاری اس رپورٹ سے درجن بھر قابل آفیسر شدید متاثر ہوں گے..... اور چلو میں مان لیتا ہوں کہ یہ درجن بھر لوگ اس جرم میں ملوث ہیں لیکن اگر ان کے خلاف یہی ہونا ہے تو پھر پورے سسٹم کے خلاف یہی کچھ کرنا چاہیے کیونکہ یہاں تو جی بھی کچھ کر رہے ہیں اور جانتے ہو اگر

اوقات فارم ہاؤس پر بھی ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ چیف منسٹر لیکچریری خورشید انور اور ان سے ذرا سا ہٹ کر ایک مہ نے پرسم اطہر بیٹھا مجھے گھور رہا تھا اور میرے بائیں ہاں قدیر بابا براجمان تھے..... دونوں ہاتھوں کو اپنے عصا لہا پر لٹکا کر وہ مجھ سے ہی مخاطب تھے۔

”بابا..... آپ کو یہ لگتا ہے کہ میں اتنا جذباتی ہوں کہ ہاضمی صاحب سے ذاتی اختلاف پر میں نے ایک ایسی رپورٹ لکھ دی ہے جس سے ان کی عزت کو نقصان پہنچ سکے.....؟ اور کسی انتقامی کارروائی کے سلسلے میں کچھ بیوروکریٹس کے نام بھی اس میں شامل ہو گئے ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں نا مجھے۔ میں ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ میں ایک الوبیسی کیئر جرنلسٹ ہوں۔ میرے سامنے اس ملک کے طاقتور لوگوں کا ایک جرم آیا ہے اور وہ بھی اپنے پورے حقائق کے ساتھ..... تو یہ میری ڈیوٹی ہے کہ اسے عوام کے سامنے پیش کروں۔“

”میں جانتا ہوں بیٹا..... اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔ ”لیکن تم نوجوان ہو..... خون گرم ہے تمہارا..... تمہاری صحافی قابلیت میں مجھے کوئی شبہ نہیں لیکن ابھی تمہیں بہت کچھ سیکھنے اور بہت کچھ جاننے کی ضرورت ہے۔ صحافت کے اصول اپنی جگہ لیکن عکسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر بات سامنے لانے والی نہیں ہوتی۔ بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ پوزیشن، ٹائٹنگ، حالات کا رخ دیکھنا پڑتا ہے۔ صحیح حالات میں ایک کڑوا سچ بعض اوقات امن بر باد کر کے رکھ دیتا ہے۔“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”بات اگر یہی ہے تب بھی میرے خیال میں میری رپورٹ کی ٹائٹنگ اور حالات بالکل مناسب ہیں۔“

”سنو.....“ قدیر بابا نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا لیکن اسی لمحے نسیم اطہر بول پڑا۔

”قدیر صاحب! یہ لیکچر پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔ فی الحال اس سے وہ بات کریں جس کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس سے پوچھیے اس کی قیمت!“
 ”پوچھنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے نسیم اطہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ویسے ہی بتا دیتا ہوں، میری قیمت ادا کرنے کی اوقات اس کمرے میں بیٹھے کسی بھی شخص کی نہیں ہے۔“

وہ بھڑک اٹھا۔ ”یو بلڈی نان سنس..... اوقات تو تمہیں ہم وومنٹ میں یاد کروادیں گے۔“

پورے سسٹم کے خلاف یہ سب کیا گیا تو کیا ہوگا؟ اس ملک کا چلتا ہوا ہتیار رک جائے گا۔ ہمیں دفاتر میں سرکاری عمارتوں میں کوئی نظر نہیں آئے گا۔ ایک دن..... صرف ایک دن کے لیے مان لو کہ تم اس سسٹم کے ہر کرپٹ آفیسر کو اس کے کام سے روک دو گے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ کروڑوں ڈالر کا نقصان ہوگا اس ملک کو.....“

”شاید آپ کی اکنائکس کمزور ہے سر..... کروڑوں ڈالر کا نقصان نہیں ہوگا بلکہ فائدہ ہوگا کیونکہ صرف ایک دن اس ملک میں اگر ہر سرکاری افسر ”کرپشن“ نہ کر سکے تو کروڑوں ڈالر کا فائدہ ہوگا..... نہیں یقین تو آزما کر دیکھ لیں۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ ہونٹ پیچ کر رہ گئے۔

”تم چاہتے کیا ہو؟“ قدیر بابا زچ ہو کر بولے۔

”بابا! میں ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ ایک غریب اپنے بھوکے بچے کے لیے روٹی چوری کرے تو قانون اسے سزا دیتا ہے لیکن جب یہ بھرے ہوئے معدے اور بھری ہوئی تجوروں والے ”چوری“ کرتے ہیں تو قانون بے بس کیوں ہو جاتا ہے؟“

کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔ میرے سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ میں اب اٹھنا چاہتا تھا۔ لیکن بھی کمرے میں ابھی تک خاموش بیٹھے سکندر بخت نے حرکت کی۔ انہوں نے موبائل ایک طرف رکھا اور نظر کا چشمہ اتار کر میری طرف مردنگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کامران! ابھی نام ہے نا تمہارا.....؟“ ان کی آواز میں ایک گونج تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس سے پہلے تم نے جور پورٹس نکلیں، کافی مشہور ہوئی تھیں اور بہت زبردست رسائیں ملا تھا ان پر..... غالباً ہمیں کوئی جرنلزم کا ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ اچھی بات ہے لیکن مسٹر کامران..... کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری ان تہلکہ خیز رپورٹس کا موجودہ اسٹیشن کیا ہے؟ جن اسٹاک مارکیٹ کے بروکرز کا منی اسکیٹل تم نے پکڑا تھا، جانتے ہو وہ کہاں ہیں اس وقت وہ آج کل یورپ میں عیش کی زندگی گزار رہے ہیں اور تمہارا دوست ایس بی جیو..... جس پر جعلی پولیس مقابلہ ثابت بھی ہو گیا تھا اسے معطل کر کے پولیس کورس کے بہانے ملک سے باہر بھیج دیا گیا ہے۔ وہ کچھ عرصے بعد واپس آئے گا تو ترقی کر کے پہلے سے بڑا افسر بن چکا ہوگا۔ دیکھو کامران! میں تمہارا پھر اگر تشنگو کرنے کا قائل نہیں۔ لہذا اپوائنٹ بر آتا ہوں۔ تم نے سچ کہا کہ تمہاری قیمت کوئی نہیں لگا سکتا لیکن یہ رپورٹس تمہاری محنت ہیں اور ہر محنت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ اب یہ تم پر

ہے کہ تم اسے کس شکل میں لیتے ہو۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

وہ خاموش ہوا تو جیسے سب میری طرف فیصلہ کن انداز میں دیکھ رہے تھے۔ میں نے چند لمحوں کے لیے سوچا اور پھر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”آپ کی باتیں سن کر میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں صحیح لوگوں کے خلاف صحیح جگہ پر ہوں۔“

”کامران.....“ سلیم قریشی نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ سکندر بخت اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اٹھنا دیکھ کر باقی سب بھی اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ گئے۔ سکندر بخت نے اپنا موبائل اٹھایا، چشمے کو آنکھوں پر جمایا اور نیم اطہر کی طرف دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔

”دنیا میں دو طرح کے انسانوں کو سمجھنا ناممکن ہے..... ایک وہ جنہیں زندگی سے بہت پیار ہوتا ہے، دوسرے وہ جنہیں زندگی سے بالکل بھی پیار نہیں ہوتا۔ اس بندے سے بات کرنا بے کار ہے۔“ اور وہ یہ کہہ کر دروازے کی طرف تیز قدموں سے بڑھ گئے۔

چند لمحوں تک نیم اطہر، خورشید اور اور سلیم قریشی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر وہ تینوں بھی ایک ساتھ ہی باہر نکل گئے۔

کمرے میں میرے ساتھ قدیر بابا اکیلے رہ گئے۔ وہ گہری سوچ میں گم تھے۔ میں نے عصا پر دھرے ان کے جھریوں زدہ ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ ایک لمبا سانس لے کر رہ گئے۔

”یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا۔“ انہوں نے کہا۔

میں نے فقط یہ شعر پڑھا۔ ”ہم صبح پرستوں کی یہ ریت پرانی ہے..... ہاتھوں میں قلم رکھنا، یا ہاتھ قلم رکھنا۔“

وہ خاموش رہ گئے۔ میں وہاں سے اٹھ آیا۔

☆☆☆

رپورٹ کا ہنگامہ اگلے دن بھی جاری تھا۔ کورٹ نے از خود نوٹس لیتے ہوئے اس معاملے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ ٹوٹ افسروں اور تفتیشی اداروں کو عدالت میں بلوایا گیا تھا۔ اخباری تبصروں، میڈیا کے پروگرامز اور میری رپورٹ کو اس مقدمے کا حصہ بناتے ہوئے منن جاری کر دیے گئے تھے۔ البتہ ابھی تک چودھری حشمت علی سمیت چند اثر افراد کے نام عدالت میں پکارے نہیں گئے تھے۔

☆☆☆

”تمہیں اپنی سیکورٹی پر توجہ دینی ہوگی۔ معاملہ گمبیر ہوتا جا رہا ہے اور تم بائیک پر گھوم رہے ہو۔“ صدیقی صاحب ناراضی سے کہہ رہے تھے۔

”میں گاڑی میں ہی آنا چاہتا تھا لیکن عین موقع پر پتا چلا کہ اس کا ناز بچکر ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ یہ دن ایسی بھاگ دوڑ میں گزر رہے ہیں کہ ان چیزوں کی طرف دھیان ہی نہیں دیا جاتا لہذا بائیک لے کر نکل آیا۔“ میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا..... کچھ دیر پہلے ہی میں ان کے دفتر میں پہنچا تھا۔

”پھر بھی احتیاط کیا کرو۔ فارم ہاؤس کی میٹنگ میں تمہیں صاف الفاظ میں دھمکیاں دی گئی ہیں۔ انہیں محض دھمکیاں مت سمجھنا..... وہ لوگ بہت آگے تک جاسکتے ہیں۔“ ”میرا نہیں خیال کہ کوئی اتنا بے وقوف ہوگا۔ عدالت میں کیس چل رہا ہے۔ ساری دنیا کو معلوم ہو چکا ہے۔ ایسے میں اگر مجھے خراش بھی آئے گی تو ذمہ دار کون ہوں گے؟“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”اس بات کو اتنا ہلکا بھی مت لو..... تمہارے پاس ایسے ثبوت ہیں جو ان لوگوں کو مجرم ثابت کر سکتے ہیں۔ وہ لوگ تمہیں ان ثبوتوں کو ہرگز ہرگز عدالت تک نہیں لے جانے دس گے، چاہے اس کے لیے انہیں کچھ بھی کرنا پڑے.....“ وہ دوافی میں فکرمند تھے۔

”میں سمجھتا ہوں اسی لیے تو میں آپ کے پاس ایک بہت ضروری کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر مجھے کچھ بھی ہو جاتا ہے تو کم از کم وہ ثبوت عدالت تک ضرور پہنچ جائیں۔“

”اس کا بہترین حل تو یہی ہے کہ تم وہ سارے ثبوت اپنے وکیل کے حوالے کر دو..... یا پھر کسی اعتماد والے شخص کو اس جگہ کا علم ہونا چاہیے جہاں وہ ثبوت تم نے چھپا رکھے ہیں۔“

”میں نے بھی یہی سوچا تھا..... لیکن وکیل والی بات پر دل نہیں مانا۔ دوسری بات ٹھیک ہے اور اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے ایک بدلفافہ جیب سے نکال کر ان کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ”موجودہ حالات میں، میں آپ سے زیادہ کس پر اعتماد کر سکتا ہوں۔ اس لفافے میں اس جگہ کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں میں نے ثبوتوں کی اصل فائلز رکھی ہیں۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو ان ثبوتوں کو عدالت تک پہنچانے کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوگی۔“

”یہ تم مجھ بوڑھے پر اتنا بوجھ کیوں ڈال رہے ہو؟“ ”آپ کے علاوہ میں کسی اور پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔“

”خدا نہ کرے کہ تمہیں کچھ ہو لیکن دوسری صورت میں میں تمہاری اس امانت کو اس کی منزل پر پہنچانے کی پوری کوشش کروں گا لیکن اگر مجھ سے کسی قسم کی کوئی کوتاہی ہوگئی تو.....؟“ وہ تذبذب میں تھے اسی لیے انہوں نے ابھی تک اس لفافے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

”آپ پر اعتنا دیکھا ہے تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ آپ کی طرف سے کسی بھی قسم کی کوتاہی پر میری طرف سے آپ بری الذمہ ہوں گے۔ آپ پر کوئی مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔“ میں نے انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا تو انہوں نے لفافہ اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اسی لمحے مجھے اپنے گھر سے چوکیدار کی کال رسید ہوگئی۔

”سر! ہمارے گھر پر فائرنگ ہو رہی ہے۔“

☆☆☆

”وہ چار لوگ تھے، دو موٹر سائیکلوں پر سوار۔ دونوں موٹر سائیکلیں بغیر نمبر پلٹ کے تھیں۔ فائرنگ دو آدمیوں نے آٹومیک رائفل سے کی اور تقریباً دس رائنڈز فائر ہوئے۔ تمہارے چوکیدار کی طرف سے جوابی فائرنگ پر وہ لوگ بھاگ نکلے لیکن اگر ہم ان کی فائرنگ کا ٹارگٹ نہ بنیں تو پتا چلتا ہے کہ گولیاں مین گیٹ اور ساتھ والی دیوار پر ماری گئیں جن کا مقصد صرف اور صرف ڈرانا تھا۔ کسی کی جان لینا ان کے پلان میں شامل نہیں تھا۔“ نیلی وردی میں بلوس بھوری آنکھوں والا اسپیکر مجھے وہ تفصیل بتا رہا تھا جو میں خود بھی سوچ سکتا تھا۔

”آپ کو کسی پر شک ہے مسٹر کامران؟“

”میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں ایک صحافی ہوں اور صحافیوں کے کئی دشمن ہو سکتے ہیں..... نئے بھی اور پرانے بھی..... میں اندازے کی بنا پر کسی کو مارتو نہیں کر سکتا۔“ میں نے کہا۔

”ہوں دیے پرانے دشمن صرف ڈراتے نہیں ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے، یہ نئے بھی تو ہو سکتے ہیں۔“

”ہوئے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے..... یہ پتا چلانا آپ کا کام ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد کپ نیچے رکھ دیا اور اٹھتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے پھر جیسے آپ کی مرضی..... میں ما معلوم افراد کے خلاف ہی پرچہ کاٹ دوں گا لیکن آپ کو تھوڑی تکلیف کرتے ہوئے تھانے آنا پڑے گا۔“ میرے سر ہلانے پر وہ اپنے ساتھ آئے اے ایس آئی اور دونوں کانٹیلوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس کا اتنا مؤدبانہ لہجہ اس لیے نہیں تھا کہ

”وہ ہیں تا پورے دو عدد کانسٹیبل میرے گھر کا پہرا دینے کے لیے۔“

”ان مجرموں کی گرفتاری کے بعد انہیں ہٹا لیا جائے گا۔ میں اعلیٰ افسران سے بات کرتا ہوں کہ انہیں کچھ دن کے لیے ہٹایا نہ جائے۔“ انہوں نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اسی شام وہ خبر بھی آگئی جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ سیکورٹی ایجنسیاں مراد آباد کے جنگل میں موجود خفیہ راستے تک پہنچ گئی تھیں۔ یہ میری ایک کامیابی تھی کیونکہ خفیہ راستے کے ہونے کا مطلب تھا کہ یہاں سے اسٹگنک بھی ہوتی رہی ہوگی مگر اس کے برعکس جو خبریں آرہی تھیں، ان کے مطابق یہ ریسٹ ہاؤس اور خفیہ راستہ طویل عرصے سے بند تھے اور انہیں ایسی کوئی شے نہیں ملی جس سے اندازہ ہو کہ یہ جگہ کبھی عرصے سے استعمال ہوتی رہی ہے اور یوں حکومتی قبضے کے بعد وہاں سے اسٹگنک کا باب ختم ہو گیا۔

ٹیلیفون کی تیل بج رہی تھی۔ دوسری جانب میرا دوست فیصل بٹ تھا۔

”اُوئے تو کیا کرتا پھر رہا ہے..... کوئی رابطہ نہیں کوئی اطلاع نہیں۔ ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ..... کل شام تیرے اسلام آباد والے گھر پر فائرنگ ہوئی تھی لگتا ہے تو گھر میں نہیں تھا ورنہ مجھے پورا یقین ہے کہ ان میں سے کوئی بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔“

”کھوتے کے سینک..... میں نے سنا تھا کہ تو اپنے منشر کے ساتھ امریکا گیا تھا۔ انہیں واپس آئے مہینا ہو گیا تو کہاں رہ گیا تھا.....؟“ میں نے پوچھا۔

”میں امریکا سے نہیں سودیہ سے واپس آ رہا ہوں۔ منشر کے کچھ یار بنی عرصے پر چارہ تھے۔ ساتھ میں رپورٹنگ کے لیے مجھے بھی لے گئے۔“

”سرکاری پیسوں پر عمرہ کر کے آرہا ہے تو..... مطلب اب تو سرکار کی نمک حلائی کرنی پڑے گی تجھے..... پھر تو اپنی چٹنے والی نہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ آج کل تیری سرکار سے اپنی بن نہیں رہی۔“

”اُوئے ان کی ایسی کی تھی..... کا ہے کی نمک حلائی..... دوست یار سے بڑھ کر ادا کون ہوتا ہے۔“

”میں ہنس پڑا۔“ احسان فراموش..... جن کے پلے سے عمرہ کر کے آرہا ہے انہی کے خلاف بولے گا؟“

”یار بولنا تو نہیں چاہیے..... پر تیرے جیسے سجن کے لیے یہ بھی کر سکتا ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں نے فی دی

میں صحافی تھا بلکہ اس لیے تھا کہ میں ایک جاگیر دار کا بیٹا بھی تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ وہ اپنے ساتھ موجود دونوں کانسٹیبلوں کو گھٹ پر چھوڑ گیا تھا۔ اس کے بعد کافی دیر تک مجھے صحافی برادری کی طرف سے کالیں موصول ہوتی رہیں وہ میرا حوصلہ بڑھا رہے تھے اور مجھے یقین دلارہے تھے کہ وہ سب میرے ساتھ ہیں۔

”ہم کل پریس کلب کے سامنے احتجاج کر رہے ہیں۔ تمہیں ایک پریس کانفرنس کرنی چاہیے..... تاکہ لوگوں کو بتا چلے کہ تمہاری جان کو کون لوگوں سے خطرہ ہے۔ اس طرح تمہارا پیس بھی مضبوط ہوگا۔“ صدیقی صاحب نے مجھے مشورہ دیا جو کچھ دیر بحث کے بعد میں نے مان لیا لیکن دوسرے دن صبح ہی صبح مجھے میرے ایک صحافی دوست کا فون آیا جو مجھے فی دی دیکھنے کا کہہ رہا تھا۔ جب میں نے فی دی آن کیا تو وہاں وہی ایکسپرس پریس کانفرنس کر رہا تھا جس سے کل میری ملاقات ہوئی تھی۔

”گزشتہ رات ہم نے معروف صحافی کے گھر فائرنگ کرنے والے چاروں مجرم گرفتار کر لیے ہیں۔ مجرموں کا کہنا ہے کہ وہ چوری کی غرض سے گھر میں گھستا چاہتے تھے لیکن گارڈ کی فائرنگ سے انہیں ناکامی ہوئی اور وہ جواباً فائر کرتے ہوئے فرار ہو گئے لیکن آج صبح کراچی کپنی کے بس اسٹینڈ سے یہ لوگ گرفتار ہو گئے اور انہوں نے اپنا جرم بھی تسلیم کر لیا ہے۔“

صدیقی صاحب کا فون آیا۔ وہ بھی اسی رپورٹ کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ میں نے ہنس کر کہا۔

”اب احتجاج کا تو کوئی جواز نہیں بنتا کیونکہ پولیس نے شاندار کارکردگی دکھاتے ہوئے نہ صرف مجرموں کو گرفتار کر لیا ہے بلکہ ساری واردات کو چوری کا رنگ بھی دے دیا۔“

”خیر احتجاج تو ضرور ہوگا کیونکہ ایک صحافی پر حملہ ہوا ہے لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آرہی کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا ان لوگوں کا خیال تھا کہ تم ایسی دھمکی سے ڈر جاؤ گے؟“

”شروعات تو ایسے ہی ہوتی ہیں صدیقی صاحب..... یہ تو فقط ایک ٹریلر تھا۔ اصل فلم تو ابھی انہوں نے ریلیز بھی نہیں کی۔“

”مجھے تمہاری سیکورٹی کی فکر ہے۔“ وہ پریشانی سے کہہ رہے تھے۔ ”تم اپنے بھائیوں سے کیوں نہیں کہتے۔ وہ کچھ لوگ بیچ دیں تمہاری سیکورٹی کے لیے.....“

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ بھائیوں نے تو بہت پہلے سے کہہ رکھا تھا لیکن میں انکار کرتا رہا تھا۔

ایسا ہوا نہیں۔

☆☆☆
”بھائی..... یہ کیا ہے؟“ میں نے کمر میں چبھن محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

”اے پستول کہتے ہیں۔ چپ چاپ چلتے رہو.....
بریک مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ غرایا۔

”ہائے اللہ..... پپ..... پستول..... وہ جس سے
مگ..... کوئی نکلتی ہے؟“ میں نے خوفزدہ انداز میں کہا۔
”خیر، تم کہہ رہے ہو کہ اس کا ہاتھ“

وہ۔ ”وہ میرا خوف دیکھ کر مطمئن سا ہو گیا۔

”مم..... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اگر مم..... مجھے راتے میں ہارٹ ایک ہو گیا تو ہم دونوں بائیک سے گر

”نہیں ہوتا تمہیں اٹیک..... اتنے نازک نہیں ہو جاتا“

..... اور یہ ہینڈل کو دائیں بائیں کیوں کھمارہے ہو.....
 ٹیک سیدھی رکھو۔“ اس نے پٹل کو مزید چبھوایا۔

”نن..... نہیں وہ..... ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ آپ کو
..... کیا چاہیے؟ موبائل میں گھر بھول آیا ہوں.....“

لیک ریٹ کی ہے اور جیب میں ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ نہیں ہیں۔“

”اے“..... اغوا بالحق..... آ..... کیسے؟ اتنا کہ.....
 ”جانتا ہے۔“..... مجھے تو صرف مہیں لے.....

میرے چھوٹے چھوٹے ماں باپ ہیں۔ بوڑھے
 بچے ہیں، ان سب کا کیا ہوگا؟“ میں نے روتے

”اے رونا بند کر اور اسپینڈ بڑھا..... ورنہ ابھی تکبیر

”وہ جھنجھلا کر بولا۔ میں نے پہلے گیسٹر میں
تھتے ہوئے ریس کو پوری طرح گھما دیا اور بائیں ہاتھ میں دبا

ایک دم چھوڑ دیا۔ ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ بائیک

لکھی۔ میں نے ہینڈل کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور ذہنی پر تیار تھا اس لیے میں بایک کے ساتھ ہی چپکا رہا لیکن

جیسے ہی مجھے اس کے گرنے کا احساس ہوا، میں نے
پر گرفت چھوڑتے ہوئے سڑک پر چھلانگ لگا دی اور اس

آواز میں چلا رہا تھا۔ پہل اس کے ہاتھوں سے نکل کر

رپورٹ دیکھنے کے بعد پرانے اخبار دیکھے ہیں۔ تیری رپورٹ پڑھی تو سمجھ گیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بس مجھے ایک بات بتادے یا روتے چاچا جی (چودھری حسرت) کو بیچ میں کیوں ڈال لیا؟“

”وہ چل نہیں آئے..... باقی لوگ راستے میں آگئے تھے۔ میں نے یہ رپورٹ چودھری شمس علی کے بارے میں ہی لکھی تھی لیکن تو جانتا ہے کہ ایسے تمام غیر قانونی کام..... ملی بھگت کے بغیر ممکن نہیں..... سو وہ افسر بھی چل نہیں آگئے۔“ میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”مجھے ساری دنیا میں اپنے باپ کے علاوہ اور کوئی مارگٹ نہیں ملتا تھا..... ویسے چاہاجی کا کیرد عمل ہے؟“

”تبدیلی کا آغاز اپنے گھر سے ہی ہوتا ہے۔ دیے
 فودھری صاحب اس معاملے میں بالکل خاموش ہیں۔“
 ”تبدیلی کا ایسی کئی سیڑھیاں ہیں۔ جن کا آغاز

بہداری کی ایسی نئی چیزیں تھیں..... جس چیز کی تبدیلی کرنے جا رہا ہے تو..... یہ معاشرہ ٹھیک ہونے والا ہے۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”نہیں..... اس معاشرے کو ٹھیک کرنے والا کوئی نہیں لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ٹھیک کرنے والا ہم میں سے ہے۔“

ایک ہو۔ تم بھی ہو سکتے ہو لیکن تمہیں اس بات کا ادراک
میں ہے۔“

میر کی بات سن کر وہ بولا۔ ”پھر تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ مجھے ادراک نہیں ہے اسی لیے تو ہنس کھیڑ رہا۔“

”کب مل رہا ہے..... گھر آ جا.....“ میں نے کہا۔

”میں تو ادھر لاہور میں ہوں۔ پرسوں اسلام آباد
 لگا سیدھا تیرے پاس..... اپنا خیال رکھنا۔“ فون بند

یا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی اور گھر میں میرے طوطے اور
کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ کیونکہ ہاسٹل اور پھر فلیٹ میں

ہنے کی عادت نے مجھے اکیلا رہنے کا عادی بنا دیا تھا۔ کھانا
نے میں وقت لگ سکتا تھا۔ میں نے سوچا باہر نکلا جائے۔

میری ساری زندگی میرے ساتھ تھی۔ میرے استاد پر اس نے بتایا کہ کاشیہل

ل آیا۔ ابھی میں اپنی گلی سے نکلا ہی تھا کہ کچھ ہی دور روڈ

نے اسے ساتھ بٹھالیا۔ اسے تھوڑا بلاک میں جانا تھا لیکن

”مم..... مجھے بہت درد ہو رہا ہے..... مجھے اسپتال لے جاؤ۔“ وہ کراہا۔

”میرا اصول ہے کہ میں ایک بندے کو ایک بار ہی لفٹ دیتا ہوں اور ویسے بھی تیرے کمرے کی کچھ تو سزا خچے ملتی چاہیے۔“ میں اسے وہیں چھوڑ کر اپنی بائیک ڈھونڈتا ہوا آگے چلا آیا۔ کافی آگے سڑک سے نیچے جھاڑیوں میں وہ مجھے مل گئی۔ اس کی نیکی چپک گئی تھی اور چٹکی کی تاریجی ٹوٹ گئی تھی لیکن جب میں نے اسے ٹائٹ کیا تو باقی سب کچھ ٹھیک تھا۔ میں وہیں سے واپس گھر ہوا۔ میرا دماغ سوچوں کے پندرہ میں گھرا ہوا تھا۔ کل گھر پر فائرنگ اور آج یہ واقعہ..... کیا وہ لوگ احمق تھے جو یہ سب کچھ کر رہے تھے؟ کیا انہیں لگ رہا تھا کہ میں دو ٹکے کے بدماشوں اور پستولوں سے ڈر جاؤں گا..... یا پھر یہ کوئی چال تھی؟ کوئی ایسی چال جسے میں سمجھ نہیں پا رہا تھا..... لیکن جیسے ہی میں گھر پہنچا تو میرے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ گیٹ بظاہر بند تھا لیکن دھکیلنے پر کھلتا چلا گیا۔ چونکدار اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ اسے کلور فارم سے بے ہوش کرنے کے بعد اس کی ٹھیکس کس کر لان کی ایک کیاری میں پھینک دیا گیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پاؤں کھولے اور وہیں گھاس پر لٹا کر برآمدے کی طرف بڑھا تو چونک گیا۔

برآمدے کی سیڑھیوں پر میں نے خون کے قطروں کی ایک قطار دیکھی۔ سفید پتھروں سے بنے فرش پر خون کے سرخ قطرے ایک قطار کی صورت میں لائونج کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں کسی ربوٹ کی طرح ان قطروں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ لائونج کا ادھ کلادروازہ میں نے ہاتھ بڑھا کر پورا کھول دیا..... تیز میوزک کی لہر میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میری نظریں خون کے قطروں پر رہی جی نہیں جو کریم کلر کے قالین پر آگے بڑھتے ہوئے صوفوں اور گھاس ٹیبل پر سے ہوتے ہوئے سامنے کی دیوار کی طرف جا رہے تھے۔ سفید دیوار پر میرے ہفت رنگ آسٹریلین طوطے کی لاش چمکی تھی۔ اس کے دونوں پردوں کو پھیلا کر چاقوؤں کی مدد سے دیوار پر اس طرح گاڑا گیا تھا جیسے اسے صلیب چڑھایا گیا ہو۔ اس کے جسم سے پہنے والا خون لکیروں کی صورت میں دیوار پر سے نیچے اترتا ہوا اب جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔

میوزک کی آواز کانوں کے رستے میرے رگ دپے میں ساری تھی۔ جن خون کے قطروں کا میں پیچھا کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا وہ اس دیوار سے اور آگے بڑھ رہے تھے۔ اب کی بار ان کا رخ سیڑھیوں کی طرف تھا۔ میرے دل کی دھڑکن خوف سے تیز ہوتی جا رہی تھی اور میں ان قطروں کا پیچھا کرتے

لکھ ساؤڈ پر کم ہو گیا تھا۔ میں نے جانتے ہی اس کے زخمی ہونے پر ٹھوکر لگائی۔ وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح اڑا رہا۔ میں اسے زخمی ٹانگ سے کھینچ کر سڑک کے دائیں طرف موجود درختوں کے تنچ میں پھینچ لایا۔ ”نام کیا ہے ہیرا؟“ میں نے اس کے زخمی تنچے کو ہاتھ سے دباتے ہوئے پوچھا۔

”شش..... شاید.....“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔

”شاہد صاحب یہ بتانے کی تکلیف گوارا کریں گے کہ آپ کو میرے لیے کس نے بھیجا ہے؟“

”تیرے باپ نے؟“ وہ چلا یا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے دبا دیا تھا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ گالیاں پکتنے لگا۔

”دیکھ میرے پاس زیادہ نام نہیں ہے..... اور نہ ہی میرے پاس.....“ بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ میرے والوں کا جواب دیتا رہ..... ورنہ دیکھ لے کہ سڑک ساری خالی ہے۔ میں تیرے پاؤں سے رسی باندھ کر موٹر سائیکل کے ہاتھ اس سڑک پر دو تین کلومیٹر بھی کھینچوں تو تیرے جسم کی ماری کھال اتر جائے گی اور کوئی دیکھنے والا بھی نہیں لگا..... میں جانتا ہوں تو صرف ایک مہرہ ہے۔ مجھے بس اپنے

س کا نام بتانا..... میں نے سر دلچے میں کہا۔

”اسحاق ساقا..... نام ہے اس کا۔“

”لجے سے تو مجھے تو لاہور یا لگتا ہے۔ وہ ساقا بھی لاہور یا رہی ہے؟“

”وہ گوجر خان کا سب سے بڑا بد معاش ہے۔ میں لاہور سے اس کے پاس ایک اور کام سے گیا تھا لیکن اس نے میرے تیرے پیچھے اسلام آباد بھیج دیا۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔

”تو کیا کہا گیا تھا تجھ سے میرے بارے میں؟“ میں نے پوچھا۔

”تیری فوٹو دکھائی تھی اور گھر کا پتا بتایا تھا۔ کہا تھا کہ تم لاہور آسا ڈراوا دیتا ہے..... اور بس۔“ اس کی بات سن کر

میں حیران رہ گیا۔

”کیا مطلب..... تم مجھے اغوا کرنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے؟“

”اگر اغوا کرنا ہوتا تو کیا میں اکیلا آتا اور وہ بھی ل؟ میں نے تو تھوڑی دور تک تجھے پستول سے خوفزدہ

تھا، تاہم تقریباً ایک گھنٹے کے لیے گھر سے باہر رکھنا تھا۔“ وہ ہنسنے ہوئے بول رہا تھا اور مارے حیرت کے میں کتنی ہی کچھ بول بھی نہ سکا۔

ہوئے سبز حیاں چڑھنے لگا تھا۔ اوپر پہنچ کر یہ خون کے قطرے ایک بند دروازے کے نیچے سے اندر جا رہے تھے۔ میں نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر تاریکی تھی۔ میں نے بائیں جانب دیوار پر لگے تختل پر سے تمام بتیاں روشن کر دیں اور اس کے ساتھ ہی ایک اور خوفناک منظر میرے سامنے تھا۔ میری سیاہی ملی کو باقاعدہ پھانسی دی گئی تھی۔ اس کا بے جان جسم تنکھے کے ساتھ ایک رسی کے ذریعے جھول رہا تھا چند لمحوں میں گم صم سا اسے دیکھتا رہا پھر اچانک مجھے جیسے ہوش آ گیا۔ میں بھاگتا ہوا سامنے کی الماری کی طرف آیا۔ جیسے ہی میں نے اس کے پٹ کھولے، ایک گیلٹا سا رومال میری ناک سے ٹکرایا۔ ایک ناگوار سی مہک میرے احساسات کو اندھیرے میں دفن کرتی چلی گئی۔ بے ہوشی کے بے بس کر دینے والے احساسات کے پردے پر کچھ تصویریں تھیں۔ ایک چہرہ جس کے ہونٹوں سے قطرہ قطرہ خون ٹپک رہا تھا۔ نیم تاریکی میں ڈوبا ایک ہال نما کمرہ..... ہانپتا ہوا ایک گھوڑا جس کا بدن پسینے سے بھگا ہوا تھا..... آگ کے شعلوں میں گھرا ایک گھر..... سفید دیوار پر معلوب کیے گئے آسٹریلین طوطے کی لاش.....!

☆☆☆

میری آنکھیں ایک نیم تاریک کمرے میں کھلیں اور بہت دیر تک میرے احساسات سوئے ہی رہے۔ سر درد اور منگی کی سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے چکراتے سر کو تھامتے ہوئے خود کو سنبھالا۔ میں اس وقت ایک بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ جب میں اٹھ کر بیٹھا تو مجھے شدید تھابت کا احساس ہوا۔ میرے دلوں ہاتھوں کی پشت پر رونے لگے تھے جن میں ڈرب کی سوئی اتاری جاتی ہے۔ بیڈ کے سرہانے پڑی ایک چھوٹی سی ٹیبل پر پانی کی بوتل پڑی تھی۔ میں نے بوتل کو منہ سے لگایا اور غٹا غٹا اسے پیتا چلا گیا حتیٰ کہ بوتل خالی ہو گئی۔ بازوؤں میں جھن سی ہو رہی تھی۔ قمیص کی آستین اوپر چڑھاتے ہوئے مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ میرے جسم پر کپڑے بھی تبدیل کیے جا چکے تھے۔ اس وقت میں نے ہلکے براؤن رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ بازوؤں کے منسلک پر مجھے ایسے نشانات نظر آئے جیسے وہاں کئی انجکشن لگائے گئے ہوں۔ میں حیران ہوا کہ میں تو کورود فارم سے ہی بے ہوش ہو گیا تھا پھر انجکشن کی نوبت کیوں آئی؟ میں بیڈ سے نیچے اتر کر کھڑا ہوا تو تھابت بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پہلا قدم تو میں نے یوں اٹھایا جیسا کوئی بچہ نیا نیا چلنا سیکھ رہا ہو۔ جسم میں توانائی کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کمرے

پر طائرانہ نظر دوڑائی دیواریں سپاٹ تھیں لیکن میرے بیڈ کے عین سامنے دیوار کے ساتھ ایک نی دی ٹرائی اور اس پر بڑا سا نی دی پڑا تھا جس کے نچلے ریک میں ایک سی ڈی پلیئر بھی نظر آ رہا تھا۔ کمرے کے کونے میں دس سے بارہ سبز حیاں اوپر کو جاتی ہوئی ایک بند دروازے تک ختم ہو رہی تھیں جن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کمرہ اصل ایک تہ خانہ ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں بنا دروازہ یقیناً ہاتھ روم کا تھا، میں اسی طرف آیا۔ واش بین میں کوئی گھما کر میں نے پانی کھولا لیکن سامنے لگے شیشے میں خود کو دیکھ کر مجھے ایسا جھٹکا کہ میں کتنی ہی دیر ساکت کھڑا رہ گیا۔ میں روزانہ شیشو کرنے کا عادی تھا اور جب مجھے بے ہوش کیا گیا اس دن بھی صبح صبح میں نے خود اپنی شیشو بنائی تھی مگر اس وقت میرے چہرے پر ڈاڑھی تھی۔ اتنی گھنی ڈاڑھی جیسے میں نے کئی ہفتوں سے شیونہ بنائی ہو۔ چہرہ بھی کمزور سا لگ رہا تھا اور سر کے بال بھی بڑھ چکے تھے۔ مجھے اپنی تھابت کا احساس ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں چند گھنٹے نہیں بلکہ کئی دن تک بے ہوش رہا تھا یا پھر بے ہوش رکھا گیا تھا۔ میں واپس آکر بیڈ پر گر گیا۔ دل کی دھڑکن کنپٹیوں میں گونج رہی تھی۔ مجھے انجکشنوں کی مدد سے بے ہوش رکھا گیا تھا اور انہی کے ذریعے مجھے اتنی خوراک دی جا رہی ہوگی کہ میں زندہ بھی رہوں..... لیکن ایسا کیوں کیا گیا اور میں کب تک بے ہوش رہا تھا؟ میری گھڑی، موبائل وغیرہ سب کچھ غائب تھا۔ جانے کتنے دنوں سے میں یہاں بے ہوش پڑا رہا اور پھر سب سے خطرناک سوال میرے ذہن میں گونجا۔

اس سب کا کیا ہوا ہوگا جس کے لیے میں اتنی سخت کر رہا تھا؟ افس خدایا! یہ سب کیا ہو رہا ہے..... میں سمجھتا رہا کہ میرے دشمن مجھے جان سے مارنے کی کوشش کریں گے لیکن انہوں نے تو کوئی اور ہی چکر چلا دیا۔ ان خیالات نے میرا دماغ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تہ خانے کا دروازہ کھل رہا تھا۔ ایک آدمی ٹرنے کے لیے نیچے اتر اور اڑے کو میرے قریب بیڈ پر رکھ دیا۔ اس میں بھاپ اڑاتے سوپ کا باؤل تھا۔

”کون ہو تم لوگ اور میں کہاں ہوں؟“ میں نے پوچھا۔ وہ بنا کچھ کہے واپسی کے لیے مڑ گیا۔ میں اٹھ کر اسے دیوچنا چاہتا تھا لیکن کھڑے ہوتے ہی میرا سر اس بری طرح چکرایا کہ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا اور میں واپس بیڈ پر گرنا چلا گیا۔ میرا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔ سوپ کی مہک میری اشتہا کو بڑھا دے جا رہی تھی۔ لہذا میں نے باقی تمام معاملات پر بحث بھیجے ہوئے سوپ کا پیالہ اٹھالیا۔ تب میری نظر ٹرنے میں رکھی ایک اور چیز پر پڑی۔

کامران چودھری کی رپورٹ مسترد کر دینے کا عندیہ سنا دیا۔“
پھر ایک نیا حیران کن منظر..... میں ٹی وی پر نظر آ رہا
تھا۔ لندن سے براہ راست..... ہاں وہ میں ہی تھا.....
شاید..... اور وہ جو میں تھا، وہ کہہ رہا تھا۔

”میں اعتراض کرتا ہوں کہ میں نے وہ رپورٹ کچھ
لوگوں کو بلیک میل کرنے کے لیے تیار کی تھی۔ اس خود ساختہ
رپورٹ کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے نہ ہی میرے پاس
ان قیمتی نوادرات کی اسمگلنگ کے ٹھوس ثبوت ہیں اور نہ ہی
ترتیب رائے کے ذریعے اسمگلنگ کی حقیقت ہے۔ اس خفیہ راستے
کے بارے میں میں بچپن سے جانتا ہوں۔ وہاں بھی کوئی غیر
قانونی کام نہیں ہوا۔ میں ان تمام لوگوں سے اور عوام سے
معافی مانگتا ہوں کہ میں نے اپنے ذاتی غصے کا اظہار کسی طور پر
بے بنیاد الزامات لگا کر کیا۔ چونکہ پاکستان میں میری جانی کو

کاغذ سے بنی پینٹنگ کے اوپر رکھا تھا..... ”واج دس“ اور اندر
ایک سی ڈی بھی جس پر کوئی نشان نہیں تھا۔ میں نے پہلے سوپ
پیا۔ اس سے میری بھوک تو نہیں مٹی البتہ طلق و معدہ ضرور تر
ہو گئے۔ مجھے بے ہوش رکھنے والے جانتے تھے کہ مجھے ایک
دم سے بہت سا کھانا نہیں کھلایا جاسکتا اس لیے انہوں نے پہلے
پانی اور اب سوپ کا بندوبست کیا تھا۔ ذہن میں بہت سے
سوالات بچل رہے تھے مگر ان کا جواب دینے والا وہاں کوئی
نہیں تھا۔ میں نے ٹرے میں بھجوائی مٹی سی ڈی اٹھائی اور
آہستہ سے چلتا ہوا ٹی وی ٹرانس کی طرف آ گیا۔ پلے کیا تو
ریکارڈ کی گئی ویڈیو چل پڑی اور اسکرین پر جو مناظر مجھے نظر
آئے، وہ اتنے حریت انگیز اور ناقابل یقین تھے کہ میں
ساکت بیٹھا انہیں دیکھتا رہ گیا۔ اسکرین چار حصوں میں تقسیم
ہو کر چار مختلف نیوز چینلز کو ایک ساتھ دکھا رہی تھی۔ چاروں
چینلز پر ایک ہی بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔

”معروف صحافی اور نوادرات کیس کے مرکزی کردار
کامران چودھری ملک سے فرار ہو گئے۔“ اسکرین پر لاہور ایئر
پورٹ کی سی سی ٹی وی فوٹیج میں ڈیپارچر لائن پر لاؤنج اور پھر
مختلف جگہوں پر جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بعد میرا
پاسپورٹ اور ٹکٹ نمبر دکھایا گیا جو میرے نام سے ہی تھا اور
ساتھ ہی بتایا جا رہا تھا کہ کامران چودھری کسی کو بتائے بغیر کل
صبح انگلینڈ روانہ ہو گئے۔ اسکرین پر ایک جھماکا ہوا اور پھر
منظر بدل گیا۔

وہی چاروں نیوز چینل تھے جو باری باری پلے ہو رہے
تھے اور اس بار بھی بریکنگ نیوز میری ہی ذات پر تھی۔
”کامران چودھری کے لندن میں ہونے کی تصدیق
ہو گئی۔ سیاسی پناہ کی درخواست دینے کے بعد مقامی میڈیا کو
بتایا گیا کہ وہ بہت جلد کچھ افکشافات کرنے والے ہیں۔“
ایک جھماکے کے بعد نیا منظر..... ”نوادرات اسمگلنگ
کیس کے سلسلے میں ایف آئی اے کی تفتیش مکمل..... رپورٹ
سپریم کورٹ میں پیش کر دی گئی۔ الزامات بے بنیاد ہیں،
چودھری حشمت علی سمیت تمام ملزمان کا بیان..... سپریم کورٹ
نے کامران چودھری کو طلب کر لیا۔ اگلی پیشی پر ثبوتوں کے
ساتھ حاضر ہونے کا حکم.....“

اگلا منظر..... ”ڈائریکٹر جنرل نسیم اطہر نے نیشنل میوزیم
سے غائب اصلی نوادرات عدالت میں پیش کر دیے۔ سیکورٹی
رسک کی وجہ سے اصلی کی جگہ نقلی نوادریں پھر منسٹری کے حکم پر
رکھے جاتے ہیں اور ایسا کرنے کے لیے بین الاقوامی طور پر
حفاظت کا قانون موجود ہے۔ عدالت نے بنا ثبوت کے

کراچی

ماہنامہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک
نیا اور منفرد سلسلہ باتیں تمہارے خزاں کی.....
پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر
قاری بہن دیے گئے سوالوں کے
جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی
ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات
ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

توقارین آج ہی

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہار سے بک کر وائیں

خطرہ تھا لہذا میں نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔“
میں بت بنا یہ ساری کارروائی دیکھتا رہا اور پھر ایک اور منظر..... ملک بھر میں صحافی برادری کا کامران چودھری کے خلاف احتجاج..... صحافت کے غلط استعمال پر شدید غصہ..... کئی جگہ پر عوام نے بھی اس احتجاج میں بھرپور شرکت کی۔ مقامی روزنامے کے چیف ایڈیٹر صدیقی صاحب دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ یاد رہے کہ وہ کامران چودھری کے اچھے دوستوں میں شمار ہوتے تھے اور انہوں نے چند دن قبل قوم سے معافی مانگتے ہوئے انکشاف کیا تھا کہ کامران چودھری کی رپورٹ حقائق پر مبنی نہیں تھی اور اسے جانچے بغیر شائع کیا گیا۔“

میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو چکے تھے لیکن اس وقت مجھے اس کا ادراک نہیں تھا..... اور ابھی اس منحوس لی وی کی اسکرین روشن ہی تھی۔

”آخر کار بڑا فیصلہ آگیا..... سپریم کورٹ نے نوادرات اسٹنگٹ کیس میں ملوث تمام ملزمان کو باعزت بری کر دیا..... کامران چودھری کے خلاف کارروائی کا ختم..... صحافی برادری کا کامران چودھری کے خلاف احتجاج جاری۔“
..... اور پھر آخری منظر.....

”نوادرات اسٹنگٹ کیس کے اہم کردار اور متنازعہ صحافی کامران چودھری نے کل رات خودکشی کر لی۔ ڈاکٹروں کے مطابق کامران نے نیند کی کئی گولیاں ایک ساتھ کھالی تھیں۔ کامران چودھری کے والد چودھری حشمت علی اپنے بیٹے کی لاش لینے آج شام لندن روانہ ہوں گے۔“ اور ساتھ میں میری لاش کی کئی انداز سے چھنی گئی تصاویر بھی تھیں۔ یہ تمام ویڈیوز پچھلے کچھ اس عرصے کی ریکارڈنگ تھیں جس عرصے میں میں شاید بے ہوش رکھا گیا تھا۔

اسکرین تاریک ہو گئی تھی۔ مجھے لگا جیسے میری تقدیر بھی ایسے ہی تاریک ہو گئی ہے۔ ایس پی جنید کہیں بیٹھا تجھے لگا رہا ہوگا اور چلا چلا کر کہہ رہا ہوگا.....

”میں نے کہا تھا نا کاوی..... میں نے کہا تھا کہ اس نظام کو بدلنے لنگو گے تو باش پاش ہو جاؤ گے۔ تمہاری یہ جنگ تمہیں زمین پر نہیں بلکہ نظروں سے ہی گرا دے گی۔ تم مجھے موردِ اِزام ٹھہراتے تھے آج خود کو دیکھو دیکھو تمہارا پہاڑ جیسا حوصلہ ہوا میں بھر گیا ہے۔ یہ ہے تم جیسے باغیوں کا انجام کہ تم مرنے سے پہلے ہی مار دیے جاتے ہو۔“

یہ سب اس وقت ہوا جب کامیابی مجھ سے چند قدم دور تھی۔ سب کچھ میرے حق میں جا رہا تھا، سب کچھ وہی ہو رہا تھا

جیسا میں چاہتا تھا اور مجھے لگ رہا تھا واقعی اگر ہمت ہو تو اس نظام سے ٹکرایا جاسکتا ہے، اس سے لڑا جاسکتا ہے لیکن..... لیکن میں غلطی پر تھا۔ میں نے اس نظام کو سمجھنے میں بہت بڑی غلطی کر دی تھی۔ یہ میری توقعات سے بھی بڑھ کر چالاک اور ناقابل شکست تھا۔ سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے دشمن مجھے دھمکیوں سے ڈرا نہیں گئے..... جان سے مارنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح کی کسی بھی حرکت سے وہ خود بچھس جائیں گے لیکن وہ مجھ سے زیادہ ذہین نکلے۔ کیا کمال کی پلاننگ تھی کہ مجھے میرے گھر سے اغوا کیا گیا۔ انہوں نے وہیں سے میرے بینک لاکر کی جابی حاصل کی ہوگی یا پھر صدیقی صاحب سے..... اور پھر تمام ثبوت حاصل کر کے ختم کر دیے ہوں گے۔ مجھے یہاں طویل بے ہوشی میں ڈال کر انہوں نے میرا ڈیپلیکٹ تیار کیا اور اس کے ذریعے ایسا ڈراما چلایا کہ کوئی کچھ بھی نہ کر سکا۔ میرے صحافی دوست مجھ سے متنفر کر دیے گئے۔ میں بزدلوں کی طرح جان بچانے کے لیے بھاگتا دکھائی دیا اور پھر اپنی غلطی کا اعتراف بھی کر لیا۔ ان لوگوں کو کتنی تکلیف پہنچی ہوگی جن کو مجھ سے امیدیں وابستہ تھیں۔ صدیقی صاحب کے بارٹ ایک کی خبر سے اندازہ ہو رہا تھا۔ بتائیں ان پر کیا ہوتی ہوگی۔ ہو سکتا ہے وہ بھی مجھ سے متنفر ہو گئے ہوں..... جہاں ایک طرف مجھ کو میرے ہی ڈیپلیکٹ سے برباد کیا گیا، وہیں دوسری طرف صحافی برادری اور میڈیا کا سر بھی جھک گیا..... میری ساری محنت، ساری کارکردگی، سارا عزم و ریت کی دیوار کی طرح ڈھس گیا اور اسے اب دوبارہ کھڑا کرنا ناممکن تھا۔ سوچنے کی بات صرف ایک ہی رہ گئی تھی کہ اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود..... مجھے زندہ کیوں رکھا گیا؟ عین اسی لمحے تہ خانے کا دروازہ کھلا اور اندر آنے والی شخصیت کو دیکھ کر ہی مجھے اس آخری سوال کا جواب بھی مل گیا۔

وہ چودھری حشمت علی تھے..... میرے اباجی۔

☆☆☆

”وہ کیا کہا ہے کسی بھلے شاعر نے..... سارے شہر نے بہن رکھے ہیں دستانے..... کیوں چودھری کامران! اب بتا..... تو کس کس کے ہاتھ پر اپنا ہولناکی کرے گا؟ دیکھا تو نے..... جن لوگوں کے چاروں طرف تو نے ایسے ایسے پھندے نصب کیے تھے کہ جن سے بچنا ناممکن تھا، وہ لوگ اس میں سے یوں نکلے جیسے مکھن میں سے بال نکلتا ہے۔ وہ تو نکل گئے اب تو ان پھندوں سے کیسے نکلے گا؟ تو تو ایک چٹان کے مانند کھڑا تھا، صرف ایک ہی وار سے ریزہ ریزہ ہو کر کیسا

حسیب

ایک بچہ کلاس میں ٹیل ہو گیا۔ گھر گیا تو اپنے ٹیل ہونے کا اعلان کرنے کے بجائے اس نے اپنے والد سے سوال کیا۔ ”ابو! جب آپ امتحان میں ٹیل ہوتے تھے تو دادا جان نے آپ کو کچھ کہا تھا کیا؟“
والد۔ ”ہاں مارا تھا۔“
”اور جب دادا جان ٹیل ہوئے تھے تو؟“
والد۔ ”انہیں ان کے والد نے مارا تھا۔“
بچے نے کہا۔ ”ابو جان! آپ مجھ سے تعاون کریں تو ہم دونوں مل کر اس خاندانی غمزدگی کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔“
(مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری۔ لاہور)

آجانی تو تیرا کیس اور بھی مضبوط ہو جاتا تھا۔ اگر تجھے کچھ ہو جاتا تو ان صحافیوں کی تحریک شروع ہو جاتی اور عوام تو پہلے ہی کسی انقلاب کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ معاملہ تیری سوچ سے بڑھ کر بگڑ جاتا اور اس میں ہم چند لوگ ہی نہیں پوری کی پوری گورنمنٹ کو وقت بڑھ جاتا تھا۔ اسی لیے تو خوب سوچ بچار کے بعد ایسی پلاننگ کی گئی کہ پہلے تجھے ہیرو سے زیر و بنایا جائے اور پھر چاہے تجھے سرخام گولیاں مار دی جائیں، کوئی فرق نہیں پڑے والا تھا۔ وہ تو جس تھا جس نے تجھے اغوا کر کے بھی زندہ رکھا اور نہ ملے تو یہ تھا کہ تجھے اغوا کرنے کے بعد جان سے مار دیا جائے گا پھر حراڈ پبلیکٹ اپنا کام کرے گا۔ تجھے زندہ رہنے کی خبر ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ہے اور یہ خبر اگر کسی کو معلوم ہوئی تو تیرے ساتھ ساتھ میری زندگی بھی واؤ پر لگ جائے گی۔“

”یہ خبر کب تک چھپی رہے گی..... آپ مجھے کب تک قید رکھیں گے؟ کبھی نہ کبھی تو مجھے یہاں سے باہر نکلتا ہی ہے۔“ میں نے بیزار سی کہا۔
”تو یہاں سے نکل سکتا ہے اور نکلے گا بھی لیکن کامران چودھری سچ بچ مر چکا ہے۔ وہ اب اپنی قبر سے بھی نہیں نکلے گا۔ اب تو ایک نئے نام اور نئے چہرے کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرے گا۔ میں نے سب بندوبست کر لیا ہے۔“ ان کی بات سن کر میں چونکا۔
”کیا مطلب..... میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”تیری پلاسٹک سرجری کی جائے گی جس میں تیرے چہرے کو بدل دیا جائے گا۔ تیرے بال، آنکھوں کا رنگ اور اٹھکیوں کے نشانات بھی بدل دیے جائیں گے۔ اس کے

مہسوس کر رہا ہے؟ مان لے کہ تو ہار چکا ہے..... مان لے کہ اس نظام نے تجھے بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔“ وہ پھنکار رہے تھے۔

”نہیں..... میں ناکام ضرور ہوا ہوں..... مگر ہار نہیں مانوں گا۔“ میں نے کہا تو ان کا قبضہ تہ خانے میں گونجتا چلا گیا۔
”یہ تو نہیں بول رہا..... تیرے اندر چودھریوں کی اکر بول رہی ہے۔ تیری جگہ میں بھی ہوتا تو یہی کہتا کہ ہار نہیں مانوں گا..... لیکن حقیقت سے جتنی مرضی نظر میں چرالے تو ہار چکا ہے۔ تیری اپنی صفائی برادری تیرے خلاف جلوس نکال رہی ہے۔ تیری وہ سوئی ہوئی قوم جسے تو جگانے کے لیے نکلا تھا وہ بھی تیرے خلاف آوازیں بلند کر رہی ہے۔ رہی بات ان لوگوں کی جنہیں تو نے اس معاملے میں گھسیٹا تو وہ آج بھی تیری جان کے دشمن ہیں۔ اگر میں تجھے یوں اغوا کر کے یہاں نہ رکھتا تو اب تک تیری قبر کا بھی کوئی اتا پتا نہ ہوتا۔“
”لکھا تو میں نے آپ کے خلاف بھی تھا..... پھر اتنی

رحم دلی کیوں؟“ میں نے تنک کر کہا۔
”کیونکہ مقدر نے مجھے تیرا باپ بنا رکھا ہے۔ تو مجھ سے جتنی چاہے نفرت کر..... میں چاہہ کر بھی تیرے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔“ ان کی آواز میں بے بسی نمایاں تھی۔
”میں نے بھی آپ سے نفرت نہیں کی.....“
”پھر تو مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ تیری محبت کا اسٹائل ساری دنیا سے سکرا ہے۔“ وہ طنز پر انداز میں بولے۔
”ایک بیٹا اپنے باپ سے کیوں نفرت کرے گا..... مجھے تو صرف آپ کے غیر قانونی کاموں سے اختلاف تھا اور یہ اختلاف تو اب بھی ہے۔“

”تیری اس ایک رپورٹ کی وجہ سے کیا کچھ بگڑ گیا تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے وہ سارے دوست ایک دم ہی میرے دشمن بن گئے۔“ وہ افسوس بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ”تجھے کیا پتا کہ ان سرکاری ملازموں سے تعلقات بنانا تاش کے پتوں سے محل کھڑا کرنے سے بھی مشکل ہے..... اور پھر ان تعلقات کا ٹوٹ جانا اسی محل کو گرانے سے زیادہ آسان ہے۔ میں تو اسلام آباد میں منہ دکھانے جو گا نہیں رہا۔“

”اس سے زیادہ آپ کے لیے یہ آسان تھا کہ آپ محل کر میری مخالفت کرتے اور ان لوگوں کے ساتھ مل کر مجھے مروا دیتے۔“ میں نے پتلی سے کہا۔

”تو کیا سمجھتا ہے تجھے مروانا بہت مشکل تھا؟ تو نے جو چال چلی تھی اس میں ہر چیز ممکن تھی لیکن اگر تجھے خراش بھی

کمرے سے باہر چلے گئے۔

☆☆☆

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ میری ذہنی کیفیت بدترتی کا شکار تھی۔ سوچ کی ساری لہریں جیسے ٹھم کی ٹھم میں زمانے سے لڑنے لگا تھا تو میرا حوصلہ پہاڑ جیسا تھا لیکن اب خود سے لڑنے لگا تھا تو میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ تین بار ملازم کھانے سے بھری ٹرے چھوڑ کر گیا اور پھر اسے ویسے ہی واپس لے گیا۔ باوجود اس کے کہ میں بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا۔ نقاہت میرے روم روم میں بس رہی تھی لیکن میں کھانے کا ایک لقمہ تک حلق سے نہ اتار سکا پھر کمرہ بہہ صورت ماکھا اندر آیا اور مجھے کھانے کی تلقین کرنے لگا۔

”بابا جی کہاں ہیں۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو جی اسلام آباد چلے گئے ہیں۔“

”ماکھے! میں اس وقت کہاں ہوں؟“

”چھوٹے چودھری جی آپ کھانا کھالیں۔ آپ کی صحت بگڑتی جا رہی ہے۔“

”دفع ہو جاؤ یہاں سے.....“ میں نے شیشے کا گلاس اس پر دے مارا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر ٹوٹے ہوئے گلاس کی کرچیاں اٹھا کر باہر چلا گیا۔ اگلے دن بھائی شفیق آگئے۔

”کیوں کر رہا ہے تو ایسا کامران.....“ بچھلے کئی دنوں سے تو نے ہمیں سولی پر چڑھا رکھا ہے۔ اب تو سب کچھ ٹھیک بھی ہو گیا ہے۔ اب ہمیں کس بات کی سزا دے رہا ہے؟“ وہ خفگی سے بولے: ”اپنی حالت پر رحم کھا۔ آئینے میں دیکھ خود کو..... کیا ہو گیا ہے تیرے ساتھ..... تو کیا سمجھتا ہے تجھے اس حالت میں دیکھ کر ہمیں خوشی ہو رہی ہوگی..... درد ہوتا ہے ادھر دل میں..... ہمارے لیے نہیں تو خود کے لیے ہی کچھ کھالے۔“

”بھائی! میں کوئی بھوک پڑتا ہوں نہیں بیٹھا اور نہ ہی اتنی ہمت ہمارے ساتھ ہوں کہ خود کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ مجھے بھوک نہیں لگی، جب لگے گی تو کھالوں گا۔“ میں نے بے رخی سے کہا۔ وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔

”ابا جی نے سب کو سختی سے تجھ سے ملنے سے روک رکھا ہے۔ کوئی نہیں جانتا تمہارے بارے میں..... لیکن میں پھر بھی تیری صورت دیکھنے کے لیے چلا آیا اور میں اکیلا نہیں کوئی اور بھی ہے میرے ساتھ..... جسے تیری ہم سب سے زیادہ فکر رہتی ہے۔ تجھے بھوک لگی ہے یا نہیں میں نہیں جانتا۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ تو وہی کرتا ہے جو کرنا چاہتا ہے۔ کبھی بھی ان

بعد تو ایک نئے پاسپورٹ اور نئے نام کے ساتھ امریکا روانہ ہو جائے گا اور باقی کی زندگی وہیں بسر کرے گا۔ یہ سب تجھے ہوش میں لائے بغیر بھی کیا جاسکتا تھا لیکن ڈاکٹروں نے بتایا کہ تجھے اب ہوش میں لے آنا چاہیے کیونکہ تیری جسمانی کمزوری بڑھ رہی تھی۔“ وہ کہہ رہے تھے اور میں حیرت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

”سب کچھ بدل دینے سے کیا ہوگا..... ڈی این اے نہیں بدلا جاسکتا چودھری صاحب! آپ کی سپریم پلاننگ کرنے والوں نے یہ نہیں بتایا آپ کو؟“

”تیرے پاگل پن کا سرٹیفکیٹ تیار ہوا پڑا ہے۔ تیرے دماغی علاج کے لیے تجھے حویلی میں بھی قید رکھا جاسکتا ہے اور امریکا بھی بھیجا جاسکتا ہے۔“ انہوں نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

میں ایک لذت ہذیانی کیفیت میں چلا اٹھا۔

”یہ..... یہ ممکن نہیں ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے کہہ دیا نا کہ میں ہار نہیں مانوں گا..... میں پھر لڑوں گا۔“ میرا سر پھر سے پھرانے لگا اور نقاہت ذہن پر غلبہ جمانے لگی۔

”تو نے اپنی زندگی گزار لی ہے چودھری کامران..... تو یقین کر لے کہ تو مر گیا ہے۔ اب تیری یہ زندگی میری امانت ہے۔ اب تو وہی کرے گا جو میں چاہوں گا۔“

”میں ہار نہیں مانوں گا..... آپ مجھے جان سے مار سکتے ہیں لیکن میرا حوصلہ نہیں توڑ سکتے۔ میں بزدلوں کی طرح نہیں بھاگوں گا، میں لڑتا رہوں گا۔“ میں ہانپتی ہوئی آواز میں چلایا۔ ”اگر آپ اپنی انا کے غلام ہیں تو میں بھی ضد کا پکا ہوں..... آخری سانس تک لڑوں گا آپ سے۔“

وہ جو میرے سامنے کرسی بیٹھے تھے، ایک دم جیسے دم بخود ہو گئے اور پھر چودھری شمشٹ علی نے اپنے بیٹے کی طرف اس طرح دیکھا کہ اس طرح زندگی میں کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

”میں یہ تو جانتا تھا کہ تیری لڑائی مجھ سے ہے لیکن کامران! میں یہ نہیں جانتا تھا کہ تو میرے ساتھ اس لڑائی کو آخری سانس تک لے جانا چاہتا ہے۔“

انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا تو ان کے لہجے میں غصہ نہیں حیرت تھی۔ وہ پُر سوچ انداز میں بڑی آہستگی کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے سیزھیوں کی طرف جا رہے تھے اور میں خاموش بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں دل چاہا کہ انہیں پکاروں اور اپنی بات سمجھانے کی کوشش کروں لیکن میں خاموش رہا۔ وہ دھیرے دھیرے سیزھیاں چڑھتے ہوئے

نے ایک عجیب بات کہی تھی۔

”ایسا مت کہو کامی..... مجھے درد ہوتا ہے۔“ اور یہ درد بعد میں میں نے خود بھی محسوس کیا تھا جب مجھے آشتی نہ کہا تھا کہ اس کی دسترس میں ایسا کوئی ایک لمحہ بھی نہیں ہے جس لمحے اس نے مجھ سے محبت کی ہو۔ وہ سارے مناظر میری آنکھوں کے سامنے سے ایک لمحے میں گزرتے چلے گئے۔ میں اس وقت چونکا جب مامی نے کھانے کا ایک لقمہ میرے ہونٹوں سے نکلایا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا دھلاؤ دھلا سا چہرہ اپنی اندرونی روشنی سے ہی چمک رہا تھا۔ اس چہرے پر گزرے لحات کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا جب حویلی میں، میں نے ایک شام اسے بری طرح ڈانٹا تھا۔ ان لحات میں جب میں موت اور زندگی کی کشمکش میں تھا ایک وہی توتھی جس نے دوبارہ مجھے پاؤں پر کھڑا کیا تھا لیکن میں نے اس کا صلہ یوں دیا تھا کہ ایک بار پھر اسے ڈانٹ کر بھگا دیا تھا مگر وہ بھی جانے کس مٹی کی بنی تھی۔ جب بھی میرے سامنے آتی، میرے دیے گئے رخصوں کو یکسر بھول چکی ہوتی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر نہیں تھا جس سے میں یہ اندازہ لگا سکتا کہ وہ مجھ سے ناراض ہے۔

”اچھے بچوں کی طرح اب منہ کھولیں۔“ میں نے لقمہ دانتوں سے پکڑ لیا۔ وہ پورسکون انداز میں دوسرا لقمہ بنانے لگی۔

”مامی! کیا تم نے مجھے معاف کر دیا؟“ میں نے بے اختیار پوچھا۔

”معافی دوسروں کو دی جاتی ہے، اپنوں سے تو ناراض ہوا ہی نہیں جاتا..... منہ کھولیں۔“ وہ بے نیازی سے کہتے ہوئے مجھے کھانا کھلائے جا رہی تھی۔

”ویسے بھی پرانی باتوں میں اب کیا رکھا ہے۔ ہمیں افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ جس کام کے لیے نکلے تھے، وہ نہیں ہوا۔ میں نے خود بھی پڑھا اور عمران بھائی سے بھی پوچھا تھا لیکن آپ فکرت کریں۔ رب ایک دروازہ بند کرتا ہے تا تو کوئی اور کھول دیتا ہے۔ ایک نہ ایک دن آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی ضرور ملے گی۔“ وہ ہنسی جاری تھی اور میں چپ چاپ کھانا کھاتے جا رہا تھا۔

”میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ اباجی مجھے ایک نئے نام اور چہرے کے ساتھ زندگی میں جھونکنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کامران چودھری کو مرامر بنے دیا جائے اور میں ایک نئی زندگی شروع کروں لیکن مامی میں ہاں نہیں ماننے والا۔ میں یہاں سے نکل کر اپنے نام اور چہرے کے ساتھ اس

کی فکر بھی کر لینی چاہیے جو تمہیں چاہتے ہیں۔“ وہ اٹھنے لگے۔ ”ضروری یہ نہیں کہ جو ہم چاہیں ویسا ہی ہمارے ساتھ ہو۔ ضروری یہ ہے کہ جو ہمارے ساتھ ہو رہا ہے ہم اسے برداشت بھی کر سکتے ہیں یا نہیں۔“ وہ باہر نکل گئے اور ان کے باہر نکلنے ہی مامی اندر داخل ہو گئی اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی۔

”مامی تم یہاں.....؟ میرا مطلب ہے تم یہاں کیوں چلی آئیں؟“ وہ یک ٹک میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں پانی سا بھرتا جا رہا تھا۔

”پلیز مامی..... میں تمہارے آنسو پونچھنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں ہاتھوں کی پشت سے صاف کیں اور میرے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ ایک لمحے کے لیے تو ہم آپ کو پہچان ہی نہ سکے۔“

”ہاں..... کچھ لوگوں نے میرا چہرہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔“ میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم سناؤ مجھے تو تم بھی کمزوری لگ رہی ہو۔ کہیں تم بھی شہری لڑکیوں کی طرح ڈانٹنگ تو نہیں کرنے لگیں؟“

”میں آپ کی ہر بات کا جواب دوں گی لیکن پہلے کھانا کھالیں۔ آپ نے بڑی دیر سے کچھ نہیں کھایا۔ بیمار ہو جائیں گے۔“ وہ بار بار اپنی بھر جانے والی آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

”خدا یا میں تیرے بندوں کو کیسے سمجھاؤں۔“ میں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے ادبچی آواز میں کہا۔

”خدا کے بندے اچھی طرح جانتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔“ وہ ہلکے سے مسکرائی اور میں سب کچھ بھول کر اس کی مسکان دیکھنے لگا۔

”اوہ مامی..... تم اتنی دیر بعد مسکرائی ہو یا میں تمہاری مسکراہٹ ہی بھول گیا تھا تاؤ..... آخری مرتبہ کب میرے سامنے مسکرائی تھیں؟“ ایک لمحے کو اس کا چہرہ متحیر ہوا پھر اس نے اپنا چہرہ جھکا لیا۔ کچھ دیر اس کے ہونٹ تھر تھراتے رہے پھر وہ آہستہ سے بولی۔

”شاید اس دن..... جس دن ہم نے غلطی سے ہیزر کلپ پہن لیا تھا۔“ اس فقرے میں ایسی کاٹ تھی کہ میں کچھ دیر... کے لیے پتھر سا بن کر رہ گیا۔ وہ شام مجھے اچھی طرح یاد تھی جب نواب صاحب اور چودھری حشمت علی ہماری شادی کی تاریخ طے کر رہے تھے اور میں اس وقت باہر لان میں، میں نے اسے کہا تھا کہ میں اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ جب مامی

”بارہ بارہ مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سے بڑھ کر بھی کچھ اور
”ہاں ہے۔“

”ہاں..... صرف ایک ناکامی مجھے شکست نہیں دے
”ماتنی..... زندگی ابھی باقی ہے تو مطلب کہانی ابھی ختم نہیں
ہوئی۔“ میں اس سے زیادہ شاید خود سے کہہ رہا تھا۔

سارے برتن خالی ہو گئے تو اس نے ٹرے ایک طرف
رکھ دی..... ٹیبل پر رکھے تھرماس میں سے دو کپ چائے نکال
کر لے آئی۔ اس سے پہلے اس نے مجھے میڈیسن بھی کھلائیں
جن کے بارے میں شاید وہ باہر سے پوچھ کر آئی تھی یا اسے
تقلین کی تھی۔

”آپ صرف وہی کرتے ہیں نا جو آپ کا دل چاہتا
ہے..... کیا کبھی ان لوگوں کے بارے میں سوچا ہے جو آپ
سے توقعات لگائے بیٹھے ہیں..... جیسے کہ بھائی شفیق، بھائی
عمران، بڑی بھائی اور نازو.....“
”جیسے کہ تم.....“ میں نے لقمہ دیا تو وہ خاموش سی
ہو گئی۔

”دیکھو ماما! ہمیں سب سے زیادہ نقصان اسی وقت
ہوتا ہے جب ہم کسی ایسے انسان سے بہت ساری امیدیں
وابستہ کر لیتے ہیں جو ہماری امیدوں پر چاہے بھی تو پورا نہیں اتر
سکتا..... یہی غلطی تم نے بھی کی اور میں نے بھی..... اس غلطی کا
ازالہ کرنے کے لیے میں نے خود کو ایک مقدمہ کے لیے مختص کر
لیا ہے لیکن تم..... تم پھر وہی غلطی کرنے جا رہی ہو۔“

”مجھے..... مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔“ اس نے
نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر کیوں تم بار بار میرے پاس آ کر میرے زخموں
پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتی ہو؟“ میرا سر بھاری سا ہو رہا تھا۔

”کیا مجھے اتنا حق بھی نہیں ہے؟“

”تمہیں حق ہے لیکن میں اس قابل نہیں ہوں.....“

میری زبان لڑھکرا رہی تھی۔ نیند کا ریلّا مجھے بہالے جانا چاہتا تھا
لیکن اس میں اتنی تیزی تھی کہ میں اس میں اترتے اترتے بھی

چوٹک گیا۔ ”ماما!“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا..... ”تم نے..... چائے میں..... کچھ ملایا تھا؟“

میرے منہ سے ٹوٹے پھوٹے سے الفاظ نکلے۔

”آپ سو جائیں کامی..... نیند آپ کے لیے بہتر
ہے۔“ اس نے میرے کانوں میں سرگوشی کی تو اس کا لہجہ بہت

عجیب سا لگا اور پھر میں گھپ اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔
☆☆☆

میری آنکھیں کھلیں تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میر
بہت دیر تک سوتا رہا ہوں لیکن نیند کا بخار پن اور سستی نہیں
تھی۔ کچھ دیر میں چھت کو گھورتا رہا پھر ایک خیال بجلی کی

تیزی سے دماغ میں آیا تو میں اٹھ بیٹھا۔ چھت کی طرح
کمرے کی ہیئت بھی بدل چکی تھی۔ میں اس تہ خانے کے
بجائے ایک اور چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ اس کمرے میں

فرش پر قالین بچھا تھا اور میں ایک ڈبل بیڈ پر لیٹا ہوا
تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے کانوں
میں ماما کا وہ آخری فقرہ گونج رہا تھا جس نے سونے سے
پہلے سنا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ماما مجھے وہاں سے نکال لائی
ہے لیکن کیوں اور کیسے؟ چودھری حشمت علی نے مجھے نہایت

خفیہ جگہ اور سخت پہرے میں رکھا ہوگا اور وہاں تو ماما اور
بھائی شفیق بھی تھے اور پھر مجھے وہاں سے نکالائے کیسے ہوگا؟ ماما
کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اس قسم کے رسک لینے والی
لڑکی تھی ہی نہیں پھر یہ سب اس نے کس طرح اور کس لیے کیا
ہوگا؟ کیا ماما یہ سمجھتی تھی کہ وہ جگہ میرے لیے غیر محفوظ
ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں اٹھا تو ایک اور بات

محسوس کی کہ اب میری جسمانی کمزوری بھی اتنی شدید نہ
تھی۔ یہ شاید پیٹ بھر کر کھانے اور دوا کا اثر ہوگا۔ میں نے
کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر کو بیڈور میں آ گیا۔ یہ ایک
مکمل فرنشڈ اور آسائشوں سے بھرپور کنبھی تھی لیکن یہاں کوئی
نظر نہیں آرہا تھا۔ میں کو بیڈور سے سیزھیوں تک پہنچا پھر نیچے
لاؤنج میں سے ہوتا ہوا باہر نکل آیا۔ یہاں بھی کوئی نہیں تھا۔

پہلے میں گیٹ کی طرف جانے لگا لیکن پھر اطراف میں پہلے
وسیع لان میں آ گیا۔ یہاں گھاس پر کرسیاں اور ایک میز رکھی
گئی تھی۔ میز پر چائے کا سامان موجود تھا۔ میں نے دیکھا

چائے بالکل تازہ اور گرم تھی۔ ایک اور چیز جس کا احساس مجھے
ہو رہا تھا، وہ یہ کہ میں اسلام آباد میں نہیں تھا۔ شام کے اس

وقت اسلام آباد میں ٹھنڈ ہوتی ہے جبکہ یہاں مجھے گرمی محسوس

ہو رہی تھی۔ اچانک ایک نسوانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں

نے گنگنائی ہوئی اس آواز کی سمت دیکھنے کے لیے اوپر

دیکھا۔ میرے بالکل سامنے قدرے بلندی پر گولائی کی شکل
میں ٹیسر بنا تھا، آواز وہیں سے آ رہی تھی۔

بالکل ایسے جیسے شیشہ ٹوٹتا ہے میرے اندر بھی ایک
چھٹکا سا ہوا۔ ٹیسر کے چنگے پر آشتی ٹھڑکی تھی۔ گنگناہٹ کی

آواز اسی کی تھی۔

اس نے مجھے دیکھ کر یوں ہاتھ لہرایا جیسے ایک دوست
دوسرے کو دیکھ کر ہائے کہہ رہا ہو۔ میں گم سم سا یک تک اسے

جہانگیر بکس



شہنشاہ کا رتارنجی ناول

450/- انسان اور دیوتا

یہ نئی سامراج کے ظہور پرستی کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

300/- پاکستان سے دیارِ کرم تک

تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفر نامہ

450/- آخری چٹان

سینہ خازم جلال الدین خوارزمی کی داستانِ شجاعت جو تاتاریوں کے تلواروں کے لیے ایک چٹان ثابت ہو

225/- سوسال بعد

گاندھی جی کی مہاتما جی، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مصادمی مہم کی پوری تصویر

325/- سفید جزیہ

مجر اکاکیل کے کسی نامعلوم جزیہ کی داستان

475/- شاہین

انڈس میں مسلمانوں کے قریب ہزاروں کہانی

475/- معتمد علی

لاہور کا تاریخی اسلام دشمنی، یہ چھتری خنداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک چھاپہ چھری کی داستانِ شجاعت

550/- خاک اور خون

سکھ، برہمن، انیسیت، قیامت خیز مہاتمر، عظیم برصغیر کے پس منظر میں داستانِ خون

450/- کلیسا اور آگ

فری جی جی کی عیسائی مسلمان سپر سٹاروں کی خنداری و سقوطِ غرناطہ اور انڈس میں مسلمانوں کی گھسٹ کی داستان

599/- قافلہ حجاز

راہِ حق کے مسافر ہیں کی ایک بے مثال داستان

425/- مخدوم بن قاسم

عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے سبب اور حرکت ملی نے ستاروں پر کنکریں ڈال دیں

300/- پورس کے ہاتھی

1985ء کی جنگ کے پس منظر میں نوجوان اور بھون کے سامراجی عوام کی گھسٹ کی داستان، جنہیں پہچاننے کی کھانی پڑی

550/- اور تلو اور ٹوٹ گئی

شیر سید (نچیا سلطان شہید) کی داستانِ شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، مجبور فوجی کے جادو جلاں اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

500/- گمشدہ قافلے

ہنگری کی اسلام دشمنی، نیچے کی میڈری و سکری اور سکوں کی مصمم بچوں اور مظلوم محروموں کو خون میں بہلانے کی کڑی خیر جنگی داستان

300/- داستانِ مجاہد

فتح علی کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مد سے دوسو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی فوجی فوج، بغاوتِ سندھ کی حرکت لاردا داستان

450/- پردیسی و رخت

اسلام دشمنی پرستی و ہندوؤں اور سکوں کے مذہبی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پا لے کر نئے سے بھی گریز کیا

یوسف بن تاشفین 500/-

انڈس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے اکرام و مصائب کی تاریک راتوں میں اموی کی قدیمیں بلکے والے کیم پانی کی داستان

550/- آخری معرکہ

وفاقت کے بڑے بہت کوڑنے کی بڑی آگ کی توجہ دہا ہادی سلطان کے نقصان میں گرنے اور کہانم لہذاں کے بعد اسو سونے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا ہر صف سے تھکا ہوا اس نے جواب دیا، میں بہت فوج رکھتا ہوں، مگر پانچا تھوں، تم کھانڈ کی تیکہ لہلا گئے گئے

اندھیری رات کے مسافر

اُس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تاجی فوجوں، مہاتمر، یوٹھوں، محروموں اور جوانوں کی ڈلٹ

475/- والی کی ملک داستان

۱۷۱۱ء، طاقت کا چار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدسوں کو لٹا دیں

۱۷۱۱ء، طاقت کا چار کرنے والوں پر ایک تحریر

لہذاں کے بعد اسو سونے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا ہر صف سے تھکا ہوا اس نے جواب دیا، میں بہت فوج رکھتا ہوں، مگر پانچا تھوں، تم کھانڈ کی تیکہ لہلا گئے گئے

625/- لیبر و کسری

ظہور اسلام سے قبل عرب ہجرت کے تاریخی، سیاسی، معاشی، تمدنی اور مذہبی حالات زندگی اور فزندان اسلام کے ابتدائی فوجی کی داستان

سبق آموز کتب سلسلہ

دورنگی طباعت اور تصویریری خاکوں سے مزین



165/- اقوال حضرت علی رضی اللہ عنہ

165/- اقوال آنحضرت کرام

195/- حکایات گلستان سعدی

140/- اقوال شیخ سعدی

180/- حکایات رومی

170/- دلچسپ و عجیب حقائق

199/- حکایات بوستان سعدی

150/- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں

180/- ایمان افروز و سبق آموز

165/- بڑے لوگوں کے روشن واقعات



اردولفت

مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہ کے لکھنے کے ساتھ اردو زبان سے کاپی ہلافت

042-35757086 022-2780128
021-32765086 051-5539609 042-37220879

جہانگیر بک ڈپو

دیکھتا رہا پھر اس نے مجھے اشارہ کیا کہ وہ نیچے آ رہی ہے۔ ایک لمحے کے لیے وہ میرے سے اوجھل ہوئی اور اگلے ہی پل وہ برآمدے سے نمودار ہوئی اور میرے قریب سے گزر کر لان میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جس وقت میں پلٹا وہ کپ میں چائے انڈیل رہی تھی۔ اس نے پیازی رنگ کا سادہ سا سوٹ پہن رکھا تھا اور بالوں کو ایک پونی میں باندھ رکھا تھا۔ اس حلیے میں وہ ایک عام سی گھریلو لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

”گلتا ہے مجھ سے مل کر تمہیں زیادہ خوشی نہیں ہوئی کا مران!“ وہ کہہ رہی تھی۔ میں اسے گھورتا ہوا اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”جانتی ہو۔۔۔ میں تمہیں ایک پل کے لیے بھی بھول نہیں پایا۔ ہمیشہ یہی دعا کرتا رہا کہ تم میرے سامنے کبھی نہ آؤ لیکن گلتا ہے کہ میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔“ میں نے سر دھچکے میں کہا۔

”اتنی نفرت کرتے ہو مجھ سے۔“ وہ تھوڑا آگے جھک کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں نے تو سنا تھا کہ انسان اپنی پہلی محبت..... بھی نہیں بھولتا۔“

”تم سے یہ بحث اس لیے فضول ہے کہ تمہیں ان احساسات کا ادراک نہیں۔“

”ٹھیک کہا تم نے..... یہ سب فضول باتیں ہیں۔ وقت کا زیاں کرنے سے بہتر ہے کہ ہم کچھ کام کی باتیں کر لیں۔“ چائے کا سب لیتے ہوئے وہ یوں کہہ رہی تھی جیسے دو دوست بے تکلف ماحول میں بیٹھے گفتگو کر رہے ہوں۔ مجھے اس کے انداز سے جھنجھلاہٹ ہی ہونے لگی۔

”مجھے یہاں کون لایا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی جسے تمہاری بہت پروا ہے۔ مجھے لگتا نہیں تھا کہ وہ ڈرپوک اتنی بہادر ہو سکتی ہے لیکن اس نے کروکھا کیا۔“

”تم مایہ کی بات کر رہی ہونا؟ کہاں ہے وہ؟“ میں نے سختی سے پوچھا۔

”وہ جہاں بھی ہے خیریت سے ہے اور تمہاری خیریت نیک مطلوب چاہتی ہے..... لیکن ابھی تم اس سے مل نہیں سکتے۔“

”آشٹی! اگر اسے ایک خراش بھی آئی تو تم تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ میں تمہارے ساتھ کیا کر سکتا ہوں۔“ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”مجھے اچھی طرح علم ہے کہ وہ تمہارے لیے کتنی اہم ہے اسی لیے تو میں نے اسے بہت سنبھال کر رکھا ہے۔ بالکل ایسے جیسے پانی کے پیلے کو کوئی پھنسا رہا ہو۔“ وہ اپنی چائے ختم کرتے ہوئے بولی۔ ”آہ..... اب ہم سکون سے باتیں کر

سکتے ہیں۔ ارے تم نے چائے نہیں پی؟ تمہیں تو میرے ہاتھ کی بنی چائے بہت پسند تھی نا؟“

”کم ٹوڈی پوائنٹ!“ میں چلا یا۔

”ٹھیک ہے، اس میں چلانے کی کیا بات ہے۔ تو کہاں سے شروع کریں..... تم ہی بتاؤ۔“

”مجھے یہ بتاؤ کہ کم اپنا منہ کس چہرے کے کمرے سامنے کیوں آگئی ہو اور تم مایہ سے کیسے جا ملیں؟“ میں نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

”مجھے بھی تمہاری محبت نہیں کھینچ لائی جان من! میں تو تمہاری زندگی سے دور جا رہی تھی لیکن تمہارے باپ نے مجھے ایک باہر چھوڑا تھا۔ میں نے اسے پر مجبور کر دیا ہے۔“ میں چونکا لیکن خاموش رہا۔ ایک توقف کے بعد وہ کہنے لگی۔

”کہانی اسی موڑ سے شروع کرتے ہیں جہاں سے دو پیار کرنے والے بچھڑ گئے تھے۔“ وہ جان بوجھ کر مجھے چڑا رہی تھی لیکن میں ساپٹ تاثر لیے خاموش بیٹھا رہا۔

”اس دن جب تم ہماری قید میں تھے، وہاں ماکھے کے آدمیوں نے حملہ کر دیا تھا۔ میں اور جواد وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ تمہیں گولی لگی ہے، یقین کرو مجھے بہت دکھ ہوا اور میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تمہیں مارنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا اور وہ گولی بھی ہم میں سے کسی نے نہیں چلائی تھی۔ خیر ہمیں ہیرے مل چکے تھے اور تمہیں اسپتال لے جانے کی وجہ سے ماکھا اینڈ کمپنی بھی پڑھیلی پڑ گئی اور اس طرح ہمیں مراد آباد سے بہ آسانی نکل جانے کا موقع مل گیا..... لیکن ہم جانتے تھے کہ چودھری حشمت ہمارا اچھا نہیں چھوڑے گا اس لیے ہم نے طے کر لیا تھا کہ ہم اس ملک سے ہی باہر نکل جائیں گے۔ قانونی طور پر تو ہم کہیں نہیں جاسکتے تھے کہ ہمارے پاس غیر قانونی ہیرے تھے اور اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم ان ہیروں کو کسی بلیک مارکیٹ میں فروخت کر سکتے..... لہذا ہم یہاں سے سندھ کی طرف نکل گئے۔ محراب پور میں جواد کا ایک وڈیرا دوست تھا جو کہ خود انسانی اسمگلنگ میں ملوث تھا۔ وہ ہمیں بذریعہ لالچ عمان بھیج سکتا تھا لیکن اسے ہمارے پاس موجود ہیروں کا پتا چل گیا جس کی وجہ سے اس کی نیت بدل گئی۔ اس نے ہیرے ہڑپ کرنے اور ہمیں مار ڈالنے کا منصوبہ بنایا۔ خوش قسمتی سے ہمیں اس منصوبے کا بروقت علم ہو گیا اور ہم وہاں سے نکل گئے لیکن ہم جہاں بھی گئے اس کے آدمی سامنے کی طرح ہم تک پہنچتے رہے۔ ان کو بھجا دیتے دیتے ہم کراچی پہنچ گئے جہاں ہماری ملاقات ایک شخص اکرم

مان سے ہوئی۔ اس نے بتایا کہ بھاری رقم کے عوض وہ ہمیں رات چن افغانستان پہنچا سکتا ہے۔ معاوضہ طے کرنے کے بعد ہم وہاں سے کوئٹہ کی جانب روانہ ہوئے لیکن چیکب آباد میں ہم پر سندھی وڈیرے کے آدمیوں کا ایک اور حملہ ہوا جس میں وہ شخص مارا گیا۔ یہاں ہماری جان ایک ٹرک ڈرائیور مالار خان نے بچائی۔ وہ لٹری کوٹل جا رہا تھا۔ وڈیرے کے ایک آدمی سے پتا چل گیا تھا کہ وڈیرے کو ہمارے پلان کی خبر ہو چکی ہے لہذا چمن کی طرف جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ جواد نے منصوبہ بنایا کہ ہمیں سالار خان کے ساتھ خیر تک جانا چاہیے۔ چنانچہ ایک بار پھر ہم نے اپنی منزل کا رخ بدلا لیکن شوئی قسمت ایسا بھی نہ ہو سکا۔ ہمیں قلعہ علم نہ تھا کہ ٹرک میں رکھی چاولوں کی بوریوں کے درمیان اسلحہ بھی چھپایا گیا تھا اور اس ٹرک کی اطلاع پولیس کو پہلے ہی مل چکی تھی۔ ڈیرہ غازی خان میں پولیس کا ناکہ کر ڈرائیور اور اس کا سامی فرار ہوئے تو ہم بھی بھاگ نکلے اور ملتان پہنچ گئے لیکن وہاں ہمیں پناہ نہیں مل سکی۔ دو دن بعد وہاں سے ہم چیچہ وطنی کے پاس ”ادکان والا“ نامی ایک گاؤں میں پناہ گزین ہو گئے۔ وہیں پر ہمیں تمہاری تہملکہ انگیز رپورٹ کے بارے میں پتا چلا جس کی وجہ سے ہر طرف ایک بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ جواد نے غلطی کی جو تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہارے بارے میں خبریں معلوم کرنے لگا۔ اسی غلطی کی بنا پر وہ ایک ایسے آدمی کی نظروں میں آ گیا جس کا تعلق ماسکے سے تھا۔ جس وقت جواد کو پکڑا گیا وہ اس گھر سے باہر تھا جہاں ہم پناہ گزین تھے۔ جواد نے میرے بارے میں ان کو بتایا اس لیے وہ صرف جواد کو لے کر واپس مراد آباد چلے گئے۔ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے میں جواد کو بچانے کے لیے ایک بار پھر سے مراد آباد آئی لیکن اس بار میرے پاس افرادی قوت بے حد کم تھی۔ میں چودھری شمس علی کے آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اس لیے میں نے لمبی ملائیک کی اور مائی کے ساتھ دوستی کی.....”میں پھر سے چونکا لیکن اب کی بار بھی خاموش رہا۔ وہ بولتی رہی۔ چونکا دینے کی اس کی پرانی عادت تھی۔

”مائی کے سامنے میں میک اپ میں آئی تھی لیکن وہ میرے اصل چہرے سے بھی واقف ہو گئی..... لیکن ہائے رے میری وہی مظلوم کہانی..... جس نے تم جیسے جفاکاری کو بھی میرا درد بتا دیا تھا تو مائی تو پھر معصوم تھی۔ میں اس کی دوست بن کر نواب کی حویلی میں رہنے لگی اور مائی کے ذریعے نہ صرف مجھے چودھری شمس علی کی اندرون خانہ باتیں معلوم

ہوتی رہیں بلکہ پہلی بار مجھے یہ بھی پتا چلا کہ مائی کو کامران چودھری سے محبت بھی ہے..... اور یہ محبت کامران چودھری کے انکار کے بعد بھی اتنی ہی شدید تھی جتنی کہ پہلے سے تھی۔ باوجود تمام کوششوں کے مجھے اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ جواد کو کہاں قید رکھا گیا ہے۔ میں بلاوجہ کسی جگہ پر حملہ کر کے ماسکے اینڈ لٹنی کو یہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ میں واپس آ گئی ہوں۔ اسی دوران تمہاری کہانی کا دی اینڈ ہو گیا..... پہلے تو میں سمجھی کہ تم واقعی ملک سے فرار ہو گئے ہو اور پھر تم نے دلیرانہ شہد ہو کر خودکشی بھی کر لی ہے۔ اس خبر کا مائی پر اتنا اثر ہوا کہ وہ شدید بیمار ہو گئی حتیٰ کہ اس کی جان بچانے کے لیے چودھری شمس نے اسے یہ دوا کا خیر خریدی کہ مرنے والا کا کاڈ پلکیٹ تھا۔ اصل کامی زندہ ہے اور اسے اسلام آباد بھی نکال کر یہاں ساجیوال کی ایک کوئی کے تہ خانوں میں چھپا کر رکھا گیا ہے..... اور پھر مائی کی نسلی کے لیے اسے اس قید خانے کا بھی چکر لگوا دیا گیا جہاں ہمیں بے ہوشی کے عالم میں رکھا گیا تھا۔ مائی کے ذریعے مجھے ان سب باتوں کا علم ہو گیا اور میں نے اپنا پلان بدل لیا۔ مائی یہ بات بھی جانتی تھی کہ چودھری شمس نے اب کامی کو ایک نئے چہرے اور نئے نام کے ساتھ ایک بالکل نئی زندگی دینے کا منصوبہ بنا رکھا ہے لیکن مائی یہ بھی جانتی تھی کہ تم بھی اسے اپنے باپ کی یہ بات نہیں مانو گے..... اور ہو سکتا ہے کہ اس بااثر باپ بیٹے میں پہلے سے بھی بڑا انکار ہو جائے۔

”ایک ہمدرد اور راز محبت سے واقف دوست ہونے کی حیثیت سے میں نے مائی کو یہ یقین دلادیا کہ چودھری شمس اگر اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے بیٹے کی زندگی بچا سکتا ہے تو وہی باپ اپنی عزت بچانے کی خاطر اسی بیٹے کو جان سے مار بھی سکتا ہے۔ اس بات کو لے کر میں نے مائی کو مجبور کر دیا کہ اسے ہر حال میں کامی کو بچانا چاہیے۔ بس پھر کیا تھا معصوم اور بھولی لڑکی میری باتوں میں آ گئی اور ہمیں بچانے کے لیے وہ ایسا سب کچھ کرنے کو تیار ہو گئی جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی..... تم ہوش میں آ چکے تھے، چودھری شمس علی کو اسلام آباد جانا پڑا تم ہوش میں آنے کے بعد بھوک ہڑتال پر چلے گئے جس پر ماسکے نے بھائی شفیق کو بلوایا۔ مجھے ان ساری باتوں کی خبر بھی لہذا موقع غنیمت جانتے ہوئے میں نے مائی کو بھائی شفیق کے ساتھ تمہارے پاس بھیج دیا۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ تمہیں تمہارے بھائی شفیق کی ساجیوال والی کوئی کے تہ خانوں میں رکھا گیا تھا۔“

اس نے ایک توقف کیا پھر کہنے لگی۔

”پھر جو ہوا اس میں مایہ کا کمال تھا۔ اس نے سب کے لیے اپنے ہاتھوں سے کھانا بنایا جس میں نیند کی گولیاں شامل کر دی تھیں۔ اس سے پہلے مایہ ہمیں بھی ٹرکولا ٹرک دے چکی تھی۔ جیسے ہی سب بے سدا ہوئے، اس نے مجھے فون کیا اور مجھے وہیں بلوایا۔ اس کے بعد ہم دونوں نے مل کر تمہیں تھانے سے باہر نکالا اور کار میں ڈال کر اس کوشی سے باہر لے آئے۔ مایہ کو میں نے ایک اور خطبہ جگہ رکھا ہے اور تمہیں یہاں لے آئی۔ اس بچاری کو یہ علم نہیں کہ اس نے تمہیں دشمنوں کی قید سے نکال کر قاتلوں کی قید میں دے دیا۔ ہے نا دلچسپ بات.....؟“ آخر میں اس نے شرارتی انداز میں قہقہہ لگایا۔

”اب مایہ کہاں ہے؟“ میں نے سناٹ لے لیا۔
”مجھ کو وہ میری قید میں ہے لیکن بالکل خیریت سے ہے..... اور یقین کرو اگر تم میرے کہنے پر چلتے رہے تو وہ خیریت سے ہی رہے گی۔“
”تم نے مایہ سے دوستی کی..... یقیناً اس کے گھر بھی جاتی رہی ہوگی۔ نواب صاحب نے تمہیں پہچانا نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”تم جانتے ہو کہ بہروپ بھرنا میرے لیے مشکل نہیں۔ نواب صاحب تو میرے سامنے آتے ہی نہیں سمجھتے کافی شرمیلے انسان ہیں، البتہ مایہ کو میں نے اپنی اصلیت بتادی تھی لیکن فکر مت کرو۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں وہی ہوں جسے کامران چودھری نے کشتوں کے پٹے لگاتے ہوئے بچایا تھا۔“

”فضول باتوں کے بجائے بہتر ہے کہ تم اس مدعے پر آؤ جس کے لیے تم نے یہ سارا ڈراما رچا ہے۔“
”تم کم ذہین نہیں ہو..... بلاشبہ اس بات کی میں معترف ہوں، کچھ اندازہ لگاؤ۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”مجھے کچھ اندازہ ہے۔ تم چاہتی ہو کہ میں مایہ کی زندگی بچانے کے لیے جو ادھو دھری شہمت کی قید سے چھڑوا کر یہاں لے آؤں؟“

”ارے واہ..... تم تو بڑے سمجھ دار نکلے۔ آئی ایم رینلی امپریس.....“ اس نے ہلکے سے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ وہ بار بار ایسی حرکتوں سے مجھے یوں چھیڑ رہی تھی جیسے مجھے ہڑکانا چاہتی ہو اور میں یقیناً اندر سے غصہ دبائے ضرور بیٹھا تھا لیکن میرا ضبط کامل تھا۔

”ویسے تو مجھے اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن ایک سوال کا جواب ضرور پوچھنا چاہوں گا.....؟“ ایک

خیال کے تحت میں نے پوچھا۔
”ہاں ہاں پوچھو نا؟“

”میں واقعی جو ادھو زندہ سلامت یہاں لے کر آؤں یا پھر صرف اس سے ان ہیروں کا پتا معلوم کر لوں جسے اس نے اس طرح کہیں چھپایا ہے کہ تم بھی اسے ڈھونڈ نہیں سکیں؟“ میں نے اچانک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔ اس کی مسکراہٹ وہیں جم کر رہ گئی اور بڑی آہستگی سے معدوم ہوتی چلی گئی۔ کالج جیسی آنکھیں مضطرب ہو گئیں۔
”مجھے جو ادھو چاہیے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں..... سمجھتے تم؟“ وہ سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ غرائی۔

”لیکن جہاں تک میرا اندازہ ہے تمہارے فقرے کا دوسرا حصہ جھوٹ پر مبنی ہے۔“ میں نے مطمئن ہو کر کہا۔ وہ کچھ دیر ہونٹ کانٹے ہوئے مجھے گھورتی رہی پھر بولی۔
”تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں جو ادھ کے بجائے ہیروں میں دلچسپی رکھتی ہوں؟“

”کیونکہ میں نے تم سے محبت کرنے کی غلطی کی تھی اور جب مجھے اس غلطی کا احساس ہوا تو ساتھ ہی مجھے یہ ادراک بھی ہو گیا کہ تم تو محبت کیلئے جانے کے لائق بھی نہیں ہو۔ تمہارے سینے میں دل نہیں ہے، ایک ہیرو کے کا ایسا ٹکڑا ہے جو جتنا بھی خوبصورت ہو لیکن ہوگا بے جان.....“ میں نے تلخی سے کہا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ ”تم جیسی عورتیں صرف مردوں کو استعمال کرتی ہیں۔ پیسے کے لیے یا عزت کے لیے..... عزت تو تمہیں راس نہیں..... اس لیے مجھے یقین ہے کہ تمہیں پیسوں سے ہی دلچسپی ہوگی جو کہ جو ادھ کے پاس ہیروں کی شکل میں ہے۔“
”اپنی بکواس بند کرو۔“ وہ چلائی۔

”اور مجھے اندازہ ہے کہ اس بات کا جو ادھ کو بھی علم ہو گیا ہوگا اس لیے اس نے ان ہیروں کو پہلے ہی کہیں چھپا دیا تھا۔ شاید تم بھی ڈیرے کی طرح ان ہیروں کو حاصل کر کے جو ادھ سے چمکارا جا رہی تھیں لیکن تمہیں صرف ایسے وقت کا انتظار تھا کہ جب تم کسی محفوظ مقام پر پہنچ چکی ہو تیں..... میں خشک کہہ رہا ہوں نا؟“ وہ غصیلی نظروں سے مجھے کچھ دیر گھورتی رہی پھر لہجے کو سیاٹ بناتے ہوئے بولی۔

”یہ سچ نہیں ہے۔“ لیکن اس کا اندرونی اضطراب بتا رہا تھا کہ میرے اندازے کا ہر تیراٹا پر بیٹھ رہا ہے۔

”میں تو صرف حقائق کی بات کرتا ہوں۔ تم چاہے لاکھ نظریں چرا لو جو سچ ہے، وہ بدل نہیں سکتا۔“
”جب میں تمہیں ٹرین میں ملی تھی تب ہیرو کے تو

میرے پاس ہی تھے۔ میں اس وقت فرار کیوں نہیں ہوئی؟“ اس نے دانت کچکاتے ہوئے پوچھا۔

”کیونکہ اس وقت تم اور تمہارے گھر والے جواد کے رحم و کرم پر تھے۔ اگر تم اسے بھی دھوکا دیتیں تو ماکھے کے ساتھ ساتھ جواد بھی تمہارا پیچھا دوزخ کے دروازے تک کرتا۔ تم نے اس وقت کا انتظار کیا جب تک تم اپنے گھر والوں کو محفوظ نہیں کر دیتیں۔ میں نے پتا چلا یا تھا..... ”موسیٰ وال“ کے اس گھر میں جہاں تمہارے گھر والوں کو جواد نے چھپا رکھا تھا اور جس دن مجھے گولی لگی تم دونوں نے وہیں پناہ لی تھی اور وہاں سے نکلنے سے پہلے تم نے اپنے گھر والوں کو ایسی جگہ بھیج دیا جس سے جواد بھی ناواقف تھا۔ میرے جواد کے پاس تھے لہذا تمہیں اس کے ساتھ جانا ہی تھا۔ دونوں کہیں دور نکل جاتے جہاں تمہارے ساتھ جواد کے علاوہ کوئی اور نہ ہوتا پھر ایک وقت آتا جب جواد ہیروں کو تمہارے سامنے لے آتا۔ تم وہ ہیرو حاصل کر کے جواد کو ختم بھی کر دیتیں تو کسی کو پتا نہ چلتا کہ تم میں اور جواد میں کیا کشمکش تھی..... کیونکہ روپ بدلنے کی تو تم ماہر ہو لیکن فرار کی تمہاری کہانی سن کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس افراتفری میں بھاگتے ہوئے تمہیں شاید جواد سے میرے حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکا ہوگا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے بات ختم کی تو وہ مجھے گھور رہی تھی۔

”تمہارے یہ اندازے غلط بھی تو ہو سکتے ہیں؟“ اس کی آواز میں اتن فن ختم ہو چکا تھا۔

”اندازے، ہمیشہ سچ کی بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں۔ تم شاید بھول گئی ہو کہ میں ایک صحافی بھی ہوں۔ جب تم اور جواد مجھے دھوکا دے کر بھاگ نکلے تھے تب میں نے تم لوگوں کی جان بخشی ہوئے تمہارا پیچھا نہ کرنے کا فیصلہ ضرور کیا تھا لیکن میں نے تمہارے بارے میں تمہارے ماضی کی داستانیں ضرور کھدیز کر باہر نکال لی تھیں لیکن پھر میں تم لوگوں پر لعنت بھیج کر شہر چلا آیا کیونکہ میرے پاس تم جیسے فضول لوگوں سے زیادہ اہم کام تھا۔“ اب کی بار چونکا دینے کی باری میری گئی۔ مجھے بہت سی باتیں ماکھے سے معلوم ہو چکی تھیں جب مجھے گولی لگنے کے بعد وہ جواد اور اشی کے پیچھے لگ گیا تھا۔

”تم..... تم کہنا کیا چاہتے ہو.....؟“ وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔

”بھئی کہ مجھے علم ہو چکا ہے کہ تمہاری رگوں میں اس بازار کے کسی گاہک کا خون دوڑ رہا ہے جہاں شریف زاوے بھی نہیں جاتے۔ تمہاری ماں کا نام بیسہ بانی تھا۔ ”بازاروں“ کا دور ختم ہو جانے کے بعد جب بہت سی طوائفوں

نے پنجابی تھیٹروں کا رخ کیا تو ان میں سے ایک تمہاری ماں بھی تھی..... اور تمہاری بہن ساہیوال کے تھیٹر کی ایک ابھرتی ہوئی اداکارہ تھی۔ جعفری نامی وہ غنڈا تمہاری بہن کے ڈانس پر فدا ہو کر اس کے پیچھے پڑا تھا۔ تمہاری ماں ایک چالاک عورت تھی، اسے تمام بازاری گر اچھی طرح آتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اپنی گدڑی کے لعل کو ایک دم بیچا نہیں جاتا بلکہ اس کی نمائش لگا کر بڑی بڑی پارٹیوں سے اس کی قیمت لگوائی جاتی ہے۔ اس مقابلے میں حصہ لینے والے اپنی انا کی خاطر قیمتیں بڑھاتے رہتے ہیں پھر اس لعل کا حق دار وہ ہوتا ہے جس کی قیمت بھی سب سے بڑی ہوتی ہے اور طاقت بھی..... جعفری تھروڈ کلاس غنڈا تھا۔ وہ اس لعل کو چھیننے کا پروگرام بنا رہا تھا..... اسی لیے جب ایک رات وہ تمہارے گھر پر حملہ آور ہوا تو تمہارے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ جواد کے ذریعے تم رانا ایوب کی این جی او میں پینپن نشیات کے کام میں بہت پیسا ہوتا ہے اور پیسے کا نشر سب سے بڑا اثر ہوتا ہے۔ تم اس کام میں اپنی مرضی سے لوٹ ہو گئیں اور پھر جب تم جواد کو بگ باس کے روپ میں ملیں تو تمہیں پتا چلا کہ یہ نو جوان وڈیرا تمہاری زلف کا اسیر بن چکا ہے تو تمہارے اندر کی طوائف جاگ اٹھی..... لیکن پھر تمہیں پتا چل گیا کہ جواد تو کنگال ہے، اس کے پاس اپنا پتہ کچھ بھی نہیں، جو کچھ بھی ہے وہ چودھری حشمت علی کا ہے۔ ہاں البتہ نشیات کی اس گلیگ میں وہ بگ باس بن کر بہت کچھ کر سکتا تھا..... مگر اسے اتنا موقع ہی نہیں ملا۔ جب معاملات خراب ہو گئے تو تم نے یہ کوشش شروع کر دی کہ کسی طرح وہ میرے ہاتھ لگ جائیں اور تم جواد کو چھوڑ دو۔ تمہیں قسمت نے جواد کی شکل میں سننے کے موقع دیا کہ جواد سب کچھ چھوڑ دینا چاہتا تھا لیکن خون اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔ تمہارے لباس، چہرے، کردار اور الفاظ میں شاید شرافت ضرور آگئی تھی لیکن نیت کا کیا کیا جائے۔ ایک طوائف زادی کے دل میں دنیا کی ہر شے سے محبت ہو سکتی ہے، سوائے ایک انسان کی محبت کے..... جواد نے تم سے محبت کی تھی لیکن تم نے صرف اس کے پیسوں سے اور صاف لگ رہا ہے اب بھی یہ تماشا جاری ہے۔“ نیم تاریکی میں، میں اس کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکا۔ وہ بس خاموش تھی۔ اتنی خاموش حتیٰ خاموشی سے ہمارے گرد شام کے اندھیرے ابھر رہے تھے۔

میں نے جھکی بجا کر اسے مخاطب کیا۔

”تم کیا سمجھتی ہو..... صرف تمہیں ہی چونکا نا آتا ہے؟“

اس کی آنکھوں میں پانی چمک رہا تھا۔

”اندر چل کر بات کرتے ہیں۔“ وہ ایک دم اٹھی اور تیز

تیز قدموں سے اندر بڑھ گئی۔ اسے پتا تھا کہ ساری کوشی خالی ہے حتیٰ کہ مین گیٹ پر بھی سوائے ایک چوکیدار کے کوئی نہیں ہے۔ میں چاہوں تو یہاں سے نکل سکتا ہوں..... لیکن وہ جانتی تھی کہ میں اب کہیں نہیں جا سکتا۔ میرے پاؤں میں مانی کے نام کی ان دیمی زنجیریں بندھ گئی تھیں۔ میں کچھ دیر وہیں بیٹھا سوچتا رہا پھر میں بھی اندر چلا آیا۔

☆☆☆

”مانی تم ٹھیک ہو؟“ میں نے ٹیلی فون ریسپور پر اس کی آواز پہچانتے ہوئے کہا۔
 ”کامی! آپ کہاں ہیں.....؟ اور وہ آشتی کہاں ہے..... اسے کہیں کہیں اس کا گارڈ مجھے باہر نہیں جانے دے رہا۔“ وہ رو ہانسی ہو رہی تھی۔

”تم فکر مت کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ گارڈ تمہاری حفاظت کے لیے ہی ہے۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”میں ڈر لگ رہا ہے۔ ہمیں گھر جانا ہے۔ اباجی کتنے پریشان ہوں گے۔“ اس کی پریشانی کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

”مانی! میری بات غور سے سنو۔ سب ٹھیک ہے، میں خود نواب صاحب سے بات کر لوں گا۔ تم بس پریشان مت ہو۔ میں بہت جلد تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں پھر ہم ایک ساتھ مراد آباد جا چلیں گے۔ تم سمجھ رہی ہو نا..... اپنا ڈرو غیرہ سب نکال دو۔“

”آپ ہیں کہاں؟ آپ میری دوست آشتی سے ملے؟ آپ اس کی بات ماننا وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”میں جانتا ہوں، وہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔“ میں نے دائیں طرف بیٹھی آشتی کی طرف دیکھتے ہوئے طنز یہ انداز میں کہا جسے مانی سمجھ نہیں سکی۔ ”اور میں کوشش کروں گا کہ اس کی کچھ باتیں مان بھی جاؤں۔“
 ”آپ کب آئیں گے؟“

”بہت جلد..... گھبراننا مت اور اپنا خیال رکھنا۔“ میں نے اختتامی الفاظ کہتے ہوئے فون کا ریسپور گرینڈل پر رکھ دیا اور آشتی کی طرف دیکھنے لگا جس کا چہرہ خلاف توقع بے تاثر تھا۔ یہ ان انکشافات کا نتیجہ تھا جو میں نے اس کے بارے میں تھوڑی دیر پہلے کہے تھے، وہ بولی۔

”تم نے جو کچھ میرے بارے میں سنا اور کہا وہ سب سچ ہے۔ بس اس میں کچھ ترمیم کرنا چاہتی ہوں یہ سچ ہے کہ میری ماں ایک طوائف تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ مجھے ایک

شریفانہ زندگی دینے کی بھی خواہاں تھی اسی لیے اس نے مجھے بڑھانا لکھنا چاہا مگر شاید تم ٹھیک کہتے ہو کہ ایک طوائف سب کچھ حاصل کر سکتی ہے سوائے عزت کے..... لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے کہ اگر جواد نے مجھ سے محبت کی تھی تو میں نے بھی اسے بے لوث چاہا تھا۔ ایسی بے لوث محبت جس میں روپے پیسے کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کے بعد ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتے تھے اسی لیے ہم نے منشیات کے چنگل سے بھی خود کو نکالنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس فیصلے پر عمل کرنا آسان نہیں تھا۔ آخری کھپ کے ان ہیروں کی حفاظت اور مالکے کا ہمارے پیچھے لگ جانا ہمارے لیے وبال جان بن چکے تھے۔ ایسے میں تم سچ میں ٹپک پڑے تو ہمیں تمہارا استعمال کرنا پڑا۔

”میری اگلی کہانی بھی سچ پر مبنی ہے کہ ہم پہلے وڈیو سے دھوکا کھاتے کھاتے بچے اور آخر کار ”اداکاں والا“ نامی گاؤں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے لیکن یہاں پر میں نے تم سے کچھ چھپایا ہے۔ اسی گاؤں کے ایک کپے سے گھر کی ایک رات کا واقعہ ہے۔ جواد باہر سے شراب پی کر آیا تھا۔ اس رات وہ خود کے قابو میں تھا۔ اس کی زبان پھسلتی جا رہی تھی اور مجھ پر نت نئے انکشاف ہو رہے تھے۔ اس نے مدھوشی میں مجھے ذلیل طوائف کہہ کر پکارا تو میرا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا۔ حالانکہ اسے میرے بارے میں سب کچھ تو پتا تھا لیکن اس نے مجھے کبھی اس طرح نہیں پکارا تھا شاید دشمنوں کے زعمے میں جان بچاتے بچاتے اس کی ذہنی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں نے اسے پیسوں کی خاطر غلط کاموں پر اکسایا اور میں ہی اس کے اب تک کے حالات کی ذمہ دار ہوں۔ وہ اپنے آپ سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے مجھے تھڑ مارے میرے بال نوچے..... اور مجھے بتایا کہ وہ مجھے ہیروں کے پاس بھی پھٹکنے نہیں دے گا۔ وہ مجھے مارتا رہا اور میں اس کے اس روپ پر اتنی حیران تھی کہ اس کی مار کھاتی رہی۔ اگلے دن اسے کچھ یاد نہیں تھا اور نہ ہی میں نے اسے احساس دلایا۔ میں تو بس اس حیرانی میں تھی کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ ہم دونوں کئی سال سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے ہر راز سے آشنا تھے۔ ہمارا تعلق کیسے اس طرح کمزور ہو سکتا ہے..... اور جانے ہو تب مجھے صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی اور وہ یہ کہ مجھے یہ سزا نہیں دھوکا دینے کے صلے میں ملی ہے۔ میں بھول گئی تھی کہ میں کئی دن بے یار و مددگار تمہارے ساتھ ایک گھر میں رہی اور تم نے میرے لیے جو کیا وہ عام بات نہ تھی۔ تم نے میری خاطر ساری دنیا سے لڑائی مول لی

اگر بیٹوں کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس گیلی مٹی کے ڈھیر کے سربانے ایک کتبہ ابھی ابھی نصب کیا گیا تھا۔ ”چودھری حشمت علی۔“ نیچے تاریخ وفات دو دن قبل کی درج تھی۔ میری آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس قبر پر تو اتارے گر رہے تھے پھر کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اس ہوٹل رہا منظر سے باہر کھینچا۔ یہ بھائی شفیق تھے، ان کے ساتھ عمران ماکھا اور کئی دوسرے آدمی بھی تھے۔

”چلو واپس چلیں۔“ عمران نے مجھے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کی طرف لے آیا میں ان کے ساتھ یوں چل رہا تھا جیسے قدم اٹھانے میں نیت کو خٹ نہ ہو۔ چند لمحوں بعد گاڑی حویلی کی طرف جاری ہوئی تھی۔ میں آج دوپہر کو ہی مراد آباد پہنچا تھا اور جس وقت میں نے حویلی میں قدم رکھا، تب تک جنازہ قبرستان لے جایا جا چکا تھا۔ حویلی رونی ہوئی عورتوں سے بھری ہوئی تھی۔ بھر جانی اور نازو نے روتے ہوئے مجھے یہ اندوہناک خبر دی تو میرا داغ ماؤف سا ہو گیا۔ میں قبرستان پہنچا تو تدفین کی تیاری ہو رہی تھی۔ میرے اندر اس قبرستان سے بھی زیادہ گہرا سناٹا اترتا جا رہا تھا۔ میں سفید کفن میں لپٹے اس انسان کو دیکھ رہا تھا جس سے میرے دور شتے تھے یہ میرا باپ بھی تھا اور میرا مذمن بھی..... لیکن ایک بات طے تھی، مجھے اس سے یا اسے مجھ سے نفرت نہیں تھی۔

ہم حویلی واپس پہنچ گئے۔ بھائی شفیق کہہ رہے تھے۔ ”آج صبح اباجی اسلام آباد سے واپس آرہے تھے موٹر وے پر بحیرہ انٹرپرائز کے قریب ایک ٹرک نے ان کی گاڑی کو ٹکڑے ماری۔ ڈرائیور، اباجی اور ایک گارڈ موقع پر ہی جان کی بازی ہار بیٹھے۔ دوسرا گارڈ شدید زخمی حالت میں اسپتال لایا گیا۔ اس سے پہلے عمران سے اباجی کی کل رات بات ہوئی تھی۔ وہ تمہاری (کامران)..... گمشدگی پر بہت پریشان تھے۔ بار بار کہہ رہے تھے کہ کامی کو ڈھونڈو اس کی جان خطرے میں ہے۔ ادھر ہم بھی کم پریشان نہیں تھے۔ ساہیوال کی کوٹھی میں جہو اس کا راز بھی نہیں کھل رہا تھا۔ ہم سب کھانا کھا کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ ہوش میں آئے تو ہم اور ماہی غائب تھے۔ اباجی کے حادثے کی خبر سب سے پہلے عمران کو ملی تو یہ فوراً روانہ ہو گیا۔ بعد میں ماکھا اور میں وہاں پہنچے لیکن..... لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔“

”وہ ایک سیڈنٹ نہیں..... قتل تھا۔“ عمران کی گھبراہٹ کوئی۔ ”زخمی گارڈ نے مجھے بتایا کہ ٹرک نے سائڈ سے گزر جانے کا اشارہ دیا تھا جیسے ہی ہم گزرنے لگے اس نے سائڈ مار دی۔ ان کی گاڑی سڑک کے داہنی طرف لگے پتھروں

لگے موت کے منہ سے کھینچ کر باہر نکالا اور بدلے میں میں نے انہیں صرف دھوکا ہی نہیں دیا بلکہ تمہاری محبت کا مذاق بھی ادا کیا شاید مجھے اسی بات کی سزا ملی تھی۔“

وہ کہہ رہی تھی اور میں حیرانی کے سمندر میں غوطہ زن یہ راج رہا تھا۔ جب میں موت و زندگی کی نگاہ سے نکل کر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا تب ماہی میری تیار داری کر رہی تھی۔ انہی لمحات میں مجھے بھی یہی خیال آیا تھا کہ میں نے ماہی کا دل دکھایا ہے شاید اس لیے قسمت نے مجھے بھی میری محبت سے محروم کر دیا۔ یہ عمل رد عمل کا دائرہ تھا، ہزار جزا کا معاملہ تھا یا پھر تو بہن محبت کا قانون تھا..... میں نہیں جانتا تھا لیکن ہاں..... کھیتی وہی اگتی ہے جس کا بیج ڈالا جائے۔ بیول کے بیج سے گلاب نہیں اگتے۔ کسی کا دل دکھا کر محبت کا بیج بویا جائے تو چاہے اس بیج کی آبیاری آنسوؤں سے کر لیا یا اس کے سر ہانے بیٹھ کر دن رات دعا کیں کرتے رہیں لیکن محبت کا پودا انہیں پھوٹا۔ پھوٹی ہیں تو صرف کانٹے دار ہماڑیاں۔

میں آشتی کی آواز سن کر سوچ کے صحرا سے واپس پلٹاؤں کہہ رہی تھی۔

”میں جانتی ہوں، تمہیں ان باتوں پر یقین کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کوئی وجہ..... اور مجھے بھی تم سے کوئی کریمٹر سرٹیفکیٹ نہیں بنوانا۔“ وہ یک لخت پھر اپنے پرانے موڈ میں آگئی۔ ”ہم دونوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ ہم دو کام کی بات کریں جس کے لیے ہم یہاں موجود ہیں۔ مجھے جواد چاہیے..... زندہ سلامت..... بدلے میں، میں تمہیں تمہاری ماہی دوں گی۔ پولو سودا منظور ہے؟“

”تم لوگوں کا قرض مجھ پہ بڑھتا جا رہا ہے۔ تمہیں اندازہ ہے کہ میں ماہی کو بچانے کے بعد تم لوگوں کے ساتھ کیا کر سکتا ہوں؟“

”مجھے اندازہ ہے..... اچھی طرح اندازہ ہے لیکن میں یہ رسک ضرور لوں گی۔ میں جواد کو لے کر یہاں سے بہت دور نکل جاؤں گی لیکن اگر تمہیں شوق ہوا تو تم ہمارے راستے روک کر بھی دیکھ لیتا۔“ وہ بے خوف انداز میں بولی، اس لمحے وہ مجھے وہی پہلے والی آشتی لگی۔ نڈر، بے باک، بے خوف، اور شاطر!

☆☆☆

تیز ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی میرے گرد چکر اڑتی تھی، ایک ایسی خاموشی بھیلی ہوئی تھی جیسے آواز ہونا جرم ہو۔ میرے سامنے موجود گیلی مٹی کے ڈھیر سے مٹی، گلاب اور

سے نکرا کر گھوم گئی۔ اس کا بایاں حصہ بری طرح پچک چکا تھا۔ اباجی اور بیٹھے بیٹھا گاڑ شدید زخمی ہو گئے لیکن اسی ٹرک نے بریک لگا کر ٹرک کو بیک کیا اور ایک بار پھر گاڑی کو بری طرح سے روندنا ہوا آگے گزر گیا..... جسے کچھ دور جا کر بری موڑ دے پولیس نے روک لیا اور ڈرائیور کو گرفتار کر لیا تھا۔ بظاہر یہ ایک ایڈنٹ تھا لیکن یہ ایک قتل کی سوچی سمجھی سازش تھی۔“ پھر ایک توقف کے بعد وہ بولا۔

”اور اس بات کا خدشہ اباجی کو پہلے سے تھا۔ کچھ دنوں سے وہ بہت پریشان سے تھے۔ تمہیں ساہیوال کی جس کوٹھی میں رکھا تھا وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی لیکن پچھلے چند دنوں سے بار بار خود بھی وہاں جاتے اور ہم دونوں کو بھی بھیجتے۔ سیکورٹی بھی سخت کر دی گئی تھی..... اور یہی نہیں، ایک دن مجھے ڈسے کمرے میں بلایا تو وہاں ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے مجھ سے ایک عجیب بات کہی۔ یہ بولے۔

”عمران پتر! جب کا می آئے گا تو اسے یہ چابی دے دینا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے تہ خانے والی تجوری کی چابی مجھے دے دی۔

میں نے حیرانی سے کہا۔ ”..... اباجی کا می کب آئے گا؟“ بولے۔ ”بہت جلدی..... اسے اب آ جانا چاہیے۔ بہت آرام کر لیا اس نے، اسے اب کام پر واپس آ جانا چاہیے۔“ ان کے لہجے میں تھکاوٹ تھی کہہ رہے تھے۔ ”میں تھک گیا ہوں ان چیزوں کی حفاظت کرتے کرتے..... اب اسے کا می کے حوالے کرنا ہی ہوگا۔“

مجھے ان کی باتیں کچھ نہیں آ رہی تھیں لیکن جو آخری بات انہوں نے کہی، اس نے مجھے پریشان کر دیا۔ انہوں نے کہا۔ ”عمران پتر! کامران سے کہنا چودھری حشمت کی انا بیٹے کی ضد سے ہار گئی۔“

عمران بھائی ساری تفصیل سننے کے بعد چپ ہوئے پھر انہوں نے ایک بڑی مضبوط سی پرانی وضع کی چابی میری ہتھیلی پر رکھ دی اور بولے۔

”اس تجوری میں تمہارے لیے کچھ ہے۔ ابھی دیکھ لو تو بہتر ہے۔ ہم ذرا مہمانوں کا انتظام دیکھ لیں۔“ اس نے کہا اور بھائی بیٹے کو لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد تجوری میرے سامنے اپنے سارے راز کھولے بیٹھی تھی۔ اندر ایک بریف کیس تھا۔ جسے کھولا تو دیکھا اس میں وہ تمام ثبوت اپنی اصل حالت میں تھے جن کی مدد سے میں اباجی اور ان کے دوست سرکاری افسروں کو ان کے غیر قانونی کاموں کی وجہ سے عدالت تک پہنچا لایا

تھا۔ البتہ اس میں کافی چیزوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ایک خط بھی تھا۔ جو تاریخ کے اعتبار سے انہی تاریخوں سے ایک میں لکھا گیا تھا جب میں ان کی تحویل میں طویل ہوئی کے عالم میں تھا۔ اس خط میں انکشاف انگیز باتیں تھیں ان باتوں میں ایک ویڈیو کا ذکر بھی تھا جو اس سامان میں تھی۔ یہ ایک ویڈیو ڈسک تھی۔ میں نے ویڈیو پلیئر منگوا کر اسے پلے کیا۔ یہ ویڈیو بہت ہی اہمیت کی حامل تھی۔ اس میں تین حصے تھے۔ پہلا حصہ کسی خفیہ کمرے کی مدد سے بنا تھا۔ کمرہ کمرے کی ایک دیوار پر قدرے بلندی پر آرائشی پھولوں میں نصب تھا مگر اس کا رزلٹ بھی بہت اچھا اور آواز کی کو آئی بھی..... منظر ویسی ہی تھا جیسا کہ اسلام آباد میں ایک فارم ہاؤس میں مجھے بلوا کر اعلیٰ حکومتی عہدیداروں سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس منظر میں نسیم اطہر، سلیم قریشی اور سکندر بخت کے علاوہ چودھری حشمت علی اور تین چار اور شخصیات بھی نظر آ رہی تھیں..... ان کے درمیان ہونے والا بحث کا موضوع میری رپورٹس ہی تھیں۔ (ویڈیو کے کچھ میں تاریخ اور وقت بھی نظر آ رہا تھا جس کے مطابق یہ وہ وقت تھا جب سپریم کورٹ بری رپورٹ پر از خود نوٹس لے چکی تھی۔“ سچ بات تو یہ ہے چودھری صاحب کہ ہم اگر خاموش رہیں تو صرف آپ کی وجہ سے۔“ نسیم اطہر کہہ رہا تھا۔ ”اگر کامران چودھری آپ کا بیٹا نہ ہوتا تو اب تک شاید اس کے ساتھ نہ جانے کیا کچھ ہو چکا ہوتا۔“

”چودھری صاحب! نسیم کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو خاموش ہیں لیکن آپ کو تو بولنا چاہیے۔ کامران کو اگر آپ نہیں روکیں گے تو مجبوراً ہمیں ایکشن لینا ہوگا اور آپ اچھا طرح جانتے ہیں کہ یہ ایکشن کیا ہو سکتا ہے۔“ سلیم قریشی کہہ رہا تھا۔

”آپ والد ہیں اس کے..... مگر اس وقت وہ صرف ہمارا ہی نہیں آپ کا بھی دشمن ہے۔ اگر آپ یونہی خاموش بیٹھے رہے تو اس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ آپ خود پر لگائے گئے تمام الزامات کو قبول کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہم سب بھی جھٹس جا رہے ہیں۔“ نسیم اطہر نے کہا۔

”وقت ریت کی طرح مٹھی سے نکل رہا ہے چودھری صاحب! کل کو کورٹ ہمیں طلب کر لے گی۔ ہم سب پر نوادرات کی اس سنگت اور بدعنوانیت کے الزامات ثابت ہو جائیں گے۔“ سفید کلف لگا سوٹ پہنے وہ شخص میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس تمام گفتگو میں اباجی اور سکندر بخت بالکل خاموش بیٹھے تھے پھر ایک دم سکندر بخت نے اپنی خاموشی

کام بھی نہیں ہوا

شوہر اور بیوی میں زبردست لڑائی ہوئی۔ شوہر نے خودکشی کی ٹھان لی چنانچہ موصوف بازار گئے اور زرہ کی گولیاں خرید لائے۔ بیوی کو دکھاتے ہوئے انہوں نے گولیاں کھائیں لیکن مرے نہیں، صرف بیمار ہو گئے۔ بیوی نے سر پیٹ کر کہا:..... سو بار کہا ہے کہ چیزیں دیکھ بھال کر خریدا کرو..... اتنے پیسے بھی بیکار گئے اور کام بھی نہیں ہوا۔

☆☆

بلیک باکس

تباہ ہو جانے والے جہازوں کا بلیک باکس تلاش کیا جاتا ہے۔ جو آگ، دھماکے غرض کسی چیز سے تباہ نہیں ہوتا۔ آخر یہ سارا ہوائی جہاز ای مواد کا کیوں نہیں بنایا جاتا؟

☆☆

زہر قاتل

ہمیں اپنے جسم سے ورم، پھوڑے اور رسولیاں دور کرنے کی نسبت اپنے ذہن سے غلط خیالات خارج کرنے کی زیادہ کوشش کرنی چاہیے کیونکہ یہ زیادہ زہریلے اور مہلک ہوتے ہیں۔

☆☆

عاجزی

ایک خستہ حال فقیر نے کسی دروازے کے سامنے صدا لگائی:..... ”اے نیک بی بی! کچھ کھانے کو ملے گا۔ بابا بھوکا ہے۔“ گھر سے کوئی آواز نہ آئی تو فقیر دوبارہ عاجزی سے بولا۔ ”اے بی بی! بابا رونی بھی کھا لیتا ہے جاوِل اور برگربھی نوش کر لیتا ہے۔“ ایک دم گھر سے ایک ٹوکڑ دار نسوانی آواز سنائی دی۔ ”کیا بابا جوتے بھی کھا لیتا ہے؟“

”نہیں بی بی! بابا کو سخت غذا منع ہے۔“ بابا نے اطمینان سے جواب دیا۔

(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ)

”دیکھیں چودھری صاحب! جتنی آپ کو اپنے بیٹے کی اس سے زیادہ مجھے میری بیٹی کا گھر عزیز ہے۔ نہ تو مجھے اس میں کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی آپ کے اس خود سر بیٹے میں صرف نسیم کے کہنے پر ابھی تک آپ کے بیٹے کے الگ حرکت میں نہیں آیا، ورنہ میرے ایک فون کرنے سے اس طرح غائب ہو چکا ہوتا کہ جیسے اس دنیا میں پیدا ہی نہیں اٹھا۔ آپ میری خاموشی کو میری کمزوری مت سمجھیے۔ ابھی اسی وقت مجھے اپنا فیصلہ سنا ہے۔“

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد اباجی نے کہا۔
”میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہم سب اس معاملے میں ٹکلیں اور کامران بھی بچ جائے۔“

”چودھری صاحب! آپ اتنی سی بات نہیں سمجھ رہے کہ اب تک کامران زندہ ہے اس وقت تک یہ معاملہ ختم ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ سمجھنے سمجھانے کے چکر سے نکل گیا ہے۔ ایسے ضدی بے کواب آپ بھی نہیں سمجھا سکتے۔“ سلیم قریشی نے کہا۔
”وہ میرا پتر ہے سلیم قریشی..... چودھری حشمت علی کا۔“ اباجی بدلتے ہوئے۔

”چودھری صاحب! مرنے کا مطلب جان سے مارنا نہیں ہوتا..... ایک موت وہ بھی ہوتی ہے جس میں بندہ کسی لی نظروں میں مرجاتا ہے۔“ سکندر ریخت سکار کا گاڑھا دھواں اگلنے ہوئے بولا۔ ”میرے پاس ایک حل ہے جس میں سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“ ایک توقف کے بعد وہ بولا۔ ”ہم کامران کے قدم قاتم کا ایک بندہ تلاش کریں گے۔ پلاسٹک سرجری یا جدید میک اپ کے ذریعے اسے ہو بہو کامران بنایا جائے گا۔ پھر ہم اصل کامران کو اغوا کر کے طویل بے ہوشی میں رکھ دیں گے..... کامران کا ڈپلیکیٹ کامران بن کر وہی کرے گا جو ہم کہیں گے..... وہ سپریم کورٹ تک اپنے ثبوت پہنچنے نہیں دیے گا..... میڈیا پر آکر یہ اعلان کرے گا کہ اس کی رپورٹ غلط تھی۔ اس نے انتقامی طور پر سبھی سرکاری افسروں کے خلاف لکھا۔ بی بی میڈیا جو اس وقت اس کی پشت پر کھڑا ہے، اسے اس کے خلاف کر دینا آسان ہو جائے گا۔ ڈپلیکیٹ کامران اپنا کیس خود ہی خراب کرے گا۔ ہمیں کا فیصلہ ہمارے حق میں آنے کے بعد ہم نقلی کامران کو اس طرح قتل کریں گے کہ وہ خودکشی معلوم ہو۔“ سکندر ریخت نے تفصیل بتائی۔

”بہت اچھی تجویز ہے لیکن اصل کامران کا کیا ہوگا؟ وہ بھی نہ کبھی تو ہوش میں آئی جائے گا۔“ سلیم قریشی بولا۔

”بس اسی بات کی گارنٹی چودھری حشمت صاحب ہمیں دیں گے۔ ایک بار یہ سہریم کورٹ کا معاملہ ختم ہو جائے۔ کامران کو ہوش میں لا کر اسے اس سارے کھیل کے بارے میں بتا کر اس کا ہمت توڑی جاسکتی ہے۔ دوسری صورت میں اس کی بھی پلاسٹک سرجری کروا کر اسے ملک سے باہر رکھا جاسکتا ہے۔ پرندہ اور وقت ہاتھ سے نکل جائے تو واپس نہیں لائے جاسکتے۔ ویسے بھی اگلا سال الیکشن کا ہے۔ یہ معاملہ جلدی دوبارہ سر نہیں اٹھائے گا۔“ سکندر بخت اپنی گونج دار آواز میں کہہ رہا تھا۔

اس کی تجویز پر کبھی پر جوش نظر آرہے تھے جبکہ چودھری حشمت بھی اثبات میں سر ہلارہے تھے۔ بات سن کر وہ بولے۔

”ٹھیک ہے، ان حالات میں یہی مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن کامران کو میرے بندے اغوا کریں گے اور وہ میری ہی تحویل میں رہے گا اور اس بات کی میں گارنٹی دیتا ہوں کہ میرے ہوتے ہوئے کامران دوبارہ کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا۔“

”ہمیں منظور ہے..... لیکن کامران کے اغواء کے بعد اس کے پاس جو ثبوت ہیں وہ آپ نے ہمیں دینے ہیں۔“ نسیم اطہر نے کہا تو اباجی نے سر ہلادیا۔

”بس تو ٹھیک ہے، ہم آج سے کامران کا ڈپلیکیٹ بنانے کے لیے بندہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔“ سکندر بخت نے ایش ٹرے میں سگار بجھاتے ہوئے کہا تو ابابو لے۔

”اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ایک بندہ میرے پاس ہے جو کامران کی جگہ لے سکتا ہے۔“ اس کے بعد کچھ دیر وہاں اسی موضوع پر بحث ہوئی رہی پھر اباجی وہاں سے چلے گئے مگر ویڈیو چلتی رہی۔ کمرے میں نسیم اطہر، سلیم قریشی اور دو بندوں کے علاوہ سکندر بخت موجود تھے۔

”کامران کو زندہ رکھنا بہت بڑی بے وقوفی ہوگی۔ جیسے ہی... کورٹ کا فیصلہ آجائے، کامران کو ختم کرنا تمہاری اولین ترجیح ہوگی، ورنہ اس کے خطرے کی ٹکواؤں پر لگتی رہے گی اور جہاں تک میں دیکھ رہا ہوں، اس کامران سے زیادہ ٹیز حا اس کا باپ ہے۔ اس کا بھی کچھ کرنا ہوگا ورنہ یہ اس سے بھی زیادہ خطرناک بن سکتا ہے۔“

یہ فقرہ سکندر بخت نے کہا تھا جس پر ان سب نے اثبات میں سر ہلایا جو اباجی کے دوست اور شریک جرم تھے۔ یہاں پہنچ کر ویڈیو کا پہلا حصہ ختم ہو گیا۔

چودھری حشمت علی کتے جہان دیدہ اور چالاک تھے، یہ

بات اس ویڈیو سے ثابت ہوتی تھی کہ انہوں نے اس عمل میں شریک کی ویڈیو ریکارڈنگ کا بندوبست پہلے سے ہی کر رکھا تھا۔ اس ہوش ربا ویڈیو کا دوسرا حصہ شروع ہو چکا تھا۔

یہ حصہ کسی اسٹوڈیو میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ اس میں چودھری حشمت علی خان کا اعتراف جرم تھا جس میں انہوں نے نہ صرف اپنے تمام غیر قانونی کاموں بشمول نوادرات کی اسٹنگنگ کا ذکر کیا تھا بلکہ ان معاملوں میں شامل ان تمام سرکاری افسران کے نام بھی لیے تھے۔ سب سے اہم بات یہ کہ انہوں نے نوادرات اسکیڈل کے متعلق اس سارے پلان کا تفصیل سے ذکر کیا تھا جس کی وجہ سے نوادرات کیسر کامران چودھری کی ناکامی اور سرکاری افسروں کی جیت پر ختم ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے خود کو اور اپنے دوستوں کو بچانے کے لیے ایک ڈراما کھیلا جس میں انہوں نے کامران چودھری کو اغوا کر کے بے ہوشی میں رکھا اور اس کی جگہ ایک اور آدمی کو کامران چودھری کے میک اپ میں ملک سے باہر بھیج کر ایسی صورت حال پیدا کی کہ سچ کو بھوٹ میں بدل دیا گیا۔

اباجی نے مزید کہا کہ شاید بات یہاں تک ختم ہو جاتی لیکن سکندر بخت چاہتا تھا کہ کامران کو مار دیا جائے اسی لیے انہوں نے کامی کوائی جگہ پر رکھا جس کا علم صرف انہیں ہی تھا اور اب انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی اور کامران چودھری کی جان کو شدید خطرہ ہے۔ اسی لیے... وہ اس معاملے کے متعلق تمام حقائق کی نہ صرف ویڈیو بنا کر انہیں ریکارڈ کر رہے ہیں بلکہ ان سے متعلق کئی دستاویزی ثبوت بھی ساتھ منسلک ہوں گے اور ان کا یہ بیان مجسٹریٹ اور چند گواہان کے روبرو بھی پیش کیا جائے گا۔

ویڈیو ختم ہو گئی..... لیکن اس کے ساتھ ہی میری مٹھی میں دبا گھٹک کا پروانہ جیت میں بدل گیا۔ چودھری حشمت علی جاتے جاتے میرا دامن بھر گئے تھے۔

اس ویڈیو کے تیسرے حصے میں پہلے اس آدمی کی پلاسٹک سرجری کرتے دکھایا گیا جسے میری شکل دی گئی اور وہ بندہ میرے لیے ابجی نہیں تھا..... اس کے بعد اس نے خانے کا منظر بھی تھا جہاں میرا بے ہوش وجود مختلف مشینوں سے جڑی تاروں پر سارکت پڑا تھا۔ اس ڈسک کی مدد سے یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ میں طویل بے ہوشی میں تھا اور لندن میں بیان دینے والا اور مر جانے والا بندہ میں نہیں کوئی اور تھا۔ بریف کیس میں جن چند کاغذوں اور فائلوں کا اضافہ تھا ان میں میری جگہ مرنے والے بندے کی ڈی این اے رپورٹس بھی

”یہ مایہ کی متعلق ہے۔ اگر میں مل رہا ہوں نہ ہاں تو اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

”اوہ..... ہاتھ اب تو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ نواب صاحب بھی پریشان ہیں لیکن انہیں میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ اسلام آباد میں ہے لیکن وہ ہے کہاں؟ تم اور وہ ایک ساتھ ہی غائب ہو گئے تھے؟“

”مایہ اس وقت آشتی کی قید میں ہے اور میں یہاں اباجی کی قید سے جواد کو چھڑوانے آیا تھا تاکہ جواد کے بدلے مایہ کو آزاد کروا سکوں۔“ میں نے کہا تو دونوں بھائیوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

”مگر.....“ عمران نے کہنا چاہا۔

”میں جانتا ہوں لیکن میرے پاس اور کوئی راہبہ نہیں ہے۔“ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

”اچھا لیکن ماکے اور اس کے آدمیوں کو ساتھ لے جا..... بلکہ میں خود بھی چلتا ہوں تیرے ساتھ۔“ عمران نے کہا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”نہیں عمران بھائی! مجھے اکیلے ہی جانا ہے اور ابھی جانا ہے لیکن اس سے پہلے مجھے ماکے سے بھی ملنا ہے۔“

☆☆☆

میں فارم ہاؤس کے ایک کمرے میں تھا۔ میرے ساتھ ماکہ کھڑا تھا اور سامنے کرسی پر دلاور نامی آدی بیٹھا تھا جس کی ابھی ابھی ماکے نے اچھی خاصی درگت بتائی تھی۔ آشتی نے مجھے روانہ کرنے سے پہلے ایک اور کوشی کا ایڈریس دیا تھا جہاں جواد کو میں نے لے کر پہنچنا تھا۔ یقیناً اس کوشی میں اس کے اور ساتھی بھی ہوں گے اور روانہ ہونے کے بعد مجھے یقین تھا کہ میرے پیچھے وہ اپنا کوئی مخبر بھی بھیجے گی جو میرے بارے میں پل پل کی خبر اسے پہنچاتا رہے۔ واپسی کے سفر کے دوران تو مجھے اپنے تعاقب میں کوئی آتا محسوس نہیں ہوا، البتہ اباجی کی تدفین کے دوران چاہے میں دماغی طور پر کتنا بھی غیر حاضر تھا لیکن ایک آدی کو اپنی طرف مگھورتا اور مشکوک انداز میں اپنے گرد منڈلاتا محسوس کر لیا تھا اور یہ آدی ماکے کا آدی ہی تھا۔ بھائی شیش اور عمران سے مل کر میں ماکے سے ملا اور اسے اس آدی کے بارے میں بتایا۔ ماکہ اسے یہاں لے آیا اور اس نے بتایا کہ اس کا نام دلاور ہے اور اب اپنی درگت کے بعد اس نے تسلیم کر لیا کہ وہ جواد اور آشتی کے لیے بہت عرصے سے کام کر رہا ہے۔ البتہ اسے اب جواد کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ اس سے ایک ٹرانسمیٹر بھی برآمد ہو گیا جس کے ذریعے اس نے آشتی تک یہ اطلاع پہنچا دی تھی کہ چودھری

لیں۔ اباجی کا اعترافی بیان بھی موجود تھا۔ نیشنل میوزیم سے دو مختلف حاصل کیے گئے نوادرات بھی موجود تھے۔ اباجی کو اس خطرے کا احساس ہو گیا تھا کہ یہ معاملہ سنگین اور متحرک حال اختیار کر جائے گا۔ وہ چاہتے تو کھلم کھلا ان لوگوں کے دشمنی مول لے سکتے تھے لیکن وہ باوقار انسان تھے۔ جن لوگوں کو انہوں نے اپنا دوست کہا تھا، ان کے ساتھ اس وقت تک یہ دوستی نبھائی جب تک ان کی جان نہیں چلی گئی۔ میں اسوں کو کہتا تھا کہ وہ ایک جانب اپنے دوستوں اور دوسری جانب اپنے بیٹے کے درمیان جاری جنگ میں دونوں اطراف سے بندھے ہوئے تھے۔ دونوں فریقین انہیں اپنی اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ اس کا انجام یہی ہونا تھا جو ہو گیا۔

اور میں..... آنسوؤں سے تر چہرے پر ہاتھ رکھے ایک ہی منظر میں کھویا ہوا تھا۔ جب وہ آہستہ آہستہ تہ خانے سے باہر جا رہے تھے اور میں چاہ رہا تھا کہ انہیں روک لوں لیکن میں انہیں روک نہ سکا۔ کاش میں انہیں آواز دے لیتا۔ جس طرح دھیرے دھیرے وہ بیڑھیاں چڑھ رہے تھے، شاید وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ میں انہیں ایک بار پکار لوں لیکن وقت کے اس لمحے میں ہم دونوں ہار گئے۔ بطور چودھری شمشٹ علی یا کامران کے نہیں..... بلکہ اس دن ایک باپ اور بیٹا ایک دوسرے سے ہارے تھے۔

رات کو بھائی شیش کہہ رہے تھے۔ ”اباجی کی وصیت بھی پڑھ لیتا..... اور میں نے اور عمران نے فیصلہ کیا ہے کہ دوڑے کمرے کی کرسی پر تجھے بٹھایا جائے۔ اباجی کی کچھ تیرے سر ہی بندھے گی۔“ میں دھندلائی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ انہوں نے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”تو جانتا ہے، ہم تو شروع سے ہی ان معاملات سے دور رہے ہیں۔ ہمیں جاگیر کی دیکھ بھال کا کام آتا ہے وہ ہم کیے جائیں گے۔ یہاں بیٹھ کر لوگوں کے مسئلے مسائل حل کرنے اور فیصلے کرنے کی ہمت ہم دونوں میں سے کسی میں بھی نہیں ہے۔ تو پڑھا لکھا ہے۔ اس کچھ کی لاج ہم سے بہتر رکھے گا۔“ وہ بولتے جا رہے تھے۔ ”کل قرآن خوانی کے بعد تیرے سر پر کچھ رکھنے کی رسم ہوگی۔ چالیسویں تک تجھے حویلی میں ہی رہنا ہے۔ تجھے جتنے بھی ضروری کام ہیں وہ بعد میں نمٹا لیتا۔“

”نہیں، مجھے ابھی فوراً جانا ہے۔ اس کے بعد آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”تیرے کام اتنے ضروری نہیں کہ تو.....“ میں نے ان کی بات کاٹ دی۔

حشمت وفات پاگئے ہیں اور بقول دلاور..... آشتی کو یہ خبر ملی
وڑن سے پہلے ہی مل چکی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس
کوئی میں کیا صورت حال ہے جہاں مجھے جواد کو لے کر پہنچنا
تھا تو اس نے مجھے ساری تفصیل بتا دی۔ میں نے اس کے
بارے میں آخری فیصلہ ماکے پر چھوڑ دیا اور باہر نکل کر ماکے
سے کہا کہ مجھے ایک آدمی کی ضرورت ہے لیکن اس کی وفاداری
پر کوئی شک نہ ہو۔ ماکے نے کہا کہ وہ خود میرے ساتھ چلے گا
مگر میں نے اس سے کہا کہ اس کی ضرورت حویلی میں زیادہ
ہے، مجھے بس ایک بندہ چاہیے۔

تھوڑی دیر بعد میں سلطان نامی اس آدمی کے ساتھ
مراد آباد سے نکل رہا تھا۔ دوران سفر میں آگے کی پلاننگ سوچتا
رہا۔ جس کوئی میں مجھے بلوایا گیا تھا، مابھی کو بھی ہونا
چاہیے۔ بالفرض وہ وہاں نہ ہوئی تب یہ بہت ضروری تھا کہ
مجھے آشتی پر اس طرح قابو پانا ہوگا کہ وہ بے بس ہو جائے۔
مطلوبہ گھر سے کافی دور ہی میں نے گاڑی روک دی۔
باقی کا سفر ہم نے پیدل طے کیا۔ خاکی لکڑی کے بڑے سے
گیٹ کے باہر سڑک کے پار درختوں کے بیچ میں نے سلطان
کو روک دیا۔

”تم نے اور کچھ بھی نہیں کرنا۔ میں تمہیں ٹرانسمیٹر پر
کال کروں گا تب تم نے اندر آنا ہے۔ ورنہ یہیں رہنا ہے اور
اگر تم دیکھو کہ اس کوئی سے میرے علاوہ کوئی فرار ہونے کی
کوشش کر رہا ہے تو تم اسے نشانہ بنا سکتے ہو..... سمجھے؟“
”آپ فکرنہ کریں چھوٹے چودھری جی..... میں سب
سنجبال لوں گا“ اس نے اپنی رائفل سنبھالتے ہوئے کہا۔

میں خود اس کوئی کی طرف بڑھ گیا جس کی اندرونی و
بیرونی لائنیں مدھم تھیں۔ اس کے باوجود میں بڑی احتیاط سے
دس فٹ اونچی دیوار پھلانگ کر اندر لان میں کودا اور پھر ایک
گوشے میں بیٹھ کر جائزہ لیتا رہا۔ میرے کونے سے کسی قسم کی
کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی تھی جس پر کوئی رد عمل ظاہر ہوتا پھر بھی
میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر گھاس پر ریٹکتا ہوا سامنے کی
کیاری تک پہنچ گیا۔ پھولوں سے بھرے بیج میں سے مجھے
برآمدہ نظر آ رہا تھا۔ یہاں ہلکے پاور کے بلب کی روشنی میں ایک
شخص کرسی پر بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی گن کرسی کے
ساتھ لگا رکھی تھی اور خود سکرٹ پیتے ہوئے کسی خیال میں گم
تھا۔ میں نے کیاری میں سے ایک چھوٹا سا پتھر تلاش کیا اور
بازو گھما کر اپنے دائیں طرف پھینک دیا۔ پتھر لان سے باہر
پختہ زمین پر ٹک کی آواز سے ٹکرایا۔ کرسی پر بیٹھا آدمی بجلی کی
سی تیزی سے اپنی گن اٹھا کر کھڑا ہو گیا اور اس سمت دیکھنے لگا

جدھر سے آواز آئی تھی۔ شاید وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ آواز بچ
آئی تھی یا اس کا واہمہ تھا۔ میں نے ایک اور پتھر اسی سمت
پھینکا۔ اب کی بار وہ بڑی احتیاط سے چلتا ہوا برآمدے سے
باہر نکل آیا اور آواز کی سمت چلنے لگا۔ میں ریٹکتا ہوا کیاری کے
بائیں طرف کھسکا رہا..... حتیٰ کہ اس کی پشت پر پہنچ گیا۔ وہ
اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں پتھر گرائے گئے تھے لیکن ظاہر ہے
نا کافی روشنی میں اسے بھلا کیا نظر آتا تھا۔ میں آہستہ سے کھڑ
ہوا اور اس کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس نے پیچھے مڑنا چاہا لیکن تب
تیک اس کی گردن میرے دائیں بازو کی گرفت میں آچک
تھی۔ بائیں ہاتھ سے میں نے اس کی گن کی نال کو پکڑ کر خوا
سے دور رکھا تھا۔ اس نے خود کو چھڑانے کے لیے زور لگایا تو
میں نے اسے کیاری کے اوپر سے لان کی گھاس پر بیخ
دیا۔ میں خود بھی اس کے ساتھ ہی تھا کیونکہ گردن چھوڑنے کا
رہسک نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی گن اس کے جسم کے نیچے ہی
دب چکی تھی۔ میں نے اس کی گردن کا دباؤ اتار رکھا نہ تو وہ بل
کے اور نہ ہی چلا سکے۔

”اندر کتنے لوگ ہیں۔“ میں اس کے کان میں آہستہ
سے غرایا۔
”کک..... کوئی نہیں۔“ وہ پھنسی آواز میں بولا تو میں
نے دباؤ بڑھا دیا۔ اس نے ٹانگیں چلائیں لیکن میں محفوظ رہا۔
”بلو گے تو تمہاری گردن ٹوٹ جائے گی۔“ وہ ساکت
ہو گیا..... میں نے دباؤ کم کیا اور وہی سوال دہرایا۔
”تت..... تین.....“ وہ اٹک کر بولا۔
”آشتی کہاں ہے؟“

”وہ..... وہ اوپر دوسری منزل پر پہلے کمرے میں.....“
م..... مجھے چھوڑ دو..... میرا سانس..... میں نے دباؤ پھر
بڑھا دیا اور اس وقت کم کیا جب وہ بے ہوش ہو کر میرے بازو
میں جھونے لگا۔ میں نے اس کا مغل اتار کر اس کے ہاتھوں
اور پاؤں کو ایک ساتھ باندھ دیا اور پھر اس کے گھٹری سے جسم
کو اسی کیاری میں ڈال دیا جہاں اس کی گن پڑی تھی۔ گن کا
میگزین نکال کر میں نے دور پھینک دیا۔ میں نے برآمدے
میں موجود اندرونی عمارت میں داخل ہونے والا دروازہ کھولا
اور اندر داخل ہوا۔ سامنے کوریڈر تھا جس کے دائیں بائیں
کمروں کے دروازے تھے جبکہ سامنے ڈرائنگ روم نظر آ رہا
تھا۔ میں آرائشی لڑیوں کو ہٹا کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو
پہلی نظر صوفے پر سوئے ہوئے آدمی پر پڑی۔ یہ اکیلا ہی
تھا۔ میں نے اس کی نیند خراب کیے بغیر گردن کی تسسل کر
اسے بے ہوش کر دیا اور اسے ایک چادر سے یوں ڈھانپ دیا

ہے۔ تم کیا سمجھتے تھے میں نے یہ گھٹیا باڈی گارڈ اپنی حفاظت کے لیے رکھے ہوئے ہیں؟ نہیں کامران چودھری نہیں..... مجھے اپنی حفاظت کرنا خود آتی ہے لیکن پتا نہیں تم کب اس بات کو سمجھو گے..... اور تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ وہ کیوں نہیں کرتے جس کام کے لیے بھیجا جائے۔ تمہارے جیسے باغی ذہن کے افراد اسی لیے نقصان اٹھاتے ہیں۔“ وہ تلخ لہجے میں بولتی رہی اور میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”اب بتاؤ، میں تمہارا کیا کروں؟ کیوں نہ تمہیں اس جگہ پر چوٹ لگاؤں جہاں تمہیں واقعی درد ہو؟ میرا مطلب ہے مافی.....!“ وہ مرد لہجے میں بولی۔

”نہیں تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔“

”کیوں نہ کروں؟ تمہیں جواد کو ساتھ لانے کا کہا تھا..... تم نہیں لائے..... اس کی سزا تو ملے گی۔“

”اس کی سزا نہ مافی کو ملے گی نہ مجھے اس کی سزا تمہیں ملے گی آٹھی!“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ حیرانی سے بولی۔

”جواد اب اس دنیا میں نہیں رہا..... وہ مر چکا ہے۔“ میں نے اسے سچ بتا دیا۔ وہ مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے اسے میرے الفاظ کی سمجھ نہ آئی ہو۔ میں بتاتا رہا۔

”تمہارے پاس سے نکل کر میں مراد آباد گیا تھا۔ وہاں مجھے پتا چلا کہ وہ اب زندہ نہیں ہے اور وہ مجھے بچاتے ہوئے مرا ہے۔“ میں نے قدرے دکھ سے کہا۔

”پہیلیاں مت سمجھاؤ کامران..... صاف صاف بات کرو۔“ اس کی آواز میں لرزش تھی۔ شاید اس نے میرے چہرے کی سنجیدگی سے اندازہ لگایا تھا۔

”جواد پکڑنے کے بعد چودھری حشمت علی نے اسے اپنی قید میں رکھا تھا۔ وہ ان دنوں میرے معاملے میں الجھے ہوئے تھے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ملک کے طاقتور لوگ میری رپورٹ پر اتنے ناراض تھے کہ وہ میری جان لے لینا چاہتے تھے۔ اباجی نے پہلے کچھ دن نہ تو ان کی حمایت کی اور نہ ہی میری..... جس کے نتیجے کے طور پر وہ لوگ اباجی سے بھی متنفر ہونے لگے۔ دراصل اباجی ایک ایسا درمیانی راستہ ڈھونڈ رہے تھے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاکھی بھی نہ ٹوٹے۔ آخر کار.....

انہیں ایک راستہ مل ہی گیا۔ راستہ انہیں سکندر بخت نے بتایا تھا کہ میری جگہ میرے ڈپلیٹ کا استعمال کیا جائے اس شاندار پلان کو سمجھی نے قبول کر لیا لیکن وقت یہی کہ میرے ڈپلیٹ کا کردار کون نبھائے گا۔ اس کے لیے اباجی نے جواد کو سب کے سامنے پیش کر دیا۔ جواد میرا کرن اور بچپن کا دوست

تھا۔ وہ سوراہا ہو۔ اس کی رائفل بھی ساتھ پڑی تھی۔ میں نے اسے صوفے کے نیچے درجہ تک دیا۔ دو آدمی اور ہوں گے! ان وہ یہاں نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں کوریڈور میں موجود لڑکوں کی طرف آ گیا۔ پہلے دونوں کمرے خالی تھے۔ دوسرے میں دونوں افراد موجود تھے لیکن ان کی حالت دیکھ کر میرے تپنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ قاتلین پر ہی لڑے میزمرے انداز میں کمرے اذکھ رہے تھے اور ان کے قریب شراب کی تین خالی بوتلیں اور ناؤ فوش کا باقی سامان بکھرا پڑا تھا۔ یہ دونوں بھی جلدی اٹھنے والے نہیں لگتے تھے۔ میں نے ان کی رائفلیں اٹھائیں اور کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ رائفلیں میں نے ڈرائنگ روم میں صوفوں تلے چھپک دیں۔

کمرے کے بائیں جانب کٹڑی کی سیڑھیاں اوپر جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں انہیں پھلانگتا ہوا اوپر پہلے کمرے کے سامنے پہنچا جس کے اندر آٹھی کو ہونا چاہیے تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ میرے سامنے نیلی مدھم روشنی میں نہایا ایک شاندار بیڈ روم تھا۔ اسے سی کی خشکی باہر کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ وسط میں رکھے ڈبل بیڈ پر کوئی کبل لے لینا تھا۔ یہ آٹھی ہوگی یقیناً..... میں نے اپنا بسٹل تھا دوا اس کی طرف بڑھا۔ لیکن جیسے ہی میں نے کبل کا کونا اٹھا تو نیچے نیچے رکھے ہوئے تھے عین اسی لمحے لوہے کے سر دھکس نے میری گردن کو چھوا۔

”اپنے ہاتھ اوپر ہٹا لو کامران اور کوئی ایسی حرکت مت کرنا جس کے بعد تمہیں پھٹنا پڑے۔“ آٹھی کی غرائی ہوئی آواز میری سماعت سے نکل گئی۔ میں نے ہاتھ اٹھا دیے اور ساکت کھڑا رہا۔ اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے میرا بسٹل چھین لیا۔ ”اسی رخ پر چار قدم دائیں طرف چلو اور صوفے پر بیٹھ جاؤ۔“

میں نے اس کی اس بات پر بھی عمل کیا۔ صوفے پر بیٹھنے سے اب وہ میرے سامنے آچکی تھی۔ سیاہ لباس پہنے..... اپنی پراسرار آنکھوں کے تمام تر سحر کے ساتھ..... اس کی پرفوں شخصیت میں ہاتھ میں پکڑا پستول واحد ایسی چیز تھی جسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ میرے سامنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”چودھری حشمت علی کے بارے میں سن کر مجھے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ تم جلد واپس لوٹو گے لیکن یہ امید نہیں تھی کہ تم جواد کو لانے کے بجائے اس طرح کی حماقت پر اتر جاؤ گے جس کی وجہ سے تمہاری اور مافی کی زندگی مشکل میں پڑ سکتی

تھا اسے میری ہر عادت اور انداز کا پتا تھا۔ اباجی نے اسے سزا دینے کے لیے قیدری بنا رکھا تھا لیکن اب اسے ایک پیش کش کی گئی کہ اسے رہائی مل سکتی ہے اگر وہ ان کے کہنے پر کامران کا کردار ادا کرے۔ جواد کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ وہ نہ صرف اباجی کے عتاب سے بچ سکتا تھا بلکہ اس ملک سے باہر بھی جاسکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کامران کا معاملہ ختم کر کے وہ آزاد ہو جائے گا۔ کہیں روپوش ہو کر دوبارہ جواد بن جائے گا اور کبھی پاکستان واپس نہیں آئے گا لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ جو لوگ اس سے ایسا کام کروا سکتے ہیں وہ کس حد تک جاسکتے ہیں۔ لہذا اس نے کامران بن کر وہ سب کچھ کیا جو اس سے کہا گیا۔ اس نے میرے سارے پلان کو تباہ و برباد کر دیا اور پھر وہی ہوا جو میں ہونا چاہیے تھا۔ اسے مل کر کے خود کشی کا کامیاب ڈراما چایا گیا تاکہ یہ راز رازی رہے۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ کامران کی جگہ جواد مر گیا ہے۔ اباجی خود لندن گئے اور اس کی لاش کو مراد آباد لاکر قبرستان میں دفن کیا۔ اس کی قبر پر اب بھی کامران چودھری کے نام کا کتبہ ہے۔

”تو تم نے ایک دن میں یہ کہانی تیار کی ہے؟“ وہ ساٹ لہجے میں بولی تو میں نے ایک ڈسک نکال کر اسے دی۔ اس نے بڑی حیرانی سے اس ڈسک کی طرف دیکھا اور پہلی بار اس کا اطمینان اضطراب میں بدلنے لگا۔

”میرے دشمنوں کو اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ جب تک میں یعنی کامران زندہ ہے جب تک یہ معاملہ پوری طرح ختم نہیں ہو سکتا۔ لیکن میرے اصل وجود کو ختم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ چودھری شمش علی تھے۔ اس لیے اباجی کو جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ نہ صرف کامران بلکہ خود اباجی کی جان کو بھی شدید خطرہ ہے۔ میرے دشمنوں خاص طور پر سکندر بخت نے بہت کوشش کی کہ میرا پتا چلایا جاسکے لیکن وہ ناکام رہے پھر انہوں نے اپنی آخری چال چلی کہ انہوں نے اباجی کو ایک حادثے میں قتل کر دیا تاکہ میں منظر عام پر آسکوں اور وہ مجھے بھی مار سکیں لیکن مجھے اس سے پہلے ہی تم ماہی کے ذریعے وہاں سے نکلوا چکی تھیں۔ اباجی کو کسی ایسی ہی صورت حال کا ڈر تھا لہذا انہوں نے تمام تر ثبوتوں کے ساتھ اپنا ایک ویڈیو پیغام بھی میرے لیے رکھ چھوڑا تھا جس میں انہوں نے جواد کو کامران بتانے کی پلاسٹک سرجری کے آپریشن کو بھی ریکارڈ کر رکھا تھا تاکہ وقت آنے پر یہ ثابت کیا جاسکے کہ اصل کامران زندہ ہے۔ یہ ڈسک اسی ویڈیو کی ایک کاپی ہے۔“ میں نے اسے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

آشتی ایک ننگ میری طرف دیکھتی رہی پھر جیسے سا کچھ بھول بھال کر سامنے بڑے ٹی وی ریک کی طرف بڑھا جس کے نچلے خانوں میں سی ڈی پلیئر بھی رکھا ہوا تھا۔ اس نے ڈسک ان کی اور وہ سب دیکھنے لگی جو میں اسے بتا رہا تھا اور اس لمحے وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ یہ بھی کہ کر سہلے میں ”میں“ بھی ہوں۔ یہ بھی کہ اس کا بھل اس کے ڈھچک ہاتھ سے نیچے فالین پر گر چکا ہے۔ ڈسک ختم ہوئی تو وہ... خود فراموشی کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ اس کی نظر اب بھی تاریک اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ جواد کے ایسے انجام کا مجھے بھی دکھ تھا۔ اس کی دہری شخصیت کا راز فاش ہونا اور مجھے مارنے کے لیے میری طرف پستول تانا۔ یقیناً وہ مناظر مجھے بھی نہیں بھول سکتے تھے۔ لیکن ان سب سے پہلے وہ میرا سب سے اہم دوست بھی تھا۔ ہمارا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔ ہم ایک ساتھ کھیتوں میں کھیلے تھے۔ ایک ساتھ ٹیوب ویل پر نہاتے تھے ایک ساتھ اسکول جاتے تھے۔ اور ایک ساتھ ہی جوان ہوئے تھے اور کیسی عجیب بات تھی کہ ہمیں محبت بھی ایک ہی لڑکی سے ہوئی۔ مجھے غنی زندگی اس کی وجہ سے ملی اور اسے موت میرے نام سے ملی۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں ان ہیروں کے بارے میں کچھ معلومات نہیں لاسکا۔“ میں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے آہستگی سے کہا تو آشتی نے چونک کر میری طرف یوں دیکھا جیسے وہ یہ بھول ہی گئی تھی کہ اس کرے میں، میں بھی موجود ہوں۔ اس کی غم آنکھوں میں پہلے مجھے حیرانی ہی جیرائی نظر آئی پھر وہ حیرانی ایک ہچان میں بدلتی چلی گئی۔

”تو پھر... تم یہاں کیا لینے آ گئے کامران چودھری... جب تمہیں ہیروں کا پتا ہی نہیں چلا تو تم یہاں کیوں آ گئے؟“ وہ بلند آواز میں بڑبڑائی اور پھر اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات پھیلتے چلے گئے۔ ”کیا سمجھتے ہو تم کہ ان ہیروں کے بغیر میں تمہیں تمہاری ماہی لوٹا دوں گی۔ ہرگز نہیں... اگر مجھے میرے ہیرو نہیں ملے تو میں... تو میں ماہی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تم کیا سمجھتے ہو... میں... میں اسے واقعی مار دوں گی۔“ وہ اس زور سے چلائی کہ اس کے حلق میں خراشیں سی پڑ گئیں۔ اس نے ایک لخت جھک کر اپنا بھل اٹھایا، میں اس کی طرف لپکا ہی تھا کہ اس نے ذرا سا جھک کے مجھے لفٹ کیا اور پیڑ پر اچھال دیا۔ جب تک میں اٹھ کر کھڑا ہوا، وہ کرے سے باہر نکل گئی تھی۔ میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ ماہی اگر

امیر ترین

دو بچے ایک دوسرے پر اپنے اپنے والد کے زیادہ امیر ہونے کا رعب ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر دلیلیں دے رہے تھے۔ آخر میں ایک بچہ بولا۔ ”میرے ابو اس لیے مجھے تمہارے ابو سے زیادہ امیر ہیں کہ وہ ہر مہینے تمہارے ابو سے زیادہ چیزوں کی قسطیں دیتے ہیں۔“

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

شگوفے

بچپن میں ماں باپ ڈرتے تھے مینڈک کو بھڑ مارا تو کوگی بیوی ملے گی۔ بہت ڈر لگتا تھا۔ اب سوچتے ہیں بھڑ مار ہی دیا ہوتا.....!

☆☆☆

ایک صاحب حج کر کے آئے تو سیدھے اپنے محلے کی دکان پر گئے اور دکاندار کو کہا کہ میرا کھانا نکالو۔ دکاندار خوش ہو گیا کہ شاید اس کے تین سال کا ادھار ملنے والا ہے۔ جونہی اس نے کھانا کھولا تو ان صاحب نے کہا۔ ”میرے نام کے ساتھ حاجی لکھ دو۔“

(مرسلہ: راجہ شفیق۔ سندھی ہول، نیوکراچی)

ہی ہوا تھا کہ اس کا پھل میرا نشانہ لے چکا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا کہ وہ مجھے شوٹ کر دے گی لیکن بھی اچانک وہ ہوا جس کے بارے میں، میں تو کیا آشتی بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ ماہی بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میرے اور اس کے درمیان آکھڑی ہوئی۔

”تم مارو گی ہمیں..... اچھا تو چلو مارو..... چلاؤ گولی..... ہم بھی دیکھتے ہیں کہ تم یہ کیسے کرتی ہو..... چلاؤ گولی۔“ ماہی نے بلند آواز سے کہا۔ میں نے دیکھا آشتی کا پھل والا ہاتھ لرز رہا تھا۔ ماہی نے اس کا لرزنا ہاتھ تھما اور پھل کی نال اپنی پیشانی سے لگا دی۔ ”لو اب چلاؤ۔ تمہارا نشانہ نہیں چوکے گا..... دباؤ نہ لگے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تمہارے لیے کسی کی جان لینا اتنا آسان کیسے ہے۔ خاص کر ان کی جان لینا جو تم سے پیار کرتے ہیں۔“ ماہی کے اس فقرے نے مجھے بھی چونکا دیا۔ یہ فقرہ بتاتا تھا کہ وہ آشتی کی حقیقت سے آشنا تھی اور شاید یہ بھی جانتی تھی کہ آشتی ہی وہ لڑکی ہے جس سے میں نے محبت کی تھی۔

ایں عمارت میں تھی تو اس کی جان کو شدید خطرہ تھا۔ میں آشتی کے پیچھے بھاگا۔ وہ کورڈور کے آخری دروازے پر ایک لمبے لمبے نظر آئی اور پھر..... اندر داخل ہو گئی۔ میں جب دروازے پر پہنچا تو میں نے ماہی کو بیڑ پر نیم دراز لیٹے دیکھا۔ آشتی نے اس کی پیشانی پر پھل رکھا ہوا تھا۔ ماہی کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

”آشتی! یہ..... یہ تم کیا کر رہی ہو؟“ وہ پکلاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”آشتی! خدا کے لیے رک جاؤ..... میری بات سنو۔“ میں نے اسے پککارا۔

”وہیں کھڑے رہو کامران..... ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں ٹریگر دبا دوں گی۔“ وہ جنونی انداز میں چلائی۔ میں وہیں رک گیا۔ میرے اور اس کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ میں صرف ایک جست میں اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ واقعی مائل ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔

”کیا کہہ رہے تھے تم..... تم میرے ہیرے نہیں لاسکتے؟ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے کامران! میں جانتی ہوں کہ ہیرے تمہارے پاس ہیں۔ مجھے ہیرے دے دو ورنہ میں ماہی کو ختم کر دوں گی۔“ وہ غرائی۔

”آشتی! تم ہم پر گولی چلاؤ گی؟“ ماہی نے جیسے صدمے کی سی کیفیت میں پوچھا۔

”ہاں..... میں تمہیں بھی مار سکتی ہوں اور کامران کو بھی۔“ یہ صفائی ہے۔ لوگوں کے اندر تک کی خبر اسے رہتی ہے۔

یہ جانتا ہے کہ میں کون ہوں۔ یہ سب جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں ایک طوائف کی بیٹی ہوں اور ساری دنیا نیست و نابود ہو سکتی ہے لیکن ایک طوائف کبھی محبت نہیں کر سکتی۔ اس کے دل میں صرف ہوس ہوتی ہے..... پیسے کی ہوس..... مجھ میں بھی وہی ہوس ہے۔ میں بھی ہیروں سے پیار کرتی ہوں۔ جو ادھر گیا سو مر گیا، بھاڑ میں جائے وہ۔ مجھے میرے ہیرے چاہئیں۔ بتاؤ کہاں ہیں میرے ہیرے.....

بتاؤ۔“ وہ چلا رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرتی جا رہی ہیں۔ اسے ادراک نہیں تھا کہ اس کی نگاہ دھندلا رہی تھی۔ وہ بس ایک جنونی..... سی کیفیت میں اتاپ شاپ کے جا رہی تھی۔ میں اسے باتوں میں لگا کر نامحسوس انداز سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا پھر میں ایک جست لگا کر اس تک پہنچا لیکن وہ مجھ سے تیز لگی۔ اس کی اسٹریٹ کلک نے مجھے واپس وہیں دھکیل دیا جہاں سے میں نے چلا تھ لگا تھی۔ وہ ماہی کو چھوڑ کر میری طرف لپکی۔ میں کھڑا

کہنے لگی۔

”تم دونوں چلے جاؤ یہاں سے..... مجھے کہیں نہیں جانا۔“ وہ نڈھال سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”یہ پہل ہیں دو۔“ مایہ نے اس کے ہاتھ سے پہل لیا اور پھر اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولی۔ ”ہم تمہیں گن پوائنٹ پر بھی ساتھ لے جاسکتے ہیں..... چلو اٹھو۔“

”تم واقعی سب سے بڑی باگل ہو۔“ آشتی اس کے انداز پر ہنس پڑی اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”تمہارے لیے واقعی ایسی ہی لڑکی ہونی چاہیے تھی..... مجھے یقین ہے یہ تمہارے سارے کس بل سیدھے کر دے گی۔“ اس بات پر مایہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا لیکن وہ بھنڈ رہی۔

”ہم تمہیں ساتھ لیے بغیر نہیں جائیں گے.....“

”دیکھو مایہ..... ابھی تم کامران کے ساتھ جاؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایک بار گاؤں آکر تم سے ضرور ملوں گی لیکن فی الحال نہیں۔ مجھے کچھ دن اکیلا رہنا ہے۔ خود کو سنبھالنا ہے۔“

”تمہارا کوئی بہانہ میرے آگے چلنے والا نہیں۔“ مایہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ آشتی نے بیچارگی سے میری طرف دیکھا۔

”پلیز کامران! اسے لے جاؤ۔ میں ابھی بہت پریشان ہوں..... مجھے تنہائی چاہیے..... پلیز۔“

”لیکن اس طرح پریشانیوں کم تو نہیں ہوں گی۔“ میں نے کہا۔ ”دیکھو قدرت نے تمہیں ایک نئی زندگی دی ہے۔ جو لوگ تمہارے بھرمنا پس منظر سے واقف تھے، ان میں سے کوئی بھی نہیں رہا۔ اپنے گھر والوں کے ساتھ تم ایک نئی زندگی شروع کر سکتی ہو۔ تم ایک مضبوط اور صحت والی لڑکی ہو۔ تم اب اپنی بہنوں کو سنبھال سکتی ہو۔ یوں تنہائی میں بیٹھ کر سوچنے سے تمہیں سوائے پریشانی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو کامران! ہم ہمیشہ سے ہی ٹھیک کہتے تھے..... میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ اب میں اپنی بہنوں کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کروں اور مجھے اسی بارے میں سوچنا ہے۔ مجھے سب سے دور تنہا ہو کر کچھ فیصلے کرنے ہیں..... پلیز۔“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں مایہ کی بات پر اس لیے اصرار کر رہا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہیں یہ جذباتی لڑکی خود کو کوئی نقصان نہ پہنچائے لیکن اب مجھے اس کے لہجے کی مضبوطی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ خود کو سنبھال چکی ہے۔ میں مایہ کو ساتھ لے کر کمرے سے نکل آیا۔ آشتی ہمیں گیٹ تک چھوڑنے کے لیے ساتھ آ رہی تھی۔ نیچے ڈرائنگ روم والا بندہ

”اب کیوں پیچھے ہٹ رہی ہو۔ ہم تمہارا کام آسان کر دیتے ہیں۔“ اس کے بعد مایہ نے وہ کیا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ٹریگر پر رکھی آشتی کی انگلی پر اپنی انگلی رکھ دی اور اسے دبانے لگی۔ آشتی نے بے اختیار اسے دھکا دے کر پہل چھڑایا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیڈ پر گر گئی۔ اس کا ہچکولے کھانا جسم اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ رو رہی تھی۔ مایہ جو ابھی کسی مضبوط دیوار کی طرح میرے سامنے کھڑی تھی، اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئی۔ اس نے آشتی کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”تم کیوں ایسی بن رہی ہو جو تم نہیں ہو..... کیوں تم نے اپنے چہرے پر اتنے چہرے لگا رکھے ہیں کہ تمہارا اصل چہرہ غائب ہی ہو کر رہ گیا ہے۔“ مایہ اس سے کہہ رہی تھی۔ ”انسان جیسا اندر سے ہوتا ہے اسے باہر سے بھی دیکھنا ہونا چاہیے اور میں جانتی ہوں کہ تم اندر سے کتنی اچھی ہو..... کتنی خوبصورت اور کتنی معصوم ہو۔ لوگ تمہیں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تمہیں نہیں بتاتی ہو لیکن میں نے ہمیشہ تمہارے اندر جھانک کر تمہیں پہچانا ہے۔ تم وہ نہیں ہو جو بن گئی ہو۔ تم وہ بھی نہیں ہو جو بننے کی کوشش کرتی ہو۔ آشتی میں جانتی ہوں کہ تمہارا دل بھی چاہتا ہے کہ تمہارے ہاتھ میں پستول نہیں پھول ہوں..... تمہارے چہرے پر کسی اور کا چہرہ نہیں تمہارا اصل چہرہ ہو..... تم محبت کرنی ہو جو اسے..... محبت کرنے والے کو کسی کی جان نہیں لیتے۔“

”جو آدمی مایہ! میرا جواد..... نہیں رہا۔“ آشتی ہلکے آہستہ سے کہتی رہی۔ ”میں بہت بُری ہوں۔ میں نے تم کو لوگوں کے ساتھ بہت برا کیا۔ میں نے کامی کا دل توڑا۔ بدلے میں خدا نے مجھ سے جواد کی محبت چھین لی۔ وہ نفرت کرنے لگا تھا مجھ سے..... شک کرنے لگا تھا کہ میں اس سے نہیں اس کے بہروں سے پیار کرتی ہوں لیکن یہ سچ نہیں..... میں قسم کھا کر کہتی ہوں یہ سچ نہیں۔“

مایہ نے اسے گلے سے لگایا اور تہی خود سے جدا کیا جب غائب ہو چکنے کے بعد وہ پرسکون ہونے لگی تھی۔

اس دوران میں، میں خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہوا، انہیں دیکھتا رہا پھر آشتی نے خود کو سنبھالا اور مایہ کو ہلکا سا دھکا دیتے ہوئے بولی۔

”جاؤ کامی! لے جاؤ اپنی مایہ کو.....“ آشتی نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”صرف ہم نہیں، تم بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہو۔ چلو اٹھو۔ بہت روئیں تم.....“ مایہ اس کا بازو پکڑتے ہوئے

ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ ہم برآمدے سے باہر نکل آئے تو آشتی بولی۔

”گیراج میں ایک ہیڈ اسوک کھڑی ہے۔ تم اسے اشارت کر کے باہر لے آؤ، میں گیٹ کھولتی ہوں۔“ میری گاڑی تو باہر کچھ دور کھڑی تھی لہذا میں گیراج کی طرف آگیا۔ گاڑی میں جالی موجود تھی۔ میں نے گاڑی اشارت کی اور ہیڈ لائٹس روشن کر دیں۔ تیز روشنی میں مجھے آشتی گیٹ دھکیلتی ہوئی نظر آئی۔ دونوں پٹ کھول دینے کے بعد اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا کہ میں گاڑی باہر لے آؤں۔ میں نے دو تین دفعہ ریس دے کر گیر لگا دیا اور کچھ دبا تے ہوئے اسٹیلرے ٹوکو دبانے لگا لیکن ابھی گاڑی کے پیچھے آہستہ سے حرکت میں آئے ہی تھے کہ وہ ہو گیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ایک دھماکا ہوا۔ یہ پمپل کے فائر کا دھماکا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں میں نے آشتی کو لہرا کر زمین پر گرتے دیکھا۔ میں یوں ساکت ہو گیا جیسے اس منظر کے ”ہونے“ کا یقین نہ ہو رہا ہو۔ تیز روشنی میں گیٹ کے باہر سے کوئی اچھل کر اندر داخل ہوا۔ وہ سلطان تھا جسے میں مراد آباد سے اپنے ساتھ لایا تھا اور اسے باہر بٹھا کر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میرے سامنے ابھی ابھی جو کچھ ہوا ہے وہ میرا وہم نہیں حقیقت ہے۔ پھر میرے کانوں میں ایک تیز چیخ گونجی۔ یہ مامی کی چیخ تھی جو برآمدے سے نکل کر آشتی کی طرف بھاگتی جا رہی تھی۔ سلطان نے بے اختیار اس کی طرف بھی پمپل اٹھا دیا۔ ایک لمحے کو میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں گاڑی سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ چیخ کر سلطان کو روکنا چاہتا تھا لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ یہ منٹوں سیکنڈوں کا نہیں بلکہ ایک لمحے کا کھیل تھا اور وہ کوئی قسمت والا لمحہ ہی تھا جب اسٹیرنگ پر رکھے ہاتھ میرے اعصابی دباؤ کی وجہ سے ہلے اور گاڑی کا تیز ہارن گونج اٹھا۔ اور وہ لمحہ بے آواز گزر گیا جس میں فائر کی ایک اور آواز گونجی تھی۔ سلطان کے پتوں کا رخ اب گاڑی کی طرف تھا۔ میں نے اپنی ساری طاقت یکجا کی اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ سلطان مجھے دیکھ کر چونک گیا اور پھر بھاگتا ہوا میری جانب آیا۔

”چھوٹے چودھری جی آپ ٹھیک تو ہیں۔“ وہ پوچھتا ہوا میرے قریب آگیا۔ نفرت کی لہر میں، میں نے جو مکا اسے مارا اس میں مجھلا ہٹ اور بے بسی کے ساتھ غصہ بھی شامل تھا۔ وہ لڑکھڑاکر گاڑی سے نکل آیا اور ناک آؤٹ ہو کر زمین پر گر گیا۔ گیٹ کے قریب مامی آشتی کا سر گود میں رکھے اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر آشتی کو دیکھا۔ پمپل کی گولی اس کی پیشانی میں گھس کر سر کے عقبی حصے

کو پھاڑتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔ اس کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ وہ مرجھ چکی تھی۔ میری ایک چھوٹی سی بھول نے اسے نئی زندگی شروع ہونے سے پہلے ہی موت کی طرف دھکیل دیا۔ میں بت نہتا اسے دیکھتا رہا جسے ایسا بے جان دیکھنے کا تصور بھی میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ محبت میں پہلا یا دوسرا نہیں ہوتا۔ محبت یا تو ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی۔ ہاں جس سے ایک بار ہو جائے پھر اس سے کبھی ختم نہیں ہوتی، چاہے اس کے دامن میں آپ کے لیے جاہت کا ایک لمحہ بھی نہ ہو۔ اور میرے لیے دکھ اس لیے بھی شدید تھا کہ وہ اب سب کچھ چھوڑ کر ایک نئی زندگی بسر کرنے جا رہی تھی۔ انسان اچھا ہو یا برا، اس کے انجام کا فیصلہ وہ راستہ کرتا ہے جس پر وہ چل رہا ہو۔ آشتی نے کچھ دیر پہلے ہی اپنا راستہ بدلنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اس فیصلے سے باہر گھات لگائے بیٹھا سلطان واقف نہیں تھا۔ اس نے آشتی کو دیکھ کر یہ سمجھا ہو گا کہ شاید میں اندر کی مشکل میں پھنس گیا ہوں اور یہی وہ موقع تھا جس میں وہ اپنی وفاداری ثابت کر سکتا تھا۔ یہ میری غلطی تھی یا آشتی کی۔ بد قسمتی..... حقیقت تو صرف یہ تھی کہ وہ اب نہیں رہی تھی۔

”تیر کی میں جل اٹھے..... روشنی میں مجھ گئے..... کیا عجیب لوگ تھے..... درد جھپٹتے رہے..... اور..... خوشی میں مر گئے۔“

مامی مسلسل روئے جا رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ہمیں صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکلنا ہوگا۔ آشتی کی لاش کو ایک چادر میں لپیٹ کر میں نے سوک کی پچھلی سیٹوں پر رکھ دیا۔

میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور مامی میرے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ شہر والا پل کر اس کر کے ہم پاکستان والے روڈ پر نکل آئے جہاں اس وقت ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔

گاڑی کی خاموشی میں مامی کی ”سوں سوں“ گونج رہی تھی..... اور میرے اندر کے سناٹے میں بھی کوئی چیخنا چاہتا تھا..... چلاتا چاہتا تھا..... اپنے آنسو بہا دینا چاہتا تھا..... لیکن میں ضبط کیے خاموش بیٹھا رہا۔

”تمہیں آشتی کی حقیقت پہلے سے معلوم تھی؟“ میں نے پوچھا تو وہ ہنسنے لگی۔

”پہلے پہل نہیں..... پھر ایک دن ہم نے اس کے پاس وہی مہر کھپ دیکھا جو آپ مجھ سے یہ کہہ کر واپس لے گئے تھے کہ یہ ہمارے لیے نہیں ہے، تب ہمیں اس کے بارے میں جاننا ہی پڑا۔“ وہ رکی اور ایک توقف کے بعد بولی۔

میں نے ہیرے مائی کے ہاتھ پر رکھ دیے اور گاڑی دوبارہ آگے بڑھادی۔ میں مائی کو سپر اسپرپیس سے شروع ہونے والی ”ہیرو، ہیروئن اور ہیروں“ کی یہ کہانی سنانے لگا۔ مائی حیرانی اور تاسف سے سب کچھ سنتی رہی۔ جب میں خاموش ہوا تب تک ہمارے سامنے افق پر سے صبح کا سویرا ہویدا ہونے لگا تھا۔

نہر کاہل کر اس کرتے ہوئے مائی نے اچانک مجھ سے پوچھا۔ ”ان ہیروں کا کیا کریں گے؟“

”ابھی سوچا نہیں.....“ میں نے جواب دیا تو وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

”لیکن ہم نے سوچ لیا ہے..... گاڑی روکیے۔“ میں نے بریک لگا دی۔

”ان کے منہ کو انسانی خون لگ گیا ہے کای!“ وہ اپنی ہتھیلی پر جگمگاتے ہیروں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”یہ ہیرے کسی اور کی جان لیں اس سے پہلے انہیں ہی ختم کر دیتے ہیں۔“

اس نے کھڑکی کا شیشہ بچھ کیا اور مٹھی میں دبے درجنوں ہیرے نہر کے بہتے ہوئے پانی میں اچھال دیے۔ میں حیرانی سے اس کی اس حرکت کو دیکھتا رہا۔ ہیرے پھینک کر اس نے پرسکون انداز میں میری طرف دیکھا تو میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔

☆☆☆

آشتی کو ہم نے مراد آباد کے قبرستان میں جواد کی اس قبر کے ساتھ دفنایا تھا جس کے کتبے پر کامران چودھری لکھا تھا۔ اباجی کے چالیسویں تک میں حویلی میں ہی مصروف رہا۔ لیکن میری موجودگی کو مراد آباد تک ہی محدود رکھا گیا۔

اور پھر میں حرکت میں آ گیا۔ اپنے تمام تر ثبوتوں کو یکجا کر کے میں نے اس بار آخری وار کی حکمت عملی بنائی۔ پرنٹ میڈیا سے زیادہ اس وقت الیکٹرونک میڈیا ترقی کر رہا تھا اور یہ میرے لیے جد مفید بات تھی۔ ملک کے نامور چینلز کو مراد آباد میں دعوت دے کر میں نے ایک دھماکے دار پریس کانفرنس کی۔ میرا زندہ ہونا ہی ایک بریکنگ نیوز بن گئی تھی۔ میں نے اس پریس کانفرنس میں ان سرکاری افسران کا کچا چٹھا کھول دیا جو اس ساری سازش میں ملوث تھے۔ میں نے چودھری حشمت علی کی آخری ویڈیو ٹیپ کو بھی وی وی چینلز کے حوالے کر دیا۔ ایک طرح سے میں نے اپنا معاملہ عوام کے سپرد کر دیا اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ میڈیا کی ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں۔ ان کی

”آشتی باہر سے جتنی سخت تھی وہ اندر سے اتنی ہی نازک اور کمزور تھی جتنی کہ ایک لڑکی ہو سکتی ہے۔ بس حالات نے اس پر ایک سخت خول چڑھا دیا تھا۔ ہم نے اس کا یہ سخت خول توڑنے کی ٹھانی اور ہمیں یقین تھا کہ ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ ایک نارمل زندگی گزارنا چاہتی تھی اور اب جبکہ وہ فیصلہ بھی کر چکی تھی تو..... تو یہ سب.....“ اس نے ڈیش بورڈ پر رکھے ٹشو پیپر کے ڈبے سے ایک سافٹ پیپر کھینچا اور آنکھوں پر رکھ لیا۔

میں نے مائی کی طرف دیکھا اور اگلے ہی بل میں نے پوری قوت سے بریک لگا دی۔ تیز چر بجز اسٹ کی آواز نکالتے ہوئے گاڑی کے نازچیسے سڑک سے چپک کر رہ گئے۔ مائی کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا۔ ایک ہلکی سی چیخ مار کر وہ اپنا ہاتھار کڑتے ہوئے مجھے ناراضی سے دیکھنے لگی لیکن میری نظریں اس کے بالوں پر پڑی تھیں جہاں سفید پھولوں والا ہیرا کلب لگا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اتار لیا۔

”یہ تمہارے پاس کیسے آیا؟“

”کل رات آشتی نے دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ بہت جلد تمہیں کامران لینے آئے گا پھر تم اس کے ساتھ گاؤں چلی جاؤ گی۔ ہو سکتا ہے پھر ہماری ملاقات ہونہ ہو۔ اس لیے میری طرف سے یہ تمہارے لیے تحفہ ہے۔“ مائی کہہ رہی تھی اور میں بے یقینی کے سے عالم میں اس ہیرا کلب کو تک رہا تھا پھر میں نے اس کے میکسوم کے ذریعے اسے کھولا اور ہتھیلی پر انڈیلا۔ جگمگ جگمگ کرتے ہیرے میری ہتھیلی پر آ گئے۔ یہ اصلی ہیرے تھے۔

”یہ کیا ہے..... یہ تو ہیرے ہیں..... کای!“ مائی کی روٹی روٹی سی آنکھیں ایک دم پھل گئیں اور میں سوچ رہا تھا کہ آشتی نے جان بوجھ کر یہ ہیرے مائی کو دیے ہیں کہ غلطی سے..... پھر ذہن میں آشتی کی وہ جنونی کیفیت ابھری جب میں نے اسے بتایا تھا کہ جواد نہیں رہا تو وہ رونے لگی لیکن جب میں نے اسے یہ بتایا کہ مجھے ہیروں کا پتا نہیں تو وہ غصے میں آ گئی تھی۔ اس نے مجھے مائی کے بدلے جواد کو لانے کا کہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہیرے جواد کے پاس نہیں بلکہ آشتی کے ہی پاس تھے اور وہ واقعی جواد سے محبت کرتی تھی۔

اور ہو سکتا ہے یہ سچ ہو کہ جواد اب اس پر اعتبار نہیں کرتا تھا..... لیکن آشتی پھر بھی جواد کے لیے یہاں آئی تھی۔

”یہ سب کیا ہے کای؟“ مائی نے میری محویت کو توڑا۔

”یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ آشتی نے جواد سے سچی محبت کی تھی۔“ میں نے خواب تک لہجے میں کہا۔ ”اور اس بات کا کہ وہ پہلے سے ہی فیصلہ کر چکی تھی کہ اپنا راستہ بدل لے گی۔“

تھا۔ ملک کی طاقتور پارٹیوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور میں نے اس پارٹی کو جو ان کر لیا جو اس بار کے الیکشن میں جیتی نظر آ رہی تھی۔ الیکشن سے پہلے ہی میں نے پارٹی میں اپنی جگہ اور ساکھ اس طرح بنائی کہ جب ہماری پارٹی ٹورنمنٹ میں آئی تو مجھے بڑے آرام سے وزیر اعلیٰ کا منصب مل گیا جو کہ میں چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں اب بھی آزادانہ طور پر بہت سے کام نہیں کر سکتا لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا میں اتنا اونچا ضرور اڑتا ہوں جتنا میرے بچے مجھے اجازت دیتے ہیں۔ اس لیے جہاں تک ہو سکتا ہے میں اس فرسودہ نظام کو بھڑکنے والے کرپٹ افسران کے خلاف کام کیے جا رہا ہوں۔ اور آگے بھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔

ایک روز مجھے سکندر بخت سے ملاقات کا موقع مل گیا اور میں اس مخصوص بنگلے کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ جیسے ہی میں گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا، ایک نوجوان تیزی سے میری طرف آیا۔ اس نے خاموشی سے ایک سیاہ پستول میرے حوالے کر دیا اور خود گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے پستول جیب میں ڈالا اور سیدھی بوش پر چلتا ہوا پورچ تک پہنچا اور وہاں سے برآمدے میں بنے بڑے سے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ لاؤنج میں نیم تارکی تھی اور اس تارکی میں دو عورتیں اور سگار کی مہک بھٹی ہوئی تھی۔ وہ کریم کمرے کے صوفے پر بیٹھا مجھے ہی گھور رہا تھا۔ ایک لمحے کو میں اسے پہچان نہ سکا۔ یہ وہ شخص تھا جس کے لباس، انداز، تاثرات اور گفتگو میں نفاست ہی نفاست تھی۔ لیکن اس وقت اس کے بدن پر مسلا ہوا لباس شاید کئی دن پرانا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی اور سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں یوں سرخ تھیں جیسے کبوتر کے خون سے تر کی گئی ہوں۔ پپوٹے یوں پھولے ہوئے تھے جیسے کئی راتوں سے سوئیں نہ سکا ہو۔ یہ سکندر بخت تھا۔ ایکس فارن فٹر۔ میں اس پر ایک نظر ڈالا ہوا سامنے کے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ بٹھا کر بیٹھ گیا۔

”کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟“ وہ لڑکھائی آواز میں غرایا۔

”تمہارے پاس بچا ہی کیا ہے؟“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”جج کہتے ہو تم۔ میرے پاس اب کچھ بھی نہیں بچا۔ سب کچھ تم نے مجھ سے چھین لیا ہے۔“

”تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ موت دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جس میں بندہ جج جج مرجائے اور دوسری وہ جس میں بندہ دوسروں کی نظروں میں مرجاتا ہے۔ تم نے مجھے

فل کورٹج کے بعد نہ صرف سپریم کورٹ نے میرا کیس ری اوپن کر دیا بلکہ حکومت کو بھی اپنے پسندیدہ افسروں کے خلاف کارروائی کرنی پڑی۔ نسیم اطہر سمیت کئی افسران کو معطل کر کے انکوائری شروع کر دی گئی۔ اگر حالات دوسرے ہوتے تو یہ انکوائری بھی سالوں جاری رہنے کے بعد بادی جاتی اور ان افسران کو صرف عہدے بدل کر نئی جگہوں پر تعینات کر دیا جاتا لیکن اس بار میڈیا کی وجہ سے اس معاملے کو اتنا اچھا لگ گیا کہ اس کیس کا فیصلہ چند ماہ میں ہی عمل کر دیا گیا۔ سپریم کورٹ نے تمام ملزمان کو مجرم قرار دیتے ہوئے سزائیں سنادیں۔ اس بار سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا میں چاہتا تھا۔ صرف ایک آدمی باقی رہ گیا تھا۔ سکندر بخت۔ میرے پاس اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ نقلی کا مران کا سارا پلان اسی ایک بندے کا تھا اور یہ پلان ایک ویڈیو میں محفوظ بھی تھا لیکن صرف اس ایک ثبوت کی بنا پر سکندر بخت جیسے بندے کا کچھ بگاڑ نہیں جاسکتا تھا۔

ہائی سے میری شادی ہو چکی تھی۔ حویلی کے دوسرے پورشن میں جہاں کبھی جوادر ہوتا تھا، اب وہاں آشتی کی بہنیں اور بوڑھی ماں بھی جنہیں ہائی خود لائی تھی۔ مراد آباد میں میری دستار بندی کی جا چکی تھی۔ دوڑے کمرے کے تخت پر میں روز بیٹھا کرتا تھا۔ علاقے کے وہ سارے سرکاری افسر جو چودھری شمش علی کے دست سایہ اپنے غیر قانونی کاموں میں ملوث تھے مجھ سے ملنے کے لیے آئے اور اپنی تمام تر وفاداریاں میرے سپرد کرنے کی کوششیں کیں لیکن انہیں اندازہ ہو گیا کہ میں ان کی توقعات پر کبھی بھی پورا نہیں اتر سکوں گا۔ نوادرات کی اس گلنگ تو اسی وقت بند ہو گئی تھی۔ میں نے غیر قانونی طور پر قبضے میں رکھی گئی سیکڑوں ایکڑ زمین کو حکومت کے حوالے کر دیا۔ بعد میں میری ہی کوششوں کے نتیجے میں ان کے مالکانہ حقوق ان مزاحموں کے نام کر دیے گئے جو سالوں سے ان پر کارستانی کر رہے تھے۔

میں نے صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کیا۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اگر مجھے کرپٹ سسٹم اور اس کے کارندوں کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھی ہے تو اب میدان بدلنا ہوگا۔ اس سسٹم کو باہر سے جتنی ضرر میں لگا سکتا تھا لگا چکا تھا۔ اب اسے اندر سے ضرب لگانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے باقاعدہ طور پر سیاست میں حصہ لیا۔ میں نوادرات اکیڈمیل کا مشہور و معروف کردار بنی نہیں بلکہ چودھری شمش علی کا بیٹا بھی

دوسروں کی نظروں سے گرانا چاہا تھا اس لیے میں نے تمہارا یہی تحفہ واپس کر کے حساب برابر کر دیا ہے۔“

”میری نوکری گنتی..... عزت گنتی..... بیوی بچے گئے..... مجرموں کی طرح سیکورٹی اداروں سے چھپ رہا ہوں۔ دیکھو تم نے میرا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ سزا میرے جرائم سے بہت بڑی ہے کا مران..... لوگ کیا کچھ کرنے کے بعد بچ نکلے ہیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا۔“ وہ نڈھال سے لہجے میں بولا۔

”جو تمہارے لیے کچھ بھی نہیں تھا، وہ کسی اور کے لیے بہت کچھ تھا سکندر تخت۔“ میں نے غرا کر کہا۔ ”اگر میں قانون کے دائروں سے باہر نکل کر تمہارا مقابلہ کرتا تو تم سب کا ایسا حشر کرتا کہ دنیا یاد رکھتی لیکن میں تو صرف ایک بات بار کر دانا چاہتا تھا کہ قوانین بڑے نہیں ہوتے..... وہ انسان غلط ہوتے ہیں جو ان قوانین کو استعمال کرتے ہیں۔ میں تو صرف دنیا کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ جس سسٹم کو ہم اور باقی دنیا کرپٹ سسٹم کہتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بے جان سسٹم کے تم جیسے جاندار آپریٹر کرپٹ ہیں۔ تم لوگوں نے میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا، وہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مجھے اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کا پہلے سے اندازہ تھا لیکن ایک یقین مجھے تم سب سے بڑھ کر یہ تھا کہ چاہے مجھے جتنا بھی گرایا جائے، چاہے مجھے جتنی بھی شکست ملے..... آخر کار فتح میری ہوگی۔ سنو سکندر تخت۔ امیر بے باس ایسے کئی ثبوت ہیں جن کی بنا پر تم اس کی سزائیں جھکتے جھکتے مر جاؤ گے لیکن میں تمہارے منہ سے ایک ایسا جرم سننا چاہتا ہوں جسے تم جرم ہی نہیں سمجھتے..... اقرار کر لو کہ چودھری حشمت علی کا قتل تمہارے حکم سے ہوا تھا۔“

وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے جیسے شکست مان لی ہو۔ ”ہاں، حشمت علی کا قتل میرے ہی حکم سے ہوا تھا۔“

میری رگوں میں دوڑتا خون جیسے لاوا بن گیا۔ میں نے بے اختیار اٹھ کر اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف ابھرا آیا لیکن میں نے خود کو سنبھالا اور اسے دوبارہ صوفے پر دھکیل دیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کی نمی کو صاف کیا۔

”تم نہیں جانتے کہ تم نے کیا کیا..... لیکن تمہارے لیے میرے دل میں اب کوئی رحم نہیں ہے۔ البتہ میں صرف ایک رعایت تمہارے ساتھ کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ تمہارا آخری فیصلہ میں پر ہی چھوڑ دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے جیب سے پھل نکالا اور اس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ جس وقت

میں گیٹ کھول کر باہر نکل رہا تھا، اندر سے فائر کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک ثانیے کو مزکر اس کوشی کی طرف دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

ہماری سیاست کٹھ پتلیوں کا ایک تماشہ ہے جس میں ہر پتلی اس ڈوری سے حرکت کرتی ہے جو کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہے..... یہاں زندہ اور آزاد پتلیوں کا کوئی کام نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے پاس وقت کم ہے لیکن میری یہی کوشش ہے کہ اس کم وقت میں، میں اس نظام کو بہتر بنا سکوں۔ بات اچھے برے کام کی نہیں اچھی بری نیت کی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شہر میں خوفناک آگ بھڑک اٹھی۔ ایک چھوٹی سی چڑیا اپنی چوچ میں پانی کے چند قطرے لے کر آئی اور اس آگ میں ڈالنے لگی۔ ایک اور پرندے نے یہ دیکھا تو کہنے لگا۔ ”تم یہ کیوں کر رہی ہو؟ کیا یہ چند قطرے اس آگ کو بجھا پا سکیں گے؟“ چڑیا بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ ان چند قطروں سے یہ آگ بجھنے کی نہیں۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ جب اس آگ کی تاریخ لکھی جائے تو میرا نام آگ بجھانے والوں میں سے ہو..... نہ کہ خاموش کھڑے تماشائیوں میں سے.....“

سسٹم برے نہیں ہوتے انہیں آپریٹ کرنے والے برے ہوتے ہیں۔ نصف صدی سے مایوس بیٹھے لوگ اب کس کا انتظار کر رہے ہیں..... کیوں یہ لوگ اسی ایک بات پر یقین رکھتے ہیں کہ کوئی مسیحا آئے گا اور انہیں دکھوں سے آزاد کر دے گا؟ کوئی بھی مسیحا آسمان سے نہیں نکلتا، وہ میرے تمہارے جیسا ایک عام انسان ہی ہوتا ہے، صرف اس میں یہ بہت ہوتی ہے کہ وہ غلط کو غلط کہتا ہے اور اپنے حصے کی ایمانداری ضرور برتتا ہے۔ ہر انسان کی ایک حد پرواز ہوتی ہے اور اسے اس حد تک ضرور اڑنا چاہیے۔ بھوک کا خوف موت کا خوف، عزت کا خوف کہہ کر اپنی جان چھڑانے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جس آگ پر وہ خاموش ہیں، ایک دن وہ ان کا گھر بھی جلائے آئے گی۔

میں نے آنکھیں موند کر سیٹ سے پشت ٹکا.... دی اور آہستہ سے کہا۔ ”مجھے سدا اس کرسی پر بیٹھ نہیں رہنا..... مجھ سے پہلے کوئی اور تھا اور میرے بعد کوئی اور آئے گا..... جو بھی اس کرسی پر بیٹھتا ہے قدرت اسے وقت بھی دیتی ہے اور موقع بھی“ سیاہ مر سیڈیز کے ساؤنڈ سسٹم میں کو بجنے والی نیرہ نوکری مدھم مدھم آواز زیا دہ واضح ہو گئی۔

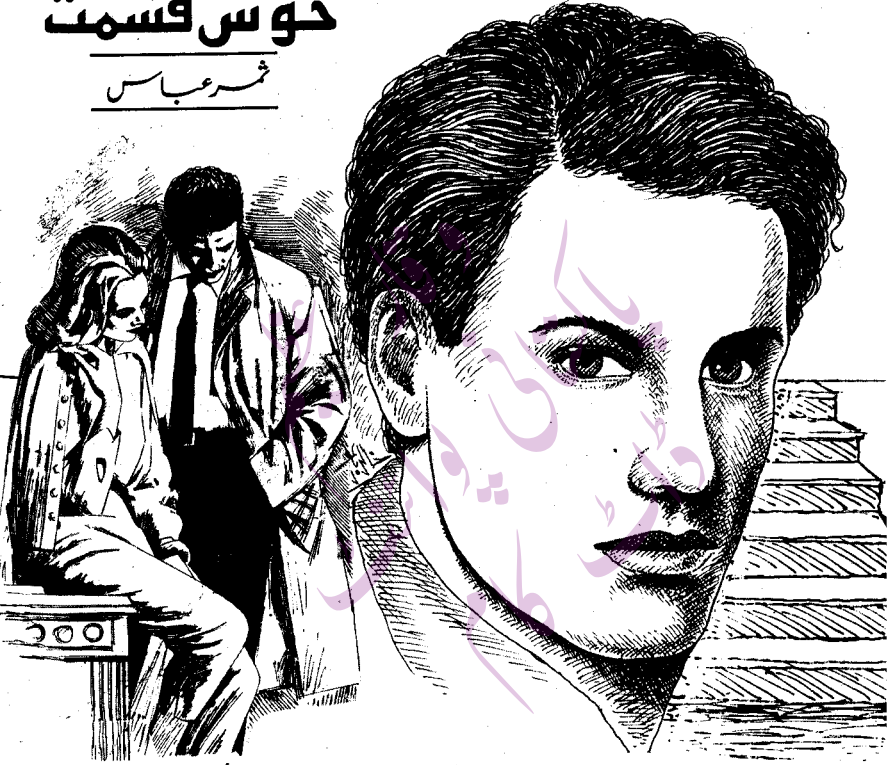
”اے جذبہ دل گر میں چاہوں، ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے“
(ختم شد)

دل میں کسی کو پالنے کی تمنا لیے ایک زیرک محبوبہ کی بلیک میٹنگ

بدقسمتی ہو یا خوش قسمتی عموماً دستک دے بغیر ہی ہماری زندگی میں داخل ہو جاتی ہے لیکن ... اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنی بدنصیبی کو خوش قسمتی میں بدل ڈالا تھا کیونکہ جب سچائی کا دعویٰ کرنے والے فریب کی بے ساکھی سے چلتے ہے تو قدم لڑکھڑاہی جاتے ہیں۔ وہ جو اس کا ہمسفر تھا کیسے اپنے ہم نفس کی لڑکھڑاہٹ کو محسوس نہ کرتا ... اور پھر وہ ہو گیا جس کا ان دونوں نے سوچا تک نہ تھا۔

خوش قسمت

شرعباس



حادثے میں انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد لائم کے دل میں یہ خیال پختہ ہو گیا کہ دولت تو آتی جانی شے ہے لیکن اگر آپ پیدا انہی خوش قسمت ہیں تو زندگی کی کسی موڑ پر وہ سب کچھ مل جائے گا جو آپ چاہتے ہیں۔

لائم کا گھرانا بھی امیر نہیں تھا لیکن وہ اپنے آپ کو پیدا انہی خوش قسمت سمجھتا تھا۔ گھر میں سب لوگ اس کے ساتھ شفقت سے پیش آتے اور صرف لفظوں کے ذریعے ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی اپنی محبت کا اظہار کرتے رہتے تھے

”دولت مند ہونے سے خوش قسمت ہونا زیادہ بہتر ہے۔“ یہ جملہ بچپن میں لائم نارٹھ نے سنا تھا اور جی سے اس کے دماغ میں چپک کر رہ گیا۔ اس وقت وہ ایک خاندانی تقریب میں بیٹھا ہوا تھا اور ان کے ماموں اپنے ایک دور کے کزن سے باتیں کر رہے تھے جس نے بتایا کہ اس کی منگنی ایک بینکر سے ہو گئی ہے جس سے اس کی ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ انکل کریم کے پاس دولت نہیں تھی لیکن وہ خوش قسمت بھی نہیں تھے۔ اس کے چھ ماہ بعد ہی ان کا ایک

جس کی وجہ سے اس کی زندگی آرام سے گزر رہی تھی، اسی وجہ سے وہ سست اور نکما ہو گیا تھا اور یہ کابلی وقت گزرنے کے ساتھ ناقابل علاج ہوتی جا رہی تھی لیکن وہ ابھی تک اس کے مضمرات سے محفوظ تھا۔ وہ مطالعے کا شوقین تھا اور ہر وقت کتابوں میں گھرا رہتا جس کی وجہ سے ہر کوئی اسے پسندیدہ اور مطالعہ دوست شخصیت سمجھتا تھا اور حیران کے خیال میں بہت آگے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اسکول اور یونیورسٹی کے امتحانات میں اس کی چرب زبانی تو کام نہ آ سکی کیونکہ وہ اپنی روایتی سستی کے سبب پوری تیاری نہیں کر پاتا تھا لیکن اس کے باوجود اپنی ذہانت کے طفیل اچھے نمبر حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتا۔ اس کا حافظہ بہت اچھا تھا اور کلاس میں جو کچھ پڑھایا جاتا، وہ اس کے ذہن میں محفوظ رہ جاتا لیکن وہ اپنی سستی اور کابلی کی وجہ سے اسے دہرانے اور یاد رکھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ لائٹ کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ ہر امتحان میں پاس ہو رہا تھا۔ اگر وہ اچھے نمبر حاصل نہیں کر پاتا تو اس کا الزام بار بار ہونے والے آدھے سر کے درد کو دیتا جس کی وجہ سے ہر کوئی اس سے ہمدردی کرنے لگتا۔ لوگ اسے پسند کرتے تھے اور اس کی کبھی ہوئی بات پر آسانی سے یقین کر لیتے۔ اس طرح اسے تنگ کا فائدہ مل جاتا۔

اسکول کے زمانے میں اس نے چند چھوٹے موٹے اور غیر اہم محاشق کیے لیکن کبھی کسی لڑکی کے ساتھ سنجیدہ نہیں ہوا۔ شاید اس وقت اسے سنجیدہ ہونے کا مطلب بھی معلوم نہیں تھا یا پھر وہ کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں تھا جو اس کے لیے خوش قسمتی کا پیغام لے کر آئے۔ البتہ جب اس نے سنٹر لینڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو پہلے ہی ہفتے میں اس کی ملاقات ایک سماجی طالبہ سے ہوئی۔ وہ سنہرے بالوں والی انتہائی پُرکشش لڑکی تھی اور لائٹ کی طرح اسے بھی کتابوں سے لگاؤ تھا۔ اس نے پہلی ہی ملاقات میں لائٹ کو بتا دیا کہ وہ ہمیشہ سے ہی مصنف بننے کا خواب دیکھتی آئی ہے۔ زمانہ طالب علمی کے دوران اس کا لپ ٹاپ، نظموں، ڈراموں، مختصر کہانیوں اور ناولوں کے اقتباسات سے بھر گیا تھا۔ ان میں سے کوئی چیز بھی شائع نہ ہو سکی لیکن لائٹ اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہا کہ وہ کبھی قائل نہ ہو سکا کہ سبلی میں لکھنے کی صلاحیت ہے لیکن کوئی بات نہیں۔ کسی وقت بھی قسمت اس پر مہربان ہو سکتی تھی۔

فارغ التحصیل ہونے کے تین ماہ بعد انہوں نے شادی کر لی۔ سبلی کا بانی سینٹر گریڈ آیا جبکہ لائٹ کو تھریڈ گریڈ پر

ہی اکٹھا کرنا پڑا حالانکہ پڑھائی کے دوران سبلی نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ یہاں تک کہ لائٹ کے زیادہ تر نوٹس اسی نے لکھے۔ اس کے باوجود وہ اپنی کامیابی پر شرمندہ بھی کیونکہ لائٹ کو امتحانوں کے دوران ایک بار پھر آدھے سر کا درد ہوتا رہا۔ وہ اس لیے پریشان ہو رہا تھا کہ تاثرہ ایسٹ میں ناقابل قبول قابلیت رکھنے والے انکس کر بجوئیٹ کے لیے ملازمت کے مواقع بہت کم تھے۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ ملازمت کے بغیر ضروریات زندگی کس طرح پوری ہوں گی۔ سبلی تیز، مستعد اور خود کو کچھ سمجھنے والی شخصیت تھی۔ اس نے جلد ہی ترقی کی سیڑھیاں چڑھنی شروع کر دیں لیکن لائٹ ایک کے بعد دوسری ملازمت کے پیچھے بھاگتا رہا۔ اس نے مختلف بارز اور ریسٹوران میں نوکری کی۔ اس کے علاوہ ایک ناول لکھنے کی بھی کوشش کی لیکن پہلے باب سے آگے نہ بڑھ سکا۔

دوسرے لوگوں کی کتابیں پڑھنا اپنی کتاب لکھنے کے مقابلے میں آسان تھا۔ اس کے اسی شوق کو دیکھتے ہوئے ایک عمر رسیدہ دوست گڈمین اسے اپنے ساتھ لے گیا جس کی پائل پول کے علاقے ہڈ لینڈ میں پرانی کتابوں کی دکان تھی۔ اس عمارت میں بوسیدہ پرانی کتابوں کی ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی اور یہ ایک الگ تھلک جگہ اس سڑک پر واقع تھی جو قبرستان اور لائٹ ہاؤس سے گزرتی تھی۔ اس سڑک پر لوگوں کی آمد و رفت برائے نام تھی اور اسی وجہ سے اس دکان پر بہت کم گاہک آتے تھے۔ وہاں کا سکون اور خاموشی لائٹ کے لیے بہت مناسب تھی۔ وہاں مطالعہ کرنے کے زیادہ مواقع تھے اور اس کا امکان بہت کم تھا کہ کوئی اس کا راستہ روک کر یہ پوچھے کہ وہ اپنا وقت کیسے گزارتا ہے۔ گڈمین اپنی بیماری کی وجہ سے دکان کو زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے اس نے لائٹ کی خدمات حاصل کر لیں تاکہ دکان چلتی رہے مگر وہ تنخواہ بہت کم تھی لیکن لائٹ کو اس بارے میں کوئی پریشانی نہیں تھی کیونکہ سبلی اچھا خاصا کماری تھی اور کم از کم انہیں یہ فکر نہیں تھی کہ اپنے علاوہ کسی اور کو بھی کھانا ہے۔

سبلی جسمانی نظام میں ہونے والی کسی خرابی کے سبب اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم تھی۔ جب ڈاکٹری رپورٹ سے اس کی تصدیق ہو گئی تو وہ رات بھر روتی رہی اور لائٹ کے علاوہ اسے دلاسا دینے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ بار بار یہی کہتا رہا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سبلی کو خوف تھا کہ وہ محض زبانی ہمدردی جتا رہا ہے لیکن وہ غلوں دل سے

اسے سمجھا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بچوں کو بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس بات کو ترجیح دے گا کہ ہمیشہ سیلی کی نگاہوں کا مرکز بنارہے۔ سیلی کی آمدنی معقول تھی اور روزمرہ اخراجات کے باوجود خدائی بچت ہو جاتی تھی کہ وہ بین کیر پولیس ایک چھوٹا سا مکان خریدنے کے قابل ہو گئے۔ یہ اس گھر سے بے حد نزدیک تھا جہاں لائٹ پلا بڑھا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بالائی منزل کے بیڈ روم سے سمندر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی، اس سے زیادہ اور کیا چاہیے تھا۔

وہ اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ سیلی کو بھی کتابوں سے لگاؤ تھا لہذا وہ ویک اینڈ پر دکان آ جاتی اور کتابوں کی فہرست بنانے میں اس کی مدد کرتی اور جب ان کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہ ہوتا تو وہ شام کو مل کر کھانا بناتے اور گھر کے دیگر ضروری کام غنائتے۔ سیلی نے بھی یہ توقع نہیں کی کہ گڈ مین اس خدمت کے عوض اسے معاوضہ ادا کرے بلکہ وہ اپنے ذہن کو مصروف رکھنے کے لیے یہ سب کچھ کرتی تھی تاکہ اس کا دھیان بنارہے اور اسے بچوں کا خیال نہ آئے۔

سیلی کے موافق رویے کی وجہ سے معاملات کچھ عرصہ ٹھیک چلتے رہے۔ وہ ہم جو طبیعت کی مالک تھی اس لیے اس نے دکان کی بہتری کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ دکان کی آمدنی بڑھنے سے لائٹ کو بھی فائدہ ہوگا اور اس کی تنخواہ بڑھ جائے گی۔ اس مقصد کے لیے اس نے کئی آئیڈیاز پر کام شروع کر دیا جن میں مصنفین کے بھی کھار دورے بھی شامل تھے۔ اس نے انہیں دکان پر مدعو کرنا شروع کر دیا تاکہ ان کی دستخط شدہ کتابیں قارئین کو فروخت کی جائیں۔ لائٹ کو تو قیاس نہیں تھی کہ وہ اس کے لیے تیار ہو جائیں گے جہاں ان کی پرانی کتابیں انتہائی کم قیمت پر بیچ جاتی تھیں لیکن سیلی انتہائی متحرک تھی اور بہت کم عرصے میں اس نے ایسی تقریبات کا انعقاد کیا جن میں تاریح ایسٹ کی نمایاں ادبی شخصیات موجود تھیں۔

لائٹ بہت خوش تھا کہ سیلی مکمل طور پر مصروف ہو گئی ہے اور اسے کام کے دوران کتابیں پڑھنے یا دن میں خواب دیکھنے کے لیے زیادہ وقت مل رہا ہے۔ سیلی نے اسے اپنی ایک دوست کے بارے میں بتایا جو باتونی اور انتہائی مونی تھی۔ اس کا شوہر اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اسے شادی کے بارہ ماہ بعد معلوم ہوا کہ وہ ہم جنس پرست تھا۔ میری کشادہ دل اور اچھی فطرت کی مالک تھی اور ہمیشہ دوسروں کے کام

آتی تھی لیکن اس کی قسمت اچھی نہیں تھی۔ اس کا جسم بے ڈول تھا اور اسے کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے فرضی معاشیوں کے قصے سناتی۔ سیلی کے مطابق اس کا خول تھا کہ کسی بھی کام کے لیے ایک کوشش ضرور کرو۔ لائٹ کی خواہش تھی کہ سیلی بھی اس کی ہم خیال بن جائے۔ وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی محبت میں پہلے جیسی شدت نہیں رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی تمام خواہشات دم توڑ چکی ہیں۔ بالخصوص لائٹ کے لیے اس کے دل میں کوئی خواہش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ بوڑھے گڈ مین کے مرنے کے بعد وہ دکان پر قبضہ کرے اور اسے مناسب انداز میں چلایا جائے۔ ایک دو مرتبہ لائٹ نے غور کیا کہ میری اسے ارمان بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے لیکن اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اس پر کوئی توجہ نہ دی ہو۔ وہ صرف اپنی بیوی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے کہ سیلی کے ساتھ اس کی زندگی مکمل نہ ہو لیکن وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ سیلی اس کے لیے خوش قسمت ثابت ہوئی ہے۔ میری کے ساتھ وقت گزارنے کے تصور سے ہی اس کے سینے جھوٹ گئے۔

اس نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے جب تک سیلی نے جان مورسین کو چھ ماہ میں دوسری مرتبہ دکان پر نہیں بلایا۔ اس کا مقصد بظاہر نئے مصنفین کے لیے ایک ورکشاپ کا انعقاد تھا۔ مورسین کا تعلق ساؤتھ شیلڈز سے تھا اور اٹھارہ ماہ قبل اس کا تیسرا ناول منظر عام پر آیا تھا۔ لائٹ کو اس کے نظریات سے اشتیاق تھا۔ اس سے ملنے کے بعد لائٹ نے محسوس کیا کہ وہ خود پسند، خسی خوردہ اور لوگوں سے بے زار رہنے والا شخص ہے لیکن سیلی اس کے کام کی گرویدہ تھی اور بالآخر لائٹ کو یوں لگا کہ شاید وہ اس کی شخصیت سے بھی متاثر ہو گئی ہے۔ مورسین کی شہرت ایک زمین مزاج کی تھی اور وہ اپنی محبوبہ کے بوائے فرینڈ کو زود کوب کرنے کے جرم میں چھ ماہ کی جیل بھی کاٹ چکا تھا۔

پہلے پہل تو لائٹ نے اپنے اندر پیدا ہونے والے حسد کے جذبے کو جھٹکنے کی کوشش کی جو سیلی اس کی نثر کی تعریفیں کر کے ابھار رہی تھی لیکن سیلی نے یہ طرز عمل جاری رکھا اور جب اس نے یہ بتایا کہ مورسین نے اسے کچھ مشورے دیے ہیں کہ کس طرح وہ اپنی تحریر کو بہتر بنا سکتی ہے، تو وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا کہ مورسین ایک گھمنڈی شخص ہے اور اسے اپنے کام سے غرض

رکھنی چاہیے۔
 ”اُمّ“ اس کے گال مٹے سے سرخ ہو گئے۔ ”یہ کہنا
 نا۔“ ان میں ہلکی سی لڑائی اے پسند کرتے ہو۔“

وہ اپنے پیروں سے نقاب نہیں اتارتا چاہ رہا تھا اس
 لیے نرمی سے بولا۔ ”میرا مطلب یہ تھا کہ تم میں بھی اتنی
 صلاحیت ہے جتنی کہ اس میں۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتیں
 کہ اس کے کام میں فاش نظر آتی ہے۔“
 ”بکواس۔“ یہ سنتے ہی وہ ایک قدم پیچھے ہٹا جیسے وہ
 اس کے گال پر طمانچہ مار دے گی۔ ”وہ ایک سچا فنکار ہے۔
 جو لوگ اسے ٹھنڈی اور شدت پسند کہتے ہیں، انہیں معلوم
 ہی نہیں کہ وہ حقیقت میں کیا ہے۔“
 وہ اتنی تیزی سے غصے میں پھر پختی ہوئی چلی گئی کہ
 اسے شک ہوئے لگا کہ وہ شام کا کھانا بنانے کی یا نہیں۔ کہیں
 ایسا نہ ہو کہ اسے فون کر کے چیز منگوانا پڑ جائے۔

لائم کے لیے ایک نئی پریشانی شروع ہو گئی۔ اسے
 مورین پر شبہ ہونے لگا کہ کیا وہ اپنی مجبواؤں کی فہرست
 میں سیلی کے نام کا اضافہ کر سکتا ہے؟ کیا وہ خود اتنا خوش
 قسمت ہے کہ اپنی بیوی کی وفاداری پر بھروسہ کر سکے؟ اس
 طرح مطمئن ہو کر بیٹھنا ایک غلطی ہوگی۔ بہتر ہے کہ
 معاملات پر نظر رکھی جائے۔ سیلی کے موبائل کا ڈانٹ اور
 دوسری سرگرمیوں کو دیکھنا بہت ضروری تھا۔

اسے یہ جان کر بہت صدمہ ہوا کہ قسمت اس سے
 روٹنے والی ہے۔ سیلی اور مورین کے درمیان باقاعدگی
 سے ٹیلی فون کالز اور پینامات کا تبادلہ ہو رہا تھا اور یہ سلسلہ
 عرصے سے جاری تھا۔ ایک ہفتے کی صبح اس نے رازداری
 سے ان دونوں کی گفتگو سنی لی اور اس کے بدترین خدشات
 کی تصدیق ہو گئی۔

”سوموار کو بینک ہالی ڈے ہے۔ اس روز میں دکان
 میں ہی رہوں گی۔“ سیلی نے مدہم آواز میں کہا۔ ”لائم نے
 مجھ سے مدد کرنے کے لیے کہا ہے کیونکہ وہ اس بوڑھے شخص
 سے ملنے جائے گا جو اپنی کتابیں فروخت کرنا چاہ رہا ہے۔
 ہاں، تمہارے آنے کے بعد ہم دروازہ اندر سے بند کر سکتے
 ہیں۔ ہم دکان اس لیے کھول رہے ہیں کہ کچھ لوگوں کو رگن
 بیٹری کے معائنے کے لیے آتا تھا لیکن بارش کی پیش گوئی
 ہے۔ اس لیے شاید وہ نہ آسکیں۔ میں نے لائم سے کہہ دیا
 ہے کہ مجھے دکان کی صفائی کرنی ہے۔ وہ انتہائی احسن شخص
 ہے، میری باتوں میں آگیا۔ موسم چاہے کیسا بھی ہو، میں
 نہیں چاہتی کہ دکان پر کوئی گاہک آئے اور کوئی مجھے دیکھے۔

دوسرے روز شیو کرتے وقت یہ بات اس کے ذہن
 میں آئی۔ حادثات تو ہوتے رہتے ہیں پھر سیلی کے ساتھ
 ایسا کوئی حادثہ کیوں نہیں ہو سکتا جس میں مورین بھی اس کی
 لپیٹ میں آجائے۔ ایک پتھر سے دو پرندوں کو مارنا ہمیشہ

حیات کی تباہی

زمین کی یا زمین پر موجود حیات کی تباہی کے اسباب جو بتدریج وقوع پذیر ہو سکتے ہیں ان میں سے چند خاص کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت سمجھا جاسکتا ہے۔

(1) یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہمارا سورج توانائی کی بہت بڑی مقدار مسلسل خارج کر رہا ہے۔ اس کے اپنے اندر بھی اچھی خاصی توانائی پیدا ہو رہی ہے، لیکن اس کی مقدار خارج ہونے والی توانائی کی مقدار سے کم ہے۔ نتیجہ میں سورج آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہونے کے عمل سے گزر رہا ہے۔ ایک زمانے کے بعد جو کہ کروڑوں سالوں پر محیط ہو سکتا ہے سورج کی حرارت میں اتنی کمی واقع ہو جائے گی کہ اس کی وجہ سے زمین پر حیات ممکن نہیں رہے گی۔

(2) ہم سب جانتے ہیں کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے سائنس دانوں کے خیال میں ایک دن کائنات کے پھیلنے کا عمل رک جائے گا اور پھر تمام ستارے سیارے ایک دوسرے کی جانب کھینچ چلے آئیں گے اور آخر کار کراکتابہ ہو جائیں گے۔ یوں زمین کی تباہی بھی ان کے ساتھ ناگزیر ہے۔ ایک دوسرے سائنسی نظریے کے مطابق اگر یہ پھیلنے کا عمل جاری رہا تو ایک دن تمام کہکشائیں جل بجھیں گی اور ان کے ساتھ یہ زمین کو محفوظ نہیں رکھ سکیں گی اور زمین پر زندگی ممکن نہ ہوگی۔

(3) زمین کا مقناطیسی ہالارفتہ رفتہ رفتہ کمزور ہوتا جا رہا ہے جو کہ زمین کو کھمک شعاعوں کی تباہی سے محفوظ رکھتا ہے۔ مقناطیسی ہالے میں واقع ہونے والی کمی بھی اس حد تک رفتہ رفتہ کم ہو جائے گی کہ کھمک شعاعوں کی تابکاری کی بیلخار سے زمین کو محفوظ نہیں رکھ سکے گی اور زمین پر زندگی ممکن نہ ہوگی۔

سعید انظر صدیقی کی کتاب

”مادرائے گل“ سے اقتباس

اس کا پرکشش مشغلہ رہا ہے جس میں تھوڑی سی کوشش سے بڑی کامیابی ملتی ہے۔

غصے کے عالم میں سوچتے ہوئے اس نے دکان سے باہر جانے کا پروگرام بنایا۔ ویسے بھی وہ بند ہو چکی تھی اور وہ سکون سے بیٹھ کر اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ اس بارے میں بہت محتاط تھا کہ منصوبے میں کوئی خامی نہ رہے۔ بعض اوقات سوچی سمجھی اسکیم بھی غلط ہو سکتی ہے۔ اس نے کئی ایسے جرائم کے بارے میں بڑھ کر کھا تھا جن کی منصوبہ بندی بڑی ہوشیاری سے کی گئی تھی لیکن وہ بد قسمتی سے ناکام ہو گئے۔ اسی لیے اس نے منصوبے کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کیا۔ اسے یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی خوش قسمتی اس کا ساتھ دے گی۔

”تم کب تک داپس آؤ گے؟“ اگلی صبح سلی نے دکان پر اترتے وقت اس سے پوچھا۔

”کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ تم جانتی ہو کہ ایرنی کس طرح کا شخص ہے۔“

وہ گڈ مین کے پرانے گا ہک سے ملے جا رہا تھا جس کے پاس کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا اور وہ اسے فروخت کرنا چاہ رہا تھا۔ ”وہ فضول باتیں کرے گا اور مجھے ہر کتاب کی قیمت کا تعین کرنے میں کافی وقت لگ سکتا ہے۔ میں بچ کے لیے مچھلی اور چپس لے لوں گا۔ شاید میری داپسی سہ پہر کے بعد ہی ہو سکے۔“

”واقعی۔“ سلی کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور لائم کا تعین مزید پختہ ہو گیا کہ وہ جو کچھ کرنے والا ہے، وہ درست ہے۔ سلی نے کہا۔ ”تمہیں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں۔ موسم بہت اچھا ہے اور میں نہیں سمجھتی کہ دکان میں زیادہ لوگ آئیں گے۔ وہ اپنا وقت کتابیں تلاش کرنے کے بجائے کسی بہتر کام میں لگا نہیں گے۔“

”ان لوگوں میں تم اور مورین بھی شامل ہو۔“ لائم نے تلخی سے سوچا۔ ”ہاں۔ میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں بھی شاید کام سے فارغ ہونے کے بعد سیدھا گھر چلا جاؤں گا۔“

وہ مسکرائی۔ اس کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ ”اچھا خیال ہے۔ کیا تم داپسی میں مچھلی لیے آؤ گے؟ آج میں تمہارے لیے ایک خاص ڈش بناؤں گی۔“

وہ مچھلی بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ اس لیے وہ اسے دھوکا دینے کے لیے اس ڈش کی بات کر رہی تھی۔ لائم نے اس کا ہاتھ چھپتاتے ہوئے کہا۔ ”زبردست..... تم سے شام

ملاقات ہوگی۔“

اس نے لائم کو رخصت کرتے ہوئے گرم جوشی سے ہاتھ ہلایا۔ اپنی کوب ہرٹ کے مضافات میں ایک پرسکون کالج میں رہتا تھا جس سے متصل ایک وسیع ویران باغ بھی تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح تباہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کی عمر اسی برس سے تجاوز کر چکی تھی اور یادداشت بھی خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ لائم کو یقین تھا کہ اسے بھولنے کا مرض لاحق ہو چکا ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے ہفتے میں دو بار کوئی بیمار دار آپا کرتا۔

لائم کو کالج تک پہنچنے میں پانچ منٹ لگے اور اگلے پانچ منٹ میں وہ اس کا حال پوچھتا رہا۔ اس کے بعد وہ بہانہ کر کے مکان سے باہر آ گیا۔ سیلی کو دکان پر چھوڑنے کے بیس منٹ بعد اس نے اپنی گاڑی ایک آٹومز کے باہر کھڑی کی جو گزشتہ موسم سرما میں دوایا ہو گیا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ یہاں اس کی گاڑی کو دیکھنے والا کوئی نہیں۔ وہ دکان کی عقبی گلی میں داخل ہوا اور صحن کے گیٹ پر لگا ہوا تالا کھول کر ان سیزھیوں کے ذریعے چھت پر پہنچ گیا جو آگ لگنے کی صورت میں نکلنے کے لیے لگائی گئی تھیں۔ اسے وہاں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر وہ ڈھکنا ہٹا دیا جس سے سورج کی روشنی آ سکتی تھی۔ وہ جگہ جگہ اور گرد آلودھی اور وہاں سے نکلنے کا واحد رستہ ایک چور دروازہ تھا۔ اس نے وہ دروازہ کھولا اور اس طویل تنگ لکڑی کی سیزھی کے ذریعے اترنے کا ارادہ کیا جو پختی منزل تک جاتی تھی۔ اب وہ ڈھلوان چھت پر دہرا ہو کر بیٹھا ہوا خاموشی سے اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب وہ ضروری کارروائی کر سکے۔

اس کے خیال میں ایسا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ ایک بڑا خطرہ مول لے رہا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اس بار بھی قسمت اس کا ساتھ دے گی۔

بچے کی منزل سے سیلی کے قدموں کی چاپ سنا کی دی۔ شاید وہ بیرونی دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ گراؤنڈ، پہلی اور دوسری منزل پر واقع کمرے کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ دوسری منزل پر ایک چھوٹا سا دفتر تھا اور چھت کے بالکل نیچے ایک کھلی جگہ میں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سیلی نے اس جگہ کو تقریبات کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ لائم کو اس کے کہے ہوئے الفاظ یاد آ گئے کہ یہ جگہ کسی بے تکلف موقع کے لیے انتہائی موزوں ہے۔ اس نے بھی سوچا بھی نہ تھا کہ

اس کے ذہن میں کس قسم کا بے تکلف موقع ہے۔
دس منٹ بعد اس نے سیلی کے قدموں کی آواز سنی۔ وہ سیزھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس نے اوپر آ کر کشن درست کیے۔ وہ حیران تھا کہ سیلی نے دکان پر آتے ہی پہلے یہ انتظام کیا۔ اس کی پہلی ترجیح یہ تھی کہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ وقت گزار سکے۔ لائم نے چور دروازے کا ڈھکنا بند کیا اور انتظار کرنے لگا۔

اس نے لکڑی کی سیزھی کو تین جگہ سے کاٹ کر واپس اسی طرح رکھ دیا۔ پہلی نظر میں دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس میں گڑبڑ کی گئی ہے۔ یقیناً سیلی کو بھی اس کا اندازہ نہیں ہوگا۔ اس کے گرنے اور چلانے کی آواز ایک ساتھ آئی۔ جب لائم نے چور دروازے سے جھانک کر دیکھا تو یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہو گئی ہے لیکن اس کی سانس ابھی چل رہی تھی۔ فرش پر قائلین نہیں تھا اس لیے اسے بہت زیادہ چوٹ آئی تھی۔

اس نے چھت کے زینک آلودہک میں ایک لمبی رسی مضبوطی سے باندھ کر لٹکا دی تھی۔ اگر ہک ٹوٹ جاتا تو اس کی اپنی گردن بھی ٹوٹ سکتی تھی لیکن وہ بحفاظت نیچے اتر گیا۔ جب وہ سیلی پر جھکا تو اس نے تصور میں اسے آنکھیں کھولتے دیکھا۔ اس نے احتیاط کے طور پر ایک لکڑی کا ٹکڑا بھی رکھ لیا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر سیلی کو دوبارہ خاموش کیا جاسکے لیکن شکر ہے کہ سیلی نے کوئی حرکت نہیں کی۔ اس کی کھوپڑی سے خون بہہ رہا تھا جس کی وجہ سے اس کا سارا میک اپ برباد ہو گیا تھا۔

کھنٹی بجنے کی آواز آئی اور کوئی دکان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے آواز دینے سے پہلے ہی لائم کو یقین ہو گیا کہ آنے والا جان مورہین ہی ہے۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ حیرانی کے عالم میں پہلی منزل کی سیزھیاں چڑھنے لگا۔

”سیلی! اتم کہاں ہو؟“ وہ زور سے ہستے ہوئے بولا۔
”مجھے آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔“

اس لمحے لائم نے سیلی کی نقل اتارتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کی مشق وہ کافی دنوں سے کر رہا تھا اور اس وقت جوش میں آ کر اس نے کچھ زیادہ ہی اچھی نقل اتاری۔
”سیلی۔“ مورہین اچانک ہی مخاطب ہو گیا۔ ”کیا تم ہو؟“

دوسری منزل پر جانے والی سیزھیاں چھت کے نزدیک نوے درجے کے زاویے پر مڑ جاتی تھیں۔ لائم کتابوں کی الماری کے پیچھے چھپ گیا۔ اب وہ کسی کو نظر نہیں

آسکتا تھا۔ ویسے بھی اسے یقین تھا کہ مورسین کی نظریں صرف سیلی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔

”سیلی! کیا تم مجھے آکھ بھولی کھیل رہی ہو؟“ اس کی خوشامداند آواز میں بھجیلاہٹ نمایاں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بھی سزا کا مستحق تھا۔ ”ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔ تم تیار ہو یا نہیں۔“

ایک بار پھر اس نے سڑھیاں چڑھنا شروع کیں لیکن سیلی کو فرش پر لیٹا دیکھ کر اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور لائٹ کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔ اس نے وحیانا انداز میں اسے گھمایا اور اندازے کی غلطی کی وجہ سے وہ مورسین کے ماتھے کو چھو کر گزر گیا۔ اس کے اطمینان کے لیے یہ بھی کافی تھا۔ سیلی کی لاش کو دیکھ کر وہ سڑھیوں پر پیچھے کی جانب لڑکھڑایا۔ درد اور دہشت سے اس کی کھٹی کھٹی آنکھیں نکل رہی تھیں۔ لائٹ اس کے پیچھے لپکا اور جیسے ہی وہ گرا، اس نے اسے ٹھوکر مارنا شروع کر دیں۔ مورسین غرایا لیکن اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ وہ بھی سیلی کی طرح مرا نہیں تھا لیکن اتنی جلدی ہوش میں بھی نہیں آسکتا تھا۔

لائٹ نے مورسین کے ہاتھ سے گرنے والی کتاب اٹھالی اور اس کی جینز کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا جن میں سے ایک سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس کی ڈبیہ برآمد ہوئی۔ وہ دن میں کافی سگریٹ پیتا تھا۔ اسے تو جوانی میں ہی مر جانا چاہیے تھا۔ لائٹ نے رومال سے پکڑ کر وہ دونوں ڈبیائیں فرش پر رکھیں تاکہ ان پر اس کی انگلیوں کے نشانات نہ آنے پائیں۔ وہ خود سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن اس نے ایرنی کی نظر بچا کر اس کے سائڈ بورڈ سے ایک ماچس کی ڈبیہ اٹھا کر جیب میں رکھ لی تھی۔ اس نے بیک وقت دو تیلیاں جلائیں اور فرش پر رکھے ہوئے رسالوں کے ڈھیر کو آگ لگا دی۔ اوپر واپس جاتے ہوئے اس نے ایک اور تیلی جلا کر پرانے اخباروں کے ڈھیر کو دکھا دی۔ نتیجہ اس کی توقع سے بڑھ کر تیز اور موثر نکلا۔ آگ تیزی سے پھیلنا شروع ہو گئی اور چندی سیکنڈ بعد دھوئیں کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گو کہ وہ فوراً ہی چھت پر پہنچ گیا اور اس نے ہک میں سے رسی نکال دی۔ اس نے سیلی پر آخری نظر ڈالنے کی ہمت نہیں کی کیونکہ اس کے گرد شعلے بھڑک رہے تھے گو کہ یہ بڑے شرم کی بات تھی لیکن اس نے اپنے جذبات کو تھپک کر سلا دیا تھا۔ کتابوں کی تباہی بھی ایک تکلیف وہ نقصان تھا لیکن اس کی تلاقی ہو سکتی تھی۔ اس دوران وہ چھت میں بنے ہوئے روشن

دانی سے باہر آ چکا تھا اور مورسین کی کتاب اس کے ہاتھ میں تھی۔ پوری عمارت آگ کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔ وہ آگ سے بچنے کے لیے تھوڑا سا لڑکھڑایا۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی کی نظر پڑنے سے پہلے ہی وہ وہاں سے نکل جائے۔ آخری سڑھی پر پہنچ کر وہ تقریباً گرنے والا تھا۔ یہ مناسب نہیں تھا کہ قتل کرنے اور گڈ مین کی دکان تباہ کرنے کے بعد وہ خود بھی اپنی گردن تر دالیتا۔ لائٹ کو ایک منٹ کے لیے یقین نہیں آیا پھر اس کے کانوں میں انکل کریم کے الفاظ گونجنے لگے کہ تم چند لمحوں کے لیے غمیرا طیٹ نہیں بنا سکتے۔

کسی نے اسے گلی میں بھاگتے یا کار میں سوار ہوتے نہیں دیکھا۔ دکان سے ایک میل دور آنے کے بعد اس نے آگ بجھانے والی گاڑی کا سائرن سنا اور وہ سوچنے لگا کہ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود شاید سیلی اور مورسین کی جان بچا لی جائے لیکن نہیں، یہ بعید از قیاس تھا۔ لہذا اس نے اس امکان پر مزید غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

☆☆☆

”کیا میں باہر جا کر اپنے اور تمہارے کھانے کے لیے کچھ لے آؤں؟“ اس نے چند منٹ بعد ایرنی سے پوچھا۔ اس بوڑھے شخص نے بے دھیانی سے سر ہلادیا۔ لائٹ کو یقین نہیں تھا کہ وہ اس کی بات سمجھا یا نہیں۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی۔ اس کا مقصد صرف جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی کو ظاہر کرنا تھا۔ واپس آنے کے بعد وہ خریدی ہوئی کتابوں کی قیمت کا چیک وہاں چھوڑ دیتا اور وہ کتابیں اپنی کار میں رکھ لیتا۔ ایرنی آکھ بند کر کے گواہی دیتا کہ لائٹ پورے وقت وہاں موجود تھا۔ ویسے بھی لائٹ اپنی کہانی پر مضبوطی سے قائم رہتا۔

پولیس کا قانون اس وقت آیا جب وہ ایرنی کے یہاں سے واپس جا رہا تھا۔ اسے یہ امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اس کا نمبر معلوم کر لیں گے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ نمبر انہیں گڈ مین سے ملا تھا جو آگ لگنے کے چند منٹ بعد ہی دکان پر پہنچ گیا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے فوراً ہی دہشت زدہ انداز میں کہا۔

”لیکن میری بیوی.....“

”کیا مطلب؟“ ایک نوجوان خاتون آفسر نے کہا۔ ”تم یہ نہیں کہہ رہے تھے کہ بینک ہالی ڈسے کی وجہ سے دکان میں کوئی نہیں تھا؟“

”ہاں لیکن وہ کسی کام سے وہاں گئی تھی۔ شاید وہ صفائی اور کتابوں کو ترتیب سے رکھنا چاہ رہی تھی اور ہمارے

ایک دوست کو بھی اس کی مدد کے لیے وہاں آنا تھا۔“

”کس دوست کی بات کر رہے ہو؟“

”جان مورسین۔ وہ بھی ایک مصنف ہے۔ اچھا آدی ہے اور ہر وقت لوگوں کی مدد کے لیے تیار رہتا ہے لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ وہ دونوں تمہیں وہاں ملے یا نہیں؟“

جب وہ دکان پہنچا تو اس وقت بھی ہلکی ہلکی آگ سلگ رہی تھی لیکن اب بھی کسی کو بچانے کی کوشش خطرناک ہو سکتی تھی۔ لائٹ نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن اس کی چیخیں نکل گئیں۔ اسے کتابوں کے جلنے کا بہت صدمہ تھا۔

دکان کے مالک گڈمین کو دل کا شدید دورہ پڑا اور بڑی مشکل سے اس کی جان بچائی جاسکی۔ لائٹ کو پورا یقین تھا کہ ایک دو ہمدرد پولیس افسروں کو آگ لگنے کی وجہ کے بارے میں شبہات ہو سکتے تھے لیکن سیڑھی اور رستی کے جل جانے کے بعد وہاں کوئی ثبوت باقی نہیں رہا تھا جس سے پتا چلا کہ سلی اور مورسین کو چھایا گیا ہے یا جس وقت آگ لگی تو ان کے علاوہ بھی دکان میں کوئی موجود تھا۔ مورسین کھڑتہ سگریٹ نوشی کی وجہ سے بدنام تھا۔ اس لیے سارا الزام اس کے سر آ گیا کہ اس نے بے پروائی سے جلتی ہوئی مارجس کی تیلی یا سگریٹ کا ادھ بھٹکا لٹا کاغذوں کے ڈھیر پر پھینک دیا جس کی وجہ سے آگ بھڑک اٹھی۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ سلی نے اس کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی تو اس نے غصے میں آکر دکان کو آگ لگا دی۔

پولیس نے اس سے مورسین کے بارے میں کئی چیزیں ہوئے سوالات کیے لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہا کہ مصنف بہت ہی اچھا انسان تھا اور صرف سلی ہی نہیں بلکہ لائٹ کے ساتھ بھی اس کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ایک مشہور مصنف ہونے کے باوجود اس میں اکثر یا غرور نام کو نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مورسین اس روز دکان پر آئے گا اور اس کی بھی کوشش تھی کہ ایرنی سے ٹھننے کے بعد وہ جلد از جلد دکان پر پہنچ جائے۔ اس تمام صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد سراخ رساں اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر لائٹ ایک بے وفا بیوی کا شوہر تھا تو اس پر شبہ کرنے کے بجائے ترس کھانا چاہیے۔ اس تحقیقات کی سربراہی ایک ایسا شخص کر رہا تھا جو خود بھی ریٹائرمنٹ کے قریب تھا اور اسے ایک پرسکون زندگی عزیز تھی۔ لائٹ نے ایک ایسے شخص کا کردار بڑی خوبی سے نبھایا جس کا سب کچھ کھو گیا ہو۔ اس نے دورانِ تفتیش سلی کے بیسہ کی رقم کا کلیم داخل کرنے کی بھی کوشش نہیں کی بلکہ انتظار کرتا رہا کہ سلی کی رقم اس سلسلے میں اس سے رجوع

کرے۔ اس نے پولیس کے سامنے بھی وضاحت کی کہ سلی نے کبھی اسے ان ہولٹوں کے بارے میں نہیں بتایا۔

سلی کی تجھیز و تکھیز کے موقع پر میری نے لائٹ کے لیے غیر معمولی گرم جوش کا مظاہرہ کیا۔ وہ ہمیشہ سے ہی پُر جوش واقع ہوئی تھی۔ وہ آگ لگنے کے بعد روزانہ اس کی خیریت معلوم کرنے آتی کہ لائٹ اپنی کتابوں کے ساتھ وقت گزارنے کو ترجیح دیتا تھا لیکن وہ کبھی اس کی آمد پر اعتراض نہ کر سکا اور ایک دن جب وہ سلی کی یاد میں کھویا ہوا تھا، اس نے ایک اعتراف کر کے اسے حیران کر دیا۔

”ہاں۔ وہ بہت پیاری تھی لیکن کبھی کسی ایک کی ہو کر نہیں رہی۔“

”کیا؟“ لائٹ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

”میرا مطلب ہے کہ جس طرح وہ اس گھٹیا شخص مورسین سے ٹھن گئیں بڑھاپے ہی تھی لیکن وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی اس بارے میں جانتے ہو گے۔ وہ مجھے اپنے محاشوں کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ گوکہ میں نے کبھی اس کی طرح پینڈر مردوں کا انتخاب نہیں کیا اور اس سے اس بارے میں بھی کوئی بات نہیں کی لیکن مجھے ان باتوں سے نفرت تھی۔ وہ ہمیشہ خوش قسمت رہی اور میں اس کے مقابلے میں غریب اور بوڑھی تھی۔ اس نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا، اس سے مجھے بہت تکلیف پہنچی۔“ اس نے اپنا ہاتھ لائٹ کے بالوں پر پھیرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم نے یہ کام کر دیا۔“

”میں نے کیا کیا؟“

”وہ قتل تم نے ہی کیے ہیں۔“ وہ اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولی تو اسے جبر جبری آگئی۔

”جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرنا۔ میں سچائی سے متاثر ہوئی ہوں۔ میں نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اس طرح معاملہ حل کرو گے۔“

وہ تھک گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ”میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا کہ تم کس بارے میں بات کر رہی ہو۔“ میری ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”لائٹ! اس روز میں ایرنی کے عقبی باغ میں موجود تھی۔ وہ میرا گاڑا فادر تھا اور میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ قصور وار سمجھا کہ اس کی صحیح طرح خدمت نہ کر سکی۔ میں اس روز باغ کی صفائی کرنے گئی تھی کیونکہ وہ بالکل جنگل لگ رہا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ مجھے باغبانی کا شوق ہے بلکہ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم بھی آنے والے ہو اور میں نے سوچا کہ ہم دونوں کے لیے جہاں

میں باتیں کرنے کا یہ اچھا موقع ہوگا کیونکہ ایرنی تو دوپہر کے کھانے کے بعد سو جاتا ہے اس طرح ہم ایک دوسرے کو بہتر طور پر جان سکیں گے۔“

اس نے لائم کو مفتی خیر انداز میں آنکھ سے اشارہ کیا لیکن لائم کی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں ہوا۔

”بہر حال، تم میری حیرت کا تصور کر سکتے ہو جب اپنے آنے کے صرف پانچ منٹ بعد ہی تم کوئی کتاب خریدے بغیر اپنی کار میں بیٹھ کر دوبارہ کہیں چلے گئے۔ یہ دیکھ کر میں پریشان اور افسردہ ہوئی۔ میں نے اپنا کام بیچ میں چھوڑ دیا لیکن یہ بات مجھے بہت بعد میں سمجھ میں آئی جب میں نے تمہیں یہ کہتے ہوئے سنا کہ تم تمام وقت ایرنی کے پاس تھے اور درمیان میں صرف کھانا لینے گئے تھے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تم نے اس کے بعد ہی اپنا کام شروع کیا تھا۔“

”تم ایک بہت بھیا تک غلطی کر رہی ہو۔“ لائم نے کہا۔
”یقیناً کرو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ کیا کر رہی ہوں۔“ میری جھکتے ہوئے بولی۔

”مجھے آگ لگنے پر حیرانی تھی پھر یاد آیا کہ سیلی نے مجھے اپنی زندگی کے نیسے کے بارے میں بتایا تھا۔ تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے پولیس کو یہ بات نہیں بتائی بلکہ یہی کہا کہ تم دونوں ایک مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تم نے جو کچھ کیا، اس کے لیے تمہیں کوئی الزام نہیں دے سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ سیلی اور مورین نے تمہیں اس کے لیے مجبور کیا۔ تمہارے اندر ایک پاکیزہ روح ہے اور تمہیں محض ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو تمہارا خیال رکھ سکے۔ جو کچھ ہوا اس کے بارے میں، میں گزشتہ روز تک یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی لیکن جب میں نے تمہارا مطالعہ کا کمراد کیا تو مجھے وہ چیز نظر آنی۔“

اس نے لائم کی آنکھوں کے سامنے کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک کتاب لہرائی۔ وہ مورین کا نیا ناول تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سرورق پلٹی، لائم سمجھ گیا کہ وہ کیا دکھانا چاہ رہی تھی۔ اس پر سیلی کے لیے مورین کے دستخط کے ساتھ ایک جملہ لکھا ہوا تھا اور اس پر سوموار یعنی پینک ہالی ڈے کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔

”میں نے اس کی فوٹو کاپی بنوائی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ بھی ایک طرح کی بیسہ پالیسی ہے۔ اگر مجھے بھی سیلی کی طرح کوئی حادثہ پیش آ جائے تو یہ میرے وکیل کے پاس محفوظ رہے گی۔“

لائم نے اسے گھورا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میری جھوٹ

بول رہی ہے۔ ”تمہارا کوئی وکیل نہیں ہے“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

”نیل نے طلاق کے سلسلے میں میرے لیے کام کیا تھا۔ وہ دل کی بات پڑھتے ہوئے بولی۔

”ہمارا تعلق چند ہفتے قائم رہا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ساتھ دینے سے قاصر رہا۔ میں اس سے انکار نہیں کر سکتی کہ مجھے بہت زیادہ توجہ چاہیے۔“

لائم کا گلہ خشک ہونے لگا۔ ”کیا.....؟“ اس نے کہنا شروع کیا۔

”پریشان مت ہو۔“ وہ بولی۔ ”تم میری طلب پوری کر سکتے ہو۔ میرا ذہن بالکل صاف ہے۔ میں بتاتی ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ ہم خاموشی سے شادی کر لیں گے۔ فی الحال اسے ظاہر کرنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ ہم ابھی تک سیلی کی موت کا سوگ منارہے ہیں۔ یہ ہمارا مشترکہ غم ہے۔ جب تم دوسری ملازمت تلاش کر رہے ہو گے تو یہ سب سے ملنے والی رقم کافی مفید ثابت ہوگی۔ شاید تمہیں کسی لائبریری میں ملازمت مل جائے۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں کتابوں سے محبت ہے کہ کوکے ذاتی طور پر میں فکشن کو پسند نہیں کرتی۔ میرے نزدیک حقیقی زندگی اہمیت رکھتی ہے۔ بہر حال میں یہ توقع نہیں کرتی کہ تم مجھے یا اپنے آپ کو مار ڈالو گے۔ ہم ہفتے میں دو دن ایک جڑے کے طور پر رہیں گے اور باقی وقت اکٹھے گزاریں گے۔“

یہ کہتے ہوئے میری کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا، جب اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا تو لائم نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس نفرت کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا جو اس کے قریب آنے کی صورت میں اس کے چہرے سے عیاں ہوتی۔ میری کو خوشی بھی تھی کہ وہ اس کی باتوں سے پھسل گیا ہے۔ اس نے اپنا چہرہ لائم کے چہرے پر جھکا دیا۔

”وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں بہت پیاروں کی۔“ اس نے دو منٹ بعد کہا۔ جب لائم نے سانس لینے کے لیے اپنے آپ کو الگ کرنے کی کوشش کی۔

”سیلی تمہارے لیے ٹھیک نہیں تھی۔ وہ تمہاری خواہشات پوری کرنے کے قابل نہیں تھی۔ وہ تمہیں اولاد کی خوشی نہ دے سکی اور تم بے وفائی کرتی رہی۔ وہ ہر لحاظ سے مجھ سے مختلف تھی۔ آخر کار اسے برسوں بعد میں جان بچی کہ قسمت کی دیوی مجھ پر مہربان ہوئی ہے اور میں بھی تمہاری طرح خوش قسمت ہوں۔“



دوستانہ

ملک صندریات

دنیا میں ہر وہ چیز جو بے جوڑ ہے وہ تنقید کا نشانہ بنتی رہی ہے اور اگر... تعلقات میں غلط جوڑ توڑ کر لیا جائے تو زندگی کی تباہی یقینی ہو جاتی ہے۔ عورت کے قدموں کی لرزش مضبوط گھروں کی بنیادیں تک ہلا دیتی ہے... وہ جو من موہنی صورت والی تھی من کی اتنی کالی نکلے گی اس کے شریک سفر کو احساس تک نہ ہو سکا۔ اس نے کب یہ سوچا تھا کہ اجلی رنگت میں اتنا میل چھپا ہے کہ اس کے اپنے کردار کی شناخت تک اس میں ڈوب جائے گی... لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل جائے تو ہر ناممکن منزل خود چل کر قدموں میں آ جاتی ہے۔ یہی انجام اس عبرت ناک داستان کا ہوا جس کا ایک سرا جب اس مسیحا کے ہاتھ لگا تو ساری گتھی خود بہ خود سلجھتی چلی گئی۔

ملک صاحب کی ڈائری سے ایک سفاکانہ

قتل کی واردات کا احوال

اپنے تھانے کی حوالات میں بند کر دیا کرتا تھا اور اگلی صبح دوپہر میں اسے جانے کی اجازت دے دیتا تھا۔ اس طرح قانونی فائلوں کا پیٹ بھرنے کے لیے خانہ پُری بھی ہو جاتی تھی اور کسی کے ساتھ ظلم بھی نہیں ہوتا تھا۔

اس طویل تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ ان دنوں میری تعیناتی ضلع لاکل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک دور دراز تھانے میں تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ ماہ مارچ کی آخری تاریخ تھی یعنی اکتیس مارچ۔ موسم بہار کا آغاز ہو چکا تھا۔ مذکورہ تھانے میں چارج سنبھالے ابھی مجھے چند روز ہی ہوئے تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں تھانے میں بیٹھا روزمرہ کے معمولات نمٹا رہا تھا کہ اے ایس آئی جہاں زیب نے میرے پاس آ کر کہا۔

”ملک صاحب! آج مہینے کی آخری تاریخ ہے اور ہمیں اس ماہ کا کوٹا پورا کرنا ہے۔“

میں فوراً جہاں زیب کی بات کی تیر میں اتر گیا اور چونکے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔ ”تفصیل کی ہے؟“

کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ ہمارے زمانے میں مجرموں کو پکڑنے کا ماہانہ ایک کوٹا ہوا کرتا تھا اور یہ کوٹا ہر تھانے کی حدود میں پائے جانے والے گاؤں دیہات کی وسعت، تعداد اور وہاں بسنے والے افراد کی کمی و زیادتی پر منحصر ہوتا تھا چنانچہ بعض تھانوں کے لیے یہ کوٹا مختصر اور بعض کے لیے خاصا صحت مند ہوا کرتا تھا۔ ہر تھانہ انچارج کی یہ ڈیوٹی ہوتی تھی کہ وہ مہینے کے اختتام پر اپنے تھانے کے کوٹے کو پورا کرے لہذا مہینے کی آخری تاریخوں میں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ عروج پر ہوتا تھا۔ میں دوسرے تھانہ انچارج کے بارے میں کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھتا، البتہ اپنے حوالے سے میں پوری دیانت داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ بعض اوقات مجھے اس ”کوٹا سسٹم“ کی باریکیوں سے گزرتا پڑتا تھا لیکن میں نے کبھی کسی بے گناہ کے ساتھ ایذا دینی نہیں کی تھی۔ ہر تھانے میں ارد گرد کے علاقوں میں لائے جانے والے عادی مجرموں کی فہرست موجود ہوتی تھی۔ میں کسی پیشہ ور چور اچکے کو پکڑ کر ایک رات کے لیے



”صرف ایک بندے کی ضرورت ہے جناب۔“ اس

”جہاں زیب! مجھے تو اس تھانے میں آئے جمو،
اللہ دن ہوئے ہیں۔ تم کافی عرصے سے یہاں کام
ہو۔ ذرا تھانے سے باہر نکلو اور ہاتھ پاؤں کو حرکت
لاؤ۔ تم یہاں کے ایک ایک جرم پیشہ بندے کو اچھی
مانتے ہو۔ ایک آدھ بندہ گھیر کر تھانے لانا تمہارے
لوں سا مشکل کام ہے۔“

”یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا مکمل ہے ملک صاحب!“
”چاہے بائیں ہاتھ کو مخصوص انداز میں حرکت دیتے ہوئے
نہیں، آپ کی طرف سے اجازت کا انتظار تھا۔ میں
انتظار کرتا ہوں اور انشاء اللہ کامیاب لوٹوں گا۔“

”اجازت تو میں تمہیں دے رہا ہوں۔“ میں نے...
انداز میں کہا۔ ”لیکن میری ایک بات کو ذہن میں رکھنا
ہو گا۔ یہ کسی معصوم اور بے گناہ انسان کے ساتھ کوئی
الٹا نہیں ہونی چاہیے۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں ملک صاحب! میں آپ کو
اس کی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“ وہ اپنے سینے پر
ہاتھ رکھ کر گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نے چند روز آپ
سے ہاتھ کام کر کے بڑی اچھی طرح یہ بات سمجھ لی ہے کہ
آپ اس ناپ کے تھانے دار ہیں۔“

”دیری گڈ!“ میں نے سناٹی انداز میں اس کی
ایکھا اور کہا۔ ”اگر تم میرے مزاج اور فطرت کو سمجھنے
لگو تو پھر ہماری خوب نیچے کی۔“
”ان شاء اللہ!“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے فخریہ
لہجہ میں بولا۔

جہاں زیب کے جانے کے بعد میں اسی کے بارے
میں سوچنے لگا۔

مغرب سے پہلے اے ایس آئی لوٹ آیا۔ اپنے
میں کے مطابق وہ خالی ہاتھ واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے
اتھ لگ بجک چالیس سال کی عمر کا ایک غریب صورت شخص
تھا۔ اس بندے کو دیکھ کر میرے ذہن میں پہلا خیال
ایسا آیا کہ کہیں جہاں زیب نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی تو
نہیں کر دی.....!

جہاں زیب بڑے فخر سے اس بندے کو میرے سامنے
لاتے ہوئے بولا۔ ”ملک صاحب! بندہ حاضر ہے۔“

”یہ کون ہے؟“ میں نے اے ایس آئی سے پوچھا۔
”اس نے کیا جرم کیا ہے؟“

”میرا نام منظور ہے تھانے دار صاحب۔“ وہ عاجزی
سے بولا۔ ”اور میں نے کوئی جرم نہیں کیا سرکار۔“

میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”تو تم
یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرا بندہ تمہیں خواہ مخواہ ہی پکڑ لایا ہے؟“
بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظر سے جہاں
زیب کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ ”ملک صاحب!
میں بتاتا ہوں۔“

میں جہاں زیب کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ان لمحات
میں میرے ذہن میں یہی خیال تھا کہ شاید جہاں زیب گنتی
پوری کرنے کے چکر میں منظور نامی اس بندے کو اٹھالایا
تھا۔ بہر حال، حقائق تک رسائی حاصل کرنے کے لیے
دونوں کا موقف سننا ضروری تھا۔

”ملک صاحب! جھوٹا بہت بدتمیز آدمی ہے۔.....“
اے ایس آئی نے بولنا شروع کیا یہی تھا کہ میں نے ہاتھ کے
اشارے سے اسے روک دیا اور پوچھا۔

”یہ جھوٹا کون ہے؟“

”یہی ہے جناب۔..... منظور احمد عرف جھوٹا مچلی فروش۔“
وہ منظور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اس نے آج
ماسٹر عاتیت جیسے بھلے مانس کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ کسی
شریف آدمی کا گریبان پکڑ کر اسے گالیاں دینا اور پھر دھکے
دے کر اپنے خلیے سے بھاگ جانے کو کہنا تو مکمل بد معاشی ہے
ملک صاحب۔ یہ ایک رات حوالات میں گزارے گا تو اس
کے دماغ کی ساری گہری نکل جائے گی پھر یہ کسی کے ساتھ
بدتمیزی کرنے سے پہلے سو بار سوچے گا۔“

اے ایس آئی کی بات مکمل ہوئی تو میں جھوٹا مچلی فروش
کی جانب متوجہ ہو گیا اور عرب دار آواز میں پوچھا۔

”ہاں بھئی جھوٹا۔..... کیا تم نے انسانوں کو بھی مچھلیاں سمجھ
رکھا ہے کہ جس کے ساتھ تمہارا جوتی چاہے وہ سلوک کرو؟“

”تھانے دار صاحب! میری کوئی غلطی نہیں ہے۔“ وہ
دونوں ہاتھ جوڑ کر منت ریز لہجہ میں بولا۔ ”میں تو ایک
سیدھا سادہ امن پسند انسان ہوں۔ نہر کے کنارے بنے
ہوئے تالاب میں سے مچھلیاں پکڑتا ہوں اور پھر قصبے کے
میں بازار میں اپنے خلیے پر رکھ کر انہیں بیچتا ہوں۔ میرا کسی
سے کیا لینا دینا۔“

”جب تمہارا کسی سے کوئی لینا دینا نہیں تو پھر تم نے
ماسٹر عاتیت کے ساتھ بدتمیزی کیوں کی؟“ میں نے سخت
لہجہ میں استفسار کیا۔

میں اگر چاہتا تو ایک بھی سوال کیے بغیر جھوٹا کو

حوالات میں ڈال دیتا۔ ہمارا مارچ کا کوٹا پورا ہوجاتا۔ اللہ اللہ، خیر سلا..... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ عمل انصاف کے اصولوں کے منافی ہوتا لہذا میں اپنی تسلی اور ضمیر کے اطمینان کے لیے اس سے پوچھتا چھ کر رہا تھا۔

”تھانے دار صاحب! برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔“ وہ برہمی سے بولا۔ ”اس ماسٹر عنایت نے کافی دنوں سے میرا دماغ خراب کر رکھا تھا۔ میں نہ صرف اس کی روز سن لیتا بلکہ اس کے کہے پر عمل بھی کرتا جا رہا تھا لیکن آج تو میری کھوپڑی ہی گھوم گئی۔ میں اس کی عمر کا احساس کرتے ہوئے برداشت کرتا چلا جا رہا تھا۔ بس جنتا.....“ ذرا دیر کورک کر اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”آج میرا ممبر جواب دے گیا اور..... میرے ہاتھ اس کے گریبان تک جا پہنچے.....“

منطقی طور پر جمجور کی بات میں وزن نظر آتا تھا۔ اس کا تجزیہ انسانی نفسیات کے عین کے مطابق تھا لیکن میرے لیے یہ جانتا بہت ضروری تھا کہ ماسٹر عنایت نے جمجور کے ساتھ ایسا کیا کر دیا تھا جس کے نتیجے میں اس کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا تھا۔

”ماسٹر عنایت..... تم سے کیا کہتا تھا؟“ میں نے جمجور سے پوچھا۔ ”اور تم اس کی کون سی باتوں پر عمل کرتے چلے جا رہے تھے؟“

میرے سوال کے جواب میں جمجور نے ایک دلچسپ کہانی سنائی۔ میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ کہانی کی سنجیدہ فضا میں کچھ لطافت پیدا ہو اور آپ بھی تھوڑا اناجوائے کر سکیں۔

جمجور نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنے ٹھیلے پر ایک پورڈو نصب کر رکھا تھا جس پر چلی حروف میں یہ عبارت درج تھی۔ ”یہاں پر تازہ مچھلی فروخت ہوتی ہے۔“ ایک روز ماسٹر عنایت جمجور کے ٹھیلے پر پہنچا۔ رکی علیک ملیک کے بعد اس نے جمجور سے پوچھا۔

”کیا اس قصبے میں کوئی اور شخص بھی مچھلی فروخت کرتا ہے؟“

ماسٹر عنایت کو مچھلی کا کوئی کام کاج سمجھ کر جمجور نے خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ ماسٹر عنایت مچھلی کے نرخ دریافت کرتا اور بھاڑتا وہ اس کے بعد اس سے مچھلی خریدتا، اس نے جمجور سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

جمجور نے اس کے استفسار کا بڑا نہیں منایا اور پیش

”ماسٹر عنایت! برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔“ وہ برہمی سے بولا۔ ”اس ماسٹر عنایت نے کافی دنوں سے میرا دماغ خراب کر رکھا تھا۔ میں نہ صرف اس کی روز سن لیتا بلکہ اس کے کہے پر عمل بھی کرتا جا رہا تھا لیکن آج تو میری کھوپڑی ہی گھوم گئی۔ میں اس کی عمر کا احساس کرتے ہوئے برداشت کرتا چلا جا رہا تھا۔ بس جنتا.....“ ذرا دیر کورک کر اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”آج میرا ممبر جواب دے گیا اور..... میرے ہاتھ اس کے گریبان تک جا پہنچے.....“

منطقی طور پر جمجور کی بات میں وزن نظر آتا تھا۔ اس کا تجزیہ انسانی نفسیات کے عین کے مطابق تھا لیکن میرے لیے یہ جانتا بہت ضروری تھا کہ ماسٹر عنایت نے جمجور کے ساتھ ایسا کیا کر دیا تھا جس کے نتیجے میں اس کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا تھا۔

”ماسٹر عنایت..... تم سے کیا کہتا تھا؟“ میں نے جمجور سے پوچھا۔ ”اور تم اس کی کون سی باتوں پر عمل کرتے چلے جا رہے تھے؟“

میرے سوال کے جواب میں جمجور نے ایک دلچسپ کہانی سنائی۔ میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ کہانی کی سنجیدہ فضا میں کچھ لطافت پیدا ہو اور آپ بھی تھوڑا اناجوائے کر سکیں۔

جمجور نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنے ٹھیلے پر ایک پورڈو نصب کر رکھا تھا جس پر چلی حروف میں یہ عبارت درج تھی۔ ”یہاں پر تازہ مچھلی فروخت ہوتی ہے۔“ ایک روز ماسٹر عنایت جمجور کے ٹھیلے پر پہنچا۔ رکی علیک ملیک کے بعد اس نے جمجور سے پوچھا۔

”کیا اس قصبے میں کوئی اور شخص بھی مچھلی فروخت کرتا ہے؟“

ماسٹر عنایت کو مچھلی کا کوئی کام کاج سمجھ کر جمجور نے خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ ماسٹر عنایت مچھلی کے نرخ دریافت کرتا اور بھاڑتا وہ اس کے بعد اس سے مچھلی خریدتا، اس نے جمجور سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ ”تازہ“ کا لفظ غیر ضروری ہے۔ اسے بھی مٹا دو۔“

ماسٹر عنایت کے مشورے میں اچھا خاصا وزن تھا۔ جھور نے اسی روز ماسٹر عنایت کی بات پر عمل کرتے ہوئے بورڈ پر سے لفظ ”تازہ“ حذف کر دیا چنانچہ مذکورہ بورڈ کی عبارت اس ترمیم کے بعد کچھ اس طرح ہو گئی۔ ”مچھلی فروخت ہوتی ہے۔“

چند روز کے بعد ایک مرتبہ پھر ماسٹر عنایت، جھور کے ٹھیلے پر موجود تھا۔ اب کی بار اس نے جھور سے کہا۔

”یار! تمہارے ٹھیلے سے دو سو قدم دور ہوں تو مخصوص بو کی وجہ سے یہ خوبی پتا چل جاتا ہے کہ یہاں آس پاس کہیں مچھلی رکھی ہوئی ہے۔ تو ہوا آگے بڑھیں تو تمہارا ٹھیلہ اور اس پر رکھی ہوئی مچھلیاں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ میرے خیال میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تمہارے بورڈ پر ”مچھلی“ کا لفظ لکھا ہوا ہے یا نہیں۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟“

”آپ کی بات دل کو لگ رہی ہے ماسٹر جی۔“ جھور نے کسی فرماں بردار شاگرد کی طرح جواب دیا۔

ماسٹر عنایت نے پوچھا پھر کیا ارادہ ہے؟“

”میں آج ہی لفظ ”مچھلی“ کو صاف کرادوں گا۔“

”شاباش!“ ماسٹر عنایت نے ستائی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

ای شام جھور نے بورڈ پر سے ”مچھلی“ کا لفظ کھرچ ڈالا۔

بورڈ پر اب ”فروخت ہوتی ہے“ کے الفاظ باقی رہ گئے تھے۔

اسی بورڈ کو اپنے ٹھیلے پر سجانے اگلے روز بھی جھور اپنے دھندے پر نکل کھڑا ہوا اور پورا دن وہ ماسٹر عنایت کا انتظار کرتا رہتا کہ اس سے پوچھ سکے کہ ”فروخت ہوتی ہے“ کا کیا کرنا ہے لیکن ماسٹر عنایت اسے کہیں دکھائی نہیں دیا۔

لوگوں نے اس نوعیت کا انوکھا بورڈ ٹھیلے پر لگا دیکھا تو جھور کا خوب مذاق اڑانا شروع کر دیا۔..... یعنی، کیا فروخت ہوتی ہے تم نے کون سا دھندا شروع کر دیا کہ برائے فروخت چیز کا نام پتا معلوم نہیں؟ کہیں تم نے منیات فروشی تو شروع نہیں کر دی؟ الغرض جتنے منہ، اتنی باتیں۔ جھور نے لوگوں کے طعنوں سے تنگ آ کر ”فروخت ہوتی ہے“ کے الفاظ کو بھی صاف کر دیا۔ اب بورڈ پر کوئی بھی تحریر باقی نہیں تھی۔

اکیس مارچ کی سہ پہر ماسٹر عنایت ایک طرف سے نمودار ہوا۔ اس کا رخ جھور کے ٹھیلے کی جانب تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے نازل انداز میں جھور کو سلام کیا۔ جھور نے

بھی حسب معمول اس کے سلام کا جواب دیا۔ ان کے بچہ رسی ملیک سلیک ہوئی پھر اچانک ماسٹر عنایت بورڈ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تادیبی انداز میں بولا۔

”جھور! تم بھی عجیب قسم کے احمق ہو۔ ٹھیلے پر سادہ بورڈ لٹکا رکھا ہے۔ اس طرح کیا خاک دھندا کرو گے۔ پاگل انسان! یہ پہلی کا زمانہ ہے۔ اگر کاروبار کو چلانا ہے تو اس بورڈ پر اپنے دھندے کی مناسبت سے چند تعریفی کلمات لکھوا لو اور.....“

ماسٹر عنایت کا بیان سنیں تک پہنچا تھا کہ جھور کو اپنے جذبات پر قابو نہ رہا اور وہ کام دھندا چھوڑ کر تیزی سے ماسٹر عنایت پر چھینا پھر اس کا گریبان پکڑ کر غصیلے انداز میں اس کی ”مزاج پرسی“ کرنے لگا۔

یہ تھے وہ حالات جن کی روشنی میں منظور احمد عرف جھور اس وقت میرے سامنے کھڑا تھا۔ ماسٹر عنایت نے اس بے چارے کے ساتھ جو بیڑہ کیا تھا، اس کے نتیجے میں جھور کا رد عمل مجھے انتہائی فطری لگا تھا۔ میں جھور کو اتنا خطا وار نہیں سمجھتا تھا کہ رات بھر کے لیے اسے حوالات میں بند کر دیتا۔ وہ کوئی عادی مجرم نہیں تھا۔ ماسٹر عنایت نے اس کے جذبات کے ساتھ جو کھلواری کھنی، اس کے زلزلے میں تو جھور کو اسی طرح جلا سٹ ہونا چاہیے تھا۔ میں نے جھور کی طرف دیکھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں سرزنش کی۔

”جھور! اپنے دماغ کو قابو میں رکھو۔ غصہ اچھی چیز نہیں ہے۔ ابھی تو گری صحیح معنوں میں شروع بھی نہیں ہوئی اور تم نے لوگوں پر گری دکھانا شروع کر دی ہے!“

”جی سرکار..... مجھے معاف کر دیں۔“ وہ عاجزی سے بولا۔

”میں آئندہ اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھوں گا۔“

”یہ تمہاری پہلی شکایت مجھ تک پہنچی ہے اس لیے میں تمہیں معاف کر رہا ہوں۔“ میں نے دونوں انداز میں کہا۔

”اگلی بار اگر تم نے ایسی کوئی حرکت کی تو سیدھا جیل بھیج دوں گا۔“

”جی سرکار..... میں سمجھ گیا۔“ وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا۔

میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

اسے ایس آئی کو میری یہ ادا عجیب سی لگی۔ وہ اب کھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”ملک صاحب! یہ آپ نے کیا کیا؟ اب اس مخصوص کوٹے کا کیا ہوگا جو ہم نے آج کی تاریخ میں پورا کرنا ہے؟“

”اگر ہم نے وہ کوٹا پورا نہ کیا تو اوپر سے باز پرس کس سے کی جائے گی؟“ میں نے اسے ایس آئی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم سے یا مجھ سے؟“

جھپٹ پڑا۔ کسی دن اس ماسٹر جی کو پکڑ کر تھانے لانا۔ میں اس کا خصوصی انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا معلوم تو ہو کہ اس نے جمہور کے ساتھ یہ سب کیوں کیا؟“

”آپ جب نہیں، میں ماسٹر عنایت کو پکڑ لاؤں گا۔“

وہ بڑے عزم سے بولا۔

”ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا وہ نجیب آباد کے اسکول ہی میں پڑھاتا ہے؟“

قصہ نجیب آباد میں ایک ہی پرائمری اسکول تھا جس میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ ماسٹر عنایت کے جمہور کے ساتھ برتاؤ کو دیکھ کر مجھے اس بات کی فکر ہوئی تھی کہ وہ کھسکا ہوا ماسٹر معصوم ذہنوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوگا!.....

”عنایت اسکول ماسٹر نہیں ہے ملک صاحب۔“

جہاں زیب نے مجھے بتایا۔

”پھر اس کے نام کے ساتھ ”ماسٹر“ کا دم چھٹا کیوں لگا ہوا ہے؟“

”اس بارے میں مجھے زیادہ پتا نہیں ہے۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”وہ اس علاقے کا پرانا رہنے والا نہیں۔ وہ کچھ عرصہ پہلے ہی نجیب آباد آیا ہے۔ سنا ہے، اس سے پہلے وہ ضلع قلعہ شیخوپورہ میں رہتا تھا۔ میں اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کے بعد آپ کو بتاؤں گا ملک صاحب۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

ضلع لائل پور اور ضلع قلعہ شیخوپورہ ازلی ابدی پڑوسی اضلاع ہیں لیکن امتداد زمانہ نے ان میں کافی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ لائل پور، فیصل آباد بن گیا ہے اور قلعہ شیخوپورہ میں سے ”قلعہ“ غائب ہو گیا ہے۔ نئی نسل اسے صرف ”شیخوپورہ“ کے نام ہی سے جانتی ہے لیکن ایک اچھی بات یہ ہے کہ یہ دونوں اضلاع آج بھی ایک دوسرے کے ”پڑوسی“ ہی ہیں!

☆☆☆

چار اپریل کی صبح میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو پتا چلا، ایک عورت میرے انتظار میں بیٹھی ہے۔ میں نے مذکورہ عورت کو فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اتنی صبح کی عورت کا تھانے آنا تو یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ کسی مصیبت میں ہے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد کا شکیل نے اس عورت کو میرے پاس پہنچا دیا۔ میرے انداز کے مطابق، اس کی عمر پینتیس کے اوپر قریب تھی۔ وہ درمیانے قد کی مالک، گندی

”ظاہر ہے جی، باز پرس تو آپ ہی سے کی جائے گی۔“ وہ بہ دستور ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے ہوا۔ ”کیونکہ اس تھانے کے انچارج آپ ہی ہیں۔“

”پھر تمہیں کس بات کی فکر لگی ہوئی ہے؟“

”وہ جناب..... تھانے کی ساکھ کا خیال بھی تو رکھنا پڑتا ہے نا.....!“ میرے کڑے استفسار پر وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ہاں..... تمہاری اس بات میں خاصا وزن ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ذرا روزناچھ لے کر آؤ۔ تھانے کی ساکھ کو بھی دیکھ لیتے ہیں.....“ میں نے لحاظی توقف کیا پھر خود کلامی کے انداز میں کہا۔

”تھانے کی ساکھ کے ساتھ ہماری عزت و آبرو جڑی ہوئی ہے۔ اس کا خیال ہم نہیں رکھیں گے تو کون رکھے گا.....؟“

اے ایس آئی کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اٹھا اور روزناچھ لے کر واپس آ گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے روزناچھ لے کر اس میں کچھ اندراج کیا پھر اے ایس آئی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”چیک کر لو..... آج کی تاریخ میں تھانے کی ساکھ محفوظ ہوگئی ہے یا کوئی کسر پاتی ہے؟“

میں نے روزناچھے میں آئیں تاریخ کی دوپہر میں منظور احمد عرف جمہور کی گرفتاری دکھائی تھی اور کرنزی باز پرس کے بعد اسی تاریخ کی شام میں اس کی رہائی کا ذکر کیا تھا۔ وجہ گرفتاری دغا فساد اور سب رہائی صلح صفائی بتایا گیا تھا۔ دونوں پارٹیوں کو روزناچھے کے ریکارڈ کے مطابق، کٹے ملا کر خوشی خوشی تھانے سے رخصت کر دیا گیا تھا۔

”ملک صاحب! آپ نے بڑی کارگیری دکھائی ہے۔“ وہ روزناچھے کا جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ”اس کو کہتے ہیں، نہ ہینک لگے نہ پشکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔“

”جہاں زیب! میری ایک بات ذہن میں رکھنا۔“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر تم کسی گناہ گار کو سزا نہ دلو اسکو تو یہ اتنا سنگین جرم نہیں ہے جتنا یہ کہ تم کسی بے گناہ کو سزا دلو۔“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ تانیذی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”تم جو کیس پکڑ کر لائے تھے، میں اس میں ماسٹر عنایت کو زیادہ قصور وار سمجھتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے رویے نے جمہور کے جذبات کو بری طرح مجروح کیا تھا جس کے نتیجے میں وہ ایک روز مشغول ہو کر ماسٹر عنایت پر

رنگت والی ایک خوش شکل عورت تھی۔ چہرے سے وہ کافی فخر مند دکھائی دیتی تھی۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔
”بیٹھو بی بی!“

وہ اپنی چادر کو سنبالتے ہوئے میری میز کی دوسری جانب بچھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تم کافی پریشان نظر آ رہی ہو؟“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بتاؤ، مسئلہ کیا ہے؟“
”میں اپنے گھر والے کی طرف سے بہت پریشان ہوں تھا نے دار صاحب۔“ وہ رو ہانسی آواز میں بولی۔

”تمہارے خاوند کا نام کیا ہے؟“ میں نے ہمدردی بھرے انداز میں پوچھا۔ ”اور اسے کیا ہوا ہے جو تم اس قدر گھبرائی ہوئی ہو؟“

”جھوڑا رات کو گھر نہیں پہنچا۔“ وہ گلو گیر آواز میں بولی۔

جھوڑا کے نام پر میں چونکا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر پوچھا۔ ”کیا تم اسی جھوڑا کی بیوی ہو جو نجیب آباد کے شین بازار میں پھٹلی کا ٹھیلا لگا تا ہے؟“

”جی..... جی.....“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”کیا آپ میرے گھر والے کو جانتے ہیں؟“
اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”کچھ خاص تو نہیں جانتا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بس، ایک آدھ بار ملاقات ہوئی ہے۔“ لکائی توقف کے بعد میں نے اضافہ کیا۔ ”کیا جھوڑا کا ماسٹر عنایت سے دوبارہ جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟“

”نہیں جی۔ ماسٹر عنایت سے تو اس کی بات چیت ہی بند ہے۔“

”پھر..... کسی اور گاہک کے ساتھ کوئی منہ ماری.....؟“

”نہیں تھا نے دار صاحب! کل تو جھوڑا نے ٹھیلا لگا لیا ہی نہیں۔“ اس نے بتایا۔

”پھر وہ کہاں گیا ہوا تھا جو رات کو واپس گھر نہیں آیا؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”میں بتاتی ہوں جی.....“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئی۔ ”جھوڑا ہفتے میں ایک دن ٹھیلا نہیں لگا تا۔ سمجھ لیں کہ اس کی چھٹی ہوتی ہے۔ کل بھی اس کا چھٹی کا دن تھا اس لیے وہ چچی وال چلا گیا تھا اور یہ کہہ کر گیا تھا کہ رات کو واپس آ جاؤں گا مگر وہ نہیں آیا۔“ بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

”میں نے ساری رات بڑی اذیت میں گزاری ہے۔ اور صبح ہوتے ہی میں آپ کے پاس چلی آئی ہوں.....“
بات کے اختتام پر وہ دوپٹے کے پلو سے اپنی نم آنکھوں کے گوشے خشک کر لگی۔

موضع چچی وال، قصبہ نجیب آباد سے پانچ میل کے فاصلے پر مغرب میں واقع تھا۔ ان دونوں گاؤں کے بیچ گھٹا جنگل پایا جاتا تھا اور اس جنگل کے وسط میں ایک نہر شمالاً جنوباً بہتی تھی۔ یہ دونوں دیہات میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے۔ میرے استفسار پر جھوڑا کی بیوی نے اپنا نام صفیہ بتایا تھا اور یہ بات بھی میرے علم میں آ گئی تھی کہ ان کی شادی کو لگ بھگ پندرہ سال کا عرصہ گزر گیا تھا مگر وہ ابھی تک اولاد ایسی نعمت سے محروم تھے۔ بچوں کے نہ ہونے کا دکھ کوئی بے اولاد ہی محسوس کر سکتا ہے.....!

”صفیہ! جھوڑا چچی وال کیا لینے گیا تھا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہاں اس کا ایک دوست رہتا ہے۔“ اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”اس کا نام تنویر جٹ ہے۔ جھوڑا تنویر جٹ سے کچھ رقم لینے گیا تھا۔“
”تم کے نام پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔ ”کتنی رقم؟“

”ایک ہزار روپے۔“ اس نے جواب دیا۔
”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

میری حیرت کا سبب یہ تھا کہ جس زمانے کا یہ واقعہ ہے تب ایک ہزار روپے خامی بڑی رقم شمار ہوتی تھی۔ آج کل اگر اس زمانے کا ذکر کریں تو نئی نسل اسے کوئی فکشن اسٹوری سمجھتی ہے۔ آپ خود سوچیں کہ موجودہ زمانے کے می ڈیڑی چکن برگر بچوں کو کس طرح یقین آئے گا کہ اس زمانے میں سو نا اسی توڑے روپے تولہ یعنی دس روپے فی گرام اور اعلیٰ درجے کی گندم پانچ روپے فی من (چالیس گلو گرام) فروخت ہوتی تھی۔ نئی نسل تو اس بات کا مذاق ہی اڑائے گی تاکہ..... میں جس ایک ہزار روپے کو بہت بڑی رقم کہہ رہا ہوں اتنے پیسوں کی تو وہ ایک وقت میں آئس کریم کھا جاتے ہیں۔ ایسی سوچ رکھنے میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے علاوہ روپے پیسے کی عزت و توقیر بھی جاتی رہی ہے..... شاید اسی کو انقلاباتِ زمانہ اور نیرنگی دوران کہا جاتا ہے!

”یہ ایک ہزار روپے جھوڑا تنویر جٹ سے کس سلسلے میں لینے گیا تھا؟“ میں نے صفیہ سے پوچھا۔

”ادھارا“ اس نے بتایا۔ ”اصل میں بات یہ ہے کہ لہر کے کنارے زمین کا ایک ٹکڑا ہمیں پھرہ سو روپے میں مل رہا ہے۔ پانچ سو روپے ہمارے پاس رکھے ہیں۔ جمہورا اپنے دوست سے ایک ہزار روپے قرض مانگنے جی وال گیا تھا کہ ہم زری زمین کا یہ ٹکڑا خرید لیں۔“

نجیب آباد اور جی وال کے درمیان جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، ایک گنا جنگل پایا جاتا تھا جس میں انسان یا تو ذاتی سواری یعنی گھوڑے وغیرہ پر سفر کر سکتا تھا اور یا پھر پیدل۔ لوگ عموماً پیدل سفر سے گریز کرتے تھے کیونکہ جنگل کے ساتھ ڈاکوؤں کے بعض قصبے جڑے ہوئے تھے۔ میرے لیے یہ سب سنی سنائی باتیں تھیں۔ اگر میں کچھ عرصے کے لیے اس تھانے میں ٹک جاتا تو پھر ذاتی تجربہ حاصل کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ میں نے مصفیٰ سے پوچھا۔

”جمہور کس چیز پر بیٹھ کر جی وال گیا تھا؟“
”وہ پیدل ہی گیا تھا جی۔“ اس نے بتایا۔ ”جمہور کو پیدل چلنے کا بہت شوق ہے۔ دس بیس میل تو اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں۔ وہ کہتا ہے، دس میل چلنے کے بعد تو انسان کا انجن اشارٹ ہوتا ہے۔“

بات کے اختتام پر اس کے آنسو ٹپک آئے۔ میں نے تسلی بخشی دے کر اسے قدرے نارمل کیا۔ جب وہ میری بات سننے کے قابل ہو گئی تو میں نے منہ پر ہونے لگے میں کہا۔
”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جمہور ارات کو اپنے دوست ہی کے پاس رک گیا ہو اور آج دن میں کسی وقت نجیب آباد واپس آ جائے!“

”تھانے دار صاحب! یہ ناممکن ہے۔“ وہ بڑے وثوق سے بولی۔ ”وہ مجھ سے وعدہ کر کے گیا تھا کہ سورج غروب ہونے سے پہلے وہ لوٹ آئے گا اسی لیے تو میں اتنا پریشان ہو رہی ہوں۔“

مصفیٰ کی بات اپنی جگہ۔ عین ممکن ہے کہ اس کا اعتماد بہت مضبوط ہو لیکن میں منطقی طور پر اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ..... جمہور کسی سبب جی وال میں رک گیا ہو۔

میں تھوڑی دیر تک چپ بیٹھا اسے آنسو بہاتے دیکھتا رہا۔ اس کا غبار قدرے دھل گیا تو میں نے عطا انداز میں سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

”کیا نجیب آباد میں تمہارے اور رشتے دار بھی رہتے ہیں؟“
یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ وہ اپنے گمشدہ شوہر کی رپورٹ لکھوانے اکیلی تھانے آئی تھی۔ اس نے برا سامنے بناتے ہوئے جواب دیا۔

تیسرا باب

گاڑیوں میں ذاتی طور پر ہمیں گدھا گاڑی بہت پسند ہے اس کی وجہ اس کا یا ہمارا گدھا بن نہیں بلکہ اس میں ہنگ لگتی ہے نہ پٹھری اور رنگ بھی چوکھا آتا ہے بس ایک گدھے کی ضرورت ہوتی ہے جن کی ہمارے ہاں کبھی کی نہیں رہی اس پر بھتا چاہے وزن لا دو بیٹھے اور دوسری گاڑیوں کی طرح یہ بچھڑتا ہے نہ اس کا انجن جواب دیتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ گدھا ڈھنچوں ڈھنچوں کر کے ہلکا سا رکھ کر اسے گدھا بہت ہوا تو ایک آدھ ہوائی دوٹی جھاڑ دے گا لیکن بھرے بازار میں کون اس کی گدھا سے گدھا بننے کی طوطی کی طرح اس کی ڈھنچوں ڈھنچوں بھی صدا بھرے بات ہوگی ایک یہ پیدا کنی گدھا ہے اور دوسرا یہ کہ آپ کے ہاتھ میں بکڑے چابک پر بھی منحصر ہے کہ آپ اسے مزید کہاں تک گدھا بنا سکتے ہیں۔ گدھا گاڑی اور کار کا فرق تو آپ کو پتا ہے کہ گدھا گاڑی میں گدھا باہر ہوتا ہے۔

یہ زمانہ چھپوں کا زمانہ ہے پھر اور دھات کے زمانوں سے انسان بخیریت گزر آیا ہے لیکن ”پیسے“ کے دور میں اس کی خیریت ٹھوگ ہو گئی ہے۔ ایک پروفیسر صاحب آخری شو دکھ کر ٹکڑا اسکوٹر اشارٹ کیا ساری رات اسکوٹر چل رہا لیکن گھر نہ آیا، صبح ہو گئی، غور کیا تو پتا چلا کہ آپ اسکوٹر کو اسٹینڈ سے اتارنا بھول گئے تھے اور کچھ لوگ تو سلوک کی آخری منزل تک جا پہنچے ہیں ایک صاحب بے تماشائی ہوئے تھے، ٹیکسی کا دروازہ کھول کر دھڑام سے سیٹ پر گرتے ہوئے ڈرائیور سے گویا ہوئے ”ریگل چوک چلو۔“

”جناب! یہ ریگل چوک ہے۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

انہوں نے دوسرا دروازہ کھولا اور بہ مشکل اترتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے یہ لو پیسے لیکن آئندہ اتنا تیز مت چلتا۔“

(چلتی کا نام..... از عطا اللہ عالی)

”جمہور کے چند رشتے دار نجیب آباد میں بستے ہیں لیکن میری ان سے زیادہ نہیں بنتی۔“

”کیا تم نے کسی رشتے دار سے جمہور کے بارے میں پوچھا؟“

”نہیں جی۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”میرا سرسالی رشتے داروں سے ملنا جلتا نہیں ہے اس لیے میں نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا اور نہ ہی میں نے کسی کو اپنی پریشانی کے بارے میں بتایا ہے۔“

”یہ بات تمہارے علاوہ اور کس کس کو معلوم تھی کہ جمہور، جتنی دال پیسے لینے گیا ہے؟“ میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

”کسی کو بھی نہیں تھا نے دار صاحب۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ جمہور صرف جتنی دال ہی گیا تھا؟“

اس نے ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔

”میں کچھ بھی نہیں جی.....!“

”میرا مطلب یہ ہے کہ.....“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”ہوسکتا ہے، جتنی دال کے علاوہ بھی جمہور نے کہیں اور جانے کا پروگرام بنا رکھا ہو اور وہ اپنے پروگرام کے مطابق، آگے نہیں اور نکل گیا ہو!“

”جمہور اب بھی نجیب آباد سے باہر جاتا ہے تو مجھے اپنے پروگرام کے بارے میں تفصیل سے بتاتا ہے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اس سلسلے میں اس نے کبھی مجھ سے غلط بیانی نہیں کی۔ اگر اسے جتنی دال کے علاوہ بھی کہیں جانا ہوتا تو مجھے ضرور بتاتا۔“

”اور تمہیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ.....“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ”جمہور کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ بھی نہیں تھی؟“

”دیکھیں جی.....“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

”بندے کے جہاں دس دوست ہوتے ہیں، وہاں ایک آدھ دشمن بھی ہوتا ہے مگر آج تک کسی سے اس کا کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔“

”یہ تو نہ کہو کہ جمہور نے کبھی کسی کے ساتھ دنگا فساد نہیں کیا۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”شاید تمہیں ماسٹر عنایت والے واقعے کا علم نہیں ہے اس لیے یہ بات کہہ رہی ہو.....!“

”جمہور نے مجھے اس واقعے کے بارے میں بتایا تھا۔“ وہ بولی۔ ”ماسٹر عنایت ایک جھگی اور کھکا ہوا انسان ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ وہ اس دن والے واقعے کی وجہ سے

جمہور کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ماسٹر عنایت کی تو اکثر لوگوں سے ایسی منہ ماریاں ہوتی رہتی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں جنگل میں اس کے ساتھ کوئی اونچے نیچے نہ ہوگئی ہو۔“

”ٹھیک ہے صنفیہ!“ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”میں تمہارے شوہر کو جنگل اور آس پاس کے علاقوں میں تلاش کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ تم بے فکر ہو کر گھر جاؤ۔ جیسے ہی مجھے جمہور کا سراغ ملتا ہے، میں تمہیں بتا دوں گا۔ ویسے پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں۔ مجھے امید ہے کہ جمہور جہاں بھی گیا ہے، وہ آج شام تک گھر واپس آ جائے گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے جی۔“ وہ تشکرانہ انداز میں بولی۔

وہ میرے کمرے سے نکلی تو میں جمہور کے بارے میں سوچنے لگا۔ پہلا امکان تو یہی تھا کہ وہ رات کو جتنی دال میں توخیر جٹ کے پاس رک گیا ہوگا اور آج شام سے پہلے کسی وقت نجیب آباد پہنچ جائے گا۔ دوسرا امکان (جیسا کہ صنفیہ نے بھی غرض خاطر کیا تھا) اس بات کا تھا کہ جتنی دال سے واپسی پر گھنے جنگل میں اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔ اس کے پاس ایک موٹی رقم تھی (اگر توخیر جٹ نے واقعتاً اسے ایک ہزار روپے ادھا روئے دیے تھے تو.....) مگر کسی بجرمانہ ذہن والے شخص کو اس رقم کی خبر تھی تو وہ مذکورہ رقم کے حصول کے لیے جمہور کے ساتھ کوئی بھی ناروا سلوک کر سکتا تھا جس میں جمہور کی جان لینا بھی شامل تھا۔ پھر میں نے گھنے جنگل میں ڈاکوؤں کی کارروائیوں کی کہانیاں بھی سنی تھیں۔ ایک امکان یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ واپسی کے سفر میں ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا ہو..... اور آخری امکان ماسٹر عنایت کا تھا۔ اکتیس مارچ والے ناخوشگوار واقعے میں جمہور نے ماسٹر عنایت کو برا بھلا کہنے کے علاوہ دو چار ہاتھ بھی چھوڑ دیے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ماسٹر عنایت نے اس دن کی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے جمہور کے ساتھ کوئی ایسی سیدی حرکت کر دی ہو۔ جب میرا دماغ تفتیشی انداز میں سوچتا تھا تو پھر میں معمولی سے معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا تھا۔

میں اسی ادھیڑ میں مل معروف تھا کہ ایک کانشیل نے آکر مجھے بتایا۔ ”ملک صاحب ابابہر بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔“

”کیسی گڑبڑ؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”ابھی جو بی بی آپ سے مل کر گئی ہے، باہر کی بندے سے اس کا پھنڈا ہو گیا ہے۔“ کانشیل نے انکشاف

صفیہ اکیلی تھانے آئی تھی اور تھانے سے نکلنے ہی کسی لمحے سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ لاجلہ میرا ذہن ماسٹر معایت کی طرف چلا گیا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کاشیبل سے کہا۔

”چلو دیکھتے ہیں، مسئلہ کیا ہے۔“

میں تھانے سے باہر آیا تو میں نے صفیہ کو ایک شخص کے رد و رد کھڑے پایا۔ دونوں میں کسی بات پر ٹکرا رہی تھی۔ میں ان کے قریب چلا گیا اور میں نے صفیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ اس کا مخاطب وہی شخص تھا۔

”تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟“ صفیہ کے استفسار سے لمحہ یاد نوعیت کی نفرت جھلکتی تھی۔

اس بندے نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اکیلی ہی تھانے چلی آئیں؟“

”کیا اب کہیں آنے جانے کے لیے مجھے تم سے اجازت لینا ہوگی؟“ صفیہ نے جارحانہ انداز میں کہا۔

”میرا مطلب تھا۔۔۔۔۔“ وہ کھسیانا سا ہو کر بولا۔

”آپ نے مجھے بتایا ہوتا۔ میں آتا آپ کے ساتھ۔۔۔۔۔“ اس شخص کے انداز میں شکوہ تھا۔

”ہاں جوان۔۔۔۔۔!“ میں نے اس بندے کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تم کون ہو اور اس بی بی کو کیوں تنگ کر رہے ہو؟“

”جناب! میرا نام جمیل ہے۔“ وہ اپنا تعارف کرتے ہوئے بولا۔ ”صفیہ میری بھابی ہیں۔۔۔۔۔ بھابی جھجھور

کی گھر والی۔“

اب بات میری سمجھ میں آ گئی کہ وہ شخص یعنی جمیل، صفیہ کا دیور تھا۔ جمیل کی عمر تیس کے آس پاس رہی ہوگی۔

اس نے اوباشوں کی طرح اپنی قمیض کے سامنے والے بٹن کھول رکھے تھے اور اس کے خال و خط بڑی حد تک جھجھور سے مشابہت رکھتے تھے۔ صفیہ نے سرسری انداز میں مجھے بتایا تھا کہ سرسرای رشتے داروں سے اس کا میل جول نہیں تھا

اور اس کا حالیہ رویہ بھی اسی امر کی غمازی کرتا تھا۔ مجھے یہ گھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ صفیہ اپنے دیور کو ملت ناپسند کرتی تھی۔

میں صفیہ کو ایک طرف لے گیا اور دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”گلتا ہے، تم اپنے دیور سے سخت ناراض ہو۔۔۔۔۔؟“

”ناراض۔۔۔۔۔ بہت چھوٹا لفظ ہے تھانے دار صاحب“

وہ دانت پکچکاتے ہوئے بولی۔ ”اگر میرے بس میں ہوتو

ظلم و انصافی

ایک گاؤں سے طوطا اور طوطی گزر رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ گاؤں کی حالت بہت خستہ ہے، بیڑے بوندے مرجھائے ہوئے ہیں۔ صرف چند قلعہ نما حویلیاں کھڑی نظر آ رہی ہیں۔ طوطے کی نظر ایک سوکھے ہوئے درخت پر پڑی۔ اس پر ایک الو بیٹھا ہوا تھا۔

طوطے نے کہا۔ ”اس الو کی وجہ سے گاؤں پر نحوست ہے۔“ الو نے جب یہ الفاظ سنے تو فوراً ان کے پاس پہنچا اور کہا۔

”یہ طوطی میری بیوی ہے۔“ طوطے نے کہا۔ ”کچھ عقل سے کام لو، یہ میری بیوی ہے۔ اس کا رنگ آواز غرض کوئی بھی چیز تم سے نہیں ملتی۔“

الو نے کہا۔ ”چلو گاؤں والوں سے اس کا انصاف کروا لیتے ہیں۔“ گاؤں کے چودھری نے فیصلہ الو کے حق میں دے دیا۔ الو نے لوگوں کی طرف دیکھا وہ صرف سر ہلا رہے تھے۔ انہوں نے اس ظلم اور نا انصافی پر کوئی احتجاج نہ کیا۔ طوطا روپیٹتا چلا گیا تو الو اس کے پیچھے طوطی کو لے کر گیا اور اس سے کہا۔

”اپنی بیوی کو ساتھ لے جا۔۔۔۔۔ نحوست میری وجہ سے نہیں اس ظلم اور نا انصافی کی وجہ سے ہے جس کا سب ساتھ دے رہے ہیں۔“

(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ)

میں اس مردود کی سچی مروڑ ڈالوں۔۔۔۔۔“

وہ جمیل کی گچی یعنی گردن مروڑنے کی بات کر رہی تھی۔ اس کے لہجے کی سنگینی سے پتا چلتا تھا کہ اگر واقعی صفیہ ایسا کوئی موقع میسر آ گیا تو وہ اپنے عزائم کو عملی جامہ پہناتا

میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرے گی۔

”اس بے پناہ نفرت کا سبب جان سکتا ہوں؟“

نے صفیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔

”جیلا ایک زہریلا سانپ ہے تھانے دار صاحب وہ اذیت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”جس شخص

ہر لمحے نقصان پہنچے گا اندیشہ رہے، اس سے محبت کیونکر جاسکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جیلا میرا دیور ہے لیکن میرے دل دو مارغ میں اس کہنے کے لیے نفرت ہی نفرت ہے۔۔۔۔۔“

”تم میرے سوال کو سمجھ نہیں پاتی ہو۔“ میں نے

معتدل انداز میں کہا۔ ”جمیل عرف جیلا کے لیے میں۔

تمہاری نفرت کو تو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ لیا ہے۔ اب میں اس نفرت کا سبب جاننا چاہتا ہوں؟“
 ”یہ ایک لمبی چوڑی داستان ہے۔“ صفیہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے فرصت ملی تو آپ کو ضرور سناؤں گی۔ بس اتنا جان لیں تمہانے دار صاحب مجھے اپنی سسرال والوں کی جانب سے آج تک کوئی سکھ نہیں ملا۔“

میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ صفیہ نے جیلا والے موضوع کو دانستہ ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا اور چند لمحات تک چپ چاپ کھڑا اس دھمی عورت کو دیکھتا رہا۔ صفیہ جیسی دل کش عورت کو رنجیدہ اور طول دیکھنا بڑے افسوس اور دکھ کی بات تھی۔ میں ان لمحات میں اپنے دل میں صفیہ کے لیے بے پناہ ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے گھر والے کے لیے پریشان اور فکر مند تو تھی ہی، اس کے علاوہ وہ اپنے چہرے سے ظلم و ستم کا شکار بھی نظر آتی تھی۔
 ”اس بد ذات کے بارے میں زیادہ نہ سوچیں تمہانے دار صاحب!“ وہ سکتتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”آپ اپنی ساری توانائی میرے گھر والے کو تلاش کرنے پر لگا میں۔“
 ”صفیہ! تم فکر نہ کرو۔“ میں نے اسے دلا سادیتے ہوئے کہا۔ ”میں جمورہ کی تلاش میں جتنی وال جا رہا ہوں۔ وہ جہاں بھی ہوگا، میں اسے ڈھونڈ کر تمہارے پاس لاؤں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“
 ”بہت بہت شکریہ تمہانے دار صاحب۔“ وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولی۔ ”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔“

میں صفیہ کو رخصت کرنے کے بعد جمیل عرف جیلا کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”اگر صفیہ تمہاری بھابی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اسے تنگ کرتے پھر دو.....؟“
 ”جناب! میں نے بھابی کو بالکل بھی تنگ نہیں کیا۔“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

”جب وہ تم سے کوئی بات کرنے کی روادار نہیں.....“ میں نے اس کے چہرے پر ہلکا سا جھکاؤ کر کے خت لہجے میں کہا۔ ”حتیٰ کہ تمہارا بار بار ”بھابی“ کہنا بھی اسے ناگوار گزر رہا ہے تو پھر تم اس سے دور کیوں نہیں ہو جاتے؟“
 ”تمہانے دار صاحب! مجھے پتا چلا ہے کہ جمورہ بھائی رات کو گھر نہیں پہنچتا تو میں پریشان ہو گیا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں اسی لیے تمہانے آیا تھا کہ جمورہ کی گمشدگی کے بارے میں آپ کو بتاؤں اور یہاں پہنچ کر پتا چلا کہ صفیہ بھابی

ایکلی ہی تمہانے پہنچی ہوئی ہے تو میں نے ان سے پوچھ لیا۔ بس اتنی سی بات ہے.....“ لہجائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
 ”سمجھ میں نہیں آتا، بھابی مجھ سے اکھڑی اکھڑی کیوں رہتی ہے؟“

”یہ راز میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔“ میں نے خود معنی انداز میں کہا۔ ”آؤ..... اندر بیٹھ کر دونوں اس قصہ کی سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔“

صفیہ نے جیلا کے لیے ”کمینہ، بد ذات، مردود، زہریلا سانپ“ ایسے الفاظ استعمال کر کے اس امر کی تصدیق تو کر دی تھی کہ ان دونوں کے بیچ کوئی کبھی معاملہ پل رہا تھا لیکن میرے استفسار پر وہ بڑی خوب صورتی سے ٹال گئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ میں فریق ثانی یعنی جمیل عرف جیلا کی زبان سے کچھ اگلاؤں میں کا میاب ہو جاتا۔ اسی خیال سے میں نے اسے اندر چلنے کو کہا تھا۔
 وہ میری اس پیشکش پر بدگ گیا۔ ”آپ مجھے تمہانے کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟“ وہ ہر اس نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”تمہیں اندر جاتے ہوئے ڈر کیوں لگ رہا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”کیا تم نے کوئی سنگین جرم کیا ہے؟“
 ”نہیں..... جناب.....“ وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے تو کچھ نہیں کیا تمہانے دار صاحب۔“
 ”جب تم نے کچھ نہیں کیا تو پھر تمہانے سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”صرف مجرموں کو تمہانے کے اندر جاتے ہوئے گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ تمہارے ہاتھ پاؤں اور دامن تو صاف ہے نا.....؟“
 ”جی، جی..... تمہانے دار صاحب۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 میں جیلا کو اپنے ساتھ لے کر تمہانے کے اندر آ گیا۔ قبل اس کے کہ میں جیلا کا انٹرو پو شروع کرتا، میں نے اسے ایس آئی کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

”جہاں زیب! تم جا کر ماسٹر عنائت کو پکڑ لاؤ۔ اب اگر سے پوچھ کچھ ضروری ہو گئی ہے۔ ذرا میں بھی تونوں کے کچھل کے بزنس پر اس نے کون کون سا مقابلہ لکھ رکھا ہے.....!“
 ”ٹھیک ہے ملک صاحب۔“ جہاں زیب نے فرمان برداری سے کہا۔ ”میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔“
 پھر میں جیلا کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ شکایتی لہجے میں

ہوا۔ ”تھانے دار صاحب! یہ تو بڑی نا انصافی والی بات ہے۔“
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

انتظار

اسرمکی عدالت میں ایک عورت نے درخواست دی کہ میری شادی کو ایک سال گزر گیا ہے لیکن میرے شوہر نے آج تک مجھ سے ایک بات بھی نہیں کی۔ عدالت نے شوہر کو بلا کر وجہ پوچھی تو وہ بڑی معصویت سے بولا۔ ”جناب! میں اپنی بیوی کی قطع کلای نہیں کرنا چاہتا تھا اور اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔“ (مرسلہ: جاوید اختر رائے۔ پاکپتن شریف)

دیور بعد میں اور جمجورا کے بھائی پہلے ہو.....!“
میرا چلایا ہوا تیر جا کر نشانے پر بیٹھا تھا۔ میں نے ٹٹول کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ذرا ٹٹول کر بتاؤ۔ صغیہ کو اپنے سر ایوں سے آخر مسئلہ کیا ہے؟“
وہ متذبذب انداز میں مجھے ٹٹولنے لگا۔
میں نے محسوس کیا کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے مجھ پر بھروسہ کرنا چاہیے یا نہیں۔
میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔
”جیلا! اگر تمہارا دل مانے تو تم مجھ پر مکمل اعتماد کر سکتے ہو۔ یہاں پر ہونے والی گفتگو ہم دونوں کے بیچ ہی رہے گی۔ تم جو بھی بتانا چاہتے ہو، بلا خوف و خطر بے دھڑک کہہ ڈالو۔“

”آپ پر اعتماد ہے جیسی تو میں آپ کے ساتھ تھا نے کے اندر آ گیا ہوں۔“ وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔
”مگر بھابی صغیہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے جناب۔“
”میں بھی تو یہی جانتا چاہتا ہوں کہ تمہاری بھابی میں برائی کیا ہے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے جیلا کی طرف دیکھا۔
”جناب! صغیہ بڑی تیز عورت ہے۔ پھل فریب میں کوئی دوسری عورت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“ وہ اپنی بھابی کی شان میں زہر نشانی کرتے ہوئے بولا۔ ”اس چالاک عورت نے اپنی مکارانہ چالوں سے جمجورا بھائی کو پورے خاندان سے کاٹ کر الگ کر دیا ہے اور مجھ پر تو ایسا گھناؤنا الزام لگایا کہ.....“ لمحائی توقف کر کے اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور ٹیٹلی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
”جناب! مجھے بتاتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے.....!“

”جناب! یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ بھابی جمجورا کہیں غائب ہو گیا ہے۔“ وہ ٹٹولی بھرے انداز میں بولا۔ ”اور بھابی صغیہ نے مجھے بتاتا تک کو مارا نہیں کیا۔ وہ اکیلے ہی تھانے چلی آئی ہے۔ میرا بھائی کم ہوا ہے اور مجھے ہی اس معاملے سے الگ رکھا جا رہا ہے۔ یہ نا انصافی نہیں تو اور کیا ہے!“
”تمہیں اس معاملے سے الگ تمہاری بھابی نے رکھا ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”اور میں نے دیکھا ہے، صغیہ تم سے کافی ناراض ہے۔ یہ تم لوگوں کا خاندانی معاملہ ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم دیور بھابی کے بیچ کون کون سے اختلافات چل رہے ہیں لیکن تم دل چھوٹا نہ کرو۔ میں تمہیں جمجورا کی گمشدگی و زلے معاملات سے علیحدہ نہیں رکھوں گا۔“

”بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب!“ وہ آسودگی بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”اللہ آپ کا بھلا کرے۔ ذرا مجھے بتائیں تو سہی، بھابی جمجورا کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟“
”اس بارے میں تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“
میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ صغیہ کی تم سے کیا دشمنی ہے؟ وہ تم سے اتنی بیزار کیوں نظر آتی ہے؟“
”مجھے تو لگتا ہے، بھابی جی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ وہ مبرا سامنے بتاتے ہوئے بولا۔ ”بے اولادی کے دکھ نے اسے ذہنی اور نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔“

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ بھی صغیہ کے لیے اپنے دل میں بھلائی اور اچھائی کے جذبات نہیں رکھتا تھا۔ گویا رنجشوں اور عداوتوں کی یہ تالی دو ہاتھوں سے بچ رہی تھی جن میں ایک ہاتھ صغیہ کا تھا اور دوسرا جیلا کا۔ میں نے اس سلسلے میں صغیہ کو پریدنے کی کوشش کی تھی مگر مجھے اس مقصد میں ہر دست کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اب یہی کوشش میں نے جیلا پر کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ تمہاری بھابی کا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے ورنہ پریشانی کے وقت تو ہمیشہ انہوں کی طرف دیکھا جاتا ہے اور تم تو صغیہ کے

”کیا اس گھناؤنے الزام کا تعلق شریعت کے کسی شعبے سے ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جی، جی، بالکل۔“

”جیلا! تم نے یہ تو سنا ہوگا کہ شرع میں کوئی شرم نہیں ہوتی؟“ میں نے کہا۔

”جی، میں نے مجھے کی تقریر میں مولوی صاحب کو ایسا بتاتے ہوئے سنا ہے۔“

”مولوی صاحب نے غلط نہیں بتایا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”شرعی معاملات کو بیان کرتے ہوئے ہجک اور شرم کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے۔“

میرے حوصلہ بڑھانے پر اس نے صنفی کے ”گھناؤنے الزام“ کی جو تفصیل بیان کی اس کے مطابق، کچھ

عرصہ پہلے تک جمورا، جیلا سے بہت محبت کرتا تھا اور اپنے چھوٹے بھائی پر جان چڑھتا تھا۔ جیلا کا اکثر اس کے گھر میں آنا جانا بھی رہتا تھا لیکن اپنے گھر میں جیلا کی آمد و شد صنفی

کو ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ اس کا آزما ہوا ہر حربہ ناکام ہو رہا ہے اور کسی بھی طور جیلا کے لیے

جمورا کی محبت میں کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی تو اس نے دونوں بھائیوں میں نفاق ڈالنے کے لیے ایک شیطانی چال

چلی۔ ایک روز جب جمورا اپنے گھر پر نہیں تھا، وہ کسی دوسرے گاؤں گیا ہوا تھا اور اسے اگلی صبح ہی واپس آنا تھا۔

حسب معمول، جیلا خیر خیریت معلوم کرنے جمورا کے گھر پہنچا تو اسے پتا چلا کہ بھائی گھر میں موجود نہیں ہے۔ وہ واپس

جانے کے لیے پلٹا تو صنفی نے کہا۔ ”آج اندر نہیں آؤ گے۔۔۔۔۔؟“

صنفی کے لہجے میں اپنات کی موجودی نے جیلا کو چونکا دیا۔ آج سے پہلے صنفی نے اتنی نرمی سے بھی اس سے

بات نہیں کی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ بہر حال، اس نے کہہ دیا۔

”بھائی گھر پر نہیں ہے اور ابھی رات بھی ہو رہی ہے۔ میں بعد میں آ جاؤں گا۔“

”تو اس کا مطلب ہے، تم مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہو۔“ وہ جیلا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی لگاؤٹ سے بولی۔

”تم یہاں پر صرف اپنے بھائی سے ملنے آتے ہو۔۔۔۔۔؟“ صنفی کا بدلا ہوا دوستانہ انداز جیلا کو حیرت میں ڈال

رہا تھا۔ وہ جڑ بڑھوتے ہوئے بولا۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں بھائی! تم خود ہی مجھ سے کبھی

کبھی رہتی ہو۔“

”تمہاری غلط فہمی ہے۔۔۔۔۔!“ وہ متنی خیز انداز میں بولا۔ ”میں سمجھا نہیں؟“ وہ سوالیہ نظر سے صنفی کو دیکھنے لگا۔

”اس لیے کہ۔۔۔۔۔۔ تم نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“ صنفی شکایتی انداز میں بولی۔ ”میں اتنی بھی بری نہیں

جتنی تمہارے خاندان والوں نے مجھے مشہور کر رکھا ہے اندر آ جاؤ۔ دروازے پر کھڑے کھڑے ہی پکچری کر کے

رہو گے تو دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ دونوں بھائی مل کر کوئی ناراضی ہو گئی ہے جو تم بڑے بھائی کے گھر کے اندر قدم

نہیں رکھ رہے ہو۔۔۔۔۔!“ اگرچہ صنفی کا بدلا ہوا رویہ جیلا کی سمجھ میں بالکل نہیں

آ رہا تھا لیکن صنفی کی آخری بات میں وزن محسوس کرنے ہوئے وہ جمورا کے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

جیلا نے مجھے بتایا کہ اس روز وہ پہلے والی صنفی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ جتنی محبت اور اپنات سے مکمل کر اس سے بات

چیت کر رہی تھی، اس سے جیلا کو یہی محسوس ہوا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے جو کوئی حقیقت کی دنیا میں صنفی نے کبھی اس کے ساتھ

ایسا برتاؤ نہیں کیا تھا۔ اس رات صنفی نے اصرار کر کے اسے کھانا کھلایا پھر جب وہ جانے کے لیے کھڑا ہوا تو صنفی نے

اچانک پیتر بدلا اور شور مچانا شروع کر دیا۔ اس کی چیخ پکار پر اڑوسی پڑوسی جمع ہو گئے پھر ایک

سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق صنفی نے رو رو کر لوگوں کو بتایا۔ ”اس شیطان نے مجھے بے آبرو کرنے کی کوشش کی

ہے۔“ ساتھ ہی وہ انگلی سے جیلا کی جانب اشارہ بھی کر رہی تھی۔ ”میں نے اس کیلئے کوہِ ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی سمجھا ہے اور

اس نے بے غیرتی کی ساری حدیں پھلانگ دیں۔ مجھے گھر میں اکیلا دیکھ کر اس نے میری عزت پر حملہ کر دیا۔ وہ تو اللہ کا

شکر ہے، آپ لوگوں کے آنے سے اسے اپنے شیطانی عزائم پورے کرنے کا موقع نہیں مل سکا ورنہ۔۔۔۔۔“ وہ رک

رک کر سسکیاں لیتے ہوئے درز بھری آواز میں بولی۔ ”ورنہ۔۔۔۔۔ میں تو آج۔۔۔۔۔ تباہ و برباد ہو جاتی۔۔۔۔۔

ایک عورت کے پاس۔۔۔۔۔ سب سے بڑا سرمایہ اس کی عزت ہی تو ہوتی ہے۔ اگر یہ مردود مجھ پر حاوی آ جاتا تو

۔۔۔۔۔ میں جمورا کو منہ دکھانے کے قائل نہ رہتی۔۔۔۔۔“ بات کے اختتام پر وہ باقاعدہ پکچریوں سے رونے لگی تھی۔

لوگوں کی ہمدردیاں اس قسم کی پھوٹیشن میں عموماً عورت کے ساتھ ہوتی ہیں لہذا انہوں نے لعن طعن کر کے جیلا کو دہاں سے بھگا دیا۔ نجیب آباد ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اگلی

آخری جملہ اس نے بڑے طنزیہ انداز میں ادا کیا تھا جس سے صفیہ کے لیے اس کی سخت ناپسندیدگی ظاہر ہوتی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”جیلا! تم نے مجھے جو کچھ بتایا ہے اگر وہ سب مبنی برحقیقت ہے اور تم نے اس میں ذرا سا بھی جھوٹ شامل نہیں کیا تو پھر قانون کی نظر میں تمہاری بھابی کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔“

”یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں تمہارے دار صاحب!“ وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”آپ بھابی کی مصوم، بھولی بھالی صورت پر نہ جائیں۔ وہ رونی شکل بنا کر خود کو بے قصور اور مظلوم ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ آپ اس عورت کو بالکل نہیں جانتے۔ یہ کسی وقت کچھ بھی کر سکتی ہے اور دولت کی خاطر تو یہ سنگین سے سنگین قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔“

”دولت کی خاطر.....؟“ میں نے چونکے ہوئے انداز میں اس کے الفاظ دہرائے۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

صفیہ کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ ایک ہزار روپے والا معاملہ صرف دو افراد کے علم میں تھا یعنی یہ راز صرف صفیہ اور جمورا ہی جانتے تھے یا پھر خیر جٹ جس سے ایک ہزار روپے ادھار لینے جمورا چنی وال گیا تھا۔ ابھی تک اس بات کی بھی تصدیق نہیں ہو سکی تھی کہ خیر جٹ نے جمورا کو قرض دیا بھی تھا یا نہیں..... جیلا کے منہ سے دولت کا ذکر نہ کرنا تو

میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ وہ بھی ایک ہزار روپیہ اس رقم کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ یہ بات میرے لیے حیران کن اور باعث تشویش تھی۔ یہ تو ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ صفیہ نے خود یہ بات جیل عرف جیلا کو بتائی ہو.....!

”مجھے پتا چلا ہے کہ بھابی جمورا کہیں سے ایک موٹی رقم لے کر آئے والے تھے۔“ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے جیلا نے بتایا۔

”نہیں یہ بات کہاں سے پتا چلی ہے؟“ میں پوچھے

بتانہ رہ سکا۔

”بس جی، کہیں سے کان میں پڑ گئی ہے۔“ وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ”یہ بات میرے علم میں ہے کہ بھابی جمورا، مشتاق مہر سے زمین کا کوئی ٹکڑا خریدنے والا تھا اور اسی سلسلے میں پیسوں کا بندوبست کرنے وہ جٹی وال گیا تھا۔ مذکورہ زمین کی قیمت میں ایک ہزار روپے کم پڑ رہے تھے۔ میں جٹی وال والے تو خیر جٹ کی طرح کوئی بڑا آدمی تو نہیں ہوں لیکن میری زمین داری ٹھیک ٹھاک چل رہی ہے۔ ایک ہزار روپے تو میں بھی بھابی جمورا کو دے دیتا۔“

میں دل ہی دل میں جیلا کی ہوشیاری کی داد دے دیتا۔

میں نے پہلے ہی اس واقعے کی خبر گھر گھر پہنچ گئی تھی اور ان گھروں میں ایک گھر جیلا کا اپنا گھر بھی تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ اس کی پوزیشن کا حال ہوا ہوگا، اس کا اندازہ یہ خوبی لگا جاسکتا ہے۔

جب وہ اس افسوسناک واقعے کو بیان کر چکا تو ایک اسودہ سائس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے دار صاحب! اور تو جو ہوا سو ہوا لیکن اس واقعے کے دو پہلو

لہایت ہی اہم ہیں۔“

جیلا نے مجھے جو کہانی سنائی تھی، اس کی روشنی میں اگر وہ سچا تھا تو پھر صفیہ بہت ہی خطرناک عورت تھی اور اگر جیلا نے کسی حرام زندگی کی پردہ پوشی کی خاطر اپنی پوزیشن کو صاف کرنے کے لیے دروغ گوئی سے کام لیا تھا تو پھر صفیہ کا کہا

ہوا درست تھا کہ اس کا دور ایک زہریلا سانپ تھا جس سے فیر کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ حقیقت کیا تھی، اس کا فیصلہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب اس حوالے سے میں صفیہ کا موقف بھی سن لیتا۔ خیر..... یہ بعد کی باتیں تھیں۔

”کون سے دو اہم پہلو؟“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”پہلو نمبر ایک.....“ وہ انگلیوں پر حساب کرنے والے انداز میں بولا۔ ”صفیہ نے مجھے بدنام کرنے کی جو سازش کی تھی اس سے میری بیوی زرینہ کے دل میں میرے کردار کے حوالے سے ذرا سا بھی شک پیدا نہیں ہوا“

یعنی میری گھریلو زندگی میں کوئی طوفان نہیں آیا۔ گاؤں والے میرے بارے میں جو بھی کہتے ہیں، اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور لمحاتی توقف کے بعد سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”پہلو نمبر دو بڑا ہی افسوسناک اور تکلیف دہ ہے۔ بھابی جمورا نے صفیہ کی فریاد کو قرآن اور حدیث کا لکھنا مان لیا اور مجھ سے شدید نفرت کرنے لگا۔ اس روز سے میرے لیے بڑے بھائی کے گھر کا دروازہ بند ہو گیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ

دونوں بھائیوں کے بیچ میلوں کا فاصلہ پیدا کرنے کی صفیہ کی کوشش کامیاب ہو گئی ہے لیکن میرے دل میں بھابی جمورا کے لیے آج بھی وہی محبت ہے اور اسی رشتے کے حوالے سے میں بھابی صفیہ کا بھی احترام کرتا ہوں۔ آپ دیکھ لیں، میں نے جیسے ہی بھابی کی گمشدگی کا سنا تو پریشان ہو گیا پھر میں دوڑتے بھاگتے ہوئے سیدھا تمہارے پہنچا ہوں اور..... آپ

نے بھابی صاحبہ کا رویہ بھی ملاحظہ فرمایا ہے.....!“

سپینس ڈائجسٹ

اکتوبر 2017ء

131

رہ سکا۔ اگرچہ جھورا کے گھر کا دروازہ اس کے لیے بند ہو چکا تھا تاہم اس نے بھائی کے گھر کے اندرونی معاملات کی مکمل جانکاری رکھی ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جھورا جتنی وال تنویر جٹ کے پاس ایک ہزار روپے ادھار لینے گیا تھا۔

”تم نے یہ کیوں کہا کہ صنفیہ دولت کی خاطر کچھ بھی کر سکتی ہے؟“ میں نے اپنے سوال کو دہرائے ضروری سمجھا کیونکہ ابھی تک مجھے اس کا نسلی جوش جواب نہیں ملا تھا۔

”مجھے بتاؤ، صنفیہ ایک ہزار روپے کی خاطر تمہارے جھورا بھائی کے ساتھ کیا کر سکتی ہے؟“

”یہ تو..... مجھے پتا نہیں جناب.....“ وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میرا خیال ہے، آپ کو بھائی جھورا کے گھر کی تلاشی ضرور لینا چاہیے۔“

”کہیں تم یہ تو بتانے کی کوشش نہیں کر رہے کہ صنفیہ نے جھورا کو اپنے گھر کے اندر ہی کہیں چھپا رکھا ہے.....“

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چپچپے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”یازمین کے اوپر اور یا پھر..... منوں مٹی کے نیچے.....؟“

میرے استفسار میں بڑی خاص قسم کی سنگینی اور سفاکی پائی جاتی تھی۔ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

”کچھ بھی ہو سکتا ہے تمہانے دار صاحب اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابھی جن ایک ہزار روپے کا ذکر ہو رہا ہے، وہ رقم بھی بھائی جھورا کے گھر کے اندر ہی سے برآمد ہو جائے!“

”جیلا! تم خواخوہ اپنی بھائی پر شک کر رہے ہو۔“

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”وہ عورت ذات اتنا خطرناک قدم نہیں اٹھا سکتی۔“

”تمہانے دار صاحب! میں نے اپنے محسوسات آپ تک پہنچا دیے ہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ کی مرضی ہے کہ میری بات کا یقین کریں یا مجھے جھوٹا سمجھیں۔ میں اپنی بھائی کو بڑی جتنی طراں جانتا ہوں۔ آپ کا واسطہ اس عورت سے پہلی بار پڑا ہے.....!“

وہ بڑے کھلے ڈالے انداز میں اپنی بھائی کے خلاف بول رہا تھا اور یہ مخالفت و ناپسندیدگی یک طرفہ نہیں تھی۔ میں نے صنفیہ کی آنکھوں میں بھی جیلا کے لیے نفرت کی چنگاریاں اڑتے دیکھی تھیں۔ وہ بھی اپنے دیور کے بارے میں ایسے ہی خاصانہ خیالات رکھتی تھی۔ دونوں میں سے کون حق پر تھا اور کس نے باطل کی مسافرت اختیار کر رکھی تھی؟ اس بات کا فیصلہ آنے والے وقت ہی نے کرنا تھا۔

بہر حال، میں نے جیلا کے اطمینان کی خاطر کہہ دیا۔

”تم فکر نہیں کرو۔ میرا صنفیہ سے پہلی بار واسطہ پڑا ہے اور میں ایک ہی تجربے میں اسے اچھی طرح سمجھ لوں گا۔ بانی جہاں تک اس کے گھر کی تلاشی کا معاملہ ہے تو میں تمہاری بات کو یکسر رو نہیں کروں گا۔ تمہارا مطالبہ جائز ہے۔ ضرورت پڑنے پر میں جھورا کے گھر کی تفصیلی تلاشی بھی لوں گا۔“

اس نے میرے عزم پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”تمہانے دار صاحب! آپ نے کہا تھا کہ میں دل چھوٹا نہ کروں۔ آپ مجھے بھائی جھورا کی گمشدگی والے معاملات سے علیحدہ نہیں رکھیں گے۔“

”میں نے تم سے غلط نہیں کہا تھا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم کل صبح تمہانے حاضر ہو جاؤ۔ میں تمہیں اپنے تمہانے کے عمل کے ساتھ جنگل کی طرف روانہ کروں گا۔ تم لوگ وہاں جھورا کو تلاش کرو گے۔ ابھی تک جو حالات میرے علم میں آئے ہیں، ان کی روشنی میں یہی نظر آ رہا ہے کہ تمہارے بھائی جھورا کے ساتھ جو بھی ہوا ہے، وہ نجیب آباد اور جتنی وال کے بیچ پائے جانے والے کھنچے جنگل کے کسی حصے میں پیش آیا ہے۔ ہمیں اپنی تلاش کا آغاز جنگل ہی سے کرنا چاہیے اور ادھر ادھر محوم پھر کر جھورا کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنا چاہیے۔“

اس نے میری تجویز سے اختلاف نہیں کیا اور نہ ہی اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر نمودار ہوا کہ اسے مجھ سے مکمل اتفاق ہے۔ وہ چند لمحات تک سپاٹ چہرے کے ساتھ مجھے تنکارتا پھر اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

”تمہانے دار صاحب! اب مجھے اجازت دیں۔“

”جیلا!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تاکیدی انداز میں کہا۔ ”ایک بات کو اچھی طرح اسنے ذہن میں بٹھا لو کہ اس مشن کے بارے میں تمہاری بھائی کو کہیں سے جھنک نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ اپنے خاوند کی تلاش کے سلسلے میں تمہاری شمولیت کو قطعاً برداشت نہیں کرے گی۔ وہ تمہیں سخت ناپسند کرتی ہے۔ اگر وہ بھڑک کر پٹری سے اتر گئی تو بتنا بنایا مھیل خراب ہو جائے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”جتنی طراں سمجھ رہا ہوں تمہانے دار صاحب۔“ وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ میں گاؤں میں اس حوالے سے کسی سے کوئی بات نہیں کروں گا اور کل صبح چپ چاپ سیدھا یہاں آ جاؤں گا۔“

”شاباش!“ میں نے ستائی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اب تم واپس جاؤ اور کل دوالی سرگرمی کے بارے میں تمہارا زبان بند رکھنا ہی فائدہ مند ہے۔“

ایک حرکات و سکنات کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لوں گا۔“
”میں کل صبح جی وال جا رہا ہوں۔“ میں نے الطاف کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور شام سے پہلے واپس آ جاؤں گا۔ مجھے امید ہے کہ اس دوران میں تم لوگ بھی جنگل یا تارے کسی اچھی خبر کے ساتھ واپس آ چکے ہو گے۔“

”ان شاء اللہ.....!“ وہ پُر وثوق انداز میں بولا۔
میں نے الطاف کو فارغ کیا تو جہاں زیب قہانے پہنچ گیا۔
میں نے اے ایس آئی جہاں زیب کو ماسٹر عنایت کو طرف روانہ کیا تھا اور مجھے قوی امید تھی کہ وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹے گا لیکن جب میں نے اسے تہا واپس آتے دیکھا تو میرا ہاتھ ٹھکا۔

”ملک صاحب! بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔“ وہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

میں نے توثیق بھرے انداز میں پوچھا۔ ”کیسی گڑبڑ؟“
”ماسٹر عنایت کے گھر پر تالا لگا ہوا ہے۔“ و
انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“
”مطلب یہ کہ ماسٹر عنایت غائب ہے۔“
”کب سے؟“ میں نے استفسار کیا۔
اے ایس آئی کی اطلاع نے مجھے عجیب تا میں ڈال دیا تھا۔

”لوگ بتاتے ہیں کہ کل دوپہر کے بعد اسے کسی نے نجیب آباد میں نہیں دیکھا۔“
”اوہ.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔ ”لوگ بتاتے ہیں..... سے تمہاری کیا مراد ہے؟ اس کے گھر والے کہاں ہیں؟“

”ماسٹر عنایت کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے ملک صاحب۔“ اے ایس آئی نے بتایا۔ ”وہ اس گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔“

”اور مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ وہ نجیب آباد کا پرانا دستک نہیں ہے۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ پہلے شیخوپورہ میں کہیں رہتا تھا۔ کہیں وہ اپنے آبائی علاقے کی طرف تو نہیں نکل گیا۔“

”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے ملک صاحب۔“ اے ایس آئی اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے فیکا درزی سے خاصی تفصیلی بات کی ہے اور اس سے ماسٹر عنایت کا شیخوپورہ والا ایڈریس بھی لے لیا ہے۔“

اس نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا پھر مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کائٹیل الطاف کو اپنے پاس بلوایا۔ جمہور کی گمشدگی کے حوالے سے میرے قہانے کا سارا عملہ باخبر ہو چکا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں الطاف کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا اور کہا۔

”کل صبح جیسے ہی جیلا قہانے پہنچے، تم اسے اور کھوجی تاج دین کو اپنے ساتھ لے کر جنگل کی طرف نکل جانا۔“

”آپ کا حکم سر آٹھوں پر ملک صاحب۔“ وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا پھر پوچھا۔ ”کیا آپ جیلا کو واقعی اس مشن میں ساتھ رکھنا چاہتے ہیں؟“

مجھے محسوس ہوا کہ الطاف کے ذہن میں جیلا کے حوالے سے کچھ خاص چل رہا ہے۔ اس کی سوچ تک رسائی حاصل کرنے کی غرض سے میں نے انہی سے سوال کر ڈالا۔

”کیوں..... کیا اس میں کوئی قاحت ہے؟“
”قاحت تو کوئی نہیں ملک صاحب لیکن.....!“
وہ بولتے بولتے رکا تو میں نے اس کی ادھوری بات کے جواب میں پوچھا۔ ”لیکن کیا؟“

”میں نے دیکھا ہے، یہ بندہ قہانے کے باہر اپنی بھائی کے ساتھ بڑی بدتمیزی سے پیش آ رہا تھا۔ آپ کی آمد پر یہ آپ کو دکھانے کے لیے نرم لہجے میں بات کرنے لگا تھا۔“ کائٹیل نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”جیلا مجھے قابلِ بھروسہ نہیں لگ رہا۔“

”الطاف! ہم نے جیلا کو لوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا بریف کیس تمہارا یا سونے کی اینٹوں سے بھرا ہوا صندوق اٹھا کر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں نہیں بھیجتا جو اس کا بھروسہ مند ہونا ضروری ہو۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”صفیہ کے ساتھ اس کا جو بھی رویہ ہے، وہ دونوں بھائیوں کے بیچ پائے جانے والے ناخوشگوار تعلقات کی وجہ سے ہے اور ایک بات ذہن میں رکھنا کہ جیلا میری نظر میں بھی گھبر نہیں ہے۔ میں اسے تمہارے ساتھ اس لیے بھیج رہا ہوں کہ تم اس پر گہری نظر رکھ سکو۔ اپنی ضرورت کے تحت اگر تم چاہو تو اپنے ساتھ ایک دو کائٹیل اور بھی لے جاسکتے ہو مگر اس پارٹی کے لیڈر تم ہی ہو گے۔ واپسی پر میں ہر سوال تم ہی سے کروں گا اور جواب بھی تمہیں ہی دینا ہوگا۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں ملک صاحب۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”میں آپ کی توقع پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔ میں جیلا کی کڑی نگرانی کروں گا اور اس کی ایک

”اس فیکا درزی کا کیا حدود اربعہ ہے؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ کیا تم فیکا کے تاریخ اور جغرافیہ سے کچھ واقفیت رکھتے ہو؟“

”تھوڑی بہت معلومات ہیں میرے پاس۔“ اے ایس آئی نے بتایا۔ ”ماسٹر عنایت کا مکان، فیکا درزی کے گھر کے ساتھ جڑا ہوا ہے یعنی وہ دونوں پڑوسی ہیں۔ پورے گاؤں میں فیکا درزی وہ واحد شخص ہے جس کے ساتھ ماسٹر عنایت کی خوب بنتی تھی۔ فیکا درزی کی باقاعدہ کوئی ٹیلرنگ شاپ نہیں ہے۔ وہ سلائی کا کام اپنے گھر کی بیٹھک میں کرتا ہے اور دن کا بیشتر حصہ ماسٹر عنایت اس کے پاس بیٹھا کپ شپ کرتا رہتا ہے۔ فیکا نے مجھے بتایا ہے کہ کسی زمانے میں ماسٹر عنایت بھی کپڑوں کی سلائی کا کام کیا کرتا تھا اسی لیے اس کے نام کے ساتھ ”ماسٹر“ لگا ہوا ہے۔ وہ اپنے گھر والوں سے ناراض ہو کر یہاں آ گیا تھا۔ فیکا درزی نے اس بات کا امکان ظاہر کیا ہے کہ شاید ماسٹر عنایت شیخوپورہ کی طرف نکل گیا ہو.....“

”فیکا نے امکان ظاہر کیا ہے۔“ میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ”مطلب یہ کہ اسے یقین نہیں کہ ماسٹر عنایت شیخوپورہ ہی گیا ہوگا؟“

”وہ فیکا درزی سے مل کر یا اسے بتا کر نہیں گیا ملک صاحب۔“ اے ایس آئی نے کہا۔ ”فیکا نے مجھے بتایا ہے کہ کل دوپہر کے وقت وہ اس کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اور خاصا اداس بھی تھا۔ اسی اداسی کی کیفیت میں اس نے فیکا درزی کو تین مرتبہ ایک مختصر سی کہانی بھی سنا ڈالی تھی اور ہر بار کہانی کے اختتام پر اس نے گردن جھٹکتے ہوئے بڑے دردناک انداز میں ایک ہی ڈائلاگ بولا تھا، پھر وہ فیکا درزی کے پاس سے اٹھ کر کہیں چلا گیا تھا۔ کہاں؟ اس بارے میں فیکا وثوق کے ساتھ کچھ بھی بتانے سے قاصر ہے۔ ماسٹر عنایت کے گھر پر لٹکے ہوئے تالے کو دیکھ کر وہ یہی سمجھا تھا کہ شاید وہ شیخوپورہ کی طرف نکل گیا ہے۔“

اے ایس آئی نے اپنی بات پوری کی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا فیکا درزی نے تمہیں بتایا کہ ماسٹر عنایت نے گردن جھٹک کر کون سا ڈائلاگ بولا تھا؟“

”جی ملک صاحب! فیکا نے مجھے وہ مختصر سی کہانی بھی سنائی ہے اور ڈائلاگ کے بارے میں بھی بتایا ہے۔“ اے ایس آئی نے جواب دیا۔ ”کہانی کے اختتام پر ماسٹر عنایت نے افسوسناک انداز میں کہا تھا..... دنیا والے کسی حال میں انسان کو جینے نہیں دیتے!“

”ماسٹر عنایت نے بات تو بڑے پتے کی کی ہے۔“ تم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اب نگے ہاتھوں وہ مختصر کہانی گل سنا ڈالو۔ ممکن ہے، اس کہانی میں ہمیں ایسا کوئی اشارہ مل جاوے جس سے مجھ کو اس تلاش میں مدد مل سکے.....!“

میری فرمائش پر جہاں زیب نے مجھے وہ مختصر سی کہانی سنا دی۔ یہ کہانی بھی ”چٹلی“ والے لافتنے کی طرح خاصی دلچسپ ہے۔ آپ بھی سن لیں..... میرا مطلب ہے، پڑھ لیں! ایک بوڑھا شخص اپنے نو عمر بیٹے کے ہمراہ کسی راستے پر چلا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کا مرل سا گدھا بھی جو مسرتھا۔ کوئی پاس سے گزرا اور اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

”تین گدھے جا رہے ہیں.....!“

بوڑھے نے اس شخص کے تمبرے کا برا مٹایا اور کہا۔ ”ہم دونوں انسان ہیں۔ گدھا صرف یہ ہے۔“ پھر اس نے اپنے گدھے کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

”اگر تم دونوں انسان ہوتے تو تم میں عقل نام کی کوئی چیز بھی ہوتی۔“ اس شخص نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”ایک سواری کی موجودگی میں پیدل چلے جا رہے ہو.....!“

وہ شخص تو بات کر کے آگے بڑھ گیا اور بوڑھا سوچ میں پڑ گیا۔ بوڑھے کو اس شخص کی بات میں خاصا وزن محسوس ہوا اور اس نے اپنے بچے کو گدھے کی پیٹھ پر بٹھادیا اور خود ساتھ ساتھ پیدل چلنے لگا۔

چند منٹ بعد ایک دوسرا شخص ان کے قریب سے گزرا اور یہ جملہ چست کر کے آگے بڑھ گیا۔

”قرب قیامت کی نشانیاں ہیں۔“ نوجوان اولاد مزے سے گدھے پر سوار ہے اور ضعیف باپ کو پیدل چلایا جا رہا ہے۔ اس سے بڑی بے غیری اور کیا ہوگی۔ اللہ ایسی بے حس اولاد کو غارت کرے..... آمین..... ثم آمین!“

بوڑھے شخص نے فوراً سے پیش تر اپنے بیٹے کو نیچے اتارا اور خود گدھے کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ جیسے اے ڈر ہو کہ اگر اس نے تاخیر کر دی تو اس بندے کی بددعا بیٹے کو لگ جائے گی۔ چند قدم کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک تیسرا آدمی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ جب وہ بندہ ان کے نزدیک پہنچا تو ہونٹ سمجھ کر خامے غصے سے بولا۔

”چائلڈ لیبر کا قانون گاؤں دیہات میں بھی نافذ ہونا چاہیے تاکہ بچوں سے کوئی بیگار لینے یا کوئی انہیں تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکے۔ اس بے شرم بڑھے کو دیکھو۔ کتنے آرام سے گدھے کی پشت پر بیٹھا کئی رائیڈ

پاس سے گزرا تھا ان کا چھٹا بھائی ماسٹر عنایت ہے کیونکہ اس نے بھی مچھلی والے معاملے میں بھجور سے کچھ اسی نوعیت کا سلوک کیا تھا لہذا.....“ میں نے لاجپاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”تم ابھی اور اسی وقت شیخوپورہ روانہ ہو جاؤ اور آج ہی کی تاریخ میں ماسٹر عنایت کو پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔ اس ٹائپ کے سنگی لوگ اپنی باتوں سے دوسروں کو زچ کر کے کچھ بھی کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ میں اس فلاسفر کا دیدار کرنا چاہتا ہوں اور اسے بھی دیکھی ہی چند کہانیاں سنانا چاہتا ہوں جیسی وہ دوسروں کو سنا کر انہیں ٹیشن دیتا ہے۔ تم نے اس کا شیخوپورہ والا ایڈریس وغیرہ تو نوٹ کر لیا ہے نا؟“

”جی ملک صاحب!“ اے ایس آئی کے سخیہ اشپات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ”وہ نجیب آباد آنے سے پہلے شیخوپورہ کے محلہ اسلام منج میں رہتا تھا۔“

”بس ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر ماسٹر عنایت کسی حوالے سے بھجور کی کشمیری میں لوٹ پایا گیا تو میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ اسے منج کی ساری اقسام زبانی یاد ہو جائیں گی، خاص طور پر..... سر والامنج.....!“

☆☆☆

موضع جتی وال اگرچہ ایک چھوٹا گاؤں تھا لیکن اس کی وجہ شہرت وہاں کی غلہ منڈی تھی۔ کشمیرہ بھجور کا دوست تو ہر جٹ اسی غلہ منڈی میں آڑھٹ کا کام کرتا تھا اور بھجور تین اپریل کو اپنے اسی دوست سے ایک ہزار روپے ادھار لینے آیا تھا لیکن وہ واپس اپنے گھر نہیں پہنچا تھا۔ مجھے امید تھی کہ تین اپریل کی شام نہ سہی، بھجور آج اپریل کا سورج غروب ہونے سے پہلے لازمی اپنے گھر پہنچ جائے گا مگر میری یہ امید پوری نہیں ہو سکی تھی لہذا میں پانچ اپریل کی صبح کاشیبل اشفاق کے ہمراہ جتی وال آ گیا تھا۔ گزشتہ روز اے ایس آئی جہاں زیب بھی شیخوپورہ سے واپس نہیں آیا تھا۔ میں جہاں زیب کے لیے پریشان تو تھا لیکن وہ آج کل جیسا فاسٹ زمانہ نہیں تھا کہ میں فوراً سیل فون کا استعمال کر کے اس کی خیریت دریافت کر لیتا۔ مجھے ہر حال میں اس کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔

غلہ منڈی میں تو ہر جٹ کی دکان تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تو ہر جٹ ایک مشہور آدمی تھا۔ جتی وال کی غلہ منڈی میں ہر شخص اسے جانتا تھا۔ گزشتہ رات اچھی خاصی بارش بھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے غلہ منڈی کے اندر کچھ نظر آ رہی تھی۔ اس کا

کالٹ اٹھا رہا ہے اور مصوم بالک بے چارہ بیٹوں بیٹوں بچے چلے پر مجبور..... کوئی شرم ہوتی ہے، کوئی حیا ہوتی ہے۔“

بوڑھے شخص کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے۔ جو شخص جو بھی بول کر جا رہا تھا، اس کی بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بالآخر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ دونوں باپ بیٹا گدھے پر سوار ہو جاتے ہیں چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

مگر آج کا دن تو ہر طرف سے کم بختی لیے ہوئے تھا۔ وہ دونوں گدھے پر سوار تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک چوتھا آدمی ان کے پاس سے گزرا اور یہ کہہ کر وہ بندہ رہی سہی کسر بھی پوری کر گیا۔

”غضب خدا کا..... ایک مریل سے گدھے پر دو دو افراد سوار ہیں۔ یہ ظلم و زیادتی کی انتہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ گدھا ہے..... بے زبان ہے..... لیکن روز قیامت اللہ اس جانور کو بھی قوت ہو گا تو کیا عطا فرمائے گا۔ بھر یہ گدھا اس بڑھے کے ایک ایک قسم کو کھول کر بیان کرے گا اور..... بے شک اللہ زبردست انصاف کرنے والا ہے۔“

بوڑھے شخص کا بیٹا صبر لمبریز ہو گیا۔ جب کسی کے ضبط کا پیمانہ چھلک جائے تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس بوڑھے شخص نے بھی ایک عجیب اور انوکھا فیصلہ کیا اور بیٹے کی مدد سے ہمت کوشش کر کے اس نے اپنے مریل سے گدھے کو سر پر اٹھالیا۔ اسی لمحے ایک پانچواں بندہ ان کے قریب سے گزرا اور ایک بلند آہنگ تہقہہ لگاتے ہوئے استہزائیہ انداز میں بولا۔

”اے کہتے ہیں مکافات عمل یعنی لاء آف نیچر..... آج کے انسان کے جیسے کرتوت ہیں ان کی پاداش میں قدرت مستقبل میں اسے حیوانوں کی منجھی چابی پر مامور کر دے گی۔ جانور آرام کریں گے اور انسان ان کی چاکری کے لیے ہر لمحہ مستعد..... شاید یہ پرومو جانوروں کے تابناک مستقبل کی ایک جھلک ہے!“

اس بوڑھے شخص نے جھنجھلا کر گدھے کو زمین پر پٹخ دیا۔ گدھا ”ڈھچو ڈھچو“ کرتا ہوا ایک طرف جا کھڑا ہوا۔ گدھے کو رسید کے جانے والے اس دھوپی پاٹ کے نتیجے میں وہ بوڑھا شخص بھی زمین پر جا گرا تھا۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے شکستہ دلی سے کہا۔

”دنیا والے کسی حال میں انسان کو جینے نہیں دیتے۔“

اے ایس آئی کی کہانی کی مکمل ہوئی تو میں نے کہا۔ ”یہ جو پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں شخص اس بڑھے کے

ایک سبب ٹرکوں کی مسلسل آمدورفت بھی تھی جو اناج کی یورپوں کو یہاں سے وہاں پہنچانے میں مصروف رہتے تھے۔
تویر جٹ اپنی دکان میں موجود نہیں تھا۔ اس کے منشی نے بتایا۔ ”آج وہ دکان پر نہیں آئیں گے۔“

مجھے اور کاشیمل کو پولیس یونیفارم میں دیکھ کر منشی ہائی الارٹ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔
”میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔ جتنی وال اور آس پاس کے تمام گاؤں دیہات میرے تھانے کی حدود میں آتے ہیں۔“

منشی نے نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ ہمیں دکان کے اس حصے میں بٹھا یا جو تویر جٹ کے آفس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں پر مکمل پرائیویسی والا ماحول میسر تھا۔ اونچی چھت والی اس وسیع و عریض دکان کا عقبی حصہ اناج کے گودام کے طور پر استعمال ہوتا تھا جہاں فرش سے چھت تک گندم، چاول، دالوں اور دیگر اناج کی بوریاں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ اس گودام اور دفتر کے آگے برآمدہ نما ایک کشادہ حصہ ضروری امور کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ آفس کی بیرونی دیوار شیٹے کی بنی ہوئی تھی یعنی اس دیوار میں اوپر سے نیچے اور دائیں سے بائیں تک ایک بڑا سا شیشہ لگا ہوا تھا جس میں سے باہر کا منظر بڑا واضح نظر آتا تھا۔ دکان کے باہر منڈی کے مگن میں اس وقت بھی دوڑک کھڑے دکھائی دے رہے تھے جن پر اناج کی لوڈنگ کا سلسلہ جاری تھا۔

تویر جٹ کے منشی کا نام محمد الیاس معلوم ہوا۔ الیاس ایک دبلا پتلا، دراز قامت اور لمبا رخسار شخص تھا۔ ہمیں آفس والے حصے میں بٹھانے کے بعد اس نے کہا۔

”اب بتائیں ملک صاحب! میں آپ کی کیا سیدھا کروں!“
”منشی جی! میں یہاں سیدھا کرانے نہیں آیا۔“ میں نے غصہ سے ہوئے لہجہ میں کہا۔ ”میں ایک ضروری تعینش کے سلسلے میں جتنی وال پہنچا ہوں اور فوری طور پر تویر جٹ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ تویر جٹ آج دکان پر کیوں نہیں آیا؟“

”وہ توکل بھی نہیں آئے تھے۔“ منشی نے بتایا۔ ”اگر آپ کا ان سے ملنا ضروری ہے تو گھر چلے جائیں۔“

”خیریت.....“ منشی کی بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔
”تویر جٹ دو دنوں سے منڈی کیوں نہیں آ رہا؟“

”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ملک صاحب۔“ منشی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اگر آپ کا حکم ہو تو میں

تاگہ منگوا کر آپ کو ان کے گھر تک پہنچا دیتا ہوں۔ آپ چاہیں تو اپنے گھوڑے ادھر منڈی ہی میں چھوڑ جائیں لیکن..... اس نے بات ادھوری چھوڑ کر آفس کے باہر ایک شخص کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا پھر بولا۔

”میں پہلے آپ کی خاطر تواضع کے لیے جمجورا سے کچھ منگواتا ہوں۔ اس کے بعد آپ جٹ صاحب سے ملنے جائیں۔“ پھر اس نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ ”ملک صاحب! سب خیریت تو ہے نا..... آپ کس سلسلے میں جتنی وال تشریف لائے ہیں؟“

منشی الیاس کی تشویش کو میں بے موقع نہیں کہوں گا۔ ہر انسان کے اندر ایک خاص مقدار میں تجسس کا مادہ پایا جاتا ہے اور جہاں معاملہ پولیس کا ہو تو یہ مادہ کچھ زیادہ ہی متحرک ہو جاتا ہے۔ منشی نے بھی اس مادے کی تحریک کے زیر اثر مجھے سے سوال کیا تھا۔ منشی کی زبان سے جمجورا کا نام سن کر میں چونک اٹھا تھا اور ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ کیا صفیہ کا گھر والا جمجورا ابھی تک جتنی وال کی فضا ہی میں سانس لے رہا ہے.....!

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
”پہلی بات تو یہ کہ میری خاطر تواضع کی زحمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری بات یہ کہ تم نے ابھی کسی جمجورا کا ذکر کیا ہے۔ یہ کون ہے؟ تیسری بات یہ کہ اگر تم نے میری دوسری بات کا جواب دے دیا تو پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں کس مقصد سے جتنی وال آیا ہوں۔“

”ملک صاحب! جمجورا جٹ صاحب کا ملازم ہے۔“ وہ بڑی رساں سے بولا۔ ”اس کو دکان کے اوپری کاموں کے لیے رکھا ہوا ہے۔ میں ابھی جمجورا سے کہہ کر آپ کے لیے چائے پانی کا بندوبست کراتا ہوں۔“

”چائے پانی ادھار رہا۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”میں جمجورا کی تلاش میں جتنی وال آیا ہوں۔ بس تم جلدی سے اسے یہاں بلا لو۔“

”جمجورا کی تلاش میں.....“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں ملک صاحب!“ اسی وقت ایک شخص آفس میں داخل ہوا۔

”لیں جی..... جمجورا آ گیا ہے۔“ منشی الیاس نے کہا۔ ”آپ کو اسی بندے کی تلاش تھی نا؟“

یہ شخص وہ جمجورا نہیں تھا جس کی کھوج میں ہم جتنی وال آئے تھے۔ حاضر اسٹاک جمجورا دو پولیس والوں کو اپنے سامنے دیکھ کر گہرے گہرے ہنسنے لگا تھا پھر منشی کے اس جملے نے تو اسے بے

جمورا جب اپنی ”ذمے داری“ کو ”نبھانے“ کے لیے آفس سے نکل گیا تو منشی نے کہا۔
”ملک صاحب! آپ نے تو اس بے چارے کی جان ہی نکال دی تھی۔“

”اس یونیفارم کی اپنی ایک دھت اور ہیبت ہوتی ہے منشی جی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن بعض خطرناک مجرم اسے دیدہ دلیر ہوتے ہیں کہ وہ اس یونیفارم کو خاطر میں لائے بغیر پورے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو چیلنج کرتے رہتے ہیں۔“
”آج کس خطرناک مجرم کی سرکوبی کے لیے آپ نے جتنی دال کا رخ کیا ہے ملک صاحب؟“ وہ ٹٹولنے والے انداز میں بولا۔

”مجرم نہیں، ایک گمشدہ مظلوم کی تلاش تھی، میں یہاں آیا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں منشی الیاس کو بتایا۔

”کون مظلوم؟“ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے
”وہ.... مظلوم جو نجیب آباد میں پھیلیاں فروخت کرتا ہے۔ وہ تنویر جٹ کا دوست ہے اور اس سے ملنے دو روز پہلے یہاں آیا تھا۔“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔ ”اور ابھی تک وہ وہاں اپنے گھر نہیں پہنچا۔“
”اوہ.....“ منشی نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”تو آپ اس جمور کی تلاش میں یہاں آئے ہیں!.....“

”جب تم سمجھ ہی گئے ہو تو پھر تمہیں یہ بات بھی پتا ہوگی کہ جمورا کس مقصد سے تنویر جٹ سے ملنے جتنی دال آیا تھا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
”اور تمہیں یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ وہ ابھی تک گھر کیوں نہیں پہنچا؟“

”ملک صاحب! جمورا پرسوں یعنی تین اپریل کو لگ بھگ گیارہ بجے دن میں یہاں پہنچا تھا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بتانے لگا۔ ”اس نے ڈرائیج صاحب سے کافی تفصیلی ملاقات کی تھی اور دوپہر کا کھانا بھی اوسر دفتر ہی میں کھا یا تھا۔ پھر کوئی چار بجے کے قریب وہ یہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہ پیدل سفر کرنے کا عادی ہے اور خاصا تیز بھی چلتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق، اسے زیادہ سے زیادہ پانچ بجے اپنے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ باقی جہاں تک جمورا کی آمد کے مقصد کی بات ہے تو۔۔۔“ لگائی تو قوت کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اس بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں۔ اس سلسلے میں ڈرائیج صاحب سے میری بات نہیں ہوئی۔ وہ نہ تو کل دکان

حد ہر اسال کر دیا تھا..... آپ کو اسی بندے کی تلاش تھی نا؟ جمورا نے یہی ہوئی نظر سے پہلے مجھے دیکھا پھر منشی کی جانب نکتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کچھ نہیں کیا منشی جی..... خدا کے لیے مجھے پولیس سے بچالیں.....“
اس کی سادگی پر مجھے بہت پیار آیا لیکن میں نے تفرغ کی غرض سے سوال کیا۔ ”کیا تم نے واقعی کچھ نہیں کیا.....؟“
”نہیں جی۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں نے تو کبھی ایک مہی بھی نہیں ماری۔“

”تمہارا یہ جرم کیا کم ہے کہ یہاں جو بھی مہمان آتا ہے۔“ میں نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم فوراً اس کے لیے چائے پانی کے بندوبست میں لگ جاتے ہو.....؟“
اس نے ایک مرتبہ پھر منشی الیاس کی جانب دیکھا پھر مجھ سے بولا۔ ”یہ سب تو میں ان کے حکم پر کرتا ہوں جی۔“
اس کے انداز میں بڑی سادگی تھی۔

”حکم کسی کا بھی ہو مگر کرتے تو تم ہی ہوتا.....“ میں نے اسے گھورا۔ ”لہذا سزا بھی تمہیں ہی ملے گی۔“
جمورا منشی کی منت خوشامد میں لگ گیا کہ وہ سفارش کر کے اسے پولیس سے بچالے۔ منشی الیاس میری اس ”حرکت“ کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا اس لیے یہ تماشا دیکھتے ہوئے وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔ میں نے جمورا کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو جمورا! اگر تمہارے ذہن میں یہ خناس ہے کہ منشی الیاس تمہیں بچالے گا تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تمہیں تو آج میرے ہاتھ سے تنویر جٹ بھی نہیں بچا سکتا۔ سزا تو تمہیں مل کر رہے گی اور تمہاری سزا یہ ہے کہ.....“ میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو جمورا کا مارے خوف کے برا حال ہو گیا۔ میں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”میں تنویر جٹ سے ملاقات کرنے اس کے گھر پر جا رہا ہوں، اس دوران میں تم ہمارے گھوڑوں کی خدمت پر مامور ہو گے۔ ان کا پوری طرح خیال رکھو گے اور ان کے لیے چارے پانی وغیرہ کا بندوبست بھی کرو گے جس طرح انسانوں کے لیے تم چائے پانی کا انتظام کرتے ہو..... بات سمجھ میں آئی کہ نہیں؟“

”آئی جی، آئی.....“ وہ جلدی سے سر کو اثبات میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”سمجھ میں آپ کی بات آئی اور جان میں میری جان آئی۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ میں آپ کے گھوڑوں کو نہلاؤں اور کھلا پلا کر ایک دم تازہ کر دوں گا۔“

پر آئے تھے اور نہ ہی آج آئیں گے۔“

”ڈرائیج“ کا لفظ نشی نے توخیر جٹ کے لیے استعمال کیا تھا۔ جس طرح کشمیری قوم کی بہت ساری اقسام ہیں مثلاً میر، راجا، بٹ، رانخور، ڈار، ملک..... اسی طرح جٹ قوم کی بھی ڈھیروں اقسام ہیں جن میں ڈرائیج بھی شامل ہے۔ میں نے نشی کو جوہر ای جتی دال آمد کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کرنا ضروری نہ سمجھا اور اس کے منگوائے ہوئے تانگے میں بیٹھ کر توخیر جٹ کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔

توخیر جٹ کا گھر جتی وال کے وسط میں واقع تھا۔ یہ ایک عالی شان رہائش گاہ بھی جہاں خدمت کے لیے نوکر چاکر بھی موجود تھے۔ ایک ملازم نے ہمیں سیدھا توخیر جٹ کے پاس پہنچا دیا۔ اپنی سینٹنگ کے اعتبار سے وہ کمر ایک بیڈروم تھا۔

توخیر جٹ بھاری تن و توش کا مالک ایک دینگ انسان تھا۔ وہ ایک کشادہ بیڈر گاؤنکے سے یک لگائے نیم دراز تھا۔ میرے مختار اندازے کے مطابق، اس کی عمر پچاس اوڑھپین کے درمیان ہوگی۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے پرتپاک نظر سے ہمارا استقبال کیا۔ میں نے بہ آہستگی توخیر جٹ سے مصافحہ کیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کاشٹیل اشفاق نے بھی میری تقلید کی۔

ہمارے درمیان رکی علیک سلیک کا مرحلہ طے ہو گیا تو اس نے ملازم سے کہا۔ ”جاؤ، جلدی سے ملک صاحب کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ملک صاحب یہاں تشریف لائے ہیں۔“

توخیر جٹ کے لہجے سے بیزاری اور نفرت چھٹی تھی۔ نشی الیاس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ پچھلے دو دن سے دکان پر بھی نہیں گیا تھا۔ اسی تناظر میں، میں نے منگوا کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”ڈرائیج صاحب! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ میں نے سنا ہے، آپ دو دن سے منڈی بھی نہیں جا رہے!“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

”آپ نے کہاں سے سن لیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں؟“ وہ خاصا ہوشیار آدمی تھا جو اس نے میری بات کو پکڑ لیا تھا۔ میں نے بڑی رساں سے جواب دیا۔ ”آپ کے نشی محمد الیاس نے مجھے آپ کی طبیعت کے بارے میں بتایا ہے۔ ہم ابھی منڈی ہی سے آ رہے ہیں اور آپ کا ملازم جوہر ہمارے کھوڑوں کی منگی چالی کر رہا ہے۔“

”اوہ.....!“ اس نے چونکا نظر سے مجھے اور کاشٹیل کو باری باری دیکھا۔ ”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ ار وقت کا سرکار پر نکلے ہوئے ہیں؟“

”آپ کا اندازہ درست ہے ڈرائیج صاحب۔“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ”میں ایک بندے کے بارے میں ضروری معلومات لینے آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”کون بندہ؟“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”پہلے آپ اپنی طبیعت کا سنائیں۔“ میں نے کہا۔

”بندے کے بارے میں بعد میں بات کریں گے۔“

”بس جناب، کیا بتاؤں.....“ وہ بیزاری سے بولا۔

”دانت کی تکلیف نے جان عذاب کی ہوئی ہے۔ کل کا پورا دن تو تیز بخار بھی رہا ہے۔ آج طبیعت قدرے بہتر ہے۔ میں نے سوچا ایک دن اور آرام کر لوں۔ کل سے دکان پر جاؤں گا۔“

”آپ کو تو پتا ہی ہے کہ دانت کا درد کتنا ظالم ہوتا ہے.....؟“

”جی..... بہت ظالم۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”ایک میڈیکل ریسرچ کے مطابق، انسان کے لیے ناقابل برداشت اور جھپٹ نکلوا دینے والے درد کی فہرست میں دانت کے درد کو دوسری پوزیشن حاصل ہے۔“

”اوہ.....!“ توخیر جٹ نے ایک گہری سانس خارج کی اور دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”پہلا نمبر کون سے درد کا ہے؟“

”پہلے نمبر پر دل کا درد ہے یعنی ہارٹ پین۔“ میں نے بتایا۔ ”دوسرا نمبر دانت کے درد کا ہے۔ تیسرے نمبر پر دو قسم کے درد بتائے جاتے ہیں۔ اول، دردِ شقیقہ یعنی آدھے سر کا درد یا میگکریں۔ دوم دردِ زہ یعنی ڈیپ یوری پین۔ اس کے بعد مختلف قسم کے دوسرے درد آتے ہیں۔“

”ماشاء اللہ.....!“ وہ تقریبی انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی میڈیکل کی معلومات تو زبردست ہیں۔“

”ہر نوعیت کی معلومات رکھنا پڑتی ہیں ڈرائیج صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”تھانے داری کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آپ بتائیں، آپ کے دانت میں کس طرح کی تکلیف ہے۔“

”ایک ڈاڑھ کھوکھلی ہو چکی ہے اور اپنے برابر والی دوسری ڈاڑھ کو بھی متاثر کر رہی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”آپ کے ذہن میں میرے مسئلے کا کوئی حل ہے؟“

”علاج دندان، اخراج دندان!“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

جناب مگر جمہور نے کبھی میری بات پر توجہ نہیں دی.....“
میں نے ابھی تک تصویر جٹ کے سامنے رقم کا ذکر نہیں کیا تھا اور وہ بتا رہا تھا کہ جمہور کے پاس ابھی خاصی رقم موجود تھی۔ صغیہ نے مجھے بتایا تھا کہ جمہور، تصویر جٹ سے ایک ہزار روپے ادھار لینے گیا تھا۔ میں نے اپنے اطمینان کی خاطر پوچھ لیا۔
”جمہور کی بیوی سے پتا چلا ہے کہ وہ آپ سے کچھ رقم لینے آیا تھا۔ آپ نے اسے کتنے پیسے دیے تھے؟“
”پورے دو ہزار روپے۔“ اس نے غصے سے انداز میں جواب دیا۔

تصویر جٹ کے جواب نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔ ”کیا واقعی وہ آپ سے دو ہزار روپے لے کر گیا تھا؟“
”میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا ملک صاحب۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”جمہور مجھ سے جتنی رقم لے کر گیا ہے، میں وہی بتا رہا ہوں۔“
”لیکن صغیہ کا کہنا تو یہ ہے کہ جمہور آپ کے پاس ایک ہزار روپے لینے آیا تھا؟“

”وہ بھی غلط نہیں کہہ رہی۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔
”یہ کیا بات ہوئی وڑائچ صاحب؟“
”بات یہ ہوئی ملک صاحب کہ.....“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جمہور آیا تو ایک ہزار لینے ہی تھا لیکن میں نے زبردستی اسے دو ہزار دے دیے تھے۔“
”وڑائچ صاحب! آپ نے تو بات کو اور زیادہ الجھا دیا ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
”اس ”زبردستی“ کا سبب بتانا پسند کریں گے؟“

”جی ضرور۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جمہور نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ادھر نجیب آباد میں مشتاق مہر سے زمین کا ایک ٹکڑا خریدنا چاہتا ہے۔ مشتاق مہر مذکورہ اراضی کے ڈیڑھ ہزار روپے مانگ رہا تھا۔ جمہور کے پاس پانچ سو روپے رکھے ہوئے تھے اور وہ ایک ہزار روپے مجھ سے ادھار لینے آیا تھا.....“

”یہ ساری باتیں صغیہ مجھے بتا چکی ہے۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

”اب جو میں بتانے والا ہوں، وہ بھی سن لیں سرکار۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے وہ قطعہ اراضی دیکھ رکھا ہے، جمہور جسے خریدنے کی بات کر رہا تھا۔ میری ساری زندگی زمین داری میں گزری ہے ملک

”مطلب یہ کہ میں اس کھوکھلی ڈاڑھ کو نکلوا دوں.....؟“ اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔
”ملک صاحب! ان باتوں سے دیرینہ تعلق ہے میرا.....“
میں نے کہا۔ ”تعلق روگ بن جائے تو اسے توڑنا اچھا۔“
”یہ غور کروں گا۔ فی الحال تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میرے پاس تشریف لائے ہیں؟“
اس دوران جٹ کے ملازم نے ہماری خاطر مدارات میں پوری ٹیبل سجادی تھی۔

”جمہور کے بارے میں۔“ میں نے جواب دیا۔
”جمہور کو تو آپ اپنے گھوڑوں کی دیکھ رکھ پر لگا آئے ہیں!“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔
”میں اس جمہور کی نہیں بلکہ اُس جمہور کی بات کر رہا ہوں وڑائچ صاحب۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ جمہور پچھلی فروش جو قصبہ نجیب آباد کا وینک ہے اور آپ کا دوست بھی ہے۔ وہ پروس مورخ تین اپریل آپ سے ملنے موضع جٹی وال آیا تھا..... آیا تھا یا نہیں؟“
”بالکل آیا تھا جناب۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس نے پورے پانچ گھنٹے میری دکان پر گزارے تھے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھایا تھا پھر ہمارے بیچ مختلف امور پر بات چیت ہوئی رہی تھی۔ وہ چار بجے یہاں سے رخصت ہو گیا تھا.....“
”لحالی توقف کر کے اس نے تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھا پھر پوچھا۔
”آخر ہو کیا ہے؟ سب خیریت تو ہے نا؟“

”اگر خیریت ہوئی تو پھر مجھے نجیب آباد سے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی وڑائچ صاحب۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا دوست تین اپریل کی سہ پہر چار بجے آپ کے پاس سے رخصت تو ہو گیا تھا لیکن ابھی تک وہ نجیب آباد نہیں پہنچا۔ میں اسی کی تلاش میں جٹی وال آیا ہوں۔ اس کی بیوی صغیہ اپنے خاوند کی پر اسرار کشمکش پر سخت پریشان ہے۔“

”یہاں سے تو وہ بیچ سلامت رخصت ہوا تھا۔“ وہ متفکر انداز میں بولا۔ ”اس کے پاس تو ابھی خاصی رقم بھی تھی۔ کہیں وہ کسی ڈاکو یا راجزن کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا؟“
تصویر جٹ کی تشویش بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ”میں نے اسے کئی بار سمجھا یا تھا کہ وہ اپنا پیدل چلنے کا شوق صاف ستھرے علاقے میں پورا کر لیا کرے۔ اس گھنے جنگل میں تن جہا سفر کرنا اور وہ بھی پیدل، خطرے سے خالی نہیں ہے

صاحب۔ زمین کا وہ کھڑا کسی بھی طرح تین ہزار روپے سے کم کا نہیں ہے اور میں مشتاق مہر کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس بندے نے زندگی بھر نقصان کا سودا نہیں کیا پھر وہ زمین کا مذکورہ کھڑا آدمی قیمت میں کیونکر فروخت کر سکتا ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر..... وہ سانس بھرا کر کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے جمورا کو ایک کے بجائے دو ہزار روپے زبردستی دے دیے تھے تاکہ زمین کا سودا کرتے ہوئے اسے کوئی پریشانی نہ ہو۔“

”آپ نے تو بڑی عظمندی کا ثبوت دیا تھا ورنہ صاحب لیکن جمورا گھر پہنچا اور نہ ہی آپ کے دیے ہوئے دو ہزار روپے۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا یہاں جتنی وال میں کسی کو یہ بات معلوم تھی کہ جمورا آپ سے دو ہزار روپے لے کر جا رہا تھا؟“

”قطعاً نہیں ملک صاحب!“ وہ دونوں کے انداز میں بولا۔ ”یہ معاملہ صرف میرے اور جمورا کے بیچ میں تھا حتیٰ کہ میرے قریبی الیاس کو بھی اس رقم کی کوئی خبر نہیں۔ یہ پیسے میں نے جمورا کو اپنی جیب خاص سے دیے تھے۔“

”ہوں.....“ میں نے گھبراہٹ میں کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ جتنی وال سے کوئی بندہ جمورا کے تعاقب میں نہیں کیا تھا.....!“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ملک صاحب۔“ وہ پُر دھڑکن انداز میں بولا۔ ”مجھے تو یہ سیدھی سیدھی ڈاکوؤں کی کارروائی لگتی ہے۔ کیا آپ نے جنگل کو چیک کیا ہے؟“

”میں نے جتنی وال کا قصد کرنے سے پہلے ایک متلاشی پارٹی کو جنگل والے حصے کا کونا کونا چھان مارنے کی ہدایت کے ساتھ جنگل کی جانب روانہ کر دیا تھا۔“ میں نے تنویر جٹ کو بتایا۔ ”اس پارٹی میں ایک تجربہ کار کھوجی بھی شامل ہے۔ اگر جمورا کے ساتھ جنگل کے اندر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہے تو شام تک اس کا پتا چل جائے گا۔“

”ان شاء اللہ.....!“ وہ غلوں بھرے انداز میں بولا۔ ”جمورا خیریت ہی سے ہوگا۔“

جمورا کے لیے تنویر جٹ کی فکر مندی اور پریشانی میں مجھے کوئی کھوٹ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ جمورا کا بچا اور تخلص دوست تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وڑناج صاحب! جمورا کی تلاش کے سلسلے میں آپ مجھ سے کیا تعاون کر سکتے ہیں؟“

”جو آپ کا حکم ہو!“ اس نے بال کو میری کورٹ میں پھینک دیا۔

میں نے کہا۔ ”آپ اپنے چند قابل اعتماد افراد پر مشتمل ایک ٹیم تشکیل دیں اور انہیں جمورا کی تلاش میں جتنی وال اور اردگرد کے گاؤں دیہات کی جانب روانہ کر دیں۔“

”آپ فکر نہ کریں ملک صاحب! یہ کام آج ہی ہو جائے گا۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”جمورا میرا بہت سچا دوست ہے۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ وہ جلد از جلد بازیاب ہو جائے۔“

”جمورا کی تلاش کا سلسلہ تو آپ پہلی فرصت میں شروع کرادیں۔“ میں نے گھبراہٹ میں کہا۔ ”اس کے علاوہ آپ مجھے یہ بھی بتائیں کہ یہاں جتنی وال میں جمورا کی کسی سے کوئی دشمنی تو نہیں تھی؟“

”جمورا اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک سیدھا سادہ انسان ہے ملک صاحب۔“ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ”اسے دشمن اور دشمنی پالنے کا بھی شوق نہیں رہا۔ میں جتنی وال میں اس کے کسی دشمن سے واقف نہیں ہوں۔“

”اور وہاں نجیب آباد میں.....؟“

”وہاں بھی جمورا کا کوئی دشمن میرے علم میں نہیں ہے۔“

”جیلا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ میں نے جیسے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”وہ چند لمحات تک ٹوٹی ہوئی نظر سے مجھ دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”جیل عرف جیلا جمورا کا چھوٹا بھائی ہے۔“

”یہ بات میں بھی جانتا ہوں۔“ میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”کیا جیلا، جمورا کی گمشدگی میں ملوث ہو سکتا ہے؟“

”یہ بات آپ کسی خاص بنا پر کہہ رہے ہیں؟“ اس نے اٹھا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں نے کہا۔ ”میں نے صفحہ کے رویے میں جیلا کے لیے ایک خاص نوعیت کی سردمہری بلکہ نفرت دیکھی ہے اور کم و بیش اسی درجے کی عداوت اور ناپسندیدگی جیلا کے انداز میں بھی پائی جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔“

”دونوں بھائیوں میں کافی عرصے سے ناراضی اور چپقلش چل رہی ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ان کا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا بھی نہیں ہے۔“

”آپ کو اس ناراضی اور چپقلش کا سبب بھی معلوم

بہترین تحریریں، لا جواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت
ماہنامہ کراچی

شمارہ اکتوبر 2017ء
کی جھلکیاں

علامہ ابن جوزی

اس عالم دین کا تذکرہ جس کا قلم
ہر ایک کے لیے رہنما تھا

راشدی برادران

سندھ کے دو پہیوں جن پر ادب کو ناز ہے

دھرتی کا بوجھ

جنگ زدہ عراق سے درآمد ایک عجیب سی روداد

آواز کا جادوگر

جہاں جہاں اردو بولی جاتی ہے
وہاں وہاں اس کی شہرت ہے

راہتی

ایک ایسی سچ سیانی جسے پڑھ کر
آپ حیران رہ جائیں گے

شمال سے ٹورنٹو

جیسا دلچسپ سفر نامہ
لہورنگ طویل قصہ ”ناسور“

کے علاوہ بھی

بہت سی سچ بیاباں دلچسپ
سچے قصے اور تاریخی واقعات

ہوگا؟“ میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔

”دراصل، جیلا اور جمہور کے مزاج اور عادات
واطوار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“ وہ سادہ سے لہجے
میں بولا۔ ”جب تک ان کے ماں باپ زندہ تھے، کسی نہ کسی
طور پر وہ رہا تھا۔ پھر ایسی جدائی پڑی کہ وقت گزرنے کے
ساتھ ساتھ بڑھتی ہی چلی گئی۔“

”آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش تو نہیں
کر رہے؟“

”نہیں تو۔۔۔“ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ ”آپ کو
ایسا کیوں محسوس ہوا؟“

”میں نے جیلا اور جمہور کے بیچ جدائی کے اسباب
تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔“ میں نے تویر
جٹ کے چہرے پر نگاہ جاتے ہوئے کہا۔ ”اور مجھے پتا چلا
ہے کہ ایک ناخوشگوار واقعے کی وجہ سے دونوں بھائیوں کے
درمیان اتنے طویل فاصلے پیدا ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ ورنہ پہلے تو
جیلا کا جمہور کے گھر بہت آنا جاتا تھا۔“

اس نے بڑے محاط انداز میں استفسار کیا۔ ”کون سا
ناخوشگوار واقعہ ملک صاحب؟“

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں تویر جٹ
کو اس واقعے سے آگاہ کر دیا جو جیلا کی زبانی مجھ تک پہنچا
تھا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور کہا۔

”یہ واقعہ جمہور نے مجھے سنایا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ
جیلا بکواس کرتا ہے۔ مافیہ ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کر
سکتی۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ جیلا نے موقع پا کر مافیہ سے دست
درازی کی کوشش کی ہو اور جب مافیہ نے اپنی عزت کے
تحفظ کے لیے شور شرابا مچایا ہو تو جیلا نے اپنا دامن بچانے
کے لیے مافیہ کو مورد الزام ٹھہرا دیا ہو بلکہ۔۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں،
ایسا ہی ہوا تھا۔“

تویر جٹ کے جواب سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ
مافیہ کو سچا اور جیلا کو جھوٹا سمجھتا تھا، یعنی اس کی ساری ہمدردی
مافیہ کے ساتھ تھی۔

”گویا آپ کی نظر میں جیلا صاف کردار کا مالک نہیں
ہے؟“ میں نے کہا۔ ”اس کی بکواس پر تو جیلا نے دینا چاہیے؟“
”میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں ملک صاحب۔“ وہ مختصراً

انداز میں بولا۔

جیلا کے حوالے سے تویر جٹ کے خیالات سے مکمل
آگاہی حاصل کرنے کے بعد میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ
اسے بتاؤں کہ میں نے جیلا کو جنگل کی جانب جانے والی

چھاپا بار پارٹی میں شامل کر رکھا ہے اور..... یہ کہ جیلا کے خیال میں، جھورا کی گمشدگی میں صفیہ کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ جیلا کے حق میں کی گئی میری کسی بات کا بھی تئویر جٹ پر مثبت اثر نہیں ہوگا۔ وہ اس حوالے سے ایک مخصوص ذہن بنا چکا تھا۔ میں نے اس کے جواب کی روشنی میں کہا۔

”اگر آپ کی نگاہ میں جیلا قابل بھروسہ نہیں ہے تو پھر کیا جھورا کی گمشدگی کے سلسلے میں اس پر بھی شک کیا جاسکتا ہے؟“

”میں سمجھتا ہوں، جیلا اس حد تک نہیں جاسکتا۔“ وہ پُر سوچ انداز میں بولا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ دونوں بھائیوں کے بیچ رنجشوں اور تنازعات کے انبار لگے ہوئے تھے مگر اسے دشمنی نہیں کہا جاسکتا۔ میں نے ایسے آثار نہیں دیکھے جن کی بنیاد پر میں ان دونوں کے درمیان کسی سنگین دشمنی کی تصدیق کر سکوں۔“

دس پندرہ منٹ مزید گفتگو کے بعد میں نے کہا۔

”وڑائچ صاحب! آپ کے تعاون کا بہت شکریہ۔ اپنی بیماری کے باوجود بھی آپ نے مجھے اتنا وقت دیا۔ اب اجازت چاہوں گا۔“

وہ اصراری لہجے میں بولا۔ ”آپ دوپہر کا کھانا

کھا کر جائیں ملک صاحب۔“

”کھانا آپ کا مجھ پر قرض رہا۔“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”پھر کبھی چنی وال کا چکر لگا تو کھانا آپ کے گھر پر ضرور کھاؤں گا۔ فی الحال کا سرکار زیادہ اہم ہے۔“

”ضرور، ضرور..... کیوں نہیں۔“ وہ بڑی محبت اور اہمیت سے بولا۔ ”آپ کا جب جی چاہے، چنی وال تشریف لائیں۔ میرے دل اور گھر کے دروازے آپ کو ہمیشہ کھلے ملیں گے۔“

الوداعی مصافحہ کرنے کے بعد ہم اس کے گھر سے نکل آئے۔

☆☆☆

میرے تھانے پہنچنے سے پہلے اے ایس آئی جہاں زیب شیخو پورہ سے لوٹ آیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں جا کر بیٹھا تو وہ میرے پاس آ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا رپورٹ ہے؟“

”ماسٹر عنایت کو لے آیا ہوں ملک صاحب۔“ اس نے بتایا۔

”اتنی دیر کہاں لگ گئی؟“ میں نے استفسار کیا۔

”تمہیں تو کل رات ہی کو واپس آنا تھا؟“

”میں ضرور کل ہی واپس آ جاتا اگر یہ بندہ مجھے مل گیا

ہوتا۔“ اس نے کہا۔ ”میں ڈھونڈتا ڈھونڈتا اس کے گھر پہنچا تو پتا چلا کہ یہ اپنی بیٹی سے ملنے دوسرے محلے گیا ہوا ہے۔ میں اس کے تعاقب میں دوسرے محلے پہنچا تو معلوم ہوا، یہ اپنی دوسری بیٹی کی طرف نکل گیا ہے۔ میں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور ایک گھر سے دوسرے گھر میرا سفر جاری رہا اور جب یہ اللہ کا بندہ ہاتھ لگا تو رات ہو چکی تھی۔ یہاں آنے کے لیے اس وقت کوئی بس نہیں مل سکتی تھی اس لیے میں ادھر شیخوپورہ ہی میں اپنی ایک خالہ کے گھر رک گیا تھا۔“

اے ایس آئی اپنی کارگزاری کی رپورٹ پیش کر چکا تو میں نے کہا۔ ”تم نے ابھی جس اللہ کے بندے کا ذکر کیا ہے اس نے تو اپنے خاندان کو چھاپا پھیلارکھا ہے!“

”جی جناب.....“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ماسٹر عنایت نے تین شادیاں کی تھیں اور اس کی پندرہ اولادیں ہیں۔ پانچ بیٹے اور دس بیٹیاں لیکن اس بے چارے کو اولاد کا سکہ نہیں مل سکا۔ بیٹیاں تو پرایا دھن ہوئی ہیں ملک صاحب۔ ماسٹر عنایت کی دس کی دس بیٹیاں شادی شدہ ہیں اور اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں مگر اس کے بیٹے گستاخ اور ناخلف نکلے ہیں۔ سب کے سب شادی شدہ اور وزن مرید۔ اسی لیے وہ بے چارہ در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔“

”اور اس کی تین بیویاں؟“ اے ایس آئی کی بات پوری ہونے سے پہلے میں نے پوچھ لیا۔ ”وہ ان کے پاس کیوں نہیں رہتا؟“

”وہ ایک ایک کر کے سب اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”بے چارہ بہت دگمی ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ وہ ایک جگہ تک گرنے نہیں رہتا۔ چند ماہ کہیں تو چند ماہ کسی اور جگہ۔ نجیب آباد میں آباد ہوئے اسے صرف دو ماہ ہوئے ہیں۔ فیکا درزی کے ساتھ اس کا دل یوں بھی لگ گیا ہے کہ کسی زمانے میں اس نے بھی ٹیلرنگ کا کام کیا تھا اسی لیے اس کے نام کے ساتھ ”ماسٹر“ لگا ہوا ہے۔“

”تم ماسٹر عنایت کو لے ہی آئے ہو تو ذرا مجھے بھی اس کا دیدار کرادو۔“ میں نے کہا۔

”جی ضرور.....“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ایک منٹ کے بعد ماسٹر عنایت میرے سامنے حاضر تھا۔ ماسٹر عنایت کی عمر پچاس سے ستادہ تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور کمزور سا انسان تھا۔ اے ایس آئی نے مجھے اس کی جودھ بھری کہانی سنائی تھی وہ بالکل ویسا ہی نظر بھی آتا تھا۔ اگر اولاد کی جانب سے انسان کو سکہ نہ ملے تو اس کی یہی حالت

ہو جاتی ہے۔ میں نے پندرہ بیس منٹ تک ماسٹر عنایت کو اپنے

سوالات کی پاڑ پر رکھا لیکن میرے پیش درانہ تجربے نے

مجھے بتا دیا کہ کسی بھی حوالے سے جمہور کی کشدگی میں اس کا

ہاتھ نہیں تھا۔ اس نے جمہور کے ساتھ ”مچلی“ والا جو سین کیا

تھا، اس نوعیت کی دل جلانے والی اوٹ پٹانگ حرکتیں وہ

اکثر لوگوں کے ساتھ کرتا رہتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں، وہ اولاد

خصوصاً اپنے بیٹوں کے رویے کی وجہ سے جن صدمات سے

گزر رہا تھا، اس میں انسان کی ذہنی کیفیت ایسی ہی ہو جاتی

ہے۔ وہ جان بوجھ کر کسی کو تار چر نہیں کرتا تھا۔ بس، مسلسل

ملنے والے دھکوں کی وجہ سے یہ اس کا اسٹائل بن گیا تھا۔

میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی کیونکہ مجھے یقین

ہو گیا تھا کہ جمہور کی کشدگی میں وہ ملوث نہیں ہے بلکہ جب

اسے پتا چلا کہ جمہور اودوں سے غائب ہے تو اس کے چہرے

پر افسردگی اتر آئی۔ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے

اس نے کہا۔

”کاش! میرے پانچوں بیٹے بھی جمہور کی طرح

ہوتے.....!“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے چونک کر اس کی

طرف دیکھا۔

”کیا بتاؤں جی.....!“ وہ خیالوں میں کھو گیا۔

میں نے کہا۔ ”اس وقت جو بھی ذہن میں ہے، سب بتا دو۔“

”جمہور بڑا ہی بی بی..... بہت فرمانبردار بندہ تھا

تھانے دار صاحب۔“ وہ خوابناک لہجے میں بولا۔ ”میں جیسے

جیسے کہتا گیا، وہ چپ چاپ کرتا چلا گیا۔ کاش، میرے بیٹے

بھی جمہور جیسے فرمانبردار اور عمل مزاج ہوتے.....!“

ماسٹر عنایت اس وقت جس ذہنی کیفیت سے گزر رہا

تھا، اس میں، میں نے اسے یہ یاد دلانے کی ضرورت محسوس

نہیں کی کہ اس کی حرکت کی وجہ سے بالآخر جمہور کی عمل

مزاجی اور فرمانبرداری کی انتہا کر دی تھی اور اس نے مجبور

ہو کر صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا اور بے قابو ہو کر

اس پر جھپٹ پڑا تھا۔

اے ایس آئی کو میں نے ماسٹر عنایت کے جانے کے

بعد اپنے کمرے میں بلایا اور تازہ ترین حالات پر اس سے

گفتگو کرنے لگا۔ میں نے اسے اپنے دورۂ چنی وال کی

تفصیل سے بھی آگاہ کیا۔ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”میں تو رپورٹ کی بات سے متفق ہوں ملک صاحب۔“

”مطلب تم بھی یہی سمجھتے ہو کہ جمہور کے ساتھ جنگل

میں کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس

کی طرف دیکھا۔

”فی الحال..... اور کوئی وجہ بھی تو نظر نہیں آ رہی۔“ وہ

ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جمہور اپنی وال سے دو ہزار

روپے لے کر روانہ ہوا اور پھر وہ نجیب آباد نہیں پہنچا۔ نجیب

آباد اور چنی وال کے درمیان تو جنگل ہی جنگل ہے ملک

صاحب..... گھنا جنگل!“

”اسی گھنے اور خطرناک جنگل میں، میں نے ایک

متلاشی ٹیم کو روانہ کر رکھا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور مجھے امید

ہے کہ وہاں سے کوئی اچھی خبر آئے گی۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں

بولا۔ ”ویسے جمہور کی تلاش کے سلسلے میں ہمیں نجیب آباد کو

بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔“

اے ایس آئی نے اگرچہ ایک عام سی بات کی تھی

لیکن میں اس کی بات سن کر چونک اٹھا تھا۔ میں نے کہا۔

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو جہاں نجیب۔“ نجیب آباد

کوئی زیادہ بڑا قصبہ نہیں۔ میں یہ کام تمہارے ذمے لگا تا

ہوں اگر تم ٹھکے ہوئے نہ ہو تو.....!“

”جھکن کا کیا ہوا! ملک صاحب۔“ وہ ہشاش بشاش

لہجے میں بولا۔ ”رات بھر میں نے ادھر خالہ کے گھر میں

آرام ہی کیا ہے۔“

”تو پھر تم نجیب آباد کے سروے پر نکل جاؤ۔“ میں

نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”ذرا گھوم پھر کر لوگوں سے پوچھو۔

شاید کسی نے تین اپریل کی شام جمہور کو قصبے میں دیکھا ہو۔

ویسے اس بات کا امکان تو نظر نہیں آتا کہ جمہور نجیب آباد

پہنچا ہو لیکن پھر بھی تفتیش کا تقاضا یہی ہے کہ ہمیں اس پہلو کو

بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔“

اے ایس آئی مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد کاشمیلر الطاف کی ٹیم جنگل سے

واپس آ گئی۔ اس ٹیم میں الطاف کے علاوہ کھوجی تاج دین

عرف تاجو چاچا، کاشمیلر جنید خان اور جمہور کا چھوٹا بھائی

جیلا شامل تھے۔ ان کی واپسی کا سب سے افسوسناک پہلو یہ

تھا کہ وہ لوگ جنگل سے ناکام و نامراد لوٹے تھے۔ کاشمیلر

الطاف نے مجھے بتایا۔

”ملک صاحب! ہم نے نجیب آباد سے لے کر چنی

وال تک پھیلنا ہوا سارا جنگل چھان مارا ہے لیکن ہمیں جمہور

کا کوئی سراغ نہیں ملا حتیٰ کہ ہم نے شمالاً جنوباً پتہ والی بڑی

نہر کے کنارے میلوں تک دیکھے ہیں۔“

وہ اپنی بات ختم کر چکا تو میں نے پوچھا۔ ”جیلا نظر نہیں آ رہا۔ اسے کہاں چھوڑ آئے ہو؟“

”وہ ہمارے ساتھ ہی نجیب آباد پہنچا تھا۔“ الطاف نے بتایا۔ ”وہ اپنے گھر گیا ہے۔ کہہ رہا تھا، بہت تھک گیا ہوں۔ اگر میری ضرورت ہوئی تو میں تمہانے آ جاؤں گا ورنہ گھر میں آرام کروں گا۔“

میں نے الطاف سے پوچھا۔ ”کیا تم نے جمہور کی تلاش کے دوران میں جیلا پر گہری نظر رکھی تھی؟“

”جناب! میں آپ کے حکم کو کیسے بھول سکتا تھا.....!“

”پھر اس کڑی نگرانی کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟“

”جناب! میں نے تو یہی محسوس کیا ہے کہ جیلا کسی بھی حوالے سے اپنے بڑے بھائی کی گمشدگی میں ملوث نہیں ہے۔“

”گویا تم لوگوں کی رپورٹ یہ ہے کہ جمہور جنگل میں کہیں نہیں ہے؟“

”جی..... ہماری تحقیق تو یہی کہتی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”جمہور تین اپریل کی سہ پہر چار بجے جتنی وال سے نجیب آباد کی طرف پیدل روانہ ہوا۔“ میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ”اسے زیادہ سے زیادہ پانچ بجے تک نجیب آباد پہنچ جانا چاہیے تھا کیونکہ میری معلومات کے مطابق وہ کافی تیز چلنے کا عادی ہے مگر وہ اپنے گھر نہیں پہنچا۔ تم بتا رہے ہو کہ گھنے جنگل میں اس کا کوئی نام و نشان نہیں ملا۔ وہ آخر گیا تو کیا کہاں..... کیا اسے زمین نے نگل لیا یا آسمان کھا گیا.....؟“

”تاجو چاچا نے ایک عجیب بات کی ہے۔“ الطاف نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ”جو میرے پلے نہیں پڑی۔“

”وہ عجیب بات مجھے بھی بتاؤ۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”ہو سکتا ہے، میری سمجھ میں آ جائے۔“

”جب ہم یہاں سے روانہ ہوئے تھے تو ہم نے جمہور کی بھوی سے جمہور کا ایک جوتا لے لیا تھا تاکہ تاجو چاچا کو اس کا کھرا تلاش کرنے میں آسانی رہے۔“ کاشیبل الطاف وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”گزشتہ رات چونکہ اچھی خاصی بارش ہوئی تھی لہذا کھوئی چاچا کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔ ایک تو جنگل کی گھاس دار زمین اور اوپر سے وہ بھی بھٹکی ہوئی، ہمیں کہیں بھی جمہور کا کھرا نہیں مل سکا لیکن نہر والے پل کے اس کنارے پر تاجو چاچا کو کچھ ایسے آثار مل گئے جن کی بنا پر اسے شک ہے کہ جمہور نجیب آباد میں داخل ہوا تھا.....“

”اوہ..... یہ تو بڑی خبر ہے۔“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا پھر پوچھا۔ ”تاجو کہاں ہے؟“

”وہ حوالدار اللہ بخش کے پاس بیٹھا گپ شپ کر رہا ہے۔“ کاشیبل نے بتایا۔

”اس سے کہو میں بلارہا ہوں، فوراً میرے پاس پہنچے۔“ میں نے تھکمانہ انداز میں کہا۔ ”گپ شپ بعد میں بھی کی جاسکتی ہے۔“

اگلے ہی لمحے تاجو دین عرف تاجو چاچا میرے سامنے حاضر تھا۔ تاجو ساٹھ کا ہندسہ عبور کر چکا تھا تاہم اس عمر میں بھی اس کی نگاہ سکس بائی سکس یعنی ایک دم شاندار تھی۔ وہ بغیر چشمہ لگائے نزدیک و دور بالکل ٹھیک ٹھیک دیکھ سکتا تھا۔ شاید یہ جوانی میں کھائی ہوئی خالص دیسی غذاؤں اور اصلی کھی کا کمال تھا۔

میرے استفسار پر تاجو چاچا نے بتایا۔ ”ملک صاحب! نہر کے پل سے جو راستہ نجیب آباد کی طرف آ رہا ہے، وہاں میں نے جمہور کے قدموں کے معدوم سے نشانات دیکھے ہیں جس میں آنے اور جانے دونوں طرح کے نشانات شامل ہیں۔“

”اتنی بڑی بات اور تم حوالدار کے پاس بیٹھے کہیں ہانک رہے ہو.....؟“ میں نے شکایتی لہجہ میں کہا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بہ ظاہر تو یہ بات بڑی ہی نظر آرہی ہے لیکن میں نے اسے اس لیے زیادہ اہمیت نہیں دی کہ جس جگہ جمہور کے قدموں کے نشانات ملے تھے، وہاں قریب ہی وہ تالاب ہے جہاں جمہور روزانہ مچھلیاں پکڑنے جاتا تھا۔ میں نے سوچا، شاید یہ جمہور کی گمشدگی سے پہلے کے نشانات ہیں۔“

تاجو چاچا کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اسے تو جانے کی اجازت دے دی لیکن کاشیبل اشفاق کو اپنے پاس بلالیا۔ وہ آج جتنی وال بھی میرے ساتھ گیا تھا۔ اشفاق نجیب آبادی کارہنہ والا تھا۔ وہ میرے پاس پہنچ کر بولا۔

”جی ملک صاحب! حکم کریں؟“

”ہمیں ابھی صغیر سے ملاقات کرنے جانا ہے۔“ میں نے کہا۔

”خیریت تو ہے نا.....؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”ہاں۔ سب خیریت ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”تم نے دیکھا تھا نا، کل صغیر کی کسی بری حالت

”پھر تو گھر کی تلاشی دینے میں تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔۔۔۔۔!“

”جی۔۔۔۔۔ کوئی اعتراض نہیں مجھے۔“ وہ ہمیں راستہ دیتے ہوئے بولی۔ ”آپ اندر آ جائیں۔“

گھر کی تلاشی کا سن کر منیفہ کے چہرے پر جو گھبراہٹ نمودار ہوئی تھی، اس نے چند لمحات کے لیے مجھے انجمن میں ڈال دیا تھا اور مجھے جیلا کے خدشات بچ ہوتے دکھائی دینے لگے تھے لیکن جتنی آسانی سے اس نے ہمیں گھر کے اندر آنے کی دعوت دی تھی، اس سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ جمہور کی گمشدگی کے حوالے سے اس کا دامن صاف ہے۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں پریشانی کے جو آثار ابھرے تھے، وہ اس کی حالیہ ذہنی پریشانی کا عکس بھی ہو سکتے تھے۔ بلاشبہ وہ بڑے نازک حالات سے گزر رہی تھی۔

”یہ معمول کی ایک چھوٹی سی کارروائی ہے۔ تمہیں نے منیفہ کے گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔“ اس لیے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“

”کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ”آپ قانونی تقاضے ضرور پورے کریں۔ جمہور آپ کو اس گھر میں کہیں بھی نہیں ملے گا۔“

منیفہ کے آخری جملے میں بے پناہ اعتماد تھا۔ ایسا اعتماد انسان کے الفاظ میں ایسی وقت پیدا ہوتا ہے جب اسے کسی بات کا صد فیصد یقین ہوتا ہے۔

میں نے منیفہ کی معیت اور لائین کی موجودگی میں گھر کے دونوں کمرے، مہن، باورچی خانہ اور دیگر تمام حصے بھی دیکھ ڈالے لیکن مجھے کسی بھی جگہ پر جمہور یا اس کی موجودگی کے حوالے سے کوئی سراغ نہ ملا۔ ایک اندرونی کمرے کا کچھ حصہ مجھے قدرے گھٹا نظر آیا جیسے وہاں کی زمین کو تازہ تازہ پوتا گیا ہو۔ میں نے کمرے کے فرش کے اس حصے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے منیفہ سے سوال کیا۔

”یہاں کیا ہوا ہے؟“

”میں نے بستروں کی پٹنی کو تھکیٹ کر ایک کونے میں کیا تھا۔“ وہ ایک چھ بانی چارٹ کی جستی پٹنی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”جس کی وجہ سے کچے فرش پر کھرنچے پڑ گئے تھے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے ہی اس اکھڑی ہوئی زمین پر پونچھا مارا ہے جس کی وجہ سے یہ سیلی ہو رہی ہے۔“

منیفہ کا جواب معقول تھا لیکن کسی اندرونی جگہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں آگے بڑھ گیا۔ شاید میری یہ حرکت جیلا

ہو رہی تھی۔ جمہور کی گمشدگی نے اسے پریشان کر رکھا ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جتنی وال سے واپسی پر میں اسے نازہ ترین صورت حال سے آگاہ کروں گا۔ بس، اسی سلسلے میں ہمیں اسے تسلی بخشی دینے جانا ہے۔“

”میں تیار ہوں جی۔“ وہ ریڈ الارٹ انداز میں بولا۔ میں نے اشفاق کے اطمینان کے لیے یہ بات کہہ دی تھی کہ میں منیفہ کو تسلی دینے اس کے گھر جا رہا ہوں ورنہ میرے ذہن میں کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ تاجو چاچانے جو بات بتائی تھی، اس کا ایک مطلب یہ بھی نکالا جاسکتا تھا کہ تین اپریل کی شام جمہور واپس نجیب آباد آیا تھا۔ اس ”مطلب“ کے ساتھ ہی میرے دماغ میں جیلا کے کہے ہوئے الفاظ بھی گردش کر رہے تھے۔۔۔۔۔ تھانے دار صاحب! یہ بڑی خطرناک عورت ہے۔ ہو سکتا ہے، اسی نے بھائی جمہور کے ساتھ کچھ کر دیا ہو۔ آپ کو بھائی کے گھر کی تلاشی لینا چاہیے۔۔۔۔۔!

جب ہم جمہور کے گھر کے نزدیک پہنچے تو مغرب کی اذان... ہو رہی تھی۔ ہم نے جمہور کے دروازے پر دستک دی تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی منیفہ نے اپنے شوہر کے بارے میں استفسار کیا۔ اس کی آواز سے فکر مندی جھلکتی تھی۔

”تھانے دار صاحب! جمہور کا کچھ پتا چلا؟“

میں نے اسے اپنی کارگزاری سے آگاہ کیا اور کہا۔

”میں نے سارا جنگل چھان مارا ہے۔ جتنی وال اور ارد گرد کے گاؤں میں بھی تلاش کر لیا ہے۔ بس، ایک جگہ باقی رہ گئی تھی۔ میں نے سوچا، ذرا اسے لمبی چیک کر لیتا ہوں۔۔۔۔۔“

”کون سی جگہ؟“ اس نے گھبراہٹ آمیز انداز میں پوچھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ”گمشدہ جمہور کا گھر۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔ آپ میرے گھر کی تلاشی لینے آئے ہیں۔۔۔۔۔؟“ وہ خوفزدہ ہو گئی۔ ”جمہور یہاں کیسے ہو۔۔۔۔۔ سکتا ہے۔۔۔۔۔!“

”ہاں۔۔۔۔۔“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔ تم تو ایسے ڈر رہی ہو جیسے تم نے اپنے خاندان کو گھر کے اندر ہی کہیں چھپا رکھا ہے۔۔۔۔۔؟“

”آپ مجھے کیسی باتیں کرتے ہیں۔۔۔۔۔ تھانے دار صاحب!“ وہ قدرے سنپٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اگر جمہور گھر میں ہوتا تو پھر میں اس کے لیے دودن سے ماری ماری کیوں پھر رہی ہوتی۔“

کی اس بات کے زیر اثر تھی کہ ممکن ہے مصنف نے بھائی جھورا کو گھر کے اندر ہی کہیں چھپا رکھا ہو.....!

جستی بھئی میں کوئی تالا وغیرہ نہیں لگا ہوا تھا۔ میں نے بھئی کے قریب پہنچ کر مصنف سے کہا۔ ”اگر تمہیں برانہ لگے تو میں بھئی کے اندر جھانک کر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”اس میں برانے والی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”بھئی کے اندر اترے بھرے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو آپ بھئی کو چیک کر لیں۔ میں لائین سے آپ کو روشنی دکھائی ہوں۔“

بات کے اختتام پر اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لائین کو قدرے بلند کر دیا تھا تاکہ میں آسانی سے بھئی کے اندر والی ماحول کا جائزہ لے سکوں۔ جب سے میں نے تلاشی کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا، لائین مسلسل مصنف کے ہاتھ میں تھی۔ سورج کو غروب ہوئے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے لیکن کمروں کے اندر اندھیرا چھا چکا تھا۔

میں نے اس جستی بھئی کے اندر موجود تمام کپڑوں کو اچھی طرح چیک کر لیا۔ وہاں پر لٹافوں، گدوں اور ٹکیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا یا پھر بستر پر بچھانے والی چند چادریں تھیں گویا اس بھئی میں مکمل طور پر بستر سے ہی بھرے ہوئے تھے۔

میں نے بھئی کو بند کر دیا اور مصنف کے ساتھ کمرے سے باہر آتے ہوئے کہا۔ ”تم فکر نہیں کرو۔ میں بہت جلد جھورا کو ڈھونڈ نکالوں گا۔“

”آپ کو یہ تسلی تو ہوگئی تاکہ میں نے جھورا کو گھر کے اندر کہیں چھپا کر نہیں رکھا ہوا؟“ اس کے استفسار سے گہری شکایت جھلکتی تھی۔

”اگر میرے کسی عمل سے تمہاری دل آزاری ہوئی ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے جو کیا وہ سب تفتیش کا حصہ ہے۔“

”کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ معتدل انداز میں بولی۔ ”میرے لیے یہی بڑے اطمینان کی بات ہے کہ آپ کی نظر میں میرا دامن صاف ہو گیا ہے۔“

میں مصنف کو تسلی دلاسا دینے کے بعد واپس تھانے آ گیا۔

میری واپسی پر اے ایس آئی جہاں زیب بھی تھانے

میں موجود تھا۔ میں نے اس سے رپورٹ طلب کی تو اس نے بتایا کہ پچھلے دو دن سے کسی شخص نے جھورا کو نجیب آباد میں نہیں دیکھا۔

تفتیش کی گاڑی ایک مقام پر آ کر رک گئی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جھورا کہاں غائب ہو گیا۔ ابھی تک کوئی ایسا سراہا تھا نہیں لگا تھا جسے تمام کمر میں جھورا تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

میں نے تمام تفکرات کو ذہن سے جھٹکا اور اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

☆☆☆

کہتے ہیں تار کی چاہے کتنی بھی گہری کیوں نہ ہو، اسے کبھی نہ کبھی روشنی کے سامنے ٹھنڈے ٹینا ہی پڑتے ہیں۔ جیسے ہر رات کے بعد لازمی سر نمودار ہوتی ہے، اسی طرح ہر ابھمن کی کوئی نہ کوئی سلجھن بھی ہوتی ہے۔ میں بھی اپنے کوارٹر میں بستر پر لیٹا اپنی ابھمن کو سلجھانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ دروازے پر ہونے والی دنگ نے مجھے چونکا دیا۔

وہ نصف شب کا عمل تھا۔ میرے تھانے کا عملہ عموماً رات میں مجھے ڈسٹرب نہیں کیا کرتا تھا۔ چھوٹے موٹے معاملات کو وہ لوگ خود ہی نمٹالیا کرتے تھے۔ آدھی رات کو دنگ کا ایک ہی مطلب تھا کہ معاملہ سنگین ہے لہذا میں بستر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔

میں نے صحن عبور کر کے اپنے کوارٹر کا بیرونی دروازہ کھولا تو سامنے شبینہ ڈیوٹی والا ایک کانسٹیبل کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”ملک صاحب! جیلا تھانے میں بیٹھا ہوا ہے۔“ اس نے اضطرابی لہجے میں بتایا۔ ”وہ فی الفور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”مسئلہ کیا ہے؟“

”وہ ہمیں کچھ نہیں بتا رہا.....“ کانسٹیبل نے کہا۔

”کہتا ہے، میں تھانے دار صاحب ہی سے بات کروں گا۔“

”ٹھیک ہے، میں لباس تبدیل کر کے آ رہا ہوں۔“

کانسٹیبل مجھے سلیوٹ کر کے رخصت ہو گیا۔

یونیفارم پہننے کے دوران میں میرا ذہن مسلسل جیلا کے بارے میں ہی میں سوچ رہا تھا۔ کسی اہم معاملے کے ساتھ آدھی رات کو اس کی تھانے میں آمد کا ایک ہی مطلب تھا کہ اس کے پاس اپنے بھائی جھورا کی کشدگی کے حوالے

کواس پر توجہ نہیں دینا چاہیے۔ تو ر جٹ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ عین ممکن ہے، جیلانے صنفیہ پر بھرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی ہو اور ناکامی کی صورت میں اس نے سارا ملایا صنفیہ پر ڈال دیا ہو۔ اگر تو ر جٹ کی رائے کو مستند مان لیا جاتا تو پھر یہ سوچا جاسکتا تھا کہ اس وقت بھی جیلانے کوئی ڈراما رچانے کی کوشش میں تھا۔ اسی امکان کے پیش نظر میں نے اسے وارننگ دی تھی۔

”آپ سختی سے پیش آنے کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ سیدہ ٹھونک کر بولا۔ ”اگر میری اطلاع غلط نکلی تو میں گردن کنوانے کے لیے بھی تیار ہوں۔ میں تو گھبراہٹ کے لیے وہاں ایک بندہ بھی کھڑا کر آیا ہوں۔“

”کیا مطلب ہے جہاز؟“ میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

”جناب! میں نے اپنے ایک دوست طارق کو بھائی جھورا کے دروازے سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا کر دیا ہے۔“ اس نے فخریہ انداز میں بتایا۔ ”تا کہ آپ کے وہاں پہنچنے سے پہلے اگر مشتاق مہر گھر سے باہر نکل آئے تو طارق اسے دبوچ لے۔ میں آپ کی نظر میں جھوٹا ثابت نہیں ہونا چاہتا تھا۔“

جیلانے کے لہجے میں جھلکنا اعتماد اس امر کی گواہی دیتا تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑا سوال تھا کہ آدھی رات کو مشتاق مہر جھورا کے گھر میں اکیلی صنفیہ کے پاس کیا کر رہا تھا؟

اس سوال کے مختلف جواب ہو سکتے تھے..... ممکن ہے، جھورا واپس آ گیا ہو اور مشتاق مہر زمین کی خریداری کے حوالے سے اس سے کوئی بات کرنے آیا ہو۔ یہ بہت کمزور جواب تھا کیونکہ مغرب کے وقت تو میں خود صنفیہ کے گھر کے اندر موجود تھا اور تب تک جھورا کی واپسی نہیں ہوئی تھی اور پھر آدھی رات کو اس نوعیت کی ملاقات کا کوئی جواز بھی نہیں بنتا تھا لہذا میں نے اس امکان کو رد کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا امکان میرے ذہن میں ابھرا..... کہیں صنفیہ اور مشتاق مہر کے بیچ کوئی خفیہ تعلق تو نہیں؟

یہ خاصا خطرناک خیال تھا اور جیلانے کے بیان کردہ واقعات کو تقویت پہنچاتا تھا جس میں صنفیہ کا کردار داغ دار دکھائی دیتا تھا۔ صنفیہ کی ذات کے حوالے سے منی انداز میں سوچتے ہوئے میرے ذہن میں کمرے کا وہ گیلیا فرش تازہ ہو گیا جہاں صنفیہ کے بقول اس نے پونچھا کر رکھا تھا اور صنفیہ نے پونچھے کا جو سب بتایا تھا، وہ اس وقت تو مجھے ہضم ہو گیا تھا

سے کوئی سنسنی خیز اطلاع موجود تھی۔ میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔

مجھ پر نگاہ پڑتے ہی جیلانے کا شاف انگیز انداز میں بولا۔

”آپ کو ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ وہاں چلنا ہوگا.....!“

”کہاں چلنا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”بھائی جھورا کے گھر.....“

”کیوں؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”جھورا کے گھر میں ایسا کیا ہو گیا ہے کہ آدھی رات کو میرا وہاں جانا ضروری ہو گیا.....؟“

”آپ بھی چلیں اور اپنے ساتھ تھوڑی نفری بھی لے لیں۔“ وہ اضطرابی انداز میں بولا۔ ”میں نے چند منٹ پہلے مشتاق مہر کو جھورا کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔“

”آدھی رات کو وہ وہاں کیا کرنے گیا ہے.....!“

میں نے خود کلائی کے انداز میں کہا۔ جیلانے نے مجھے تشویش میں ڈال دیا تھا۔

”تھانے دار صاحب! آپ دیر نہ کریں۔“ وہ جھنجھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ”آج اس کمپنی کو رنگے ہاتھوں پکڑنا ہے۔“

”کمپنی“ کا لفظ اس نے یقیناً اپنی بھابی صنفیہ کے لیے استعمال کیا تھا۔ میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

”یہ مشتاق مہر وہی ہے نا جس سے تمہارا بھائی جھورا کوئی زمین وغیرہ خرید رہا تھا؟“

”جی..... یہ وہی بندہ ہے۔“ وہ نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”آپ باتوں میں وقت ضائع نہ کریں تھانے دار صاحب۔ میں آپ کے سارے سوالوں کے جواب راستے میں دے دوں گا۔“ بات کے اختتام پر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

جیلانے جتنی بڑی اور سنسنی خیز خبر لایا تھا، اگر وہ حقیقت تھی تو پھر واقعاً ایک لمحہ ضائع کرنا بھی حماقت کے زمرے میں آتا۔ میں نے حوالدار اللہ بخش کو ساتھ لیا اور جیلانے کی معیت میں جھورا کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

راستے میں، میں نے جیلانے سے کہا۔ ”اگر تمہاری اطلاع غلط ثابت ہوئی تو میں تمہارے ساتھ بہت سختی سے پیش آؤں گا، یہ بات ذہن میں رکھنا۔“

جیلانے مجھے صنفیہ کی جو کہانی سنائی تھی، تو ر جٹ کی نظر میں وہ ایک پروپیگنڈا سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھا۔ تو ر جٹ کے مطابق، جیلانے اپنی بھابی کو ناپسند کرتا تھا اس لیے وہ اس کے خلاف ایسی سیدھی باتیں کرتا رہتا تھا لہذا اس کی

لیکن اب میرا ذہن کسی اور انداز میں سوچ رہا تھا۔

بستروں والی جستی پٹنی کو کبھی بھی ایسے ہی زمین کے اوپر نہیں رکھ دیا جاتا بلکہ اس کے چاروں کونوں کے نیچے اینٹیں لگائی جاتی ہیں تاکہ پٹنی زمین کی سطح سے تھوڑی اوپر رہے۔ میں نے صفیہ کے گھر کے ایک کمرے کے کونے میں جو جستی پٹنی دیکھی تھی، وہ زمین کے ساتھ لگی ہوئی تھی جیسے عارضی طور پر اسے وہاں رکھ دیا گیا ہو۔ صفیہ کے بیان کے مطابق، اس نے پٹنی کو کھینٹ کر کونے میں کیا تھا جس کی وجہ سے کچے فرش پر کمر وچے سے بڑگئے تھے اور اسے پونچھا لگانا پڑا تھا۔ میرے ذہن نے پیچ کر کہا..... اس پٹنی کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہے.....!

میں جب صفیہ کے گھر کے معائنہ پر تھا تو میں نے مذکورہ جستی پٹنی کو کھول کر اس کے اندر کا تفصیلی جائزہ بھی لیا تھا۔ اس کے اندر رضائیاں، دلائیاں، نیکے اور بستری چادریں وغیرہ بھری ہوئی تھیں۔ مجھے اس پٹنی میں کہیں کوئی گڑبڑ دکھائی نہیں دی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ساری گڑبڑ اسی پٹنی کے نیچے گیلے فرش کے اوپر یا..... گیلے فرش کے نیچے تھی۔

جب انسانی ذہن کو سوچنے کے لیے کوئی مخصوص زاویہ مل جائے تو پھر ہر قسمی خود بہ خود کھلی چلی جاتی ہے۔ میں بھی صفیہ کی ذات کے حوالے سے ایک منطقی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ میرے ذہن کا اخذ کیا ہوا نتیجہ حالات حاضرہ سے لگا کھاتا ہے یا نہیں۔ ہم صفیہ کے گھر کے سامنے پہنچ گئے تو ایک شخص اندھیرے سے نکل کر تیزی سے ہماری جانب بڑھا۔ جیلا نے کہا۔ ”تھانے دار صاحب! یہ طارق ہے جسے میں نے نگرانی کے لیے یہاں کھڑا کر رکھا تھا۔“

طارق ہمارے قریب پہنچا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا مشتاق مہرا بھی تک جیلا کے گھر کے اندر ہی ہے؟“

”جی، تھانے دار صاحب۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”اگر دستک دی تو مشتاق مہر ہوشیار ہو جائے گا۔“ جیلا نے اضطرابی انداز میں کہا۔ ”ہمیں دیوار پھلانگ کر گھر کے اندر داخل ہونا چاہیے ورنہ وہ بد معاش نکل جائے گا۔“ اگرچہ جیلا کی یہ تجویز پر عمل تھی لیکن اخلاقی اعتبار سے اسے موزوں قرار نہیں دیا جاسکتا تھا مگر اس وقت ایک تنہا عزم عورت کے گھر میں مشتاق مہر کی موجودگی اس معاملے کو قابلِ دہل اندازی پوئیس بناتی تھی، خاص طور پر ایک ایسی اکیلی

عورت جس کا گھر والا پچھلے دو دن سے گمشدہ تھا۔ ان حالات میں جیلا کی تجویز پر عمل کرنے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ ”تھانے دار میں ہوں یا تم؟“ میں نے جیلا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ ”ظاہر ہے جی..... تھانے دار تو..... آپ ہی ہیں.....“

”پھر اس بات کا فیصلہ بھی مجھے ہی کرنے دو کہ جمجھور کے گھر میں داخل ہونے کے لیے ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا پھر اس کے چوکیدار دوست کو مخاطب کرتے ہوئے اضافہ کیا۔

”طارق! تم جیلا کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور وہیں اندھیرے میں کھڑے ہو کر انتظار کرو۔ اگر مجھے تم لوگوں کی مدد کی ضرورت ہوگی تو میں آواز دے کر بلا لوں گا۔“

”جی، ٹھیک ہے تھانے دار صاحب۔“ طارق نے فرمانبرداری سے کہا۔ وہ دونوں چلے گئے تو میں نے صفیہ کے دروازے کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔ ”اللہ بخش! تم بہ آہستگی دیوار پھانچ کر گھر کے اندر پہنچو گے اور دروازے کی کنڈی کھول دو گے تاکہ میں بھی گھر میں داخل ہو سکوں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا.....؟“

”جی ملک صاحب! میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ یہ تھیلا پکڑیں، میں دیوار پر چڑھ رہا ہوں۔“

میں نے خوالدار کے ہاتھ سے وہ تھیلا لے لیا۔ مذکورہ تھیلے کے اندر دو ہتھکڑیاں اور کچھ دیگر سامان تھا۔ میں جب مجرموں کی سرکوبی کے لیے میدانِ عمل میں اترتا تھا تو ہر زاویے سے عمل تیاری کر کے تھانے سے نکلتا تھا۔ میرا سر دس رپوالور بھی اس وقت میرے پاس ہی تھا۔ میں ہر قسم کے ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔

وہ پانچ اپریل کی ایک معتدل رات تھی۔ اصولی طور پر چھ اپریل کی تاریخ شروع ہو چکی تھی۔ میری رسٹ وایج ایک بن کر دس منٹ کا وقت بتا رہی تھی۔ رات کے اس پہر مشتاق مہر کی صفیہ کے گھر میں موجودگی ذہن میں سیلاؤں خطرناک سوالات کو جنم دیتی تھی۔ میں نے کسی ایک سوال کے جواب کے لیے بھی اپنے ذہن کو زحمت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ چند لمحات کے بعد میرے ہر سوال کا عملی جواب ”حاضر خدمت“ ہونے والا تھا۔ میں نے جیلا کو دانستہ باہر روک دیا تھا کیونکہ صفیہ اسے سخت

تھا..... تھانے دار صاحب! آج اس کمینے کو رینگے ہاتھوں پکڑتا ہے۔ مجھے صفیہ کے کردار سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میں تو جھوڑا کی بازیابی کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے تھا۔ جس عورت کو اپنے شوہر کی گمشدگی پر بے حد غمزدہ ہونا چاہیے تھا، وہ رات کے اس پہر ایک نامحرم کے ساتھ اپنا منہ کالا کر رہی تھی۔ میرے ذہن نے فیصلہ سنا دیا..... اگر جھوڑا کی گمشدگی کا معما حل کرنا ہے تو صفیہ اور مشتاق مہر پر ہاتھ ڈالنا ہوگا..... ابھی اور اسی وقت.....!

میں نے حوالدار اللہ بخش کو ریڈارٹ ہونے کا اشارہ دیا اور اپنا ہاتھ کمرے کے دروازے کی جانب بڑھا دیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے دروازے پر دستک دی اور کان کو ایک مرتبہ پھر جبری کے ساتھ چمکا دیا۔ دستک کی آواز پر ایک لمحے کے لیے کمرے کے اندر خاموشی چھا گئی تھی۔ میری تمام تر توجہ اندر کے معاملات پر لگی ہوئی تھی۔ اگلے ہی لمحے ایک تشویش بھری مردانہ آواز ابھری۔

”صفیہ! اس وقت تمہارے گھر میں کون آ گیا؟“

”میں تو خود بخیر ان ہوں.....“ صفیہ کے لہجے سے پریشانی مترشح تھی۔

”آ؟“ مردانہ آواز نے استفسار کیا۔

”ہاں مشتاق.....“ صفیہ کی ابھن بھری آواز ابھری۔ ان دونوں کی تشویش بھری گفتگو نے صورت حال کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیا تھا۔ اس کمرے میں آمد و جاہ کا واحد راستہ یہی دروازہ تھا گویا مشتاق مہر کے فرار کے لیے کوئی اور راستہ موجود نہیں تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر دروازے پر دستک دی اور کڑک دار آواز میں کہا۔ ”صفیہ! دروازہ کھول دو۔ تمہارا ڈراما ختم ہو چکا۔“

”مشتاق! یہ تو تھانے دار کی آواز ہے.....“ صفیہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اب کیا ہوگا.....؟“

”تم غم نہ کرو اور جا کر دروازہ کھول دو۔“ مشتاق مہر نے کہا۔ ”یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں یہاں ہوں۔ میں چینی کے اندر چسپ جاتا ہوں۔ تم کسی طرح تھانے دار کو مطمئن کر کے واپس بیٹھ دینا۔ ایک بات ذہن میں رکھو کہ تھانے دار بھی ایک مرد ہے اور تمہارا جین تو بڑے بڑوں کے ہوش اڑا دیتا ہے۔ اگر ضرورت محسوس کرو تو اپنے بدن کی تھوڑی سی سوغات تھانے دار کی خدمت میں بھی پیش کر دینا۔ یہ وقت اور حالات کی مجبوری ہے.....“

ناپسند کرتی تھی۔ جیلا کی وہاں موجودگی سے کوئی بھی بد مزگی پیدا ہو سکتی تھی اور میں ان سسکی خیز لمحات میں کسی بد مزگی کے موڈ میں نہیں تھا۔

حوالدار نے میری ہدایت کے مطابق، گھر کے اندر پہنچ کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ اگلے ہی لمحے میں جھوڑا کے گھر کے اندر تھا۔ یہ مرحلہ چند سیکنڈ میں طے ہو گیا تھا اور ایک ذرا سی بھی آواز یا کھٹکا پیدا نہیں ہوا تھا۔ اندر پہنچنے ہی میں نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔

رات آدمی سے زیادہ مگر زچگی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔ گھر کا صحن خالی تھا۔ ویرانی اور سناٹا میرے پیش نظر تھے۔ ان دنوں موسم میں کافی گرما نش اتر آئی تھی۔ موسم کی مناسبت سے صفیہ کو گھر کے صحن یا پھر برآمدے میں جو ٹینڈ ہونا چاہیے تھا مگر وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ اس صورت حال نے میرے ذہن میں موجود شک کے گھوڑے کو ہمیز کیا اور میں دے دے دموں، گھر کے پچھلے حصے میں بنے کمروں کی سمت بڑھنے لگا۔

میں آج شام میں جھوڑا کے گھر کا تفصیلی معائنہ کر چکا تھا لہذا اس پیش قدمی میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں اور حوالدار اللہ بخش برآمدے میں پہنچ گئے۔ دونوں کمرے ہمارے سامنے تھے جن میں سے ایک کا دروازہ کھلا ہوا تھا جبکہ دوسرے کا دروازہ بند تھا۔ بند دروازے کے پیچھے ہلکی سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ یہ وہی کمرہ تھا جس کے خیمے فرش پر میں نے ایک جستی چینی مشکوک انداز میں رکھی دیکھی تھی۔ کمرے کے اندر یقیناً لائٹیں روشن تھیں جس کی ہلکی سی روشنی دروازے کی درزوں سے چھن کر باہر آ رہی تھی۔

میں نے دروازے کی ایک نسبتاً بڑی جبری سے کان لگا کر اندر کی صورت حال کو بھانپنے کی کوشش کی۔ اگلے ہی لمحے میں چونک اٹھا۔ اندر دو افراد کے دھیمے سروں میں باتیں کرنے کی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ ان میں ایک آواز نسوانی اور دوسری مردانہ تھی۔ میں نے اپنی تمام تر قوت سماعت کو وہ آوازیں سننے اور سمجھنے پر مامور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دماغ سنگ اٹھا۔ کمرے کے اندر سے جس نوعیت کی آوازیں نے میری سماعت تک رسائی حاصل کی، اس سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی وقت محسوس نہ ہوئی کہ صفیہ کمرے کے اندر کسی مرد کے ساتھ شرم ناک حالت میں تھی.....!

وہ فیصلہ کن لمحات تھے۔ کمرے کے اندر صفیہ کے ساتھ یقیناً مشتاق مہر ہی تھا۔ جیلا نے بالکل درست کہا

مہر کو میں نے جی بھر کر اپنے غضب کا نشانہ بنایا پھر گرفتار کر کے تھانے لے آیا۔

وہ دونوں رٹتے ہاتھوں پکڑے گئے تھے لہذا ان کی زبان کھلوانے کے لیے مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ انہوں نے منظور احمد عرف جھورا کے قتل کا اعتراف کر لیا۔ تفصیلات کے مطابق، صفیہ اور مشتاق مہر میں کافی عرصے سے دوستانہ چل رہا تھا اور ان کے معاملات کے حوالے سے جھورا کو کسی حد تک شک بھی تھا۔ انہوں نے جھورا کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے ایک منصوبہ بنایا چنانچہ مشتاق مہر نے تین ہزار کی زمین ڈیڑھ ہزار میں اس کے ہاتھ فروخت کرنے کا لالچ دیا۔ صفیہ نے اپنے آشنا کو بتا دیا تھا کہ جھورا رقم کا بندوبست کرنے اپنے دوست نویر جٹ کے پاس جتنی وال جائے گا۔ پروگرام کے مطابق، جھورا کی واپسی پر مشتاق مہر نے اسے موت کے گھاٹ اتار کر کمرے کے اندر ہی دبا دینا تھا۔ اس مقصد کے لیے مشتاق مہر تین اپریل کو جھورا کی آمد سے قبل ہی گھات لگا کر اس کے گھر میں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد جھورا کے ساتھ جو حالات پیش آئے ہوں گے، اس کا آپ نے جو خوبی اندازہ لگایا ہوگا۔

اسی رات کے آخری پہر میں نے جستی بیٹی کے نیچے والے کپے کیلئے فرش کی کھدائی کر کے جھورا کی لاش کو بھی برآمد کر لیا تھا۔ اس ٹھوس ثبوت نے انہیں اقبال جرم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کا خیال یہی تھا کہ جھورا کی کشتگی کو جنگلی ڈاکوؤں کی کسی بیہمانہ کارروائی کے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا اور وہ دونوں اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو جائیں گے اور ایسا ہوا بھی تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں بھی ڈاکوؤں کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن پھر مشتاق مہر کی بے اعتیالی اور جیلا کی پھرتی نے پاسا پلٹ دیا۔

صفیہ سارا الزام مشتاق مہر کو دے رہی تھی کہ وہ اس کے ورغلانے میں آگئی اور مشتاق مہر کا موقف یہ تھا کہ صفیہ نے اپنے شوہر کو کھٹکانے لگانے کے لیے اسے اپنا مہرہ بنایا اور وہ اس شاطر عورت کے بہکاوے میں آ گیا اور نہ وہ جھورا کی جان لینے کے حق میں نہیں تھا۔

یہ ساری توضیحات، دلائل اور صفائیاں بے سود ہیں۔ صفیہ اور مشتاق مہر کا دوستانہ جھورا کا اصل قاتل تھا۔ اسی زہریلے دوستانے نے ایک معصوم انسان کی جان لے کر اس کے ہتھتے بستے گھر کو جاڑ دیا تھا اور..... اس بربادی میں صفیہ اور مشتاق مہر برابر کے حصے دار تھے۔

(تحریر: حسام بٹ)

”تم دروازہ کھول رہی ہو یا میں اسے توڑ کر اندر آؤں؟“ میں نے گرج دار آواز میں کہا اور ایک بار پھر زوردار دستک دی۔

مشتاق مہر کی باتوں نے میرے تن بدن میں شرارے بھر دیے تھے۔ یہ بندہ بے غیرتی کے آخری درجے پر فائز تھا۔ مجھے تیسری بار دستک نہیں دینا پڑی۔ صفیہ نے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور بے ترتیب لباس کے ساتھ نیند بھری آواز میں بولی۔

”تھانے دار صاحب..... آپ اس وقت..... خیریت تو ہے نا؟“

میں نے ان کی بند کمرے کی گفتگوں لی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ مشتاق مہر اس وقت جستی بیٹی کے اندر چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کمرے میں چاروں جانب نگاہ دوڑانے کے بعد سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔

”دو لہا کہاں ہے؟“

”دو لہا.....“ وہ ابھمن زدہ انداز میں بولی۔ ”آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟“

”میں اس بندے کا ذکر کر رہا ہوں جس کے ساتھ ابھی تمہارا نکاح پڑھایا جائے گا تاکہ ہمیں رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر اس کے ساتھ منہ کالا نہ کرنا پڑے۔“

میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”مشتاق مہر کہاں ہے؟“

میرے آخری جملے نے صفیہ کو لرزاکر رکھ دیا۔ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ”مشتاق..... کون مشتاق؟“

میں نے بے ساختہ اس کے گال پر ایک زنائے دار تھپڑ رسید کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”وہ مشتاق مہر جس کے ساتھ اس وقت تم رنگ لیاں منارہی تھیں.....!“

صفیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولے۔ وہ خوفزدہ نظر سے یک ٹک مجھے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ میں نے آواز دے کر حوالدار کو کمرے کے اندر بلایا اور حکمانہ انداز میں کہا۔

”اللہ بخش! صفیہ کو تھکڑی پہناتا دو.....!“

جستی بیٹی کے اندر سے مشتاق مہر کو برآمد کرنے میں بھی مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے پاس رات گئے صفیہ کی خواب گاہ میں اپنی موجودگی کا کوئی مقبول جواز نہیں تھا لہذا کمال ڈھٹائی کے ساتھ اس نے باہر آتے ہی مجھے بھاری رشوت کی پیشکش کر دی۔ میں پہلے ہی اس کی طرف سے بھرا بیٹھا تھا۔ اس کی اس حرکت نے میرا پارا ساتویں آسمان تک پہنچا دیا۔ صفیہ کو عورت ذات جانتے ہوئے میں نے محض ایک طمانچے پر اکتفا کیا تھا لیکن مشتاق



چوتھا خانہ

بابر نسیم

کسی کی تلپٹ ہوتی زندگی بعض لوگوں کے لیے تفریح کا سبب بن جاتی ہے وہ بھی ایک ایسی ہی دوشیزہ تھی جو بھوک اور افلاس کی چمکی میں پستے پستے کسی کی ہوس کا شکار ہو گئی تھی مگر چٹ پٹی باتوں کی بہنہناہٹ کا تسلسل اس کی سانس کی ڈوری نوٹ جانے کے باوجود قائم رہا..... کیونکہ یہ دنیا محض ایک تماشا گاہ ہی تو ہے۔

دل دالوں کی دلچسپی کا محور و مرکز ایک دکھاری کا تھہ

”مجھے“ ہوئے دکاندروں نے برقع کی اس چمک کو دیکھا پھر چمک کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ سیاہ پردے سے پار دیکھنا تو ان کے لیے ناممکن تھا پھر بھی انہوں نے اندازے لگانے کی کوشش کی اور دل ہی دل میں یہ تہرے کیے۔
 ”چال میں غضب کا لوچ اور رد وسم ہے۔“
 ”کوئی... کلی معلوم ہوتی ہے۔“
 یہ تہرے اور اس جیسی دوسری باتیں وہ سوچ سکتے

ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ گلی کے کونے سے نمودار ہوئی اور اپنے سیاہ برقع کی لٹکارے مارتی چمک گلی میں چھوڑتی گزر گئی۔ گلی میں دکاندہ بھی تھے، چند لڑکے اور مسمر افراد بھی۔ انہوں نے روز کی طرح اسے دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں کیونکہ وہ شریف لوگ تھے اور یہ شریفوں کا محلہ تھا۔
 گو یہ شریفوں کا محلہ تھا اور یہاں رہنے والے لوگ کسی برے یا غلط فعل کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے، تاہم بعض

تھے۔ مگر ان پر عمل ان کے لیے ناممکن تھا۔ کیونکہ یہ خیالات اور ان پر کیا جانے والا عمل اخلاقیات سے ماوراء تھا اور شریفوں کے محلے میں ایسی باتوں یا حرکتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

شریفوں کے اس محلے کی عورتیں کہیں باہر نہیں جاتی تھیں۔ کیونکہ عورتوں کا گلیوں اور بازاروں میں آزادانہ گھومنا وہاں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ برقع والی پہلی عورت بھی جو روزانہ محلے سے باہر جاتی تھی۔ محلہ کمیٹی کے ارکان کو یہ بات پسند نہ آئی کہ برقع والی محلے سے باہر جائے اور محلے کی دوسری عورتوں خصوصاً نوجوان لڑکیوں کا اخلاق تباہ کرنے کا باعث بنے۔ اس لیے وہ ایک متفقہ فیصلے کے تحت برقعے والی کے گھر پہنچے تاکہ اگر گھر میں کوئی مرد ہو تو اس سے بات کریں اور اپنی اسی کوشش میں وہ اس کے باپ سے جا ملے تھے جو بستر مرگ پر دراز تھا۔ کب سے؟ محلہ کمیٹی والوں کو معلوم نہیں تھا حالانکہ وہ کمیٹی اسی مقصد کے لیے بنائی گئی تھی کہ غریب مریضوں اور غریب متوفین کو ان کے آخری وقت میں سہارا دے سکے۔ برقع والی کا باپ ہنوز موت کے انتظار میں تھا مگر نہ تو محلہ کمیٹی والوں نے اسے سہارا دیا، نہ فریضہ اجل اسے منزل پر پہنچانے کو تیار تھا۔ وہ ایک عرصے سے مرض یا موت کے اس پلنگ سے لپٹا ہوا تھا اور ڈاکٹروں کے لال پیلے شربت اور متعدد اقسام کی گولیاں بھی اسے بستر چھوڑنے پر آمادہ نہ کر سکیں۔

محلہ کمیٹی کے ارکان اسے یہ کہنے کے لیے گئے تھے کہ وہ اپنی بیٹی کو باہر نہ بھیجا کرے لیکن ان لوگوں کو دیکھتے ہی بوڑھے نے اپنی نہ رکنے والی کھانسی کو دباتے ہوئے یہ مشکل کہا۔ ”میرا کوئی بیٹا نہیں اور نوجوان بیٹی کام کرنے کے لیے باہر جانے پر مجبور ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ دوبارہ کھانسنے لگا۔ محلہ کمیٹی کے صدر اور جامع مسجد کے امام جو دونوں کمیٹی کے کرتا دھرتا افراد تھے، بولنے سے پہلے ہی خاموش ہو کر لفظوں کی ایسی ترتیب ڈھونڈنے لگے، جس سے وہ اپنے آنے کا مقصد واضح کر سکیں۔ محلہ کمیٹی کے صدر علاقے میں ہونے والے ہر ایکشن میں حصہ لیتے تھے اور باوجود ہارنے کے وہ سیاسی داؤد بیچ کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اس بات کا واضح ثبوت ان کی تین بیویاں تھیں جو ایک ہی گھر میں رہ رہی تھیں۔ ان کے سیاسی اثر و رسوخ کا محلے والوں پر یہ اثر تھا کہ جب ان کی بیویوں کے جھگڑنے سے محلے میں ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا تو وہی محلے والے یہی کہتے کہ ”دیکھو تو حاجی صاحب کے گھر میں کیسا اتفاق ہے، تین بیویوں اور بچوں سے بھرانا کا

گھر محلے کا بارون فی ترین گھر ہے۔“

حاجی صاحب کو آج سے پہلے کبھی سوچ کر بولنے کی ضرورت نہیں پیش آئی تھی لیکن آج ایک نحیف بوڑھے نے انہیں الفاظ کے تانے بانے میں الجھا دیا تھا۔ ابھی انہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ برقع والی کے باپ کا ناتوان ہاتھ ان کے گھٹنے پر جم گیا۔ ہاتھ کی کپکپاہٹ سے حاجی صاحب کا گھٹنا بھی لرزنے لگا۔ بوڑھے نے اپنی معدوم ہوتی آواز میں ان سے درخواست کی کہ اگر وہ اس کی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں کچھ کر سکیں تو وہ ان کا ممنون ہوگا۔ اسے اپنی بیٹی کے لیے ایک اچھے رشتے کی ضرورت تھی۔ صدر محلہ کمیٹی کے کہنے پر محلے کا کوئی بھی نوجوان اس لڑکی سے شادی کرنے پر تیار ہو جاتا لیکن امام صاحب اور وہ خاموشی سے بوڑھے کو کوئی دلاسا دیے بغیر ہی اٹھ کر وہاں سے چلے آئے کیونکہ وہ کسی کو ایسی لڑکی سے شادی کرنے کا نہیں کہہ سکتے تھے جو محلے سے باہر جاتی ہو اور پبلک بسوں میں گھومتی ہو۔ آخر یہ شریفوں کا محلہ تھا۔

شریفوں کے اس محلے میں کئی سال گزر گئے اور کوئی بھی بوڑھے کی بیٹی کا ہاتھ تھانے کو تیار نہیں ہوا۔ بوڑھے کی بیٹی کا برقع اپنی چمک کھو چکا تھا اور اب پھیکا پھیکا خاصا سوگوار سا نظر آنے لگا تھا۔ مگر بہر حال وہ واحد چیز تھی جو لڑکی کا ساتھ دے رہی تھی کیونکہ اس کا بوڑھا باپ بھی پچھلے سال اپنی باری آنے پر قبرستان میں جا لیتا تھا۔

وہ پہلے لڑکی بھی اب عورت بن رہی تھی۔ برقع کے سیاہ پردے کے پیچھے سے بھی اس کے جسم میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔ نئی کھلنے والی کلی پھول کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ دکا دنداروں کے تہرے اب ایک نیا رنگ اختیار کر رہے تھے۔ وہ سرگوشیوں میں تہرے کرتے پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر کھی کھی کرنے لگتے لیکن برقع والی یہ سب کچھ دیکھ کر سن کر کبھی برداشت کر رہی تھی اور کسی سے کچھ گلہ شکوہ کیے بغیر اپنے گے بندھے معمولات پر کار بند تھی۔

محلے کے کئی نوجوان اس کے پیچھے جا کر یہ دیکھ چکے تھے کہ وہ ایک فیکٹری میں کام کرتی ہے اور راستے میں آتے جاتے بلکہ فیکٹری میں داخل ہونے تک برقع کا نقاب اس کے چہرے پر رہتا ہے۔ مگر وہ سارے نوجوان جو اس کی شرافت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے، کسی نہ کسی فرضی قصے کو اس کی ذات سے منسوب کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ گو کہ ان کا پول جلد ہی کھل جاتا لیکن وہ اپنی ان دل آزار حرکتوں سے باز نہ آتے۔ ایسے جھوٹے اور شرم ناک قصے

کاروباری الجھن

میری صدارت میں مارکیٹ کا اجلاس چل رہا تھا۔ مارکیٹ میں سخت مندی ہمارا ایجنڈا تھا۔ ہر طریقہ آزما لیا مگر مندی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ سب پریشان تھے، کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میننگ کو بے نتیجہ ہوتے دیکھ کر چائے منگوائی کہ شاید تازہ دم ہو کر کچھ سمجھ آ جائے۔

”ان پڑھ“ کل خان (باہر والا) چائے بانٹتے ہوئے بولا۔ ”ہم ایک بات بولے؟“

”حاجی صیب! آپ لوگ مارکیٹ گیارہ بجے کھولنا ہے۔ وہ زوال کا وقت ہے..... جب کاروبار زوال کے وقت شروع کرے گا تو عروج نہیں زوال ہی ملے گا۔“

(مرسلہ: درحیلہ شیق۔ سدھی ہوئی، نیو کرہاچی)

کود پایا اور لوگوں کی رائے سننے لگا۔

”ٹیکسٹری میں بھی تو کوئی ہو سکتا ہے۔“ ایک دوسری آواز سنائی دی۔ ”ایسے کام چاندیواری کے اندر ہی ہوتے ہیں۔“ یہ بالکل معدوم ہوتے ہوئے ختم ہو جاتی اگر اگلے دن کے اخبار میں یہ خبر نہ ہوتی۔ ”شہر کے باہر مندی کے پل سے چھلانگ لگا کر ایک لڑکی نے خودکشی کر لی۔ لڑکی چار ماہ کی حاملہ بتائی جا رہی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر برقع کا نقاب موجود تھا۔“

اس خبر کے ساتھ ہی برقع والی کی تصویر تھی۔ محلے کے بیشتر افراد پہلی بار اسے بغیر برقع کے دیکھ رہے تھے اور وہ بھی مردہ حالت میں۔ جن چند معمر افراد نے پہلے بھی اتفاقاً اسے بغیر برقع کے دیکھا تھا، وہی اسے شناخت کر سکے تھے۔

شریفوں کے محلے میں کبھی حیران تھے کہ وہ کون تھا جس کے برقع والی کے ساتھ تعلقات تھے۔

محلہ میٹھی کے ارکان میں بھی اس سلسلے میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ تجسس سے سب کا برا حال تھا مگر کبھی جانتے تھے کہ یہ معاملہ ہونے والا نہیں۔ صدر میٹھی صاحب بھی اس گفتگو میں پیش پیش تھے لیکن ان کا دھیان کہیں اور تھا، وہ سوچ رہے تھے کہ انہوں نے اپنی ازدواجی بساط کا چوتھا خانہ کس خوب صورتی سے خالی رکھا تھا۔

لڑکی کے کانوں تک بھی پہنچ جاتے بلکہ پہنچا دے جاتے لیکن وہ خاموش ہی رہتی۔ وہ اس کے سوا اور کچھ بھی کیا سکتی تھی۔

اس کی عمر کی تمام لڑکیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔

اس محلے میں لڑکیاں جوان ہوتی ہی بیاہ دی جاتی تھیں۔

وجہ یہ تھی کہ یہ شریفوں کا محلہ تھا اور یہاں لڑکیوں کو گھر

بٹھائے رکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا جاتا تھا۔ بلکہ جلد از جلد

ان کے ہاتھ پیلے کر دینے کی کوشش کی جاتی تھی لیکن وہ لڑکی

ہنوز اپنے برقع کے ساتھ فیکٹری اور گھر کے درمیان پبلک

بسوں میں دھکے کھانے پر مجبور تھی۔ باپ کے انتقال کے بعد

اس نے کچھ عرصہ تک پڑوسیوں سے میل ملاپ بڑھانے کی

کوشش کی تھی لیکن عورتوں کی جلی کٹی باتیں سن کر وہ دوبارہ

اپنی ذات کے خول میں بند ہو گئی۔

محلے کے مرد اور نوجوانوں کے بھی اس کے گھر کے سامنے

سے گزرنے یا وہاں کھڑا ہونے سے کتر اتے تھے کہ کہیں وہ

بدنام نہ ہو جائیں۔ ان کے نظریے کے مطابق وہ اچھوت

بن چکی تھی یا کوئی چیزیں جس کے قریب جاتے ہوئے ڈر

محسوس ہوتا ہو، وہ سب بدنامی سے ڈرتے تھے کیونکہ یہ

شریفوں کا محلہ تھا۔

شریفوں کے محلے میں ایک روز ہلکی سی ہلچل پیدا ہوئی

جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ برقع والی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

اس روز بھیا پرچون والے اور راجو حمام کی دکانوں

پر یہ تبصرے سنائی دیے۔

”کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہوگی۔“

”لیکن اس محلے میں تو سبھی شریف لوگ رہتے ہیں۔“

”ابھی باہر کا کوئی آدمی ہوگا۔“

”باہر کے کسی آدمی سے تو وہ ملتی ہی نہیں تھی۔“

”تم کیسے جانتے ہو؟“ بات کرنے والے نے اس

نوجوان کی طرف دیکھا۔

وہ تھوڑا سا کھینا ہوا پھر بولا۔ ”میں اس لیے جانتا

ہوں کہ وہ ایک مقررہ وقت پر یہاں سے گزرتی ہے نا اگر وہ

کسی سے ملتی ہوتی تو اس کے معمولات میں فرق آ جانا

چاہیے تھا۔“ اپنی بات ختم کرتے ہی اس نوجوان کے ذہن

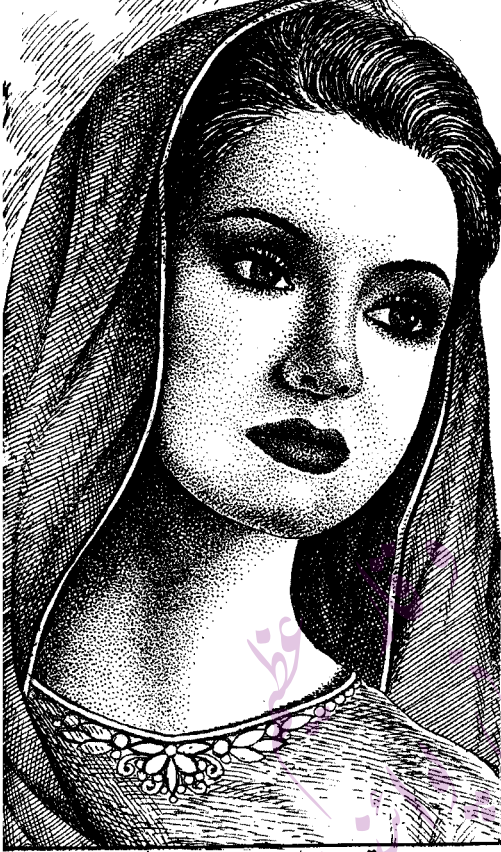
میں ایک شخص کا چہرہ ابھر آیا جسے اس نے برقع والی کے گھر

کے سامنے کھڑے دیکھا تھا۔ تاہم وہ اپنے اس شبیہ کا اظہار

نہیں کر سکا کیونکہ سنان دوپہر کو برقع والی کے گھر کے

سامنے کھڑا ہونے والا وہ آدمی اس قدر شریف تھا کہ کوئی بھی

نوجوان کی بات پر یقین نہ کرتا۔ اس لیے اس نے اپنے شبیہ



﴿۱﴾ وزیر محمد خان..... بٹل ہزارہ

اب نہ صورت ہے نہ وہ عکس گری ہے مجھ میں
نہک دریا کی طرح ریت بھری ہے مجھ میں

﴿۲﴾ ریاض بٹ..... حسن ابدال

خوابوں کی بھیڑ میں کچلے گئے ہیں ذہن یوں
لے اڑی دیوانگی انسان کا معیار بھی

﴿۳﴾ زین..... جملہ گنگ، سکھر

یہ سارے حسین چہرے میری تسبیح کے دانے ہیں
نظر سے گرتے رہتے ہیں، عبادت ہوتی رہتی ہے



﴿۴﴾ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... فورٹ عباس

اتنا اداس تھا کہ سویا نہ رات بھر
پلکوں سے لکھ رہا تھا تیرا نام چاند پر

﴿۵﴾ طہمیر احمد..... سرگودھا

کی برے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہوتا

﴿۶﴾ انیلارشد سیال..... خیر پور میرس

یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی

﴿۷﴾ اوشارٹھی..... مٹھی، سندھ

تم سے ملنے کی دیر ہے جاں
زندگی مجھ میں لوٹ آئے گی

﴿۸﴾ زرین آفریدی..... حیدرآباد

موضوع سخن کچھ ہو..... تادیر اسے نکلتا
ہر لفظ پہ رک جانا، ہر بات پہ کھوجانا

﴿۹﴾ عروہ گڑیا..... کراچی

کہا اس نے زمانہ درد ہے اور تم دوا جیسے
اگا، تم سے محبت ہے، مجھے اس نے کہا جیسے

﴿۱۰﴾ قدرت اللہ نیازی..... خانیوال

ہے یہ بھی سچ کہ تیرے سامنے مجھے برسوں
کوئی رفیق، کوئی کام بھی یاد نہ آیا

یہ بھی نہیں جھوٹ کہ کل جو تجھے میں نے دیکھا
تو کتنی دیر تیرا نام بھی مجھے یاد نہ آیا

﴿۱۱﴾ محمد شہباز اکرم نوٹی..... پاکستان شریف

ساری دنیا کی محبت سے کنارہ کر کے
دلشیں ہم نے رکھا ہے خود کو فقط تمہارا کر کے

﴿۱۲﴾ مظہر بلال..... سکھر

نہ آنا میری قبر پہ ہمارا رقیبان
مردوں کو مسلمان جلایا نہیں کرتے

﴿۱۳﴾ بلال حسین..... جملہ گنگ، سکھر

تیرے چہرے کی کشش تھی کہ پلٹ کر دیکھا
دور نہ سورج تو دوبارہ نہیں دیکھا جاتا

* ماہین فاطمہ..... حجرہ شاہ مقیم
 صحرا میں ڈھونڈتا ہوں سمندر کی ادائیں
 مجھ کو میرے معیار کی دنیا نہ مل سکی
 * ملائکہ حریم..... حجرہ شاہ مقیم
 ساتھ اس کے کوئی منظر، کوئی پس منظر نہ ہو
 اس طرح میں چاہتا ہوں اس کو تنہا دیکھنا
 * اشفاق شاہین..... لاہور
 لٹ کر سمجھ رہے ہیں کہ نام ہے راہزن
 کتنی حسین..... اہل مروت کی بھول ہے
 * مہتاب احمد..... حیدرآباد
 بدن کے قید خانے میں، عجب تھی روح کی حالت
 اسیری بھی مقدم تھی، رہائی بھی ضروری تھی
 * داؤد اشفاق..... حجرہ شاہ مقیم
 میرا مزاج تو تھا اس سے مختلف لیکن
 عیب شخص تھا خود سا بنا گیا مجھ کو
 * کبھی وکیل..... کوئٹہ
 ضد کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں
 بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے
 * جاوید اختر رانا..... پاکپتن شریف
 مبادا قصہ اہل جنوں ناگفتہ رہ جائے
 نئے مضمون کا لہجہ نیا کرنا پڑے گا
 * رمضان پاشا..... گلشن اقبال کراچی
 کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مرجاؤں گا
 میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
 * اطہر حسین..... کراچی
 کتاب زندگی کا میری وہ خوبصورت باب تھا
 یوں حرف حرف پڑھا جیسے وہ شخص مرا نصاب تھا
 * سعید اسلم..... ٹنڈوالہیار
 اسے کہنا سدا موسم بہاروں کے نہیں رہتے
 سبھی بچے بکھرتے ہیں ہوا جب رقص کرتی ہے
 * ارم کا مران..... کراچی
 روز آجاتی ہے میرے پاس تسلی دینے
 شب تنہائی بتا تو میری کیا لگتی ہے
 * تنویر لودھی..... واہ کینٹ
 تیرے غموں کی تشریح کچھ اتنی تھی
 ہم..... لکھتے گئے مٹنے بھرتے گئے

* سحر زاہد..... کراچی
 آؤ آنکھوں سے بات کرتے ہیں
 لفظ مطلب بگاڑ دیتے ہیں
 * عارفہ جاوید..... سکھر
 ہمارا تذکرہ چھوڑو ہم ایسے لوگ ہیں جن کو
 محبتیں کچھ نہیں کہتیں وفا میں مار دیتی ہیں
 * زاہد احمد..... شادمان ٹاؤن، کراچی
 دائم آباد رہے مگر
 ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا
 * عاصم خان..... کوئٹہ
 بدل جاتے ہیں وہ لوگ وقت کی طرح
 جنہیں ہم حد سے زیادہ وقت دیتے ہیں
 * کمال احمد..... کراچی
 چراغ طور نہ ملا تو کیا
 شب ظلمت گزر ہی جائے گی
 غموں نے دیکھ لیا ہے مرا در
 انہی کے سہارے زندگی گزر جائے گی
 * ادیس احمد خاں..... ناظم آباد کراچی
 کہوں کس سے میں کہہ گیا ہے شب تم بری بلا ہے
 مجھے کیا بُرا تھا مرنے اگر ایک بار ہوتا
 * مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر مجاویہ..... خانیوال
 اس کے انکار سے کچھ تو پردہ رہ گیا
 میں بھی کافی غلطیوں ہوں وہ بھی اچھا رہ گیا
 * ظفر اقبال ظفر..... کامرہ شرقی
 نوح کی رشتی کو طوفان سے بچایا تو نے
 معجزہ بھی زمانے کو دکھایا تو نے
 کوئی تیرا شکر بجا لائے نہ لائے یا رب
 بھوکا دنیا میں کسی کو نہ سلایا تو نے
 * پرویز علی..... پشاور
 کسی کے پیار کی خوشبو کو عام کر دے گی
 گزر کے جائے گی جب بھی ہوا درختوں سے
 * مدثر اقبال وٹو..... مٹن آباد
 کہنے کو تو بہت کچھ تھا مگر کہہ نہ سکا
 جب ملاقات ہوئی تو زبان چپ رہی
 * بلقیس خان..... واہ کینٹ
 سروں میں خاک غریبی بھی ڈال دیتی ہے
 یہ سارے لوگ محبت کے مارے تھوڑی ہیں

❖ شاہینہ مہتاب..... چنیوٹ

آگ سے پانی میں بجتے دشتی ہے صدا
ہر کوئی در ماندگی میں نالے سے دوچار ہے
❖ عظیم احمد..... جنگ ش

ابھی آئی..... نہیں بہار کہ یاں
دل میں دشت کے دلولے آئے
❖ جنید احمد ملک..... کراچی

نہ خوشی وصل کی ہے اس کو نہ اندیشہ ہجر
دل افسردہ کو ہو عیش کہ غم ایک سا ہے
❖ شاہد علی..... فیصل آباد

دکھانے کو لوگوں کے ہے یہ رکاوٹ
نہ بیزار میں ہوں نہ بیزار وہ ہے
❖ عاطف علی..... میرپور خاص

اٹھا دیتا ہے جو پردہ ذرا تو روئے زیبا سے
ابھی خلق خدا تجھ کو منم کچھ اور کہتی ہے
❖ اسامہ جنید..... کراچی

کہیں ایسا نہ ہو کل جائے دل کا راز محفل میں
ہماری آنکھ پھر اس وقت محفل سے ملتی ہے
❖ اسماء فیصل..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

سن کے احوال مرا گرچہ ہوں پتھر پانی
سنگدل پر نہ بڑی آنکھوں سے آنسو نکلے
❖ مہوش خان..... حیدر آباد

یار نہیں غم خوار نہیں ہمدرد ظفر اب کوئی نہیں
پنج غم میں آپ ہی کیسے دل کو مرے بہلائے کون
❖ سائرہ نواب..... پشاور

آنکھوں میں روتے روتے غم بھی نہیں ہے اب تو
تھے موجزن جو پہلے طوفان! اب کہاں ہیں
❖ امتیاز احمد..... پھالیہ

ہم سے زمانہ آج اگر پھر گیا تو کیا
لاکھوں ہی اس کے دیکھ چکے انقلاب ہم

❖ عمران شیروانی..... لاہور

اٹھ گیا ہے کون پہلو سے کہ گھبرائے ہوئے
دیکھتے ہیں گھر میں ہم دیوار و در چاروں طرف
❖ محسن خان..... نواب شاہ

کب تک قلم اٹھائیں تری فرقت میں جان
بے بس اب جان ہی سے ہاتھ اٹھاتے ہم ہیں
❖ نعیم احمد..... بہاولپور

نام ہے بدنام سے کا ورنہ اس سے بھی سوا
مست ہو جاتا ہے انسان نشہ دولت کے وقت
❖ نوشہرہ گلزار..... بکھر

صیاد یہ دعا ہے نہ ہم کو خدا دکھائے
دام و قفس کوئی ترے دام و قفس کے بعد
❖ انعم کمال..... حیدر آباد

دنیا ایک سرا ہے اس میں کرلو رین بئیرا
اپنے پاؤں پیارے تم نے، کس غفلت نے گھیرا
❖ آصف رضا..... اسلام آباد

ہوں سکھش نزع میں ہاں جذب محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے
❖ میمونہ علی..... سرگودھا

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کہینے جانیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے
❖ فاطمہ خان..... کراچی

عشق مجھ کو نہیں دشت ہی سہی
میری دشت تیری شہرت ہی سہی
❖ شاہد حسن..... اچھرہ، لاہور

اے زندگی ہمیں تو ذکر ایسے بکھیر داب کی بار
نہ خود کو جوڑ پائیں ہم نہ پھر سے توڑ پائے کوئی
❖ رحمان خان..... کراچی

اب کشتیوں پہ کس کو بچانے چلے ہو تم
ساحل کے آس پاس تو گھر بھی نہیں رہے

محفل شعرو سخن

کوین

برائے

شمارہ

نومبر

2017

نام:

پتا:

اکتوبر 2017ء

156

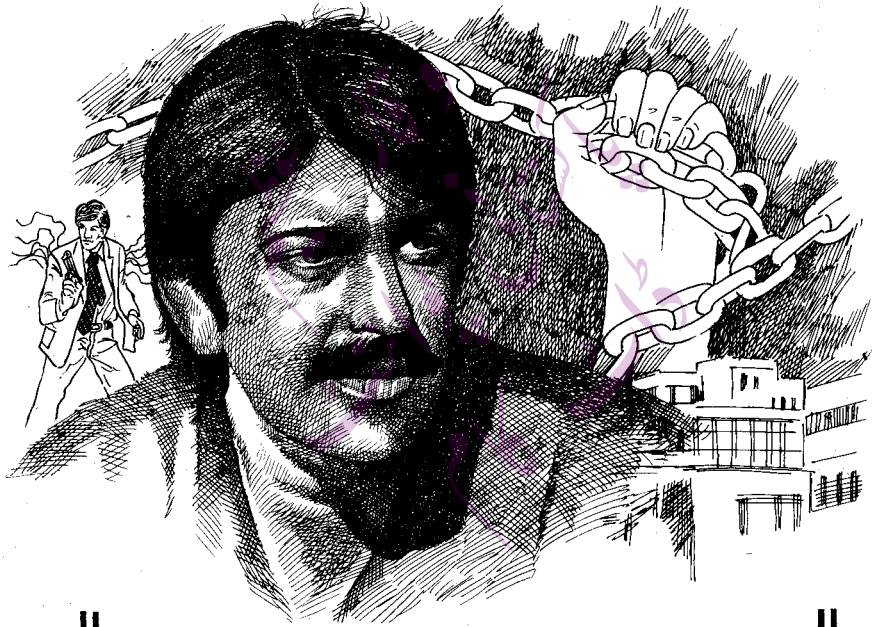
سپینس ڈائجسٹ

انکشاف

محمد فاروق انجم

یوں تو زندگی میں بہت سے انکشافات انسان کو کچھ دیر کے لیے حیران کر دیتے ہیں لیکن یہاں معاملہ چند لمحات کا نہیں بلکہ عمر قید کا تھا جبکہ اس کی آنکھوں میں خوابوں نے ایسا ڈیرا جما یا کہ اس کا منات میں اسے ہر ایک اپنا دشمن دکھائی دینے لگا اور ایسا کیوں نہ ہو تاکہ عشق کا دیوانہ بن اسی کو کہتے ہیں۔

اپنے کرداروں میں زندہ رہنے والے ایک لکھاری کا قصہ



سیانے تھے، انہوں نے کام اس دن شروع کیا تھا جس دن کام ختم ہونا تھا، اس سے اگلا دن اتوار تھا۔ اس طرح ہمیں صرف ایک ہی چھٹی ملتی۔

ہم سب کام میں اس قدر مصروف رہے کہ ہم میں سے کسی نے کبھی دو گھنٹوں سے زیادہ نیند نہیں لی تھی۔ لمبا چوڑا حساب تھا۔ کمپنی کے شراکت دار ہمارے سروں پر سوار تھے۔

میں جس کمپنی میں کام کرتا تھا، اس کا نفع نقصان کا حساب ہو رہا تھا۔ ہم اکاؤنٹس کے شیجے سے تعلق رکھنے والے مسلسل اس کام میں مصروف تھے اور ہمیں گھر جانے کی چھٹی بھی نہیں ملی تھی۔ کمپنی نے ہمارے لیے یہ اعلان کیا تھا کہ کام ختم ہوتے ہی وہ ہمیں دو چھٹیاں دے گی۔ کمپنی کے لوگ بھی بڑے

پھر جیسے ہی کام ختم ہوا تو دوسرے دن کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ اتوار کا دن تھا۔ یعنی کہ کمپنی نے ہماری عام تعطیل میں سے بھی کچھ گھنٹے اپنے کام کے لیے لیے تھے۔ نیند سے میری آنکھیں خود بخود بند ہو رہی تھیں اور میں نے سوچ لیا تھا کہ گھر جاتے ہی بستر پر ڈھیر ہو جاؤں گا اور خوب مزے سے نیند لوں گا۔

جب میں بانک پر بیٹھ کر گھر جانے کی تیاری میں تھا اور اپنے خوبصورت بالوں میں بانک کے ساتھ لگے شیشے میں اپنی صورت دیکھ کر ہاتھ کی انگلیوں سے بال سنوار رہا تھا تو دل ہی دل میں یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ قدرت نے مجھے بنانا ہی ہر اسٹائل عطا کیا ہے۔

میں نے ابھی بانک کو کلک بھی نہیں ماری تھی کہ گھر سے فون آگیا۔ دوسری طرف اماں تھیں۔

”ظہیر! تم کب گھر آ رہے ہو؟“ اماں نے پوچھا۔

”بس اماں نکلے والا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اچھا آتے ہوئے شیو کر کے آنا۔“ اماں نے کہا۔

”کیوں اماں..... خیر تو ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”چار بجے لڑکی والے مجھے دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔“ دوسری طرف سے اماں کی خوش کن آواز آئی۔

”اچھا اماں۔“ یہ سن کر تو جیسے میرے دل میں

جلتر تک سی بج اٹھی تھی۔ میں نے بانک کو کلک ماری

اور وہاں سے چل پڑا۔

اس سے قبل مجھے دوبار لڑکی والے دیکھنے کے لیے

آئے تھے۔ پہلی بار جب لڑکی والے دیکھنے کے لیے آ رہے

تھے تو ان کے آنے سے ایک گھنٹا قبل دادی اماں کی طبیعت

خراب ہو گئی اور ہم ان کو اسپتال لے گئے۔ اس طرح لڑکی

والے رک گئے۔ دادی اماں کو دو گھنٹوں کے بعد گھر لے

آئے تو ہمارے لڑکی والوں کو فون کیا کہ وہ اب آنا چاہیں تو

آجائیں۔ لڑکی والوں نے بتایا کہ ان کی نظر میں ایک اور

رشتہ تھا اس لیے وہ وہاں چلے گئے تھے اور انہیں لڑکا پسند آ گیا

ہے۔ اس طرح وہ رشتہ اسی جگہ ختم ہو گیا تھا۔

دوسری بار جب مجھے لڑکی والے دیکھنے کے لیے

آ رہے تھے تو دادی اماں کھلی میں ٹہل رہی تھیں۔

ایک سال کھلی میں کھیلتے بچوں کی گیند دادی اماں کو لگ

تی اور دادی اماں بے ہوش ہو گئیں۔ ان کو پھر اسپتال

لے جایا گیا۔ لڑکی والوں کو فون کر کے پھر روک

دیا گیا کہ گھر میں مسئلہ ہو گیا ہے۔

اس دن بھی دادی اماں دو گھنٹے تک اسپتال میں رہی

تھیں۔ جب دادی اماں گھر آئیں تو ہمارے لڑکی والوں کو فون کیا اور انہیں کہا کہ وہ آجائیں تو لڑکی والوں نے صاف گھٹی سے کام لیتے ہوئے بتایا کہ لڑکی نے اب بات کی ہے کہ وہ اپنے کزن کو پسند کرتی ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کی شادی اسی جگہ کر دیں۔

اس بار مجھے کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ دادی اماں بتایا ابائے گھر شیخوپورہ گئی ہوئی تھیں اور اگر خدا نخواستہ اس دوران دادی اماں کو کچھ ہو بھی جاتا تو لڑکی والوں کو گھر بلا کر اور ان کی خدمت کر کے، ہم آسانی سے ان کی خبر کے لیے نکل سکتے تھے۔

میں کا کام والے کے پاس جا پہنچا۔ بانک ایک طرف کھڑی کی۔ اندر کرسیاں خالی تھیں۔ نیند کا خمد زورور پر تھا لیکن دودن کی بڑھی ہوئی شیو کرانی بھی ضروری تھی کیونکہ اگر میں گھر جا کر سوجانا تو پھر شیو کا ہونا مشکل ہو جاتا۔

جب میں شیو کرانے کے لیے کرسی پر بیٹھ رہا تھا تو عین میرے ساتھ والی کرسی پر ایک اور نوجوان بیٹھ رہا تھا۔ ہم دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ میری شیو کر دو اور اس نے کہا تھا کہ میری منڈ کر دو۔ میرے گلے کے گرد تولیہ لپیٹ کر اس نے جیسے ہی

اپنے ماہر ہاتھوں سے میرے ماتھے اور پھر آنکھوں کے اوپر کے حصے کو سہلایا مجھے فوراً ایسا سکون ملا اور میں نیند کی وادی میں پہنچ گیا کہ مجھے ہوش ہی نہ رہا۔ جب میری آنکھ کھلی تو بانک کا کام والا مجھے کہہ رہا تھا۔ ”اٹھ جائیے.....“

بڑے مزے کی نیند تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں تو مجھے کسی کے تیز بولنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے گردن گھما کر اس نوجوان کی طرف دیکھا جو میرے ساتھ منڈ کرانے کے لیے بیٹھا تھا۔ وہ غصے سے بول رہا تھا۔

”مجھے تو نیند یوں آتی ہے جیسے نیند بنی ہی میرے لیے ہو۔ میں تم کو منڈ کرنے کا کہہ کر سو گیا گیا، تم نے میری شیو کر دی..... میری اسٹائش ڈاڑھی صاف کر دی.....“ وہ مسلسل غصے سے بول رہا تھا۔ اسے اپنی اسٹائش

ڈاڑھی کے صاف ہونے کا بہت تاسف ہو رہا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر سامنے شیشے میں دیکھا تو چونک پڑا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ سامنے میری شکل کا کون بیٹھا ہے جس کے سر کے بالوں کو اسٹریس سے صاف کیا ہو تھا۔

”یہ کون ہے.....؟“ میں نے شیشے کی طرف

اشارہ کر کے کا کا سے پوچھا۔

”یہ آپ ہو۔“ اس نے تولیہ تارتے ہوئے کہا۔

”میں ہوں تو میرے سر کے بال کہاں ہیں؟“ مجھے ایک دھچکا لگا اور میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

”آپ نے ٹنڈ کرنے کا بولا تھا، وہ میں نے کر دی۔“ اس نے کہا، جب تک ساتھ والا نوجوان اپنی شیو ہونے پر مسلسل اس سے لڑ رہا تھا اور وہ چپ کھڑا اس کی سن رہا تھا۔

”اے ٹنڈ کرنے کا تو اس نے بولا تھا۔ میں نے شیو کرنے کا کہا تھا۔“ مجھے غصہ آ گیا۔ میرا خوبصورت ہیئر اسٹائل ٹنڈ کی شکل میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ”میری ٹنڈ کیوں کر دی۔“ میں اپنی جگہ تڑپا۔

”تم دونوں بہرے اندھے ہو..... سنائی نہیں دیا تھا۔ میری اسٹائش ڈاڑھی صاف کر دی..... گدھو.....“ اس نوجوان کا غصہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا اور میرا غصہ بھی دو چند ہوتا جا رہا تھا۔

اس نوجوان نے بس ”گدھو“ کہا ہی تھا کہ دونوں نے اس نوجوان کو پکڑ لیا اور اس کی دھلائی شروع کر دی۔ میں ایک طرف سہم کر کھڑا ہو گیا۔ جو بھی وہ اس کی دھلائی سے فارغ ہوئے، میں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے اور ان کی طرف بڑھا کر اس شرافت سے حمام سے باہر نکلا کہ جیسے میری ٹنڈ میری عین منشا کے مطابق ہوئی ہو۔

سارے راستے میں روتا رہا۔ بس آنسو نہیں نکلے لیکن رہ رہ کر مجھے اپنا پیارا ہیئر اسٹائل یاد آتا رہا اور یہ سوچ سوچ کر تو میری جان نکلی جا رہی تھی کہ آج مجھے لڑکی والے دیکھنے کے لیے آرہے ہیں۔

گھر میں داخل ہو کر میں نے بانک ایک طرف کھڑی کی اور ابھی منہ میں قدم رکھا ہی تھا کہ اماں دیکھتے ہی چلائیں۔ ”کون ہے تو..... ہمارے گھر دن دیہاڑے چور آ گیا ہے..... ارے کوئی پکڑو اسے.....“

اماں کا شور روکنے کے لیے میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اماں! میں ہوں ظمیر.....“ میری آواز سننے ہی اماں کے ہاتھ چرک گئے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور مجھے پچاننے کی کوشش کرنے لگیں۔ پھر جب مجھے..... پچان گئیں تو..... میری طرف بڑھیں۔

”یہ تو کیا کرا کے آ گیا ہے..... میں نے شیو کا کہا تھا..... اس حالت میں تو تم مجھے اچھے نہیں لگ رہے ہو، لڑکی والوں کو خاک اچھے لگو گے.....“

میں نے اماں کو ساری بات بتائی تو اماں میرا منہ حیرت سے دیکھتی رہیں۔ میں چپ ہوا تو بولیں۔

”اس کم بخت کو پکڑ لیتا تھا.....“

”اچھی خاصی ٹھکانی کر کے آیا ہوں اماں۔ اپنی غلطی پر معافی مانگی تو چھوڑا تھا۔“ میں نے یہ جھوٹ بول کر دراصل اپنے آپ کو سولی دی۔

”میں سوچ رہی تھی کہ آج تیری دادی نہیں ہے، سب ٹھیک رہے گا لیکن دادی کی کسر تو اس کم بخت نے نکال دی جس نے تیری ٹنڈ کی ہے۔“ اماں کو دکھ ہو رہا تھا۔ ابھی ہم اسی طرح کھڑے تھے کہ ابابھی باہر سے آگئے۔ وہ آتے ہی بولے۔

”برخودار کون ہے؟“

”ظمیر ہے اور کون ہے۔“ اماں نے مرجھائے سے انداز میں بتایا۔

ابا نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میں ان کے سامنے ایکسرا ہوں اور وہ کوئی ڈاکٹر ہیں۔ ”بہت برا ہو گیا ہے۔ وہ تو ماڈرن لوگ ہیں۔ ایک گھنٹے کو کیسے پسند کریں گے۔“

”ابا! آپ ان کو روک دیں۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”میں اس سے پہلے دو بار لڑکی والوں کو روک چکا ہوں۔ اب ایسا نہیں کروں گا لڑکی والے آئیں گے اور آج ہی آئیں گے۔ تم اپنا کوئی بندوبست کرو۔“ ابا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میں سوچنے لگا کہ میں بالوں کا کیا بندوبست کروں؟ کہاں جاؤں، کیا کروں؟ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وگ کہاں سے ملتی ہے؟ لیکن مجھے سہرے کے ساتھ لڑکی والوں کے سامنے جانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہ تو مجھے دیکھتے ہی ناپسند کر دیتے۔ بہر حال مجھے کچھ تو کرنا تھا۔ ساری عمر کنوارا نہیں رہنا تھا۔

چار بجے لڑکی والوں نے آنا تھا، کچھ گھنٹے باقی بچے تھے۔ ان گھنٹوں میں میرے سر پر بال تو آنے سے رہے۔

”ایسا کریں لڑکی والوں کو آپ میری تصویر دکھادیں اور ان کو بتادیں کہ میں مصروفیت کی وجہ سے نہیں آسکا۔“ میں نے تجویز پیش کی۔

”لڑکی والے آرہے ہیں۔ تم ان سے ملو گے۔ بات کرو گے۔ بس یہ سوچو کہ تمہارا منگیا سر کور کیسے ہو سکتا ہے۔“ ابا تو فیصلہ کیے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ددوٹک کہہ دیا۔

اجانک مجھے پروفیسر ظلیل کا خیال آیا اور میں چونک سا گیا۔ پروفیسر ظلیل تقریباً چار ماہ قبل ہمارے بالکل برابر والے گھر میں مقفل ہوئے تھے۔ وہ اکیلے ہی وہاں رہتے تھے۔ جب وہ شفٹ ہو رہے تھے تو ان کا ایک بیٹا، کچھ کرسیاں اور ضرورت کا سامان آیا تھا لیکن کتا نہیں اتنی آلی تھیں کہ سب کو گمان ہوا تھا کہ وہ

پرانی کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں۔

پروفیسر خلیل بڑی پراسرار سی شخصیت کے مالک تھے۔ پہلے تو کسی کو پتا ہی نہ چلا کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ پھر کسی نے بتایا کہ وہ پروفیسر ہیں لیکن کسی کو نہیں پتا کہ وہ فال نکالنے والے پروفیسر ہیں کہ پڑھانے والے..... روزانہ وہ ایک کتاب بغل میں دبائے چلے جاتے تھے اور واپسی پر ان کے پاس وہ ایک ہی کتاب ہوتی تھی یا پھر دو ہو جاتی تھیں۔ وہ کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ کوئی بھی ان کی اصل حقیقت کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔

ایک دن تیز ہوا میں ان کے سر پر رکھی وگ اڑ کر نیچے گر گئی تھی۔ تب مجھ پر آشرف ہوا تھا کہ اصل بالوں کے قریب تر دراصل وہ وگ ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے سوچا کہ اگر پروفیسر صاحب سے ایک دو گھنٹے کے لیے وگ ادھار مانگ لی جائے تو میرا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

”ساتھ دالے پروفیسر صاحب کے سر پر بھی وگ ہے جو میں نے خود دیکھی تھی۔ میں ان سے وگ ادھار مانگ لاتا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”وہ تم کو وگ دے گا؟ وہ تو کسی سے بات نہیں کرتا کسی کی طرف دیکھتا نہیں ہے۔ کسی کو پتا ہی نہیں ہے کہ وہ کرتا کیا ہے.....“ ابانے کہا۔

”اباجی! اس مشکل گھڑی میں کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔“ میں نے سب کچھ جاننے کے باوجود امید کا پلو پکڑ لیا۔

”کوشش کرو دیکھو لیکن جو بھی کرتا ہے، جلدی کرو۔ پونے تین ہو گئے ہیں۔ چار بجے انہوں نے آنا ہے۔“ ”میں ابھی آتا ہوں۔“ میں نے اٹھ کر اپنے سر پر ٹوپی رکھی تاکہ میری ٹنڈ اس کے اندر چھپ سکے۔ میں باہر نکل کر پروفیسر صاحب کے گھر کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ تیل پرانگی رکھی اور زور سے دبائی۔ تیل شاید خراب تھی اس لیے مجھے اس کے بجنے کی آواز نہیں آئی۔

میں نے دروازہ ہنجایا۔ چار بار دروازہ ہنجایا تو اندر سے آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

”جی پروفیسر صاحب میں ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”مسٹر..... سواری میں آپ کو نہیں جانتا۔“ پروفیسر صاحب کی اندر سے آواز آئی۔

”جی میرا نام ظمیر ہے اور میں آپ کے برابر میں رہتا ہوں۔“ میں نے اپنا تعارف کرایا۔

”بویس کیا کام ہے؟“ انہوں نے دروازہ کھولنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔

”سر! ذرا دروازہ کھول دیں تو میں آپ سے ہا کروں۔“ میں نے کہا تو اندر ایسی خاموشی چھا گئی جیسے پہاڑ نے اچانک شوہر سے خرچہ مانگ لیا ہو اور شوہر کی بولتی ہو جائے۔

میں کم از کم دس منٹ تک کھڑا رہا، اس کے بعد صبح میں مایوس سا ہو کر جانے لگا تو دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پروفیسر صاحب نے اتنا دروازہ کھولا جس سے ان کا سر و چہرہ باہر نکل سکے۔

میری نظر پروفیسر صاحب کے سر پر جی وگ پر گئی اور پھر میں نے کہا۔ ”کیا تم اندر بیٹھ سکتے ہیں؟“

میری بات سن کر پروفیسر صاحب کے ماتھے پر سلوٹیر مزید ابھریں اور پھر انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”کیوں.....“

”وہ جی..... بات کرنی ہے آپ سے۔“

”ہاں تو کرو۔“

”ذرا اندر بیٹھ جاتے تو مہربانی ہوتی۔“ میں نے پھر استدعا کی اور پروفیسر صاحب سوچ میں پڑ گئے پھر انہوں نے بادل نا خواستہ دروازہ کھول دیا اور پیچھے ہٹ گئے۔

”آپ کے پاس بات کرنے کے لیے صرف پانچ منٹ ہیں۔“ پروفیسر صاحب نے کہتے ہی اپنی نگاہیں کلائی پر بندھی گھڑی پر مرکوز کر دی تھیں۔ ہم دروازہ پار کر کے ساتھ ہی کھڑے ہو گئے تھے۔

میں نے وقت کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے پہلو تو اختصار سے انہیں بتایا کہ میری ٹنڈ کس مغالطے میں ہوئی تھی اور پھر بتایا کہ مجھے ابھی لڑکی والے دیکھنے کے لیے آرہے ہیں اور مجھے دو گھنٹوں کے لیے آپ کی وگ درکار ہے۔

وہ اپنی نگاہیں گھڑی پر مرکوز کیے میری بات سنتے رہے۔ جو نبی میں نے بات عمل کی، انہوں نے مجھے بڑے اپنایت بھرے لہجے میں کہا۔

”آپ ذرا باہر نکلیں گے.....“

میں دروازے کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر قدم رکھا تو انہوں نے ایک دم سے کہا۔

”سواری.....“

ساتھ ہی انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور میں بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔

مجھے پروفیسر صاحب کے اس رویے پر غصہ تو بہت آیا کہ یہ کونسا طریقہ ہے انکار کرنے کا۔ میں کچھ دیر اس جگہ کھڑا رہا اور پھر واپس اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

جونہی میں نے اپنے گھر کے اندر قدم رکھا، میں چونک گیا۔ مجھے اندر سے آوازیں آرہی تھیں۔ بابو چہرہ ہے تھے۔
”آپ نے تو چار بجے آنا تھا..... آپ پہلے ہی آگئے.....“ کہنے کے بعد ابانے بھی۔

ایک خاتون نے جواب دیا۔ ”دراصل ہم نے تین بجے ایک اور گھر رشتہ دیکھنے جانا تھا، وہاں گئے تو ہم لڑکے کو اچھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے..... لڑکے کے سر کے بال اتنے تھے کہ بس گنجابی سمجھ لیں.....“

”جی جی، کوئی بات نہیں آجائیں ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔“ اماں کی آواز آئی۔ میں باتیں سننے ہوئے رکابیں تھا بلکہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا اور جب میں محن میں پہنچا تو وہ سب مہمان ڈرائنگ میں جا چکے تھے۔ بس ایک چھ سال کی بچی اندر کی طرف جارہی تھی کہ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ چلائی۔

”مما..... یہاں بھی ایک انکل سمجے ہیں..... جلدی سے آکر دیکھیں.....“

بچی ایسے ماما کو بلارہی تھی جیسے کوئی عید الفطر کا چاند دیکھ کر شور مچا دے۔

میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی سر سے ٹوپی اتار لی تھی اس لیے میری ٹنڈ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اوپر سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگا دی اور اوپر والے کمرے میں جا کر دم لیا۔

پانچ منٹ کے بعد اماں بھی میرے پیچھے ہی آگئیں۔
”لے آئے وگ؟“

”انہوں نے انکار کر دیا ہے۔“ میں نے منہ بنا کر جواب دیا۔

”اب کیا کرو گے؟ وہ تو ایسے لڑکے کو دیکھ کر بھاگ آئے ہیں جو ابھی پورا گنجابی تھا..... تمہارے سر پر استرے سے پورا کمال کیا ہوا ہے..... اب جاؤ اور بازار سے وگ خرید لاؤ۔“ اماں نے پریشان ہو کر کہا۔

”اماں! جو وگ پروفیسر صاحب کے سر پر ہے، اسے دیکھ کر کوئی نہیں جان سکتا کہ وہ وگ ہے۔“ میں نے کہا۔

”پھر اب کیا کرتا ہے؟“ اماں نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”آپ جائیں، مہمانوں کے پاس بیٹھیں اور انہیں بتائیں کہ آفس میں کام تھا بس لڑکا آئی رہا ہے۔ میں سارا انتظام کر کے آتا ہوں۔“ میں نے ایک دم سے کچھ اور سوچ لیا۔
”کیا کرو گے؟“

”بس آپ جائیں، میں اس سر کے ساتھ ان کے سامنے نہیں آؤں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔“ میں نے اماں کو سلی دی اور اماں پریشان سی پیچھے چلی گئیں۔

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ پروفیسر کی وگ اپنے سر پر جما کر ہی دم لوں گا کیونکہ وہ ایسی وگ تھی جو اصل بالوں کی طرح تھی۔ بالکل سلی بال تھے اور پھر اتنی جلدی میں کسی دوسری وگ کا نہیں سے انتظام بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے ساری زندگی کنوارا نہیں رہنا۔

چنانچہ میں اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کمرے سے باہر نکلا اور چار پائی پر ٹھکڑا ہو کر ارد گرد کے گھروں کی چھتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ کسی چھت پر مجھے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔

میں بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے دیوار کے پاس پہنچا اور جست لگا کر اوپر چڑھا اور پھر دوسری طرف کود گیا۔ اب میں پروفیسر صاحب کے گھر کی چھت پر تھا۔ میں سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ سیڑھیوں پر کمزور سا دروازہ لگا ہوا تھا۔ ایک طرف سے ٹوٹا ہوا تھا جس کے اندر ہاتھ ڈال کر میں نے آسانی سے کنڈی کھول لی تھی۔ اس گھر میں میرا ایک دوست کرائے دار کی حیثیت سے رہ چکا تھا اس لیے میں اس گھر کو خوب جانتا تھا اور یہ دروازہ میرے دوست نے ہی توڑا تھا جب ایک بار وہ اپنی بیوی کے ساتھ باہر سے تالا لگا کر گیا تھا اور واپسی پر چابی کم گئی تھی۔ جب وہ دوست ہماری چھت سے اس طرف آیا تھا اور دروازہ اس جگہ سے توڑ کر اس نے کنڈی کھولی تھی۔

میں آہستہ قدم سے سیڑھیاں اترتا ہوا آخری سیڑھی پر کھڑے ہو کر دائیں بائیں دیکھا۔ مجھے لگا کہ بیڈ روم میں کوئی ہے۔ میں بغیر آہٹ پیدا کیے بیڈ روم کے دروازے تک پہنچا اور ادھر کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔

پورا کمرہ کتابوں سے لدا پھندا تھا۔ دائیں بائیں کتابیں تھیں۔ بیڈ کے سرہانے اور پاس پڑی میز پر بھی کتابیں تھیں۔ پروفیسر صاحب دوسری طرف منہ کیے براجمان تھے اور انہوں نے کان سے موبائل فون لگایا ہوا تھا۔ ان کا سر جو دھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ انہوں نے وگ اتار کر بیڈ کے ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ اگر میں آگے بڑھتا تو بغیر آواز پیدا کیے ان کے پیچھے سے وہ وگ اٹھا کر اگلے پیر واپس جاسکتا تھا لیکن ان کی باتیں سن کر میں گھبرا کر اسی جگہ رک گیا تھا۔ وہ کسی سے کہہ رہے تھے۔

”میں نے سوچ لیا ہے کہ میں راشد کو مروا دوں..... اس کے قتل سے سحرش کی زندگی میں سکون آجائے گا.....“ پروفیسر صاحب نے یہ بات اس قدر پرسکون انداز میں کی تھی جیسے وہ کبھی کو مارنے کی بات کر رہے ہوں جبکہ میں کانپ کر رہ گیا تھا۔ وہ دوسری طرف سے ہونے والی بات سننے لگے اور پھر بولے۔ ”میں نے پورا منصوبہ بھی بنالیا ہے۔ راشد جب اس کے لیے لفٹ میں بیٹھ کر اوپر چلے گا تو اسے لفٹ میں موجود ایک اجرتی قاتل مار دے گا.....“

ان کی باتیں سن کر تو میری سانس تیز ہو گئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ محلے والے ٹھیک کہتے تھے کہ پروفیسر بہت پراسرار آدمی ہے۔ وہ لوگ تو انہیں پراسرار کہتے تھے جبکہ میری نظر میں پروفیسر صاحب ایک سفاک انسان تھے جو کسی کو بھی اجرتی قاتل کے ذریعے قتل کروا سکتے تھے..... میں سمجھ گیا تھا کہ پروفیسر صاحب دراصل کسی کو بھی قتل کرنے کے پیسے لیتے تھے۔

فی الحال مجھے دگ کی ضرورت تھی کیونکہ میرا رشتہ طے ہو رہا تھا۔ میں پروفیسر کو فون پر باتوں میں منہمک دیکھ کر آگے بڑھا اور ہاتھ بڑھا کر ان کی دگ اٹھائی، اس دوران وہ بولے۔

”راشد کے بعد میں سحرش کے باپ کو بھی روڈ ایکسیڈنٹ سے مروا دوں گا..... یہ بہت ضروری ہے، وہ ایماندار ہے اور اپنی ایمانداری کی وجہ سے کامران کے عین کا بتا دے گا.....“

مجھے تو ڈر لگنے لگا تھا۔ اچانک میرا موبائل فون بج اٹھا۔ ایک دم سے فون کی تیل ہوئی اور میری تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ میں نے برق رفتاری سے جیب سے موبائل فون نکالا، اس کی تیل بند کی۔ ان لمحات میں فون سنتے ہوئے پروفیسر نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا، جب تک میں نیچے بیٹھ چکا تھا اور بیڈ کے نیچے گھس کر لیٹ گیا تھا۔ یہ سب اس قدر سرعت سے ہوا تھا کہ لمحوں میں سب کچھ ہو گیا تھا۔ جب میں نے کال منسٹوئل آئی بند ہو گئی تھی اور میں نے اسی وقت فون سائیلنٹ پر لگا دیا۔

مجھے پروفیسر صاحب کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے فون پر کہا تھا۔ ”میں تمہیں دوبارہ کال کرتا ہوں۔“

میں نے بیڈ کے نیچے سے دیکھا کہ ان کے قدموں نے اس جگہ سے حرکت کی اور وہ چلتے ہوئے دروازے کی طرف آئے۔ وہاں کچھ دیر کے اور پھر باہر چلے گئے۔ میں نے اماں کو کال کی اور جیسے ہی رابطہ ہوا میں نے سرگوشی کی۔

”کیا بات ہے اماں.....“

”دیکھو اطمینان سے دگ کا انتظام کر لو..... لڑکی کا ماموں کا انتظار ہو رہا ہے اور وہ آدھے گھنٹے تک بیٹھ رہے ہیں۔ میں نے بھی کہہ دیا ہے کہ ظہیر ضروری میٹنگ میں مصروف ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ کوئی بات نہیں، وہ اطمینان سے آجائے۔“ اماں بتاتے ہوئے خوش تھیں اور میں نے اہم کہہ کر فون بند کر دیا۔

میں نے سوچا کہ میں جلدی سے باہر نکل کر یہاں ٹھکنے کی کوشش کروں لیکن اسی وقت پروفیسر کی ٹانگیں دکھائی دیں اور وہ دروازے کے پاس رگ گئے۔ پھر مجھے اس کی آواز آئی۔

”فون کی تیل مجھے اپنے قریب سے سنائی دی تھی۔“

”ہوسکتا ہے آپ کے کان بج رہے ہوں۔“ ایک نسوانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”میرے کان ہیں کھنٹیاں۔“ پروفیسر نے ناگواری سے کہا۔

”آپ نے پورا گھر دیکھ لیا ہے۔ کوئی نظر آیا آپ کو؟“

نسوانی آواز پھر آئی۔

”کچھ نظر نہیں آیا۔“

”پھر اطمینان سے بیٹھ کر فون کریں۔ آپ کا وہر ہوگا۔“ نسوانی آواز سنائی دی۔ میں نے پوری کوشش کی کہ دگ سکوں کہ کمرے میں جو خاتون ہیں، وہ کہاں کھڑی ہیں لیکن مجھے محض پروفیسر صاحب کی ہی دوباس ٹانگیں دکھائی دے رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ، میرے لیے چائے بنا کر لاؤ۔“

پروفیسر یہ کہتے ہوئے اس کرسی کی طرف بڑھے جہاں وہ پہلے براجمان تھے۔ خاتون نے تنک کر جواب دیا۔

”مجھ سے نہیں بنتی چائے..... خود بنالیں۔“

”تم ہو بڑی بدتمیز.....“

”بدتمیزی آپ سے ہی سیکھی ہے۔“

پروفیسر صاحب چپ ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ کسی خاتون کی آواز بھی اسی کمرے سے آرہی تھی لیکن مجھے اس خاتون کی ٹانگیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ پروفیسر صاحب کھڑے تھے پھر ان کی آواز آئی۔ انہوں نے پھر موبائل فون پر رابطہ کیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”ہیلو..... ہاں..... میں تمہارے پاس آتا ہوں۔ بیٹے کربات کرتے ہیں۔ راشد کو قتل کرنے کا تم بھی اچھی طرح سے سوچ لو..... میں آ رہا ہوں..... کیا تم آؤ گے؟ چلو تم آ جاؤ، میں انتظار کر رہا ہوں.....“ انہوں نے فون بند کر دیا۔

سنائی دی اور میں وہاں پہنچا اور سوچنے لگا کہ کہاں جاؤں۔ سیزھیوں کے نیچے ہاتھ روم کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے وہ دروازہ کھولا اور اندر جا کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے میں ایک سوراخ بھی تھا جس کی مدد سے میں آسانی سے باہر دیکھ سکتا تھا۔

مجھے پروفیسر صاحب کی آواز سنائی دی۔ ”سیزھیوں کا دروازہ کھلا ہوا ہے..... اس کا مطلب ہے وہ بدتمیز ہمسایہ جو مجھ سے دگ لینے آیا تھا، وہ اس راستے سے آیا اور میری دگ اٹھا کر لے گیا اور وہ موبائل کی بیل بھی اسی کی تھی۔ اسے لڑکی والے دیکھنے کے لیے آ رہے تھے دگ لینا اس کی مجبوری تھی اس کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔“

میں حیران تھا کہ پروفیسر صاحب نے کس تیزی سے اندازہ بھی لگایا تھا اور بات کی تک نہ بھی پہنچ گئے تھے۔ اس کے دو ہی مطلب ہو سکتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ پروفیسر صاحب غیر معمولی ذہین تھے اور یا پھر وہ واقعی بھوت تھے۔

اجانک وہ بولے۔ ”میں ابھی اس کے گھر جاتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ چوری کا انجام کیا ہوتا ہے۔“ یہ سن کر تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ اگر پروفیسر صاحب نے وہاں ہنگامہ کھڑا کر دیا تو میری عزت خاک میں مل جائے گی۔

”آپ اس کے گھر جا سکتے ہیں؟“ خاتون کی آواز آئی۔

”اور کیا سیر کو جا رہا ہوں؟“ پروفیسر صاحب غصے سے بولے۔

”کیا ثبوت ہے آپ کے پاس کہ وہ ایسا اٹھا کر لے گیا ہے۔“ خاتون نے میری دانست کے مطابق عقل کی بات کی تھی۔

”کیونکہ وہ وہی مانگے آیا تھا۔“

”یہ تو کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اٹنا ان کے گھر جانے پر اگر وہ آپ کے گلے پڑ گئے تو پھر.....؟“

”پھر کیا کروں؟“

”جھک سہ کام لیں۔ اندر آئیں بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔ کسی کے دروازے پر جا کر ہنگامہ کرنے کے بجائے بات کرنے کا دوسرا طریقہ بھی ہو سکتا ہے۔“ خاتون نے کہا تو مجھے لگا کہ پروفیسر صاحب چل رہے ہیں۔ میں نے تھوڑا سا دروازہ کھولا تو پروفیسر صاحب بیڈ روم کی طرف جا رہے تھے۔ جیسے ہی وہ اندر گئے، میں ہاتھ روم سے باہر نکلا اور اوپر کی طرف دوڑ لگا دی۔

چھت پر جاتے ہی میں نے دیوار پھلانگی اور اپنی چھت پر چلا گیا۔ میں سیدھا ہاتھ روم میں گیا تو اماں کا فون آگیا۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ؟“ اچانک وہ نسوانی آواز بھڑکی اور میں نے چونک کر نیچے اپنی نگاہیں دوڑائیں کہ شاید مجھے اس کی بھی ٹانگیں دکھائی دے جائیں لیکن مجھے پروفیسر صاحب کی ٹانگوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”جنہم میں جا رہا ہوں۔“ پروفیسر صاحب نے اکتا کر کہا۔

”آپ روز بھی کہہ کر جاتے ہیں اور پھر واپس آ جاتے ہیں۔ وہ آپ کو واپس آنے کیسے دیتے ہیں؟“ خاتون کی آواز میں غصہ تھا۔

”مجھے تعلق کی وجہ سے.....“ پروفیسر صاحب بیڈ کے ارد گرد چکر کاٹ رہے تھے۔ اب پتا نہیں جانے سے پہلے وہ کوئی جگہ کاٹ رہے تھے۔ پھر مجھے کچھ چیزیں ادھر سے ادھر کرنے کی بھی آوازیں آنے لگیں۔

پھر اچانک پروفیسر صاحب کی پریشان سی آواز آئی۔ ”ادھر آؤ اور دیکھو کہ میری دگ کہاں گئی ہے۔“

”اور کتنا ادھر آؤں..... آپ کے ساتھ تو کھڑی ہوں۔“ خاتون کے اس جواب نے مجھے چونکانے کے ساتھ

ساتھ ڈرا بھی دیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ ان کے ساتھ ہی کھڑی ہے جبکہ مجھے بیڈ کے نیچے سے صرف پروفیسر صاحب کی دو ٹانگیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ اگر وہ خاتون ان کے پاس تھی تو اس کی دو ٹانگیں کہاں تھیں؟ یہ سوچ کر مجھے تو خوف آنے لگا تھا۔

مجھے کمرے میں پھر پھل سی محسوس ہوئی۔ یقیناً پروفیسر صاحب اپنی دگ تلاش کر رہے تھے۔ پھر مجھے ان کی دو ٹانگیں پورے کمرے میں گھومتی دکھائی دیں اور وہ غصے سے بولے۔

”میں نے یہاں دگ اتار کر رکھی تھی..... کہاں چلی گئی..... کوئی بھوت لے گیا ہے کیا.....؟“

”تم سے بڑا کوئی بھوت ہے اس گھر میں۔“ خاتون کی آواز نے میرے جسم میں سنسنی سی پھیلا دی اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ پروفیسر انسان نہیں بلکہ بھوت ہی ہے اور جو خاتون اس کے ساتھ باتیں کر رہی ہے، وہ بھی کوئی چیزیل ہے اس لیے تو وہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ پروفیسر صاحب ایک جگہ کھڑے تھے۔ شاید وہ کچھ سوچ رہے تھے پھر اچانک وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں اسی وقت بیڈ کے نیچے سے لٹلا، کمرے میں دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دروازے کے پاس جا کر باہر جھانکا..... مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اوپر جانے کے لیے سیزھیوں کی طرف دوڑا، ابھی اسی وقت مجھے اوپر سے کسی کے اترنے کی آواز

”جلدی آجاؤ۔ اس کے ماموں بھی آگئے ہیں۔“
 ”میں نے دُک کا انتظام کر لیا ہے، بس دس منٹ میں
 تیار ہو کر آرہا ہوں۔“ میں نے کہا اور جلدی سے شیو
 کی، کپڑے تبدیل کیے، وہ دُک اپنے سر پر جمائی اور آئینے
 میں اپنا جائزہ لیا۔ بالکل بھی نہیں لگتا تھا کہ میرے سر پر دُک
 ہے۔ میں مسکراتا ہوا نیچے چلا گیا۔

جونہی میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا چونک گیا کیونکہ
 پروفیسر صاحب سر پر ٹوپی رکھے ایک طرف براجمان تھے۔
 انہوں نے میری طرف دیکھ کر ایک معنی خیزی مسکراہٹ عیاں
 کی۔ میں نے سب کو سلام کیا اور بیٹھتے ہوئے ابا سے آہستہ
 سے پوچھا۔

”پروفیسر صاحب یہاں کیا کر رہے ہیں؟“
 ”انہوں نے ٹیل دی، میں باہر گیا تو مجھے بولے کہ اگر
 مجھے اندر لے کر نہیں گئے تو میں یہیں ہنگامہ کھڑا کر دوں گا کہ
 آپ کے بیٹے نے میرے گھر چوری کی ہے۔ میں انہیں اندر
 لے آیا اور اپنا بہت اچھا ہمسایہ بتا کر انہیں یہاں بٹھا دیا۔“ ابا
 نے سر کوٹھی میں مجھے ساری روداد بیان کی تو میں بیٹھ گیا۔

پہلی بار میں لڑکی والوں کو اپنا چہرہ دکھا رہا تھا۔ وہ چہرہ
 جسے وہ اپنی بیٹی کے لیے پسند کرنے آئے تھے۔ میرے اندر
 کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا، لیکن مجھے یہ خوف بھی محل کر سکرانے
 نہیں دے رہا تھا کہ جانے پروفیسر صاحب یہاں کیا گل کھلا
 دیں کہ میرا رشتہ ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے۔

وہ مجھ سے گپ شپ کرتے رہے، مختلف سوال پوچھتے
 رہے۔ چائے کا درود بھی چلتا رہا اور پھر اچانک پروفیسر صاحب
 اُٹھ کر میرے بالکل برابر میں براجمان ہو گئے۔ جب اماں
 اور ابا ان مہمانوں کے ساتھ باتوں میں مشغول تھے تو پروفیسر
 صاحب نے مجھ سے سر کوٹھی کی۔

”ان کو بتاؤں کہ جس لڑکے سے آپ اپنی بیٹی کا رشتہ
 طے کر رہے ہیں، وہ گنجاب ہے اور وہ میرے گھر سے میری دُک
 چوری کر کے اپنے سر پر جمائے بیٹھا ہے؟“

”آپ بتائیں گے تو میں بھی بتا دوں گا کہ آپ کسی
 راشد کو قتل کرنے والے ہیں۔ اس کے بعد آپ سحرش کے
 باپ کو بھی مار دیں گے۔ آپ پروفیسر کے روپ میں جرائم پیشہ
 ہیں۔“

میری بات سن کر پروفیسر صاحب کا منہ کل سا گیا اور وہ
 مجھے اس طرح حیرت سے دیکھنے لگے جیسے میں نے ان کے
 ہاتھ سے چائے کا کپ چھین لیا ہو۔

”پہلے تو آپ کا بیٹا بہت پسند ہے۔ ہماری طرف سے

تو ہاں ہے۔ اب آپ ہمارے گھر تشریف لائیں۔“ اچانک
 وہ جو لڑکی کا ماموں تھا، اس نے ایسا اعلان کیا کہ مجھے سمجھ نہ آئی
 کہ میں خوشی مناؤں کہ افسردہ منہ بنا کر بیٹھ جاؤں کیونکہ
 میرے برابر میں بیٹھے ہوئے پروفیسر صاحب میرے لیے کچھ
 اچھا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

”میں ابھی تمہارا بھانڈا پھوڑتا ہوں۔“ پروفیسر
 صاحب نے اچانک کہا۔

”اور میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔“ میں نے بھی
 دھمکی دی۔

”کچھ لوگ سر سے بالکل سمجھتے ہوتے ہیں اور انہوں نے
 دُک لگائی ہوتی ہے۔“ اچانک پروفیسر صاحب بولے اور وہاں
 موجود ہر ایک نے ان کی طرف حیرت سے دیکھنا شروع
 کر دیا۔ اماں اور میں تو پروفیسر صاحب کی طرف ایسے دیکھ
 رہے تھے جیسے انہوں نے اچانک پتول نکال کر ہم پر تان لیا ہو۔
 ”بھائی جی، ہم آپ کی بات کا مطلب نہیں
 سمجھتے۔“ لڑکی کے ماموں نے بڑی معصومیت سے دریافت
 کرنا چاہا۔

پروفیسر صاحب نے میری طرف گھوم کر اپنی شہادت
 کی انگلی اٹھائی اور کچھ کہنے ہی والے تھے کہ میں نے کوئی لمحہ
 ضائع کیے بغیر پیچھے موجود شیلف میں پڑی بھاری بھر کم
 ڈکٹری اٹھائی اور پروفیسر صاحب کے سر پر پورے زور سے
 مار دی۔ بے چارے پروفیسر صاحب خیم ڈکٹری کا دار
 برداشت نہ کر سکے اور بے ہوش ہو گئے جبکہ یہ منظر دیکھ کر سب
 مہمان ہنسنے لگے۔

میں نے کہا۔ ”گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ یہ دماغی
 طور پر بیمار شخص ہیں اور ہمارے ہمسائے ہیں۔ جیسے ہی ان کی
 طبیعت خراب ہونے لگتی ہے اگر ان کے سر پر ہلکی سی چوٹ لگا
 دی جائے تو یہ کچھ دیر اسی طرح پڑے رہنے کے بعد ٹھیک
 ہو جاتے ہیں۔“

میری وضاحت سے مہمانوں کی تسلی ہوئی کہ انہیں البتہ
 وہ مسکرائے اور اماں ابا کو جلد اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر
 ڈرائنگ روم سے نکل گئے۔ میں بھی پیچھے ہی چل پڑا۔

جاتے ہوئے بھی مہمان باتیں کر رہے تھے اور میں
 یہ دیکھنے کے لیے کہ پروفیسر صاحب کا کیا حال ہے ڈرائنگ
 روم کی طرف بڑھا تو مجھے خاتون کی آواز سنائی دی، اسی
 خاتون کی جس کی آواز میں نے پروفیسر صاحب کے گھر میں
 سنی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”میں نے کہا بھی تھا کہ مت جاؤ ان کے گھر۔“

”کیونکہ تم نے میری بیوی کی آواز سن لی تھی۔“ انہوں نے انکشاف کیا۔ ”اور مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوا کہ تم نے میری بیوی کی آواز کیوں سنی۔“

میں حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا پھر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ وجہ یہ تھی کہ میں جان گیا تھا کہ آپ راشد کو قتل کرنا چاہتے تھے۔“

انہوں نے میری طرف دیکھا اور مجھے ایک دوسری شلف کی طرف لے گئے۔ انہوں نے سامنے اشارہ کیا تو وہاں ایک درجن سے زیادہ ناول لگے ہوئے تھے جن پر مصنف کا نام غلیل احمد لکھا ہوا تھا۔ پھر ایک ناول نکال کر انہوں نے اس ناول کی پشت پر اپنی تصویر بھی دکھائی اور بولے۔

”میں ناول نگار ہوں۔ جہاں تم کھڑے ہو یہ میرے پبلشر کی دکان ہے۔ اس دن میں اپنے اسی پبلشر سے کہانی کے کردار راشد کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ چاہو تو وہ سامنے بیٹھے ہیں، ان سے پوچھ لو۔“

میں ان کی بات سن کر اور بھی حیران ہو گیا تھا۔ پہلی بار مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وہ ناول نگار ہیں۔

”آپ کی بیوی کی میں نے صرف آواز سنی تھی۔ اتنی سی بات آپ سے برداشت نہیں ہوئی؟“ میں نے پوچھا۔

وہ کچھ توقف کے بعد بولے۔ ”مجھے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ ہماری پندرہ سالہ رفاقت ہنسنے مسکراتے، ٹوک جھوک کرتے گزری تھی۔ وہ اچانک مر گئی اور میں اکیلا رہ گیا۔“

پروفیسر صاحب اتنا کہہ کر اداس ہو گئے اور میں اور بھی شدید رورہ گیا کہ اگر ان کی بیوی مر چکی تھی تو وہ جو باتیں کرتی تھی، وہ کون تھی؟

پھر انہوں نے مزید کہہ کر مجھے اور بھی حیران کر دیا۔ وہ بولے۔ ”میں اپنی بیوی سے روز باتیں کرتا ہوں۔۔۔۔۔ وہ میری تنہائی میں آتی ہے جس کا صرف مجھے پتا ہے۔۔۔۔۔ کسی اور کو نہیں۔۔۔۔۔ لیکن تم کو پتا چل گیا اور تم نے اس کی آواز بھی سن لی۔۔۔۔۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ مر چکی ہیں اور آپ کی تنہائی میں آتی ہیں۔ آپ ان سے باتیں کرتے ہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔۔۔“ میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو رہا تھا۔

وہ مجھ پر یہ انکشاف کر کے اور مجھے مزید حیرت کے سمندر میں دھکیل کر اپنے پبلشر کے پاس چلے گئے۔ میں دم بخود کھڑا تھا۔۔۔۔۔ ان کے الفاظ کچھ اس طرح تھے۔

”میں تنہائی میں اپنی مرحومہ بیوی کی ہو بہو آواز میں خود باتیں کرتا ہوں۔۔۔۔۔ بھی اپنی آواز میں اور بھی اس کی آواز میں۔۔۔۔۔“

”جھوٹ مت بولو۔۔۔۔۔ تم نے ہی مجھے کہا تھا کہ اس طرح سے ان کے گھر جاؤ۔“ پروفیسر صاحب کی آواز آئی۔ میں تو ڈر گیا تھا کہ پروفیسر صاحب تو اکیلے ہی تھے پھر وہ خاتون کیسے آگئی؟ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں اندر جا کر ان کو دیکھ سکوں۔ میرے قدم دروازے پر ہی جم گئے تھے۔

کچھ وقت اور گزر رہا۔ اب اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ میں نے ہمت کی اور آہستہ سے اندر کی طرف بڑھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اندر کوئی بھی نہیں تھا اور ہمارے ڈرائنگ کا وہ دروازہ جو باہر کی طرف کھلتا تھا، وہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پروفیسر صاحب اس دروازے سے باہر چلے گئے تھے لیکن وہ خاتون کیا اسی دروازے سے اندر آئی تھی؟ میرے لیے وہ معما بڑا حیران کن تھا۔

☆.....☆.....☆

میں، پروفیسر صاحب کی وگ واپس کرنا چاہتا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیسے وگ واپس کروں؟ مجھے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ دو، تین دن میں یہی سوچتا رہا۔ ایک دن آفس سے واپس آیا تو اماں نے بتایا کہ پروفیسر صاحب اپنا سامان لے کر کہیں چلے گئے ہیں۔

مجھے آفس بھی ہوا اور میں سوچنے بھی لگا کہ انہوں نے اچانک کرائے کا مکان کیوں چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ نہیں یہ تو نہیں ہے کہ میں ان کے قتل کے منصوبے سے آگاہ ہو گیا تھا۔ میں تو ابھی یہ بھی جانتا چاہتا تھا کہ وہ خاتون کون تھی جو دکھائی نہیں دیتی تھی؟

اس بات کو کئی دن گزر گئے تھے۔ ایک دن مجھے میرا دوست اردو بازار لے گیا۔ ایک بڑی سی کتابوں کی دکان پر وہ کچھ کتابیں خریدنا چاہتا تھا کہ اچانک میں چونک گیا۔ کیونکہ اس دکان کے مالک کے پاس پروفیسر صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی میری طرف دیکھ لیا تھا۔ وہ اٹھ کر میرے پاس آگئے اور بولے۔

”میری وگ کہاں ہے؟“

”میرے پاس ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم نے میرے سر پر بڑے زور سے ڈکٹری ماری تھی۔“ انہوں نے مسکرا کر شکوہ کیا۔

”آپ بھی تو دلن بنے جا رہے تھے۔“ میں نے کہا۔

”جانتے ہو میں اچانک وہاں سے کیوں چلا گیا تھا؟“

پروفیسر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

”کیوں چلے گئے تھے؟“ میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر پشیمانی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاٹو ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو ہونڈ پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا ... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستان حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج ... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

قسط نمبر: 7

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب

تھا۔ ایک ایسے پر عزم بازی گر کی بازی گری

..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک

دربار باطویل داستان





اس کا نام اسد علی رکھا گیا ہے ”علی“ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔ علی سلطان نکپاس (امریکا) کا ایک مستیز کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو مکمل چیز تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی ریٹائرڈ اہلین سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ وقت رخصت ریٹائرڈ اہلین کو اپنی بیوی کے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ کر کچھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمرہ مقرر ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد اور برادرزادہ کرتا تھا جو اسے اگلے لہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سکولوں و ملاقات اس کے ساتھ ہی ملی بڑھ کر وہ جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی اہل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس پر بدواً محض نے نہایت ہی خوب صورتی سے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا..... ”میرے بچے انتظار کرو۔ وقت آنے پر تمہیں سب بتا دوں گا۔“ یہ شخص علی کے محسن کو ہوا دیتی تھی لہذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے نکپاس کے علاقے انتھکٹن میں واقع ”سرکل اے“ نامی ایک اسٹور پر جڑواں ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکلا کومبی میں پچھلے ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو مسیکین لڑکے کچھ کچی کیت سے ”سرکل اے“ میں گھس آئے۔ تمام پیش لوٹنے کے بعد وہ وکیت علی کے ساتھ موجود سیکل میں نظر کو شوٹ کر گئے۔ پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شامل تفتیش کر لیا۔ علی کا دامن صاف تھا۔ پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔ بعد ازاں ان دونوں مسیکین وکیت کو گھس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج ٹیک جینکس (نیکپاس) میں تھا جیکل علی سلطان کی رہائش بے سٹی (نیکپاس) میں تھی۔ علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور ٹیک جینکس کے اکثر رہنموش میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ”وٹی لاؤنچ“ نامی ایک رہنموش میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک ہسپانوی دو شیئر شادرو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس دل کش منہ جبین نے علی کے دردل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات وٹی لاؤنچ میں جب لیونا رڈو نامی ایک مسیکین غنڈے اور اس کے حواریوں نے شادروے بدھیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔ اس باراماری کو ایک امیر وکیر انجینئر ایڈی ڈیٹیلیا نے بڑی دھچکی سے دیکھا اور اپنا زور ٹینگ کارڈ علی کو تھما کر یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی..... ”مجھے بہادر لوگ بہت پسند ہیں۔ زندگی میں جب بھی میری ضرورت محسوس کرو تو رابطہ کر لینا۔“ اس واقعے کے بعد لیونا رڈو نے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں علی اور لیونا رڈو کے غنڈوں میں گاہے بے گاہے مڈھ بھیر ہوتی رہی۔ لیونا رڈو نے اپنی تربیت کا بدلہ لینے کے لیے شادرو کو ناکرٹ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ وٹی لاؤنچ والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شادرو کی رہنموش والی جاب چھوڑا کر اسے اہل سلطان کی خدمت کے لیے مقرر میں رکھ لیا تھا۔ ایک روز جب شادرو اسیٹل اسٹورز سے گزری خریدنے کی تو لیونا رڈو نے اسے ڈھوا کر لیا۔ علی نے شادرو کی تلاش میں بہت نہ ہاری اور شادرو کو ڈھونڈتا رہا بالآخر ایک رات لیونا رڈو کا ایک قریبی ساتھی چیلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ دونوں کے بیچ خونیں معرکہ ہوا مگر چیلو، شادرو اور لیونا رڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔ علی نے پیش کے عالم میں مار مار کر چیلو کو ادھ موا کر دیا۔ آئندہ روز چیلو کے قتل کی خبر ٹیک جینکس اور اس کے قرب وجوار میں گردش کر رہی تھی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ ٹیک جینکس میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہذا علی نے اہل سلطان کو مصرت حال سے آگاہ کیا اور اپنی سرخ ہنڈائے اسپورٹ کار میں ٹیک جینکس سے پوسٹن پہنچ گیا۔ پھر سرخ ہنڈائے اسپورٹ میں قاتل کے فرار ہونے کی خبر نے علی کے ہوش اڑا دیے۔ اس سنگین صورت حال میں علی نے ڈیٹیلیا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیٹیلیا نے علی کی کھانسنے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر ٹیکسنگ باہر کی دیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بیٹھنے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر ٹیکسٹوں میں برٹن ملی پر تھیں تو ان کا ایک نیا درواہ ہوتا رہا۔ ڈیٹیلیا بہت اونچی بیچ کی مالک ایک پراسرار لڑکی تھی۔ اس نے اپنا ڈراموخی استعمال کر کے علی کو چیلو و ڈیکس سے اس طرح نکال لیا جیسے محسن سے ہال..... علاوہ ازیں ڈیٹیلیا نے شخص ثبوت کی مدد سے علی کو تیار کر لیا۔ لیونا رڈو، شادرو کو ڈھوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شادرو کو مصمت فروشی کے جنم میں جمو کھینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیٹیلیا نے علی کو یقین دلا کہ اگر وہ بہتر ٹیکسٹ پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شادرو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔ شادرو کے حصول کی خاطر علی ڈیٹیلیا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ بریٹن ہالو لہاں بیٹھنے میں ڈیٹیلیا کی سنگت میں گزرنے والے وہ ظلم ہوش ربا بہتر ٹیکسٹ بڑے سنگین، سنگین، رومان پر دور اور ناقابل یقین تھے۔ ڈیٹیلیا کی شخصیت کسی سمسے سے کم نہ تھی..... اس پر مستزاد ڈیٹیلیا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات رلی آرتک بارڈ لاڈ اور ایما اچیل بام سے علی کی ملاقات بھی کروادی۔ جب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد بیویوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ”اسکل اینڈ بوز“ سے تعلق رکھتے تھے۔ جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ لیوگ خود کو زنجی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہر عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیٹیلیا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صا کرتے ہوئے ”اسکل اینڈ بوز“ کی کینیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیٹیلیا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیٹیلیا سے بے بسی اپنے انکل سے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دکھ رہی تھی۔ انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دو برین اور سر بہت راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامریک کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرزا عامریک، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گارڈین کی حیثیت سے انہیں برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ دم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامریک نے بھی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامریک مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامریک نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس

لالوں کو تلاش کر سکتا تھا۔ اس صورت حال میں علی کا دل علی الاعلان یہ کہہ رہا تھا کہ وہ عورت اس کی ماں ہے۔ علی نے حتی الامکان سرمت۔ ہماری کی اور بوسہ لگا کر اپنی آسما۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی سنے ہنگاموں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ان پورٹ سے ایک عکسی پکڑ کر اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہوا تو ہمسایہ ڈرائیور نے اسے ویرانے میں جا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنادیا۔ اگلے ہی دن ایک سیاہوٹا ناکرولا اس کے سر پر آن پڑی۔ علی ہر نوعیت کے حالات سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔ تاہم کسی ڈرائیور ناکام رہا اور علی کے ہاتھوں درگت بخوانے کے بعد گرفتار ہو گیا۔ علی کی مدد دونوں جوانوں نے کی جن میں سے ایک کا تعلق پولیس سے تھا۔ وہ دونوں کزن تھے۔ ان میں سے ایک عظیم نامی جوان سے علی کی دوستی ہو گئی۔ اس سے دوستی ہونے پر علی کی واقعیت اس کی شکل سے بھی ہو گئی اور علی نے اپنی پاکستان آمد کے بارے میں عظیم کو بتایا کہ وہ کسی ہستی کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔ اس نے عظیم کو اپنے پاس موجود ٹیلی فون نمبر دے دیے۔ عظیم نے ان نمبر پر زنگ کیا جس میں سے ایک اس کے کسی جاننے والے کا تھا۔ عظیم کے اس استفسار پر کردہ کسی سلی ٹلی فون خاتون کو تلاش کر رہے تھے اپنی جذباتی ہو گیا اور عظیم کی کال سننے سننے اس کا ٹلی فون اس کے ہاتھ سے پھل کر بیڑ پر جا گرا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

خوشبو محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کا تصور لبو بن کر میری رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ عظیم کے منہ سے اپنی ماں کا نام سننے ہی مجھے اپنے جذبات پر اختیار نہیں رہا تھا اور شدت جذبات سے میرا ہاتھ لرز اٹھا تھا اور سیل فون ہاتھ سے نکل کر بیڑ پر جا گرا تھا۔

انسان جب کسی جذباتی کیفیت سے گزر رہا ہوتا ہے تو احساسات پر اس کا قابو نہیں رہتا چنانچہ بعض اوقات اس کا عمل اس کی مرضی اور سوچ کے طالع نہیں رہتا اور وہ بے اختیار کوئی بھی غیر ارادی حرکت کر بیٹھتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ان لمحات میں کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ جیسے ہی سیل فون میرے ہاتھ سے پھل کر بیڑ پر پہنچا، میں نے عظیم سے ہونے والی گفتگو کی رو میں اس سے سوال کیا۔

”تم میری ماں کو کیسے جانتے ہو؟“

اگلے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں نے سیل فون کے بغیر ہی عظیم سے سوال کیا ہے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سیل فون اٹھا لیا اور اسے کان سے لگا لیا۔ اسی وقت اس کی مخصوص آواز ساعت سے نکرائی۔

”اسد..... کیا ہوا..... تم چپ کیوں ہو..... سب ٹھیک تو ہے نا؟“

”عظیم! میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے سنبھلے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”ہاں، تو تم کیا کہہ رہے تھے؟“

”میں نے تم سے یہ پوچھا تھا کہ تمہیں جس ہستی کی تلاش ہے، کیا اس کا نام سلی ہے؟“ اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہاں..... بالکل۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے سلی صاحبہ کی تلاش ہے اور میں دراصل ان سے ملاقات کرنے کے لیے ہی کراچی آیا ہوں۔ اس سے پہلے وہ جن جالیں افراد کے توسط سے کسی نہ کسی طرح مجھ سے رابطے میں تھیں، ان سب کے سیل نمبرز

میں کوئی تا تو اس اور خفیہ و نزار انسان نہیں تھا کہ عظیم کی زبان سے ادا ہونے والا ایک جملہ مجھ پر پکچھی طاری کر دیتا۔ عظیم کا استفسار محض ایک فقرہ نہیں تھا۔ اس جملے میں ایک ایسی ہستی کا نام بھی شامل تھا جو میری زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل تھی اور..... وہ ہستی تھی سلی..... میری ماں!

ماں کا اپنی اولاد کے ساتھ بڑا گہرا جذباتی رشتہ ہوتا ہے۔ مالک اور بندے کے تعلق کے بعد یہ رشتہ دنیا کا سب سے مضبوط تعلق ہے۔ مالک اور ماں کے درمیان ایک چیز قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے اور وہ شے ہے..... دونوں کا ”خالق“ ہونا۔ مالک کائنات کی ہر چیز کا خالق ہے اور مالک ہی کے حکم پر ایک ماں اپنی اولاد کو جنم دے کر ”خالق“ کا ٹائٹل حاصل کر لیتی ہے۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنی ماں کی گود میں پروان چڑھتے ہیں اور ساری زندگی انہیں اپنی ماں کا ساتھ میسر رہتا ہے۔ میں بیس سال کا ہونے والا تھا لیکن آج تک میں نے اپنی ماں کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ مجھے تو اپنی ماں کی آغوش کی نری اور گرمی بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ میں مست کی کیف آذر نور ماہٹ اور سکون بخش گرماہٹ سے نا آشنا تھا۔ میں اس کے لاڈ پیار اور محبت کو ترسا ہوا تھا۔ انیس سال کی مدت کوئی کم عرصہ نہیں ہوتا۔ میں نے یہ روز و شب کس تنگی میں گزارے تھے، یہ میں ہی جانتا تھا یا میرے مالک کو اس کیفیت کی خبر تھی۔ میں نے برسوں اپنے والدین سے ملاقات کا انتظار کیا تھا اور اب جا کر میرے اس اذیت ناک انتظار کو بریک لگے تھے۔ افسوس! کہ میں اپنے باپ سے کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ وہ کسی دشمنی کی جھینٹ چڑھ کر اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ میری امیدوں کا آخری سپہارا میری ماں ہی تھی جو اب مجھ سے چند قدموں کی دوری پر تھی۔ یہی وجہ تھی، پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مجھے ماں کی

میں نے تمہیں دیے تھے اور تم نے بتایا ہے کہ ان میں سے انیس نمبر زربا نہ نہیں کر رہے۔ صرف ایک نمبر ایسا ہے جو تمہارے کسی جاننے والے کا ہے۔ تم نے اس شخص کا نام نزاکت بتایا ہے۔“

”ہاں، نزاکت شاہ کا نمبر میرے پاس فیڈ تھا۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”اس لیے میں نے جیسے ہی تمہارا دیا ہوا چالیس واں نمبر لگایا تو اس نمبر کے بجائے سیل فون کی اسکرین پر نزاکت شاہ کا نام ابھر آیا۔“

”ٹھیک ہے۔ تمہاری بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”نزاکت شاہ سے تمہاری دوستی یا کوئی اور تعلق ہو سکتا ہے مگر تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ مجھے جس خاتون ہستی کی تلاش ہے، اس کا نام سسلی ہے؟“

”ارے یار! جب تم نے چالیس فون نمبر والی لسٹ مجھے تھمائی تھی تا تو اس کے ساتھ ہی تم نے مجھے ان کے حوالے سے تھوڑی تفصیل بھی بتائی تھی کہ تمہیں ان چالیس سیل فون نمبر کے ذریعے جس ہستی تک پہنچنا ہے وہ کسی نہ کسی طرح ان چالیس افراد کے ساتھ وابستہ رہی ہے۔ یہ معلومات میرے ذہن میں محفوظ تھیں چنانچہ۔“ وہ سانس ہوار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”جب میرے سیل فون کی اسکرین پر نزاکت شاہ کا نام ظاہر ہوا تو مجھے فوراً یاد آ گیا کہ وہ کسی سسلی نامی عورت کے پاس ملازم تھا اس لیے میں نے تم سے کوئی کے انداز میں وہ دو سوال کیے تھے کہ..... کیا وہ کوئی خاتون ہے؟ کیا اس ہستی کا نام سسلی ہے؟“

”اوہ اچھا۔“ میں نے جلدی سے کہا پھر پوچھا۔ ”کیا نزاکت شاہ سے تمہاری بات ہوئی ہے؟“

”نہیں اسد۔“ اس نے بتایا۔ ”دوسری طرف سے وہی ریکارڈنگ سنائی دی جس کا ذکر تم نے کیا تھا، فون انیڈ نہیں ہو سکا۔“

”کیا نزاکت شاہ تمہارا کوئی قریبی ہے؟“

”کوئی خاص نہیں۔ بس مبینے میں ایک آدھ بار ہماری ملاقات ہو جاتی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”نزاکت شاہ دراصل میرے ایک دوست سہیل کا دوست ہے۔ میں نزاکت کو سہیل ہی کے توسط سے جانتا ہوں۔“

”اچھا اچھا۔“ میں نے کہا۔ ”آخری مرتبہ نزاکت شاہ سے تمہاری ملاقات کب ہوئی تھی؟“

”کم و بیش دو ماہ پہلے۔“ اس نے بتایا۔

”جب تمہیں یہ معلوم ہے کہ نزاکت شاہ کسی سسلی نامی عورت کے پاس کام کرتا ہے تو پھر تم یہ بھی جاننے ہو گے کہ سسلی صاحبہ کرتی کیا ہیں۔ مطلب، ان کا کیا کاروبار ہے، وہ کہاں رہتی ہیں، میں ان سے کہاں ملاقات کر سکتا۔۔۔۔۔ ہوں؟“

”نن..... نہیں.....“ وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں یہ سب نہیں جانتا۔ مجھے سسلی کے بارے میں اتنی زیادہ جان کاری نہیں ہے۔“

”اگر جان کاری نہیں ہے تو پیدا کرنے کی کوشش کرو تا یار۔“ میں نے اضطرابی انداز میں کہا۔ ”میں صبح ان خاتون سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں بلکہ اگر ممکن ہو تو میں اس وقت بھی ان سے ملنے کے لیے جانے کو تیار ہوں۔“

”اوہ..... اتنی بے قراری۔“ وہ چپک کر بولا۔ ”گنا ہے، سسلی صاحبہ کی تمہاری زندگی میں بہت زیادہ اہمیت ہے اسی لیے تم ان سے ملنے کے لیے امریکا سے یہاں چلے آئے ہو۔“

”تمہاری سوچ سے بھی زیادہ اہمیت!.....! میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس وقت میرے دل و دماغ کی کیا حالت ہے۔“

”تم مجھے اپنا دوست مانتے ہو نا.....؟“ اس نے سوال کیا۔

”میں نے جواب دیا۔ ”اس میں کیا شک ہے۔“

”تو پھر یقین کر لو کہ مجھے یہ خوبی اس بات کا اندازہ ہے کہ ان لمحات میں تمہاری دلی کیفیات کیا ہیں۔“ اس نے اپنا تپ بھرے لہجے میں کہا۔ ”جذبات میں ڈوبی ہوئی تمہاری آواز اور اس آواز کا اتار چڑھاؤ تمہارے معاملات دل کی کہانی سنار ہے۔ تم تیرہ، چودہ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اگر کسی ہستی سے ملنے یہاں آئے ہو تو اس کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ..... وہ ہستی تمہاری زندگی کا مرکز و محور ہے اور اس سے ملاقات کرنا تمہارا مقصد حیات!“

”تم نے ہو یہ ہو میرے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی ہے۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا پھر پوچھا۔ ”عظیم! اگر نزاکت شاہ کا فون انیڈ نہیں ہو رہا تو کیا کسی دوسرے ذریعے سے تم اس سے رابطہ کر کے سسلی صاحبہ کے بارے میں معلومات حاصل نہیں کر سکتے۔ تم میرا اشارہ سمجھ رہے ہو نا.....؟“

”بالکل سمجھ رہا ہوں یار۔“ وہ دوستانہ انداز میں

”جیک لیک کی حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن میں سونے جاگنے کے لیے اس کیفیت کا محتاج نہیں ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے اپنی نیند پر پورا اختیار حاصل ہے۔“

”جیک لیک“ ایک خاص قسم کی اصطلاح ہے جو ”سونے جاگنے“ کی عادت کے حوالے سے استعمال کی جاتی ہے۔ جب کوئی مسافر ہزاروں کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچتا ہے اور ان دونوں ملکوں کے مقامی وقت میں چھ سات گھنٹے سے زیادہ کا فرق ہوتا ہے تو وہ نئی جگہ پہنچ کر پرانی جگہ کی روٹین کے مطابق ہی سوتا اور جاگتا ہے۔ کراچی اور یوسٹن کے مقامی وقت میں دس گھنٹے کا تفاوت تھا لہذا ”جیک لیک“ کے اصول کے مطابق چند روز تک کراچی میں مجھے دن میں نیند آنا بھی اور رات میں مجھے جاگنا تھا۔ ہاں..... اگر کسی بھی طرح پہلے دن زبردستی مقامی وقت کے مطابق انسان سونے میں کامیاب ہو جائے تو بھر وہ ”جیک لیک“ کی کیفیت سے آزاد ہو جاتا ہے اور مجھے وہی کرنا تھا۔

”گریٹ.....“ وہ سراپنے والے انداز میں بولا۔ ”تم آرام کرو۔ جو بھی صورت حال ہوگی، میں تمہیں اپ ڈیٹ کر دوں گا۔“

”تحذیک یو عظیم“ میں نے بدول سے کہا۔ ”اور اگر میں تم سے رابطہ نہ کروں تو کچھ لینا کہ سحری میں میری سہیل سے بات نہیں ہوگی۔“ اس نے کہا۔ ”لہذا ہم دس گیارہ بجے اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔ اوکے!“

”اوکے..... ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ عظیم سے سیلولر رابطہ موقوف ہوا تو میرا دل پلیوں اچھل رہا تھا۔ اس نے مجھے بہت بڑی خوشخبری سنائی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی مجھے میری ماں کا سراں مل جائے گا۔ اگر زکرت شاہ بھی عظیم کا جاننے والا تھا اور وہ عظیم کے کسی دوست سہیل سے بہت قریب تھا تو پھر سہیل کے توسط سے لازمی مجھے میری ماں کا پتا ٹھکانا معلوم ہو جانا تھا۔ میں جب یوسٹن سے روانہ ہوا تھا تو اس وقت میرے ذہن میں یہی تھا کہ ان چالیس سیل نمبرز، مئی ٹرانسفر کی رسیدوں، پرائیویٹ اسپتالوں کے برتھ ریکارڈ چیک کرنے اور دیگر دسیلوں حیلوں کی مدد سے اپنی ماں کو تلاش کرنے میں مجھے ہفتہ دس دن یا ایک مہینا لگ جائے گا لیکن چوبیس گھنٹے سے پہلے میں اپنی ماں کے بہت قریب پہنچ گیا

بولا۔ ”تم سہیل کی طرف اشارہ کر رہے ہو کیونکہ سہیل کے براہ راست زکرت شاہ سے دوستانہ تعلقات ہیں۔“

”ہاں، بالکل۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ اب میں مکمل طور پر خود کو سنبھال چکا تھا۔ چند لمحات کے لیے میں جس جذباتی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا، اب میں اس بھنور سے نکل آیا تھا اور بالکل نارمل انداز میں عظیم سے بات کر رہا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی اطمینان ہو گیا کہ میرے وہ الفاظ عظیم کی سماعت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے جب بے اختیار میں نے اس سے پوچھا تھا..... تم میری ماں کو کیسے جانتے ہو؟

اگر عظیم نے میرے یہ الفاظ سن لیے ہوتے تو اس حوالے سے اب تک وہ مجھ سے درجنوں سوال کر چکا ہوتا۔ عظیم کا اس ایٹوکوچ نہ کرنا اس امر کی دلیل تھی کہ میرے وہ استفسار یہ الفاظ اس تک نہیں پہنچے تھے اور شاید اس کا سبب یہ تھا کہ ان نازک لمحات میں میرا سیل فون مجھ سے کچھ دور، بیڈ پر پڑا تھا۔

”یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“ عظیم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ”میں سہیل سے بات کر کے یہ ساری معلومات حاصل کر سکتا ہوں لیکن اس کے لیے تمہیں کم از کم تین گھنٹے اور زیادہ سے زیادہ دس گھنٹے انتظار کرنا ہوگا۔“

”اس تاخیر کی کیا وجہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”یار! اس وقت رات کا ایک بج رہا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”رمضان کا مہینا شروع ہو چکا ہے۔ کل پہلا روزہ ہے۔ تین بجے تک لوگ سحری کے لیے انٹیں گے تو بھی رابطہ ہو سکے گا۔ ابھی نیند سے کسی کو جگانا مناسب نہیں ہوگا اور وہ جو میں نے زیادہ سے زیادہ دس گھنٹے کی بات کی ہے نا تو اس کی منطق یہ ہے کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں، سہیل روزے نہیں رکھتا لہذا اس کا سحری میں بیدار ہونا ممکن نہیں۔ وہ اپنے معمول کے مطابق، صبح آٹھ، نو بجے ہی سوکراٹھے گا۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ”تو یہ بات ہے۔“

”برو ای جی مامی آہیں نہ بھرو۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”رمضان کے مہینے میں، میں پوری رات جاگتا ہوں اور سحری کرنے کے بعد ہی میں سونے کے لیے لیٹا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں سحری کے وقت سہیل کو ٹرائی کروں گا۔ اگر میری اس سے بات ہوگی تو میں فوراً تمہیں فون کروں گا۔ تم تو جیک لیک میں ہو۔ تمہیں تو صبح ہی نیند آئے

سن کر بے حد مسرت ہوتی کہ مجھے اپنی ماں کا سراغ مل گیا ہے۔

عظیم کا فون آنے سے پہلے میں نے انکل سے طویل گفتگو کی تھی اور انہیں یہاں کی صورت حال کے بارے میں بتایا تھا لیکن اس صورت حال میں اچانک ایک بہت بڑی تبدیلی آگئی تھی لہذا انکل سے بات کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

میں نے سیل فون سے ان کا نمبر ملایا اور کال پک ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت بے سی (یکس) میں سہ پہر کے تین بجے تھے۔ دوسری گھنٹی پر انکل نے کال ریسیو کر لی۔ میرے ”ہیلو“ کے جواب میں وہ قدرے تشویش بھرے لہجے میں بولے۔

”میرے بچے! سب خیریت تو ہے نا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو ہماری بات ہوئی ہے۔“

”انکل!“ میں نے ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”حالات میں ایسی تبدیلی آئی ہے کہ میں آپ کو فون کرنے پر مجبور ہو گیا۔“

”کیسی تبدیلی میرے بچے؟“ انہوں نے فکر مندی سے استفسار کیا۔

”آپ پریشان نہ ہوں انکل۔“ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ”تبدیلی مثبت ہے۔“

”کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔“ وہ اضطرابی لہجے میں بولے۔ ”آخر ہوا کیا ہے؟“

”آپ کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے فون کیا ہے کہ میری ماں کا سراغ مل گیا ہے۔“ میں نے مسرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”عظیم کا ایک دوست میری ماں کا ملازم ہے۔ نزاکت شاہ اس کا نام ہے۔ کل کسی وقت بھی میری اپنی ماں سے ملاقات ہو جائے گی۔۔۔۔۔ ان شاء اللہ!“

”مبارک ہو میرے بچے۔“ وہ بے حد جذباتی لہجے میں بولے۔ ”یہ تو واقعی بہت بڑی خوش خبری ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا نا۔۔۔۔۔ چوتراہ شہرے، امید بھار رکھ۔۔۔۔۔ سمجھ لو، تمہاری زندگی میں بہار کا موسم اتر آیا ہے۔“

”میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں انکل۔“ میں نے اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنی کامیابی کے لیے بہت پر امید ہوں۔“

”اللہ تمہیں فتح نصیب کرے میرے بچے۔“ وہ جذبات سے معمور لہجے میں بولے۔ ”مجھے کچھ تفصیل تو بتاؤ کہ یہ نزاکت شاہ کون ہے اور وہ تمہاری والدہ کے پاس کس قسم کی ملازمت کرتا ہے۔ تمہاری والدہ کراچی کے کس

تھا اور یہ سب عظیم کے توسط سے ہوا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس سلسلے میں ابھی تک عظیم نے کوئی عملی کوشش نہیں کی تھی لیکن یہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ مالک نے اسے میری ماں تک رسائی کا وسیلہ بنا دیا تھا۔ عظیم قدرت کی کسی مصلحت کے تحت مجھ سے ملا تھا لہذا مجھے عظیم کی اور اس کی دوستی کی قدر کرنا تھی۔

دفتر مسرت سے میری عجیب حالت ہو رہی تھی۔ گزشتہ کئی سالوں سے میں اپنے والدین سے ملنے اور ان کی شکل دیکھنے کو ترس رہا تھا، ان کی آواز سننے کے لیے میری سماعت تڑپ رہی تھی۔ عظیم کی زبانی سنائی دینے والی خوش خبری کے بعد یہ تڑپ، یہ محرومی اور یہ کک ہزاروں، لاکھوں گنا بڑھ گئی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ہوٹل کے کمرے سے نکل جاؤں، فضا میں رہتی بسی اپنی ماں کی خوشبو کو سونگھتے ہوئے میں آگے ہی آگے بڑھتا جاؤں اور میرے قدم اس وقت تک جو حرکت رہیں جب تک میں اپنی ماں کے سامنے نہ کھج جاؤں اور۔۔۔۔۔ اس کی مٹا بھری آغوش میں چھپ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر نہ ہو جاؤں۔۔۔۔۔!

فوری طور پر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ میرا اس انداز میں سوچنا جذباتی رد عمل کا نتیجہ تھا۔ یہ احساسات کی شدت کا جوش تھا جو مجھے بھی بڑجوش بنارہا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اپنی ماں کے سامنے پہنچنے سے پہلے مجھے چند مراحل سے گزرنا تھا اور ان مراحل کا فیصلہ اس وقت ہونا تھا جب عظیم مجھے فون کرتا۔

میں اس وقت اپنی عمر کی بیسویں سیڑھی پر تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اپنے والدین کے بارے میں سوچنا چلا آیا تھا۔ کم و بیش پندرہ سال سے میں اپنے والدین کی تلاش میں تھا۔ میرے انتظار کی محنت رنگ لانے والی تھی۔۔۔۔۔ بڑا گہرا رنگ!

میں ”جیک لک“ جیسی کیفیات کے سامنے مجبور نہیں تھا۔ مجھے اپنی نیند پر مکمل اختیار حاصل تھا۔ میں اپنی مرضی سے جب چاہوں، سو سکتا تھا اور جس وقت چاہوں بیدار ہو سکتا تھا۔ اس وقت رات کا ایک بج چکا تھا۔ یہ وقت کراچی والوں کے سوجانے کا تھا۔ مجھے بھی سوجانا چاہیے تھا لیکن میں دانستہ ابھی سونا نہیں چاہتا تھا۔ عظیم نے اتنی بڑی خوش خبری سنائی تھی کہ اس بات کو انکل سلطان سے شیئر کرنا بہت ضروری تھا۔ وہ میرے مربی و مہربان تھے۔ انہوں نے انیس سال تک میری پرورش و نگہداشت کی تھی۔ اس خوشی کے موقع پر میں انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں یہ

علاقے میں رہتی ہیں اور ان کے مشاغل کیا ہیں؟“

جواب میں، میں نے اکل کو عظیم سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل سے آگاہ کر دیا اور کہا۔ ”کل شام تک ساری صورت حال کل کر سامنے آ جائے گی۔ جب میں اپنی ماں کے رد برد پہنچوں گا تو سارے سوالات کے جوابات مجھے مل جائیں گے پھر میں آپ کو مزید تفصیلات بتا سکوں گا۔“

”میں مطمئن ہو گیا میرے بچے!“ وہ گہمیر آواز میں بولے۔ ”میرا مشن پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اب میرے دل میں کوئی بھی خلش باقی نہیں ہے۔ میں بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ رخصت ہو سکوں گا۔!“

”آپ کو کہاں جانا ہے اکل؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”ارے..... کہیں نہیں..... میرے بچے.....!“ وہ

جلدی سے بولے۔ ”مم..... میرا مطلب یہ تھا کہ.....

تمہاری ماں کا سراغ مل گیا۔ یہ تمہاری بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس خوش خبری نے مجھے بہت سکون بخشا ہے۔ میرا

اندرون شانت ہو گیا ہے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ اس

وقت میں کتنا خوش اور کتنا مطمئن ہوں۔ میرے اللہ نے کرم

کیا اور تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔“

”جی اکل! یہ واقعی بہت بڑی کامیابی ہے۔“ میں

نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور یہ سب میرے مالک کے حکم

سے ہوا ہے۔ آپ کو پتا ہے، ابھی ابھی میں نے کیا فیصلہ کیا

ہے.....!“

”کیا میرے بچے۔“ انہوں نے بڑے دُلا رے

پوچھا۔

”مالک کی اس مہربانی کے شکر کے طور پر روزہ رکھوں

گا۔ آج یہاں پہلا روزہ ہے۔“ میں نے بھڑائی ہوئی آواز

میں کہا۔

”اوہ..... ویری گڈ.....“ وہ سراپنے والے انداز

میں بولے۔ ”تمہارے اس فیصلے سے مجھے دلی خوشی ہوئی

ہے۔ اللہ تمہیں ہر آزمائش اور ہر امتحان میں سرخرو کرے

میرے بچے۔“

”آمین.....!“ میں نے تڑپل سے کہا۔

مزید تھوڑی دیر تک ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ جاری

رہا پھر ہم نے ایک دوسرے کو ”اللہ حافظ“ کہہ دیا۔

میں نے سیل فون کو سائڈ ٹیبل پر رکھا اور انٹرکام سے

روم سروس کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر میں نے کہا۔

”آپ کے ہوٹل میں سحری کا بندوبست بھی ہوتا

ہے؟“

”کیسی باتیں کرتے ہیں سر۔“ دوسری جانب سے

نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں کہا گیا۔ ”ہمارے ہوٹل میں

سحری اور افطاری کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔ کیا آپ روزہ

رکھیں گے؟“

”شیور.....“ میں نے جواب دیا۔

”سحری ڈائننگ ہال میں کرنا پسند فرمائیں گے یا

آپ کے روم میں سرو کر دی جائے؟“

”روم میں۔“ میں نے کہا۔

”اوکے سر!“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”آج پہلا

روزہ ہے۔ پہلی سحری کا وقت چار بج کر پندرہ منٹ پر ختم

ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ جتنے بچے حکم کریں گے، سحری

آپ کے روم میں سرو کر دی جائے گی۔“

”ساڑھے تین بجے بھجوا دیں۔“ میں نے کہا۔

”اوکے سر! آپ سحری میں کیا لینا پسند فرمائیں

گے؟“

میں نے عظیم کے گھر پر رات کو بہت ڈٹ کر ڈنر کیا

تھا۔ اس وقت مجھے کوئی خاص بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی

لیکن کھانا بھی ضروری تھا۔ میں نے روم سروس سے کہا۔

”مجھے سادہ مگر ٹھوس اور غذایت سے بھرپور سحری چاہیے۔“

”اوکے سر!“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”آپ کے

حکم کی تعمیل کی جائے گی۔“

میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ سحری کرنے کے بعد ہی

سوؤں گا۔ سحری میں اب زیادہ وقت باقی نہیں تھا۔ اس

وقت میرے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔

میرے رگ و پے میں ایک بے نام سی سنسنی دوڑ رہی تھی۔

میں نے سن رکھا تھا کہ رمضان کا مہینا بڑا برکتوں والا ہوتا

ہے۔ اس ماہ مبارک میں مالک اپنے بندوں پر خصوصی

رحمتیں نازل کرتا ہے۔ مجھے اپنے مالک پر پختہ یقین تھا اور

اس یقین کا ایک ناقابل تردید ثبوت بھی میرے سامنے تھا۔

رحمت اور برکت بھرے اس ماہ مبارک کے آغاز پر ہی

مالک نے مجھے ایک عظیم تحفے سے نوازا یا تھا، مجھے میری ماں

کا سراغ مل گیا تھا۔ کسی بچے کے لیے اس سے بڑا تحفہ اور کیا

ہو سکتا تھا کہ اسے اپنی کھوئی ہوئی ماں مل جائے۔ انیس سال

پہلے میں ماما کے جس بے بہا خزانے سے محروم ہو گیا تھا،

چند گھنٹے بعد مجھے وہ حاصل ہونے والا تھا۔ اس کرم نوازی پر

میں مالک کا جتنا بھی شکر ادا کرتا وہ کم تھا۔ ایک فوری خیال

کے تحت میں اٹھا اور واش روم میں داخل ہو گیا۔
میں نے نہایت ہی اہتمام کے ساتھ وضو کیا پھر جائے نماز پر کھڑے ہو کر گھرانے کے دو اظہار ادا کیے۔ اس کے بعد سجدے میں گر کر زار و قطار رونے لگا۔ میری یہ کیفیت بے اختیاری تھی۔ اس میں میری کسی سوچ اور فیصلے کا مکمل دخل نہیں تھا۔ میں جو کچھ بھی کر رہا تھا، کسی غیبی طاقت کے زیر اثر کر رہا تھا اور وہ غیبی طاقت میرے مالک کے سوا اور کسی کی نہیں تھی۔

☆☆☆

سیل فون کی کھنٹی پر میری آنکھ کھلی گئی۔
سحری میں سونے سے پہلے میں سیل فون کی کھنٹی بند کرنا بھول گیا تھا۔ بے ساختہ میری نگاہ دیوار گیر کلاک کی جانب اٹھ گئی۔ کلاک ساڑھے بارہ کا وقت بتا رہا تھا۔ میں بہت پرسکون نیند سو رہا تھا۔ مجھے بالکل پتا نہیں چلا کہ یہ وقت کیسے گزر گیا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ساڑ ٹیبل سے فون اٹھالیا۔ وہ عظیم کی کال تھی۔
”ہیلو.....!“ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔
”برو! لگتا ہے، تم گہری نیند سو رہے تھے۔“ عظیم نے بے تکلفی سے کہا۔ ”میں نے تمہیں دو تین ایکسٹ کیے۔ جب تمہارا رپلائی نہیں آیا تو پھر میں نے کال کی ہے۔“
”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے عظیم۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں واقعی گہری نیند سو رہا تھا۔ تمہاری کال پر میری آنکھ کھلی ہے۔“
”اوہ..... آئی ایم سوری برو۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”لیکن یہ ضروری تھا۔ پاپا تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“
”تمہارے پاپا میرا انتظار کر رہے ہیں!“ میں نے الجھن زدہ انداز میں عظیم کے الفاظ دہرائے۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں؟“

”ارے یار! پاپا شوگر پیشنٹ ہیں اس لیے وہ روزہ نہیں رکھ پاتے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں فوراً گھر پر بلا لوں۔ وہ ابھی سو کر اٹھے ہیں۔ وہ ہفتہ اور اتوار کو دیر تک سوتے ہیں۔ اتوار کو ہمارے آفس کی چھٹی ہوتی ہے اور ہفتے کو ہم ذرا تاخیر سے آفس جاتے ہیں۔ ویسے پاپا نے آج پہلا روزہ ہونے کی وجہ سے آفس جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم ان کے ساتھ بیٹھ کر بریج کرو یعنی..... بریک فاسٹ + لچ ایک ساتھ۔“
”سوری عظیم! میں آپ کے پاپا کی یہ خواہش پوری

پتا نہیں، میں کب تک اپنے مالک کے حضور سجدہ ریز رہا اور مالک کی آنکھ عتایتوں و لاتعداد نوازشوں پر شکر کے آنسو بہاتا رہا۔ میرا یہ ایمان ہے کہ مالک اپنے بندوں پر بہت زیادہ مہربان ہے لیکن اکثر بندے اس کی مہربانیوں کی قدر نہیں کرتے اور جواب میں اپنی زندگی کو مشکل بنا لیتے ہیں۔ انسان اگر اس بات کو اپنی زندگی کا شعار بنالے کہ مالک نے جو عطا کر دیا، اس پر شکر اور جو عطا نہیں کیا، اس پر صبر..... تو پھر زندگی میں کوئی مسئلہ باقی نہیں رہتا۔ میں پچھلے انیس سال سے اپنے والدین کی محبت کو ترسا ہوا تھا لیکن میں نے بھی مالک سے اس محرومی کا شکوہ نہیں کیا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میری اس محرومی کے پیچھے مالک کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہے اور مالک کی مصلحتوں کو کوئی جان نہیں سکتا۔ اس کی مرضی کے سامنے سرنگوں ہونے ہی میں عافیت ہے، اس کے سامنے سربے جود ہو کر آنسو بہانے ہی میں نجات ہے اور..... میں یہی کر رہا تھا۔

دروازے پر ہونے والی دسک نے مجھے جھجکا دیا۔
یقیناً روم سروس کے ذریعے میرے لیے سحری بھجوائی گئی تھی۔ میں نے جائے نماز پر سر رکھے رکھے بے آواز بلند کیا۔
”دروازہ کھلا ہے۔ آپ سحری اندر ٹیبل پر رکھ دو۔“

اس وقت میری جو حالت تھی، میں وہ روم سروس پر آشکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ میرا اور مالک کا معاملہ تھا۔ میں اس معاملے کو کسی تھرڈ پرسن کے ساتھ شیئر کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرا چہرہ ان لحاظ میں آنسوؤں سے تر بہ تر تھا۔ یہ میرے دل کا غبار تھا، میرے ضمیر کا بخار تھا جو آنکھوں کے راستے دھل گیا تھا اور مجھے کورے لٹھے کی طرح صاف شفاف اور اُجلا بنا گیا تھا۔

میں نے اٹھ کر منہ دھویا اور سحری کرنے بیٹھ گیا۔ اس دوران میں وہ رہ کر میری نگاہ اپنے سیل فون کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی۔ مجھے عظیم کے فون کا انتظار تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر سحری میں سہیل سے اس کی بات ہوگئی تو وہ مجھے فون

”او کے.....“ میں نے اس کے پاپا کی خواہش کے سامنے ہتھیار پھینکتے ہوئے کہا۔ ”میں ریڈی ہوں۔ تم آ جاؤ۔“

”دش گڈ۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”عظیم! میرے کام کا کیا ہوا؟“

”کون سا کام؟“ الٹا اس نے مجھ سے سوال کیا۔

”ارے یار! میں نزاکت علی اور سہیل والے معاملے

کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”کیا تمہاری

ان دونوں میں سے کسی سے بات ہوئی؟“

”ہاں، بات ہوئی ہے۔“ وہ سرسری لہجے میں بولا۔

”پھر.....“ میں نے انہیں خطراری لہجے میں استفسار کیا۔

”کیا پتا چلا سکی صاحبہ کے بارے میں؟“

”فون پر کیا بتاؤں یار۔“ وہ ٹالنے والے انداز میں

بولا۔ ”تھوڑی دیر میں ہم مل رہے ہیں پھر اطمینان سے

بات کرتے ہیں۔“

میں نے ضد کرنا مناسب نہیں سمجھا اور کہا۔ ”او کے!“

میں اگلے چندہ بیس منٹ میں فریش ہو کر ہوٹل کے

رہنشین پر پہنچ چکا تھا۔ چیک آؤٹ ہونے کے پروس

میں دس منٹ لگے ہوں گے۔ ایک خاص اماؤنٹ کاٹ کر

باقی کی رقم مجھے واپس کر دی گئی۔ اس ہوٹل میں میری تین

دن کی بکنگ تھی لیکن سونے اتفاق کہ میں نے وہاں صرف

ایک روز قیام کیا تھا۔ میں اس تمام تر کارروائی سے فارغ

ہو کر لائی میں آ بیٹھا اور عظیم کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد عظیم میرے پاس پہنچ گیا۔ آئندہ

چند منٹ کے بعد میں گاڑی میں بیٹھا اس کے گھر کی جانب

رواں دواں تھا۔ خلاف معمول عظیم مجھے خاصا چپ چپ

لگا۔ میں نے پوچھا۔

”عظیم! تمہارے ساتھ کوئی پر اہلم ہے کیا؟“

”نہیں تو۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”تم ایسا کیوں سوچ

رہے ہو؟“

”آج تم کافی خاموش دکھائی دیتے ہو.....“

”شاید یہ روزے کے اثرات ہیں۔“ وہ وضاحت

کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”تمہیں تو پتا ہی ہے،

میں اسموکنگ کرتا ہوں۔ تمباکو نوشی کرنے والوں کو روزہ ذرا

سست کر دیتا ہے۔“

”ہاں..... ایسا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا پھر پوچھا۔

”کیا تمہاری اپنے دوست سہیل سے بات ہو گئی ہے؟“

”ہاں، اس سے میرا رابطہ ہو گیا ہے۔“ اس نے

نہیں کر سکتا۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔

”ارے یار! تم فکر نہیں کرو۔ میں تمہیں لینے آ رہا

ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”بس تم فریش ہو جاؤ۔“

”میں تمہارے گھر آنے کے لیے فکر مند نہیں ہوں

عظیم.....“

”پھر کیا بات ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”یار! میرا روزہ ہے۔“ میں نے بتایا۔

”اوہ.....“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے

ہوئے بولا۔ ”دیری گڈ! یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تم نے

روزہ رکھا ہے۔ میں بھی روزے سے ہوں۔ ٹھیک ہے، میں

پاپا کو تمہارے روزے کے بارے میں بتا دیتا ہوں لیکن

تمہیں یہاں تو آنا ہی ہوگا۔“

عظیم کے آخری جملے میں بڑا شدید اصرار پایا جاتا

تھا۔ میں پوچھنے پر تیار نہ رہا۔ ”خیریت..... کیا کوئی خاص

بات ہے؟“

”بالکل خیریت ہے یار۔“ وہ بولا۔ ”تمہیں پریشان

ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم سے پاپا کوئی ضروری بات کرنا

چاہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، تم آ جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”میں چندہ

بیس منٹ میں تمہیں ریڈی ملوں گا۔“

”میں آ رہے ہوں۔ کھنڈے میں تمہارے پاس پہنچوں

گا۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جب تک تم اطمینان

سے فریش بھی ہو جاؤ اور اس دوران میں تمہیں ہوٹل سے چیک

آؤٹ بھی کرنا ہے۔“

”چیک آؤٹ..... وہ کیوں؟“ میں نے الجھن زدہ

لہجے میں استفسار کیا۔ ”میری تو یہاں تین دن کی بکنگ

ہے۔“

”تین دن کی بکنگ ہے تو کیا ہوا۔“ وہ بے پروائی

سے بولا۔ ”تم اس بات کے پابند تھوڑی ہو کہ پورے تین

دن پئی سی ہی میں گزار دو گے۔ یہ تمہاری مرضی ہے کہ جب

چاہو، چیک آؤٹ کر لو۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہارے پاپا ایسا کیوں چاہتے

ہیں؟“

”انہوں نے تمہارے لیے کسی بہتر رہائش کا

بندوبست کر دیا ہے۔“

میں نے بے ساختہ پوچھا۔ ”کہاں؟“

”یہاں پہنچو گے تو تمہیں سب پتا چل جائے گا۔“ وہ

ذومعنی انداز میں بولا۔

اثبات میں جواب دیا۔
 ”پھر..... اس نے نزاکت شاہ کے بارے میں کیا بتایا ہے؟“ میں نے اضطرابی لہجے میں استفسار کیا۔
 ”نزاکت شاہ اس وقت کراچی میں نہیں ہے۔“ عظیم نے جواب دیا۔
 ”اوہ.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ”وہ کہاں گیا ہے اور اس کی واپسی کب تک ہوگی؟“
 ”اس کی واپسی کی فی الحال کوئی امید نہیں ہے۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ”اس نے سسلی صاحبہ والی ملازمت چھوڑ دی ہے اور ”ہوائے ای“ چلا گیا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ وہاں اس انجیمہ میں کوئی جاب کر رہا ہے اسی لیے اس کا یہ نمبر کوئی رسائی نہیں کر رہا تھا۔“
 ”اسے بھی ابھی اس انجیمہ جانا تھا.....!“ میں نے

پٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”فینش نہیں لو برو.....“ عظیم ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بولا۔
 ”فینش کیسے نہیں لوں یار۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔ ”سسلی صاحبہ تک پہنچنے کا ایک دروازہ کھلا تھا اور وہ بھی بند ہو گیا۔“
 ”تمہیں کس نے کہہ دیا کہ منزل تک پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ، ایک ہی دروازہ ہوتا ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”کیا تمہاری سائیکالوژی نے یہ اصول بیان کیا ہے؟“
 ”نہیں!“ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے قطعی لہجے میں کہا۔ ”کسی بھی منزل تک پہنچنے کے لیے ایک سے زیادہ راستے، ایک سے زیادہ دروازے ہو سکتے ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“
 ”ویری سہیل۔“ وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ ”اگر سسلی صاحبہ تک رسائی کا ایک دروازہ بند ہو گیا ہے تو سمجھو، دوسرا دروازہ کھل گیا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
 ”مطلب یہ کہ نزاکت شاہ سسلی صاحبہ کے ہاں ملازمت کرتا تھا۔ وہ تمہیں سسلی صاحبہ سے ملوا سکتا تھا لیکن وہ ملازمت چھوڑ کر اس انجیمہ چلا گیا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لہذا نزاکت شاہ ہمارے کام کا نہیں رہا۔ اب یہی کام سہیل کرے گا اور.....“
 ”کیا سہیل بھی سسلی صاحبہ کو جانتا ہے؟“ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے سوال داغ دیا۔
 ”ہاں بالکل۔ سہیل، سسلی صاحبہ کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ شام کو میرے گھر آئے گا۔ پھر ہم دونوں اس کے ساتھ سسلی صاحبہ کی طرف چلیں گے۔ یوں سمجھو کہ آج کی تاریخ میں سسلی صاحبہ سے تمہاری ملاقات لازمی ہو جائے گی۔“
 ”ویری گڈ۔“ میں نے خوشی سے معمور لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”سہیل شام میں کتنے بجے تمہارے گھر آئے گا؟“
 ”انظار کے بعد۔“ عظیم نے بتایا۔
 ”میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔“ اوکے برو!“

مالک مجھ پر آج خاصا مہربان تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ آج میں اپنی ماں سے ضرور ملاقات کروں گا۔ حالات و واقعات اس ملاقات کی نوید سنارہے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے پر کھل آئے ہوں۔ دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش کروٹیں لے رہی تھی کہ میں چشم زدن میں اڑ کر اپنی ماں کے پاس پہنچ جاؤں اور اس کے ماتہا بھرے سینے سے لگ کر برسوں کی جدائی کے داغ کو دھو ڈالوں۔
 ہم باتیں کرتے ہوئے عظیم کے گھر پہنچ گئے۔
 عظیم کے پاپا حفیظ پور نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ”آؤ میری جان“ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بڑے پرجوش انداز میں مجھ سے معافہ کیا۔
 میں نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا۔ اس وقت ڈرائیونگ روم میں حفیظ پور کے علاوہ چند اور افراد بھی موجود تھے۔ میں نے باری باری ان سب سے مصافحہ کیا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔
 حفیظ پور نے عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! تم نکل جاؤ اور چاہے جتنی بھی دیر لگے، کام کر کے ہی آنا ہے۔“
 ”جی پاپا۔“ عظیم نے فرماں برداری سے کہا پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اسدا! تم پاپا سے گپ شپ کرو۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“
 ”اتنی فکر نہ کرو اپنے دوست کی۔“ حفیظ پور نے عظیم

سے کہا۔ ”میں یوڑھا ہو گیا ہوں تو کیا ہوا۔ ابھی میرا دل جوان ہے۔ میں تمہارے دوست کو پور نہیں ہونے دوں گا۔“

عظیم کچھ بولے بغیر ڈرائنگ روم سے رخصت ہو گیا۔ میں نے یہ بات کل رات کو بھی محسوس کی تھی اور آج بھی مجھے یہ لگا تھا کہ بڑے کپور صاحب کا اپنے بڑے بیٹے یعنی عظیم کپور کے ساتھ خاصا خشک رویہ تھا۔ کل دن بھر کے ساتھ میں عظیم بھی مجھے اپنے باپ سے خاصا شاک اور خفا نظر آیا تھا۔ بہر حال، میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ باپ اور بیٹے کے مابین اس تناؤ کی تینک رسائی حاصل کروں گا اور اسے ختم کرنے کی اپنی سی کوشش ضرور کروں گا۔

حفیظ کپور نے وہاں موجود تمام افراد کو مجھ سے متعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ اسد علی ہیں۔ امریکا سے آئے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اسد، عظیم کے دوست ہیں۔“

حفیظ کے آخری جملے پر ان سب لوگوں نے دلچسپ لگا ہوں سے میری طرف دیکھا مگر کسی نے کوئی ایسا دیا تبصرہ نہیں کیا۔ کنگ سائز مونچھوں والے ایک شخص نے صرف اتنا کہا۔

”عظیم صاحب بھی تو امریکا سے ہو کر آئے ہیں۔ ادھر ہی ان سے دوستی ہوئی ہوگی۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں انکل! ہماری دوستی ادھر کراچی میں ہوئی ہے اور وہ بھی ایک دن پہلے۔“ پھر میں نے حفیظ کپور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سرا! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آپ نے ادھر اور تعارف کرایا ہے۔ اپنے دوستوں کے بارے میں مجھے بھی تو کچھ بتائیں۔“

”بس، سمجھ لو کہ یہ سب میرے دوست ہیں۔ میرے خیر خواہ اور میرے جاں نثار۔“ حفیظ کپور نے فخریہ لہجے میں کہا پھر اپنے دوستوں کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

”اب تم لوگ خود اپنے بارے میں اسد صاحب کو بتاؤ۔“

وہ سب حفیظ کپور کے حکم کی تعمیل میں لگ گئے۔ دراصل کپور نے کوئی حکم نہیں دیا تھا لیکن ان کی شخصیت بہت دبنگ تھی۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک عام سا جملہ بھی بڑے رعب و ابالامحسوس ہوتا تھا اور پہلی ہی نظر میں، میں نے واضح اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ سب لوگ حفیظ کپور سے بہت متاثر تھے۔

اگلے دو منٹ میں ان سب کا تعارف مجھ تک پہنچ گیا۔ ہماری مونچھوں والے جس شخص نے عظیم کے امریکا

جانے کی بات کی تھی اس کا نام شا کر علی تھا۔ شا کر علی محکمہ انکم ٹیکس کارپوریشن ڈائریکٹر تھا۔ باقی دو افراد... بریڈرز بیگ اور چودھری سہیل اشرف کا تعلق بھی انکم ٹیکس کے محکمے ہی سے تھا اور وہ حاضر ڈیوٹی تھے۔ واحد علی نامی ایک دراز اقامت شخص ایف آئی اے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش پائی جاتی تھی۔ ندیم صاحب ایئر کنڈیشنرز کا کام کرتے تھے۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا جیسے وہ کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر ہوں۔ ایک عجیب سی اداسی تھی ان کی آنکھوں میں۔ باسط علی صاحب برٹنگ کا کام کرتے تھے اور ذوالفقار شیخ صاحب کا تعلق ہائی کورٹ سے تھا۔ شیخ صاحب سے میں غائبانہ طور پر متعارف تھا۔ گزشتہ روز عظیم کی ”زخمی“ وٹو کو شیخ صاحب کے بھیجے ہوئے بندوں ہی نے ٹار شہید پارک سے موٹر سیکل تک پہنچایا تھا۔ عظیم نے فون پر شیخ صاحب کو بھی وہی ڈاکوؤں والی جھوٹی کہانی سنائی تھی۔ بعد ازاں میں نے اس حرکت پر عظیم کو سرزنش بھی کی تھی۔

شیخ صاحب نے گہری نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ”آپ اس وقت عظیم کے ساتھ ہی تھے جب ڈاکوؤں نے آپ کی گاڑی پر فائرنگ کی تھی؟“

”جی انکل!“ میں نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

”سامیں! اللہ پاک کا بڑا اکرم ہے کہ بچوں کی جان سلامت رہی۔“ شیخ صاحب نے حفیظ کپور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”گاڑی کا کیا ہے، وہ تو اب تک مرمت بھی ہو چکی ہوگی۔“

”اللہ کا مجھ پر بڑا اکرم ہے۔“ حفیظ کپور نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

”بھائی! آپ بڑے فیاض انسان ہیں۔“ شا کر علی نے کہا۔ ”آپ کے ہاتھ سے صدقہ خیرات کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔ ہاتھ سے دیا ہوا کہیں نہ کہیں ضرور انسان کی ڈھال بنتا ہے۔“

”میں تو بہت گناہ گار انسان ہوں۔“ حفیظ کپور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ”میری کیا مجال کہ میں ٹیکس کا دعویٰ کروں۔ یہ سب کام تو مجھ سے میرا رب کراتا ہے۔“

”بھائی! آپ مائیں یا نہ مائیں۔“ واحد علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے لوگوں کو حرم دکھانے کا جو کام شروع کر رکھا ہے نا، اس سے بڑی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ ہر سال درجنوں افراد کو اپنے خرچے پر جج اور

”بس تو آج افطار کے وقت تم غلوں دل سے صرف اور صرف میرے لیے دعا کرو گے کہ اللہ میری آزمائش کو ختم کر کے مجھے دوبارہ سربز و شاداب کر دے۔“ وہ ملتینا انداز میں بولا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے لیے ضرور یہ دعا کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”اس کے بدلے میں، میں تمہیں یقین دلانا ہوں کہ آج کی تاریخ میں، میں آپ کو ایک ایسی ہستی سے ملواؤں گا جس کی تلاش میں تم امریکا سے یہاں تک آئے ہو۔“ حفیظ کپور نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو..... کیا..... عظیم نے آپ کو..... سب بتا دیا ہے.....؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”سب کچھ نہیں۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بس اتنا ہی کہ تم کسی ہستی کی تلاش میں امریکا سے پاکستان آئے ہو اور وہ ہستی کراچی میں موجود ہے۔ میں نے ابھی عظیم کو اسی ہستی کا سراغ لگانے کے لیے بھیجا ہے اور مجھے امید ہے..... بلکہ یقین ہے کہ عظیم یہ کام ضرور کر لے گا۔ یہ بالکل محض جس بھی کام میں ہاتھ ڈالتا ہے، سرخرو ہو کر ہی جیتتا ہے اور..... تم تو اس کے دوست ہو!“

حفیظ کپور کی باتوں نے میرا منوں خون بڑھا دیا۔ یہ مجھے ہر مالک کی خاص مہربانی تھی کہ اس نے کراچی میں مجھے اس ٹیبل سے ملوایا تھا۔ اس کے بعد میرا ہر کام لائن اپ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے ذہن کی الجھن کو دور کرنے کی غرض سے پوچھ لیا۔

”انگل! میں نے آپ کے کہنے پر ہوٹل سے چیک آؤٹ کیا۔ عظیم بتا رہا تھا کہ آپ نے میرے لیے رہائش کا کوئی انتظام کر دیا ہے۔ یہ کیا اسٹوری ہے؟“

”اسٹوری کوئی نہیں ہے بیٹا جی۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”عظیم کی بیوی آج کل دو بیٹیوں کے ساتھ امریکا گئی ہوئی ہے ہمارے گھر کا اوپر کا پورشن خالی پڑا ہے۔ تم ایک ماہ تک تو یہ آسانی یہاں قیام کر سکتے ہو۔ ویسے مجھے امید ہے، اس کی نوبت نہیں آئے گی.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے یقین ہے کہ اس ہستی سے ملاقات کے بعد تو تم اس کے پاس ہی رہنا پسند کرو گے.....!“

”جی ضرور!“ میں نے پُر اعتماد انداز میں کہا۔

”سب رب کے حکم سے ہوتا ہے۔“ حفیظ کپور نے کہا۔ ”اس کی مرضی، وہ جس کو نکلی کی توفیق دے اور جسے محروم رکھے۔“ پھر وہ پریذیزیک اور سہیل اشرف کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”آپ دونوں سے بے حد معذرت کہ میں رمضان کے مہینے میں آپ لوگوں کو عمرے پر نہیں بھیج سکوں گا اور آپ اس کا سبب بھی سمجھتے ہیں لیکن عید کے بعد پکا ہے۔ آپ دونوں اپنے پاسپورٹ میرے پاس جمع کرادیں۔“

”جی بھائی۔ ہم آپ کے حالات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔“ سہیل اشرف نے کہا۔ ”آپ کو جیسے آسانی ہو، ہم خوش ہیں اور ہر وقت آپ کے مسائل کے خاتمے کے لیے دعا گو بھی ہیں۔“

”آپ دوستوں کی دعاؤں کے سہارے ہی تو میں چل رہا ہوں۔“ حفیظ کپور نے کہا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ”عظیم بتا رہا تھا کہ آپ نے آج روزہ رکھا ہے؟“

”جی انکل! میں روزے سے ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”بیٹا جی! آپ نے میرا ایک کام کرنا ہے۔“ وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ”میں زندگی بھر آپ کا یہ احسان یاد رکھوں گا۔“

اس باہمی گفتگو سے مجھے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ کپور صاحب ان دنوں کسی مشکل میں پھنسے ہوئے تھے لیکن میں ان کی مشکل کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”انکل! آپ حکم کریں۔ جو میرے بس میں ہوگا، میں آپ کے لیے ضرور کروں گا۔ آپ میرے دوست کے والد ہیں اور میرے لیے بہت محترم ہیں۔“

”اس وقت میں نہ تو آپ کے دوست کا والد ہوں اور نہ ہی آپ کے لیے کوئی محترم شخصیت۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”ہم دونوں بچہ پاری ہیں۔ ہم ایک سودا کر لیتے ہیں۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں انکل.....!“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں سمجھتا ہوں۔“ وہ اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں جانتا ہوں، کوئی روزہ دار افطار کے وقت غلوں نیت سے جو بھی دعا کرے، رب اسے ضرور قبول کرتا ہے۔“

”ہاں، یہ تو میں نے بھی سنا ہے۔“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ان شاء اللہ!“
 ”بھائی ہمیں اجازت دیں۔“ پرویز بیک اور سہیل
 اشرف اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ”آج پہلا روزہ ہے۔
 افطاری کے بندوبست کے لیے جلدی گھر جانا ہوگا۔“
 ”یار چودھری!“ اس نے سہیل اشرف کی طرف
 دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پرویز بیک تو جو رو کا غلام ہے اور یہ
 بات سمجھ میں بھی آتی ہے کیونکہ اس کی بیوی عمر میں اس سے
 بیس سال چھوٹی ہے لیکن تمہاری پھرتیاں سمجھ سے بالاتر
 ہیں۔ تم لوگ تو اب یونس کی زندگی گزار رہے ہو پھر بھی گھر
 جانے کی اتنی جلدی؟“

جواب میں چودھری سہیل اشرف معنی خیز انداز میں
 مسکرا کر رہ گیا۔

حافظ پکور نے واحد علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”آپ بے چین کبوتر کی طرح بار بار پہلو کیوں بدل رہے
 ہیں۔ جانا ہے تو آپ بھی نکلیں۔ آپ تو بیک سے بھی زیادہ
 انہی شیعہ ہیں۔ آپ کو تو اپنے گھر کے علاوہ اپنی سالی کے
 گھر کے مسائل بھی حل کرنا ہوتے ہیں۔!“

”بھائی! آپ بڑے ہیں۔ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔“
 واحد علی جڑبڑہتے ہوئے بولا۔ ”رات بھر انٹرنیٹ پر
 ڈیوٹی کی ہے اور آئندہ رات بھی ڈیوٹی ہے۔ گھر جا کر تھوڑی
 سی نیند لینا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔ مگر آپ کی اجازت ہو تو!“

”اجازت ہے۔“ حافظ پکور نے فراخ دلی سے کہا۔
 ”لیکن یہ بات ذہن میں رکھو کہ مجھے بھی بڑا نہیں کہتا کیونکہ عمر
 میں آپ مجھ سے دو چار سال بڑے ہی ہو گئے۔“

”بھائی! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔“ واحد علی
 خفت آمیز لہجے میں بولا۔ ”آپ ہی بڑے ہیں۔ عمر میں
 بھی، تجربے میں بھی اور مرتبے میں بھی۔“

پرویز بیک، چودھری سہیل اشرف اور واحد علی
 رخصت ہوئے تو حافظ پکور نے باسط علی سے پوچھا۔
 ”کتابوں کا کام کہاں تک پہنچا؟“

”بھائی! آج اور زاریاتوں والی دونوں کتابیں تو پرنٹنگ
 میں جانے کے لیے تیار ہیں۔“ باسط علی نے جواب دیا۔
 ”عمرے والی کتاب کی فائل پروف ریڈنگ ہو رہی ہے۔
 آپ تبھی، ہفت روزہ دن میں تمام کام مکمل ہو جائے گا۔“

”میں تمہیں پورا رمضان کا مہینہ دیتا ہوں۔“ حافظ
 پکور نے کہا۔ ”عید سے پہلے مجھے تینوں کتابیں ریڈی
 چاہئیں لیکن ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا کہ کوئی غلطی
 نہ چلی جائے۔ یہ دین کا معاملہ ہے۔ اس میں بہت زیادہ

احتیاط کی ضرورت ہے۔“
 ”جی بھائی! آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔“ باسط علی
 نے کہا۔ ”میں احتیاطاً ایک ریڈنگ عالم دین سے بھی
 کروا رہا ہوں تاکہ قرآنی آیات میں زبر، زیر، پیش کی غلطی
 کا بھی احتمال نہ رہے۔“

”شاباش!“ حافظ پکور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں
 کہا۔ ”اس نیک کام کا اجر تمہیں اللہ دے گا۔“

”جی بھائی۔۔۔۔۔۔ ان شاء اللہ۔“ باسط علی نے کہا۔
 ”کہیں یہ نہ سمجھتا کہ میں تمہیں سوکھے اجر پر رخصت
 ہوں۔“ حافظ پکور نے مذاق کے انداز میں کہا۔ ”تمہارا پورا
 مل بھی کلیئر کروں گا۔ تم فوری طور پر پیسوں کی ضرورت تو
 محسوس نہیں کر رہے؟“

”نہیں بھائی! اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔“ باسط نے
 ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”جب ضرورت ہوگی
 تو بتا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ بہت مہربانی۔“ حافظ پکور نے کہا پھر
 میری جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”سچ اور عمرے پر
 جانے والوں کے لیے میں پاکٹ سائز کتابیں بھی چھپواتا
 ہوں جن کے اندر ہر بات آسان الفاظ میں پوری تفصیل
 کے ساتھ درج ہوتی ہے۔ اس کتاب کی مدد سے اللہ کے گھر
 اور اس کے رسول ﷺ کے روضے پر جانے والوں کو بہت
 آسانی ہو جاتی ہے۔“

”ویری گڈ!“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔
 ”انکل! آپ کے اس نیک کام نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔“

”جیسے رہو بیٹا جی۔“ وہ دعا دینے والے انداز میں بولا۔ ”یہ تو
 کچھ نہیں ہے۔ میں نے ماضی میں جس شان بان سے یہ کام
 کیا ہے اس کا ذکر سن کر تم حیران رہ جاؤ گے۔ ایک ایک سچ
 میں، میں نے سو سو، ڈیڑھ ڈیڑھ سو افراد کو عمرے پر بھیجا
 ہے۔ اب ٹوٹ کر رہ گیا ہوں۔۔۔۔۔۔“

آخری جملہ اس نے دل شکستگی کے انداز میں ادا کیا
 تھا۔ شاکر علی نے کہا۔

”بھائی! وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا۔ آج آپ
 کے حالات اچھے نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ کل بہت اچھا وقت
 آئے گا۔ آپ دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو جائیں
 گے۔ آپ نے سیکڑوں، ہزاروں لوگوں پر احسانات کیے
 ہیں۔ کسی کی دعا تو لگے گی۔۔۔۔۔۔!“

”بالکل سچ بات ہے۔“ ندیم اے سی والے نے
 شاکر علی کی تائید میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہم

کر دیتا ہوں۔“
”بڑی مہربانی آپ کی۔“ حفیظ کپور نے ممنونیت بھرے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”وہ تمہاری بیٹی کا کیا حال ہے؟“

”گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔“ ندیم نے دھکی لہجہ میں بتایا۔

”میاں لینے نہیں آیا؟“
”اس طرف تو مکمل خاموشی ہے بھائی۔“
”بیٹی کیا کہتی ہے؟“

”وہ تو کسی بھی ٹیمٹ پر سسرال جانے کو تیار نہیں۔“
ندیم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میری بیوی اور والدہ بھی اسی حق میں ہیں کہ ہم خلع کے لیے کورٹ چلے جائیں۔“
”خلع تو اس مسئلے کا آخری حل ہے لیکن بیٹیوں کے معاملے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔“ حفیظ کپور نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں کہا۔ ”تمہارے جیسی چوہین میں میرے ساتھ بھی ہے۔ ہمارا معاملہ تمہارے سامنے ہے۔“

”جی بھائی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ ندیم تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی بات میری سمجھ میں تو آ رہی ہے لیکن میری بیٹی، بیوی اور والدہ سمجھنے کو تیار نہیں ہیں۔“

”اگر عورتوں کو اپنا راہ نمائا کر چلو گے تو سراسر نقصان ہی اٹھاؤ گے۔ کیوں شیخ صاحب؟“
آخری جملہ اس نے ذوالفقار شیخ کی جانب دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ شیخ صاحب نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ان کا مخاطب ندیم تھا۔

”سامعین بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ لڑکے کو سمجھاؤ..... مصالحت کی کوئی راہ نکالو۔ کورٹ میں جانا بہت آسان کام ہے لیکن کوشش کرو، بیٹی کا گھر برباد نہ ہو۔“

”شیخ صاحب! میں نے تو ہر طرح سے کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔“ ندیم روہا ہوا۔ ”لیکن ایک سال میں میری بیٹی کے ساتھ سسرال میں جتنے ظلم و ستم ہو چکے ہیں، اس کے بعد وہ اس گھر میں قدم رکھنے کو تیار نہیں۔ میں نے اپنے داماد کو بھی بہت سمجھایا ہے کہ الگ گھر لے کر رہنا شروع کر دے مگر سب میری بیٹی ہی کو قصور وار ٹھہراتے ہیں۔ کوئی اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں۔“

”ندیم صاحب! آپ نے اپنے داماد کو پیار سے سمجھایا ہے اور آپ کا پیار اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔“

تو دن رات آپ کے لیے دعا کرتے ہیں.....“ اس کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ ”مجھے یقین ہے، اللہ بہت جلد آپ کو بہت اوپر لے جائے گا۔“

”اوئے! یہ تم میرے لیے کس قسم کی دعا کرتے ہو۔“ حفیظ کپور نے تفرق لینے والے انداز میں کہا۔ ”میرا ابھی اوپر جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ قدرت نے ابھی مجھ سے بہت سارے کام لینا ہیں۔ میرا ستن ابھی پورا نہیں ہوا۔“
”اللہ آپ کی عمر دراز کرے بھائی۔“ ندیم نے ندامت آمیز لہجہ میں کہا۔ ”میرا وہ مطلب نہیں تھا جو آپ نے سمجھا۔“

”ارے یار! میں تو مذاق کر رہا تھا۔“ حفیظ کپور نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ سب دوستوں کے خلوص اور دعاؤں کے سہارے تو میں چل رہا ہوں۔“
”اللہ آپ کی مشکل آسان کرے بھائی۔“ ندیم نے کہا۔
”آمین.....!“ حفیظ کپور نے کہا۔ ”اور اللہ کرے کہ تم بھی میرے اسے سی کی مشکل آسان کر دو۔“
”آپ کے اسے سی کو کیا ہوا بھائی؟“

”آواز دے رہا ہے۔“ حفیظ کپور نے بتایا۔ ”دن میں تو زیادہ محسوس نہیں ہوتا لیکن رات کے سنائے میں اس کی ”گھول گھول“ سے نیند ڈھس رہی ہوتی ہے۔“
حفیظ کپور کو میں نے ایک خوش مزاج اور بذلہ سنج انسان پایا تھا۔ وہ ہر بات میں تفرق کا پہلو نکال لیتا تھا۔ انسان کو ایسا ہی زندہ دل اور بے پروا ہونا چاہیے ورنہ زندگی کے مسائل کسی ویمپ کی طرح انسان کو چاٹ جاتے ہیں۔ ایک بے پروا قبضہ سوبیار یوں کو پرے ہٹاتا ہے۔ انسان کی بے ساختہ مسکراہٹ اور قبضہ اثر پذیری میں ہر اینٹی بائیوٹک کو مات دے دیتا ہے۔

”بھائی! میں نے بتایا تھا نا، آؤڑ کا مسئلہ ہے۔“ ندیم نے کہا۔

”مجھے بتانے کا کیا فائدہ ہے اللہ کے ولی۔“ حفیظ کپور نے کہا۔ ”اسے سی کے ڈاکٹر تم ہو یا میں؟ آؤڑ، انرجس بھی یونٹ کا فالٹ ہے اسے ٹھیک کرو۔ اگر ٹھیک نہیں ہو سکتا تو آؤڑ کو تبدیل کر دو مگر جو بھی کرنا، اپنی جیب سے کرنا۔ تمہارے بہت سے بلز میرے پاس پہلے ہی پڑے ہوئے ہیں۔“

”بھائی! آپ پیسوں کی فکر نہ کریں۔ میرے پاس جو کچھ ہے یہ سب آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔“ ندیم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں کل دن میں آپ کا آؤڑ تبدیل

اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر ایک کامیاب بزنس مین بن جانا چاہیے تھا مگر اسے تو شراب پی کر غل غباڑا کرنے اور باپ کو اپنا دشمن سمجھنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔

”ایسی بات نہیں ہے سامعین۔“ شیخ صاحب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں آپ کو بالکل سچ بتا رہا ہوں۔ عظیم آپ کی بہت عزت کرتا ہے۔“

”انکل! میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے کہ عظیم دل کا بہت اچھا ہے۔“ میں نے حفیظ کپور کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی راست رائے دی۔

”واہ واہ..... بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں بجان اللہ! حفیظ کپور نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹائی! آپ امریکا سے ایسی کون سی دوربین اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں جس کی مدد سے ایک ہی دن میں آپ نے عظیم کے خفیہ فلینٹ کو دیکھ لیا..... خیر، آپ تو حق دوستی نبھا رہے ہیں۔“

”حق دوستی اپنی جگہ اور آواز حق اپنی جگہ۔“ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

حفیظ کپور نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔

”آپ کا مطلب کیا ہے بیٹا؟“

”انکل! آپ مائیں یا نہ مائیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ عظیم اندر سے کھرا اور صاف انسان ہے۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹائی! میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔“ وہ سادگی سے بولا۔ ”اور اپنے رب سے دعا کرتا ہوں کہ وہ عظیم کو بالکل ویسا ہی بنادے جیسا آپ اور شیخ صاحب اسے سمجھتے ہیں۔“

”آمین.....!“ میں نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد شاہ کرم علی اور ندیم صاحب بھی وہاں سے رخصت ہو گئے۔ صرف شیخ صاحب رہ گئے۔

حفیظ کپور نے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”افطار میں ابھی تین، ساڑھے تین کھٹے باقی ہیں۔ تم چاہو تو اوپر جا کر تھوڑا آرام کرلو۔“

”انکل! میں بالکل فریش ہوں۔“ میں نے صاف کوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”عظیم کی داپسی کب تک متوقع ہے؟“

”ممکن ہے، وہ افطار سے پہلے آجائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے، وہ افطار کے بعد آئے۔“ حفیظ کپور نے کہا۔

”میں اس سن مونی کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں

شاہ کرم علی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”میری مجبوری یہ ہے کہ آج کل ہمارے لیے ہر معاملے میں خاموشی اور لاطعلی اختیار کرنے کے احکامات ہیں ورنہ ہمارے پاس سمجھانے کے بہت سے طریقے ہیں۔ وہ آپ کا داماد سالا سر کے بل چل کر آتا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر منت خوشامد کر کے آپ کی بیٹی کو لے جاتا۔“

”بھائی! مجھے کسی جھگڑے پھڑے میں نہیں پڑتا۔“ ندیم نے حفیظ کپور کی طرف دیکھتے ہوئے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

”تم خاموش ہو کر اپنے گھر میں بیٹھ جاؤ اور گھر کی عورتوں کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دو۔“ حفیظ کپور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بیوی اور اماں زیادہ جھگ کریں تو ان کی تسلی کے لیے کہہ دو کہ مختلف وکیلوں سے تمہارا صلاح مشورہ چل رہا ہے۔

ان شاء اللہ! بہت جلد عدالت میں خلع کے لیے کیس دائر کر دیا جائے گا۔“

ادھر حفیظ کپور کی بات ختم ہوئی ادھر اس کے سیل فون کی کھنٹی بج اُچی۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں.....!“

چند سیکنڈ اس نے دوسری طرف کی بات سنی پھر کہا۔

”ٹھیک ہے۔ جتنا بھی وقت لگے، پروا نہیں ہے۔ آج تم نے یہ کام نفاذ کر ہی آنا ہے بیٹا.....“

اس نے فون کو ہاتھ سے چھوڑا تو میں نے کہا۔ ”کیا عظیم کا فون تھا انکل؟“

”ہاں بیٹا۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”میں نے اسے ایک پارٹی کے پاس پے منٹ کے لیے بھیجا تھا۔

اس نے خوش خبری سنائی ہے کہ کام ہو جائے گا مگر تھوڑی دیر لگے گی۔“

”سامعین! عظیم بہت قابل بچہ ہے۔“ شیخ صاحب نے کہا۔ ”میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔ یہ بہت ترقی کرے گا۔“

”وہ عینک تھوڑی دیر کے لیے مجھے بھی عنایت کر دیں شیخ صاحب جس کو آنکھوں پر لگانے کے بعد آپ کو عظیم کے اندر مخفی جوہر نظر آنے لگتے ہیں۔“ حفیظ کپور نے کہا۔ ”وہ

میری اولاد ہے۔ میری نگاہ کے سامنے وہ ہل بڑھ کر چوتیس سال کا ہوا ہے۔ شادی شدہ ہے۔ دس گیارہ سال سے

ازدواجی زندگی گزار رہا ہے۔ چار بچوں کا باپ ہے مگر آج تک مجھے تو اس میں کوئی کن نظر نہیں آیا۔ اب تک تو اسے

کر سکتا۔“

”عظیم نے ایک دن میں کیا گھول کر پلا دیا ہے آپ کو.....؟“ پھر وہ روئے سخن شیخ صاحب کی طرف موڑتے ہوئے بولا۔ ”آپ دیکھ رہے ہیں، اسد کے چہرے کی رونق کو۔ یہ ایک ہی دن میں لکٹی جینوں کی جوڑی کا رول پلے کرنے لگے ہیں۔“

”سائیں! میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔“ شیخ صاحب اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔ ”عظیم کی شخصیت میں ایک جادو ہے۔“

”تو کیا میرے علی کی شخصیت میں آپ کو کچھ دکھائی نہیں دیتا؟“ حفیظ پکڑ نے شاکی انداز میں ذوالفقار کی طرف دیکھا۔

”نہیں سائیں! آپ میری بات کا غلط مطلب نہیں لیں۔“ شیخ صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو بالکل سچ بتا رہا ہوں۔ آپ کے دونوں بیٹے بہت اچھے، بہت فرماں بردار اور بہت لائق ہیں۔ میں علی اور عظیم میں کوئی فرق نہیں کر رہا۔ دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے۔ جس طرح ایک ہاتھ کی تمام انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں، ایسے ہی ایک انسان کی تمام اولادیں بھی ایک جیسی نہیں ہو سکتیں۔“

”شیخ صاحب! آپ نے میرے علی کو اپنے ساتھ پر اپرٹی کے کام میں لگاتا ہے۔“ حفیظ پکڑنے کہا۔ ”میں نے محسوس کیا ہے کہ ریکل اسٹیٹ کے کام میں علی کا ذراغ بہت چلتا ہے اور اسد صاحب.....“ میری جانب دیکھتے ہوئے اس نے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”آپ اپنے دوست عظیم کو اپنے ساتھ امریکا لے جائیں۔ یہ اللہ کا بندہ وہاں کے کچھ میں زیادہ ترتی کرے گا۔“ ”جی انکل! میں آپ کی خواہش کی تکمیل کے لیے ضرور کوشش کروں گا۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”عظیم کے لیے امریکا میں سٹیل ہونا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“

ذوالفقار شیخ صاحب ہائی کورٹ میں اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے علاوہ پارٹ ٹائم میں پر اپرٹی کی خرید و فروخت کا کام بھی کرتے تھے۔

”ہو جائے گا سائیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“ شیخ صاحب نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

اسی وقت عظیم پکڑ کا چھوٹا بھائی محمد علی پکڑ ڈرائنگ روم کے دروازے میں دکھائی دیا پھر خراماں خراماں چلتے ہوئے وہ ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے سب کو سلام کیا پھر

”سائیں! آپ اپنے دوست کو فون کر کے معلوم کر لوں گا۔“ شیخ صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... یہ اچھی ترکیب ہے۔“ حفیظ پکڑ نے کہا۔

”آپ عظیم کو فون کر کے اس کی واپسی کا پروگرام پوچھ لو۔ وہ تمہارا دوست ہے۔ تمہیں سب ٹھیک ٹھیک بتا دے گا۔“

میں نے اپنے تیل فون سے عظیم کا نمبر لگایا۔ دوسری کھنٹی پر اس نے کال ریسیو کر لی۔ میرے ”ہیلو“ کے جواب

میں اس نے پوچھا۔

”اسد! تم پورے نہیں ہو رہے ہو؟“

”نہیں یار! آپ کے پاپا بہت دلچسپ انسان ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ان کی محفل میں پورے قدم نہیں رکھ سکتی۔“

”ہاں ہاں۔ وہ تو مجھے معلوم ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”میں تمہارے اور پاپا ہی کے کام سے نکل ہوا ہوں۔ یہ کام کر کے ہی لوٹوں گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”افطار تو ایک ساتھ ہی کریں گے نا؟“

”ہاں برو! میں افطار سے پہلے ہی آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ پہلا روزہ ہم ایک ساتھ ہی افطار کریں گے۔“

”اوکے۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”کیا تمہارا سہیل سے رابطہ ہوا؟“

”ہاں یار! میں نے سہیل کو لائن اپ کیا ہوا ہے۔“

اس نے بتایا۔ ”آج شام میں اس سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“

”گویا میرا کام ہوتا صد فیصد ہے؟“ میں نے دبے

دبے جوش کے ساتھ استفسار کیا۔

وہ جتن سے بولا۔ ”ایک سو دس فیصد!“

”گڈ!“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

رسی اختتامی کلمات کے بعد میں نے سیلور رابطہ

موقوف کر دیا۔ جب تک میں عظیم سے بات کر رہا تھا اس

دوران میں حفیظ پکڑ ایک ٹک میرے چہرے پر نگاہ جمائے

بیٹھا تھا۔ عظیم کی زبانی ”ایک سو دس فیصد“ کے الفاظ سن کر

میرا سن خوشی سے گل و گلزار ہو گیا تھا۔ انگش میں ”فیس از

این انڈیکس آف مائنڈ“ کی اصطلاح بہت معروف ہے

یعنی چہرہ دل کی کتاب ہوتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ حفیظ پکڑ

نے میرے چہرے سے ایسی خوشی کو دیکھ لیا تھا۔ میں فون

سے فارغ ہوا تو اس نے بڑے کھوجتے ہوئے لہجے میں مجھ

سے استفسار کیا۔

مجھ سے اور شیخ صاحب سے معاف کرنے کے بعد وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

محمد علی کے چہرے پر بڑی معصومیت پائی جاتی تھی۔ اسے دیکھ کر دل میں محبت کے جذبات اٹھتے تھے۔ اگرچہ وہ بہت زیادہ ادور ویٹ تھا۔ اس کی عمر اور قامت کے لحاظ سے اس کا وزن دو گنا تھا لیکن عظیم الجثہ ہونے کے باوجود بھی وہ بے ڈھنگا اور برا نہیں لگتا تھا۔ اس کے چہرے کی معصومیت اور زبان کی شیریں بیانی اس کے منہ پر کے سامنے ڈھال بن جاتے تھے۔ اس مختصر سی ملاقات میں، میں نے علی کو انتہائی تمیز دار اور ڈیسنٹ پایا تھا۔

”علی! افطار کے معاملات کو ذرا دیکھ لیتا۔“ حفیظ پور نے کہا۔ ”کوئی ٹی نہیں رہنا چاہیے۔“

”جی ہاں! میں نے سب چیک کر لیا ہے۔“ علی نے شائستگی سے جواب دیا۔ ”اکبر سے ہر قسم کا سامان منگوا لیا گیا ہے اور ملازما میں امی کے ساتھ کچن کے کاموں میں ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ افطار سے پہلے سب کچھ تیار ہو جائے گا۔“

”شاباش بیٹا!“ حفیظ پور نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ”آج پہلا روزہ ہے۔ غزالہ، عروج اور ہما سے بھی کہہ دو کہ آج افطار ادھر ہی کریں۔“

”کہہ دیا ہے ہاں۔“ علی فرماں برداری سے بولا۔

”غزالہ باجی اور ہما تو آج بھی کی لیکن عروج باجی نے معذرت کر لی ہے۔“

”وہ کیوں؟“ حفیظ پور نے کہا۔ ”میری بات کراؤ۔ عروج سے!“

”نہیں پاپا! اس کی ضرورت نہیں۔“ علی نے بڑی رساں سے کہا۔ ”عروج باجی اپنی سسرال میں افطار پارٹی پر مدعو ہیں اس لیے یہاں نہیں آ سکیں گی۔ ان کی مجبوری جیونن ہے۔“

”عروج باجی کے چچے ایک تم ہی تو لگے ہوئے ہو جو اس کی مجبوریوں کا سارا حساب رکھا ہوا ہے تم نے۔“ بڑے پور نے دوستانہ انداز میں کہا۔

میں نے حفیظ پور صاحب کے انداز میں ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ان کے اندر کافی حد تک غرور و تکبر کے جراثیم پائے جاتے تھے۔ وہ خود کو سب سے زیادہ سہر سمجھتے تھے۔ ان کے اسٹائل میں شاہانہ پن تھا اور میں نے آج یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ ان کے ملاقاتی دل و جان سے انہیں ایک بادشاہ تسلیم بھی کرتے تھے۔

”میں نے تمہارے لیے شیخ صاحب سے بات کر لی

ہے۔“ بڑے پور صاحب نے چھوٹے کپور سے کہا۔ ”عید کے بعد یہ اپنا آفس بنارہے ہیں اور تمہیں اس آفس میں بیٹھنا ہے اس لیے کمر کسو۔۔۔۔۔۔ صرف کس ہی نہ لو بلکہ اس کے سائز میں بھی کس لانے کی کوشش کرو۔“

”جی پاپا! آپ کا حکم سر آکھوں پر۔“ علی فرماں برداری سے بولا۔

”سامیں! آپ فکر ہی نہ کریں۔ پراپرٹی کے کام میں بڑی بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے۔“ شیخ صاحب نے کہا۔

”میں آپ کو کچ بٹا رہا ہوں۔ چند ماہ میں آپ علی کو پہچان بھی نہیں پائیں گے۔ میں اسے اتنا بھاگواؤں گا کہ چربی پھٹنے پر مجبور ہو جائے گی۔“

”پاپا! وہ بمبئی صاحب کا فون آیا تھا۔“ علی نے کہا۔

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ علی نے موضوع گفتگو کو بدلنے کی کوشش کی تھی۔ حفیظ پور نے جلدی سے پوچھا۔

”کیا کہہ رہے تھے بمبئی صاحب؟“

”وہ آنے کو کہہ رہے تھے۔“ علی نے بتایا۔ ”بول رہے تھے، اگر کوئی سواری مل گی تو افطار سے پہلے آؤں گا ورنہ تڑاوتج کے بعد آنے کی کوشش کروں گا۔“

”سامیں! آپ کے یہ پیر و مرشد مقبول بمبئی صاحب بڑے پیارے انسان ہیں۔“ بڑے پور صاحب نے شیخ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سامیں! آپ کے ساتھ ان کا دل لگ گیا ہے۔“ ذوالفقار شیخ نے کہا۔ ”ورنہ یہ تو آسانی سے کسی کے ہاتھ نہیں آتے۔“

”علی! بمبئی صاحب سے میری بات کراؤ۔“ حفیظ پور نے اپنے بیٹے سے کہا۔

علی نے فوراً آپ کے حکم کی تعمیل کر دی۔

”سامیں! آپ ہمارے پاس آنے کے لیے سواری کے کب سے محتاج ہو گئے۔“ رابطہ ہونے پر بڑے پور صاحب نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”اگر گھر میں کوئی گاڑی موجود ہوتی تو میں علی کو فوراً آپ کی طرف روانہ کر دیتا لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ ایک بات ذہن میں رکھیں کہ افطار آپ نے میرے ساتھ ہی کرنا ہے۔ اگر اپنی روحانی قوت کے بل پر اڑ کر آ سکتے ہیں تو بس اللہ کریں۔ شیخ صاحب بھی ادھر ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔“

شیخ صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر حفیظ پور کی طرف اشارہ کیا۔ پور صاحب نے دوسری طرف کی بات سنی اور کہا۔

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

جو شخص چھ باتیں اختیار کر لے، اس نے جنت کی طلب اور دوزخ سے بھاگنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔
1- جس نے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی اور اس کی اطاعت اختیار کی۔

- 2- جس نے شیطان کو پہچانا اور اس کی نافرمانی اختیار کی۔
- 3- جس نے حق کو پہچانا اور اسے قبول کیا۔
- 4- جس نے باطل کو پہچانا اور اس سے بچاؤ اختیار کیا۔
- 5- جس نے دنیا کو پہچانا اور اس کو چھوڑ دیا۔
- 6- جس نے آخرت کو پہچانا اور اس کی طلب میں لگ گیا۔

حکمت

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حکمت آسمان سے قلوب میں اترتی ہے اور ایسے قلوب میں نہیں ٹھہرتی جس میں درج ذیل 4 خصلتیں ہوں۔

- 1- دنیا کی محبت۔
 - 2- کل کی فکر۔
 - 3- مسلمان بھائی سے حد۔
 - 4- شرف و جاہ کی محبت۔
- آپ نے فرمایا کہ عند شخص وہ ہے جو تین کام کرے۔
1- اس سے پہلے کہ دنیا سے چھوڑے، وہ دنیا کو چھوڑ دے۔
2- قبر میں جانے سے پہلے اس کی تیاری کر لے۔
3- اپنے خالق کو ملنے سے پہلے اسے راضی کر لے۔
(مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ پاکستان شریف)

سلام کے فوائد

- 1- رابطے کا ذریعہ۔
 - 2- سلامتی اور برکت کی دعا۔
 - 3- مسلمان کی شناخت۔
 - 4- امن کا درس۔
 - 5- غصے میں کمی۔
 - 6- باہمی تعلقات میں اضافہ۔
 - 7- عاجزی کا اظہار۔
 - 8- اخلاق حسنة کا تحفہ۔
 - 9- نیکیاں کمانے کا ذریعہ۔
- (مرسلہ: جابرہ شفیق۔ سندھی ہوٹل، نیو کراچی)

”شیخ صاحب کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ کا حکم ہو تو وہ آپ کو لینے آ جائیں؟“
دوسری جانب مقبول بھٹی نے کچھ کہا۔ حفیظ پکڑنے یہ کہتے ہوئے رابطہ ختم کر دیا۔ ”ٹھیک ہے سائیں۔ جو آپ کی خوشی۔“

حفیظ پکڑنے فون رکھا تو شیخ صاحب نے پوچھا۔
”کیا کہہ رہے ہیں بھٹی صاحب؟“

”وہ رکشا پکڑ کر آ رہے ہیں۔“ حفیظ پکڑنے بتایا۔
”کہہ رہے ہیں، شیخ صاحب کو زحمت دینا ٹھیک نہیں۔ وہ ادھر ہی بیٹھیں۔ میں تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔“

”اللہ والے ایسے ہی ہوتے ہیں سائیں۔“ ذوالفقار شیخ نے کہا۔ ”اگر یہ ایک اشارہ کریں تو ان کے لیے گاڑیوں کی لائن لگ سکتی ہے۔ بڑے بڑے مشرزیں اور اعلیٰ سرکاری افسران ان کے ارادت مندوں میں شامل ہیں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں شیخ صاحب۔“ بڑے پکڑ صاحب بڑی سنجیدگی سے بولے۔

”سچا مرشد خدمت خلق کرتا ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”اور جھوٹا پیر خدمت خلق کرتا ہے۔“

”واہ واہ..... سبحان اللہ!“ شیخ صاحب تو صوفی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سائیں! آپ نے تو بڑی گہری بات کہہ دی ہے۔ صرف ایک نقطے کا فرق ہے۔“
”خلق اور خلق“ میں۔“

”صرف ایک نقطے ہی کا فرق نہیں بلکہ نقطے کی اونچ نیچ کا معاملہ بھی ہے۔“ حفیظ پکڑنے نے کہا۔ ”وہ ایک شعر بھی ہے نا..... نقطے کی اونچ نیچ نے محرم سے مجرم بنادیا۔“

”سائیں! میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔“ شیخ صاحب نے حفیظ پکڑ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ اسد صاحب بھی اپنی ہی لائن کے آدمی ہیں۔ انہوں نے ابھی بڑی باریک نظر آفریں اور صوفیانہ بات کی ہے۔“

”سبحان اللہ!“ حفیظ پکڑ نے غلوں دل سے کہا۔
پھر ہمارے سچ مقبول بھٹی سے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ شیخ صاحب اور پکڑ صاحب کی باہمی بات چیت سے میں جو سمجھ پایا اس کے مطابق، بھٹی صاحب ایک درویش صفت انسان تھے۔ نوجوانی کی عمر تک بھٹی صاحب سننے کی صلاحیت سے محروم تھے اور بولنے میں بھی انہیں خاصی دقت محسوس ہوتی تھی۔ وہ پیدا کنٹی کوٹے بھرے نہیں تھے۔ حادثاتی طور پر یہ بیماری ہوئی لیکن اب وہ اس بیماری سے کافی حد تک نکل آئے تھے۔ وہ آلہ سماعت کی مدد سے سننے

کے قابل ہو گئے تھے اور بڑی حد تک صاف بولنے بھی لگے تھے۔ وہ کراچی کے ایک علاقے میں رہائش پذیر تھے۔ وہ کسی سرکاری محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز بھی تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ بعضی صاحب کے پاس موکلات ہیں جن کی مدد سے وہ کام لیتے ہیں۔ حقیقت کیا تھی یہ تو مالک ہی جانتا تھا۔

علی نے شیخ صاحب سے پوچھا۔ ”انکل! اونٹن کا کیا ہوا؟“
”آج کی وقت گیرانج والا گاڑی آپ کے گھر بھجوا دے گا۔“ شیخ صاحب نے جواب دیا پھر حفیظ کپور نے حسرت پھرے لہجے میں بتایا کبھی ان کے پاس تین تین گاڑیاں نہیں گرا بٹیں ہیں۔

”انکل! آپ کے پاس ٹویونا کرولا بھی تو ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ سیاہ گاڑی جس میں عظیم گیا ہے۔“

”جان جی! سیاہ ٹویونا کرولا میرے پاس نہیں، عظیم کے پاس ہے۔“ حفیظ کپور کے لہجے میں کئی کھلی ہوئی تھی۔
”آپ کے پاس ہو یا عظیم کے پاس، ایک ہی تو بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایک بات نہیں ہے بیٹائی۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ”یہ گاڑی مہرالنسا کی ماں نے اسے دلائی ہے اس لیے زیادہ تر اسی کے استعمال میں رہتی ہے وہ بچوں کو اسکول میں پک اپنڈ ڈراپ دیتی ہے اور سیر پانے کرتی ہے۔ آج کل وہ امریکا فتح کرنے گئی ہے تو عظیم اس گاڑی کو استعمال کر رہا ہے۔ میں اور علی بھی اس گاڑی میں نہیں بیٹھے۔“
میں نے محسوس کیا تھا کہ کپور صاحب کو عظیم سے کم اور اس کی بیوی سے زیادہ مسئلہ تھا۔ لہذا میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔
شیخ صاحب نے کہا۔ ”ایک چھوٹی موٹی گاڑی ہو جائے۔“

”ایک گاڑی کی فوری ضرورت تو بہر حال ہے۔“ حفیظ کپور نے کہا۔ ”لیکن یہ کام پیسوں کے بغیر نہیں ہو سکتا اور پیسے فی الحال میرے پاس ہیں نہیں۔“

”پیسوں کو چھوڑیں سائیں۔ سب ہو جائے گا۔“ شیخ صاحب نے بڑی محبت سے کہا۔ ”کارڈیلر اپنا پیار ہے۔“

”شیخ صاحب! آپ کے کارڈیلر دوست کے پاس کیا چوری کی گاڑیاں ہیں۔“ حفیظ کپور نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ”جو وہ ہمیں بغیر پیسوں کے گاڑی دے دے گا۔“

”آپ میری بات کو سمجھ نہیں سائیں۔“ شیخ صاحب وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ”آپ علی کو کسی

وقت میرے ساتھ بھیجیں۔ دس بارہ لاکھ کی جو بھی گاڑی اسے پسند آئے گی وہ سمجھ لیں اس کی ہوگی۔ دو لاکھ روپے اس کی منجھی میں رکھیں گے۔ باقی تھوڑے تھوڑے کر کے دیتے رہیں گے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے سائیں۔ میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔“

”اگر دو لاکھ دینے سے نئی گاڑی گھر میں آ رہی ہے تو اچھی بات ہے لیکن دس بارہ لاکھ والی گاڑی سے کام نہیں چلے گا۔“ حفیظ کپور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس سے بڑی گاڑی چاہیے ہوگی ہمیں۔“

”سائیں! میں نے تو ایک بات کی تھی۔ آپ چاہو تو سٹی یا کرولا بھی لے سکتے ہیں۔“ شیخ صاحب نے کہا۔ ”میں آپ کا کام کروا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ اس پروجیکٹ پر غور کیا جاسکتا ہے۔“ حفیظ کپور نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔
اس کے بعد علی کو موبائل کے سلسلے میں باہر جانا تھا، بڑے کپور نے مجھے بھی اس کے ساتھ کر دیا تھا کہ میں بھی ذرا گھوم آؤں۔

☆☆☆

بہادر آباد کراچی کا پُر رونق کمرشل ایریا تھا۔ سب سے پہلے علی نے اپنا سیل فون تبدیل کیا پھر ہم گاڑی میں بیٹھ کر مرزگ نور دی کرنے لگے۔
میں نے پوچھا۔ ”علی! تمہارے سیل فون میں کوئی خرابی تھی؟“

”نہیں تو۔۔۔۔۔۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”یہ شاپ والا میرا دوست ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جب بھی کوئی نیا سیل فون لاؤنچ ہوتا ہے یہ مجھے فون کر دیتا ہے۔ میں اپنا فون اسے دے کر نیا فون لے جاتا ہوں۔“

”گڈ۔۔۔۔۔۔ تمہارے تو مزے لگے ہوئے ہیں۔“ میں نے مناسب الفاظ میں دل کی بات کہہ دی۔
”ایک بات بتاؤ اگر سائنڈ نہ کرو تو یہ انکل کا رویہ عظیم کے ساتھ اتنا ناگوار کیوں ہے۔“

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ایسا صرف آپ ہی نے محسوس نہیں کیا بلکہ ہر وہ شخص جو ہمارے حالات سے پر خوبی آگاہ نہیں، اس کا بھی یہی خیال ہے۔“
”پر اہم کہاں پر ہے؟“ میں نے علی کو کریدنے کی کوشش کی۔

علی کپور بڑا سافٹ اور شائستہ انسان تھا۔ اس کی گفتگو میں معقولیت پائی جاتی تھی۔ وہ منطقی اور خوش بات کرتا تھا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔

”پراہم دونوں طرف ہے۔“

”میں اس پراہم کو سمجھتا چاہتا ہوں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور میری خواہش ہے کہ باپ بیٹے کے بیچ موجود یہ تاؤ ختم ہو جائے۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں بھائی۔“ وہ دیکھی لہجے میں بولا۔ ”لیکن دونوں اپنی اپنی عادت بلکہ ضد پر جتے ہوئے ہیں۔“

”تم میرے بھائی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”تم مجھے ان دونوں کی عادت، ضد اور مجبوریوں کے بارے میں تھوڑا بریف کرو۔ ممکن ہے، میں اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں۔“

”اگر ایسا ہو جائے تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں ہوگی۔“ علی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”اللہ آپ کو کامیاب کرے!“

اس کے بعد ہمارے بیچ آئندہ دس منٹ تک جو بات چیت ہوئی اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ.....
عظیم بے حد جذباتی، پرجوش اور بڑبولا قسم کا انسان تھا جبکہ حفیظ کپور... ناپ تول کر سنجیدگی سے بات کرتے تھے۔ عظیم نے اپنی پسند کی شادی کی تھی اور یہ اس کی کو میرج تھی بلکہ کورٹ میرج تھی جبکہ حفیظ کپور مہر النسا سے عظیم کی شادی کے لیے رضامند نہیں تھے۔ وہ مہر النسا کو اپنے خاندان کے شان شان نہیں سمجھتے تھے۔ باپ کی مخالفت کے نتیجے میں عظیم نے مہر النسا سے کورٹ میرج کر لی تھی لیکن دونوں اپنے اپنے گھر میں رہتے تھے۔ جلد ہی اس عدالتی نکاح کا راز کھل گیا جس کے نتیجے میں دونوں طرف دنگا فساد کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ بالآخر اس ہنگامے کو بریک لگانے کے لیے حفیظ کپور نے اپنے اصولوں میں نرمی دکھائی اور مہر النسا اپنے میکے سے رخصت ہو کر سرسرا ل یعنی حفیظ کپور کے گھر آ گئی۔ اس سلسلے میں حفیظ کپور نے شادی کی عالی شان تقریب کا انعقاد کیا اور یہ قول کسے، پیسا پانی کی طرح بہا یا گیا۔ بعد ازاں یہ بات میرے علم میں آئی کہ حفیظ کپور نے اپنے تمام بیٹیوں اور بیٹیوں کی شادیاں اسی طرح شاہانہ انداز ہی میں کی تھیں۔

مہر النسا، حفیظ کپور کے گھر کی بہو تو بن گئی تھی لیکن بڑے کپور صاحب کے دل میں اپنی بہو کے لیے ایک گروہی بندھ گئی تھی۔ وقت دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا۔ محبوبہ

جب بیوی بنی تو اس کے اندر سے محبوبیت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور اس کی جگہ بیویانہ انداز و اطوار نے لے لی۔ شادی سے پہلے عظیم نے ایک لمبے لمبے کی حیثیت سے زندگی گزاری تھی۔ اس کی درجنوں گرل فرینڈز تھیں جن کے ساتھ وہ ڈانس پارٹیاں اٹینڈ کرتا تھا اور پینے پلانے کا سلسلہ بھی روز کا معمول تھا اور یہ سارے معاملات مہر النسا کے علم میں تھے لیکن جب عظیم نے مہر النسا سے نکاح کیا تھا، اس کے بعد اس نے کسی بھی گرل فرینڈ کے ساتھ سنجیدہ تعلقات نہ رکھنے کا عہد کر لیا تھا البتہ جام نوشی کا سلسلہ جاری تھا۔ گھر کے اندر ہی بیٹھے میں ایک آدھ بار لیٹا تھا اور جب وہ زیادہ چڑھا لیتا تو غل غلا زانگی کرتا تھا یعنی ہنستے، دس دس میں رات کے وقت محلے والے حفیظ کپور کے گھر کی بالائی منزل سے چیخنے چلانے اور چیزوں کے ٹوٹنے کی آوازیں ضرور سنا کرتے تھے۔ یہ سب حفیظ کپور کے لیے ناقابل برداشت اور اذیت ناک تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے دل میں عظیم کے لیے پسندیدگی کم ہوتی اور نا پسندیدگی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

عظیم اپنے باپ کی حق کی کو تو کسی نہ کسی طرح جھیل ہی رہا تھا۔ اس کے لیے کریب ناک بات یہ تھی کہ مہر النسا نے اس کے کردار پر شک کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اب بھی اسے ایک فلرٹ اور پلے بوائے ہی سمجھ رہی تھی اور وہ جب بھی کبھی خاموش بیٹھا ہوتا یا جب بھی اچانک اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آتی تو مہر النسا طنز سے لہجے میں اس سے یہ استفسار کرنا نہیں بھولتی تھی۔ ”کہاں کھوئے ہوئے ہو۔ کس محبوبہ کی یاد آ رہی ہے۔ مجھ پر تو ہمیشہ گرجتے برستے رہتے ہو۔ یہ کس حرافہ کے تصور نے تمہارے چہرے پر مسکراہٹ سجادی؟“

مہر النسا کی ایسی جلی بکلی باتیں اس کا کلیجا چیر دیتی تھیں اور وہ غم غلط کرنے کے لیے اور زیادہ پینے لگتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ گھر کے بالائی حصے میں ہنگامہ آرائی کا تناسب بڑھ جاتا تھا اور اس بدامنی سے گھر کا زیریں حصہ بھی بعض اوقات محفوظ نہیں رہتا تھا۔ عظیم سچے دل سے یہ عہد کر چکا تھا کہ وہ شادی کے بعد مہر النسا سے بے وفائی نہیں کرے گا لیکن مہر النسا اس کی وفاداری کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ بیوی کا یہ رویہ اس کے لیے سوہان روح تھا۔ باپ طعنہ دیتا تھا کہ وہ جو رو کا غلام ہے۔ جو رو و شک کرتی تھی کہ اس کے دوسری عورتوں کے ساتھ بھی خفیہ تعلقات ہیں۔ وہ اکثر عظیم کے سیل فون کا این باکس اور کال ریکارڈ چیک کرتی رہتی تھی

ٹریڈنگ کے بزنس میں تینوں باپ بیٹے ایک ساتھ تھے لہذا اس صورت حال نے وہاں بھی بد امنی اور بد مزگی کی نفعا قائم کر رکھی تھی۔ عظیم کا دعویٰ تھا کہ اس نے اپنی قابلیت کے بل بوتے پر کمپنی کو کروڑوں کما کر دیے ہیں لیکن پاپا کی پختے خانی اور بدگامی نے سارے کاروبار کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ دوسری جانب حفیظ کو سب کو پورے ووثق کے ساتھ جیتا پھرتے تھے کہ عظیم کی جذباتیت اور جھگڑا لومراج نے بزنس کا بدالیا نکال دیا ہے۔ شراب نوشی نے اس کی ست مار دی ہے۔ اس کے اسی رویے کی وجہ سے بزنس تباہ ہو گیا ہے۔ دو سال پہلے کسٹم والوں نے ان کا دو کروڑ کا مال روک لیا تھا۔ عظیم کا کہنا یہ تھا کہ پاپا نے کسٹم کے افسران کے ساتھ بدگامی کی تھی اور ٹریڈنگ ایجنٹ کو بھی گامالیاں دی تھیں اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ملائیشیا سے آنے والی آئل کی یہ پورٹ کسٹم والوں نے اپنے قبضے میں کر لی۔ حفیظ کو پورے نقصان کا ذمہ دار عظیم کو ٹھہرایا تھا۔ اس کے تئیں عظیم کی لائق کے سبب ان کا مال بچھڑ گیا تھا۔ قصور باپ کا تھا یا بیٹے کا، حقیقت یہ تھی کہ فوری طور پر دو کروڑ کا مال کسٹم کھاتے لگایا تھا۔ اس سلسلے میں حفیظ کو پورے عدالت میں کسٹم والوں پر کیس کر رکھا تھا۔ اغلب امکان یہی تھی کہ اگست ستمبر وہ دیس جیت جائے گا جس کے بعد اس کے دن پھر محسوس ہوئے۔

”علی! تم دونوں میں سے کس کو غلط اور کس کو سچ سمجھتے ہو؟“

”بھائی جان! یہ دونوں اپنی اپنی جگہ درست سمجھتی ہیں اور اپنی اپنی جگہ غلط نہیں ہیں۔“ اس نے دونوں الفاظ میں جواب دیا۔ ”لیکن میری حمایت اور ہمدردی بابا کے ساتھ ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”اس امتیازی سوچ کا سبب کیا ہے؟“
 ”دیکھیں بھائی جان!“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”پاپا ہمارے باپ ہیں انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا بڑس چاہے جیسا چلائیں لیکن ہمیں یہ

”میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ آج کل مالی مسائل کا شکار ہیں۔“ میں نے کہا۔

میں نے سوالیہ نظر سے اُس کی طرف دیکھا اور

”سب سے بڑا مسئلہ تو ان کی صحت کا ہے۔“

میں کہا۔ ”میں نے تو انہیں بالکل فٹ دیکھا ہے۔ عظیم بتا رہا تھا

”وہ شوگر پینٹ ہیں۔ ان کی آئی سائٹ بڑی تیزی

کر جاتا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کے

ل کے والوز بھی تبدیل کرائے گئے ہیں اور سب سے

س جگر کے قریب پندرہ سینٹی میٹر سائز کا ٹیومر ہے۔ ان اتمام

لولیاں اور کپسول بھانکتے ہیں اور تین چار مرتبہ انجیکشن

س نے دو تین گہری سانسیں لیں پھر اپنی مات کو آگے

”اس برہمائی مسائل کا عفریت منہ کھولے ہمارے

روڈ کی امیورٹ روکی ہے، زنسر، بالکل اسٹاپ ہو گیا

۷۔ ماما چھروں فقروں کے پاس بھیجا۔ تہہ نہ بھائی

”لے کر رکھ دے ہر؟“

ابروہ کرتے ہوئے کہا: ”نہیں!.....“

راجو عالی شان گھر دیکھا ہے نا اس کے ڈاکو منٹس

اکتوبر 2017ء

”ولیم آرتھر.....“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ کون صاحب ہیں؟“

”ولیم آرتھر کا تعلق امریکی ریاست کینٹکی سے ہے۔“ علی نے بتایا۔ ”پاپا کے ایک دوست ہیں بٹ صاحب۔ ولیم آرتھر دراصل بٹ صاحب کا دوست ہے۔ بٹ صاحب ہی کے توسط سے ولیم آرتھر نے ہم سے رابطہ کیا ہے اور ہمیں ایک گولڈن آفر کی ہے جس کے بعد پاپا نے گھر اور آفس کو سیل آؤٹ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔“

”کیا یہ بٹ صاحب بھی امریکا میں رہتے ہیں؟“

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”اور یہ بھی بتاؤ کہ ولیم آرتھر نے آپ کو کونسا آفر کی ہے؟“

”میں آپ کو بتاتا ہوں بھائی۔“ وہ بڑی رساں سے بولا۔ ”پاپا کے دوست بٹ صاحب ادھر کراچی ہی میں رہتے ہیں۔ ولیم آرتھر فیس بک پر ان کا فریڈ ہے۔ ولیم آرتھر امریکا میں یو این (یونائیٹڈ نیشنز) کے پرائیکٹس میں کام کرتا ہے اور یورپ کی کئی کمپنیوں کے ساتھ بھی اس کا بزنس چلا ہوا ہے۔ ولیم آرتھر نے بٹ صاحب سے کہا کہ وہ پاکستان میں انویسٹمنٹ کرنا چاہتا ہے۔ اسے بتایا جائے کہ وہ کس سیکٹر میں سرمایہ کاری کرے۔ بٹ صاحب نے کہا کہ بھائی! مجھے تو بزنس کی سوجھ بوجھ نہیں ہے۔ میں تمہیں اپنے ایک دوست حفیظ کپور سے جوڑ دیتا ہوں۔ تم ان کے ساتھ معاملات طے کرو گے میرے دوست حفیظ کپور کراچی کے ایک معروف اور کامیاب بزنس مین ہیں۔ اس طرح ولیم آرتھر ہم سے ڈائریکٹ ہو گیا۔ ہمارے بیچ ای میل کے ذریعے معاملات آگے بڑھنے لگے۔ اس نے ارادہ ظاہر کیا ہے کہ پہلے مرحلے پر وہ سترہ ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہے جس کا تیس فیصد وہ ایڈوانس دے گا، باقی پراجیکٹ شروع ہوتے ہی رفتہ رفتہ بے منٹ کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور منصوبہ مکمل ہونے سے پہلے وہ مکمل ادائیگی کر دے گا۔ ہمارے بیچ زمین کی خریداری کے بزنس پر اتفاق ہو گیا ہے۔ ہم ولیم آرتھر کی انویسٹ کی ہوئی رقم سے کسی ایسے علاقے میں یہاں زمین خرید کر اس کی پلاننگ کریں گے اور ایک عالی شان رہائشی منصوبے کا آغاز ہو جائے گا۔ ہم نے اسے چار لاکھ روپے فی مربع فٹ کارڈ دیا تھا۔ تھوڑی بحث و تکرار کے بعد تین لاکھ روپے فی مربع فٹ پر ہمارا اتفاق ہو گیا ہے۔ یہ قیمت تیار ہونے کی ہے یعنی اگر ہم چار سو مربع فٹ پر دن پلس دن ایک بنگلا تعمیر کریں تو اس کی کل قیمت بارہ کروڑ ہوگی۔ یہ بنگلا تعمیر اور معیار کے

بزنس کو سنبھالا دینے کے لیے گھر کو گروڈی رکھوا کر بینک سے پانچ کروڑ قرض لیا تھا۔ بزنس نہیں سنبھل سکا اور پیسے اڑن چھو ہو گئے۔ اس کے علاوہ دوستوں اور رشتے داروں سے کل ملا کر تین کروڑ ادھار لے چکے ہیں۔ کریڈٹ کارڈز کے ذیل میں بھی کم و بیش پچاس لاکھ روپے ہم پر واجب الادا ہیں۔ اس وقت ہم ٹک بھگ ساڑھے آٹھ کروڑ کے مقروض ہیں اور اس قرض کا سارا دباؤ پاپا کے اعصاب پر ہے۔ وہ چڑچڑے نہیں ہوں گے، تو پھر کیا کریں گے۔ یہ ان کی بہت اور اللہ کی مہربانی ہے کہ وہ اس سچویشن میں بھی زندہ ہیں۔ نہ صرف زندہ ہیں بلکہ بڑی زندہ دلی سے تقیم بھی لگاتے ہیں اور اپنے دوستوں کو اسٹریٹجی بھی کرتے ہیں۔“

”واقعی! میں بڑے کمزور صاحب کی برداشت کو سلام کرتا ہوں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”سچویشن بڑی کمبیر اور توشیٹاک ہے۔“

”ایسی ویسی توشیٹاک۔“ وہ دھکی لہجے میں بولا۔

”اب تو کوئی ہمیں دس بیس ہزار ادھار دینے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔ پوری مارکیٹ میں ہماری زبوں حالی کا چرچا عام ہو چکا ہے اور قریبی رشتے دار و احباب بھی کئی کاٹنے لگے ہیں۔ ایک ماہ پہلے پاپا نے اس کرائس سے نکلنے کا سعی فیصلہ کر لیا تھا۔“

”کیا فیصلہ؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

علی نے گاڑی کو فیل کے لیے ایک فلنگ اسٹیشن پر روکا اور بولا۔ ”گھر اور آفس کو سیل کرنے کا فیصلہ۔“

”اوہ.....“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

وہ گاڑی کو دوبارہ ایک صاف ستھری روڈ پر چڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ہمارا گھر پانچ سو گز پر دن پلس دن بنا ہوا ہے اور اس گھر کی تعمیر میں پاپا نے کوئی کمپروماز نہیں کیا تھا۔ ہر چیز دل کھول کر بہترین معیار کی لگائی تھی۔ اس وقت دس کروڑ میں گھر کا خریدار موجود ہے۔ ایک پارٹی ایک کروڑ میں آفس خریدنے کو تیار ہے۔ اگر ہم گھر اور آفس فروخت کر دیں تو ہمارے ہاتھ میں گیارہ کروڑ آجائیں گے۔ ہم پر ساڑھے آٹھ کروڑ کا قرضہ ہے۔ اگر تمام قرضہ جات ادا کر دیے جائیں تو ہمارے پاس ڈھائی کروڑ بیچ جائیں گے۔ اس رقم میں ہم ایک گھوڑی اپارٹمنٹ خرید سکتے ہیں۔ پاپا نے اس ترکیب پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن ولیم آرتھر کی آفر نے دقیق طور پر پاپا کو اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔“

لحاظ سے عالی شان ہوگا۔ زمین اور تمام تر تعمیراتی مراحل سے گزرنے کے بعد یہ بنگلہ ہمیں چھ کروڑ میں پڑے گا یعنی اس کام میں سو فیصد منافع ہے۔ اس منافع کا آدھا ہم رکھیں گے اور آدھا ولیم آر تھر کو دیں گے۔ اس حساب سے وہ مزید سرمایہ کاری کرتا چلا جائے گا۔“

”علی! سترہ ملین ڈالر کو ذرا پاکستانی کرنسی میں تبدیل کر دو تو تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”سترہ ملین ڈالر کا مطلب ہے، پاکستانی کم و بیش پونے دو ارب روپے.....“

”جی بھائی! اتنا ہی حساب بنتا ہے۔“ وہ تانیذی انداز میں بولا۔

”میں امریکیوں کی فطرت اور عادت سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور اس وقت پاکستان کے جو اندرونی حالات ہیں وہ سب تمہارے سامنے ہیں۔ میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ کیننگی میں بیٹھا ہوا ولیم آر تھر ابتدائی مرحلے میں پاکستان میں اتنی بھاری انویسٹ منٹ کے بارے میں سوچ بھی سکتا ہے۔ اگر وہ یو این کے پرائیویٹس میں کام کرتا ہے تو وہ عقل اور آنکھوں کا اندھا نہیں ہو سکتا۔“

”تو آپ کے خیال میں ولیم آر تھر ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے؟“

”بے حد حد فطرت کے ساتھ میرا یہی خیال ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”مگر وہ ہم سے کچھ تو نہیں رہا، کچھ دے ہی رہا ہے!“ علی میری بات کو ختم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”کیا آپ لوگوں نے کبھی ولیم آر تھر سے فون پر بات کی؟“ میں نے ایک اہم سوال کیا۔

”نہیں۔“ وہ فنی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”ابھی تک ہمارے سارے معاملات ای میل کے ذریعے ہو رہے ہیں۔“

”آپ کے پاس اس کا فون نمبر تو ہے نا؟“

”ہاں..... اس نے دو تین نمبر زد دیے ہوئے ہیں۔“

”آپ ان نمبر پر ولیم آر تھر کو کالنگ کر سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اور اسے دعوت دو کہ وہ پاکستان آئے اور اس زمین کا وزٹ کرے جہاں اس کے غیر سرمائے سے ایک گلوٹری ہاؤسنگ سوسائٹی بننے جا رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی پاکستان آنے کو تیار نہیں ہوگا اور آئی ایم پریئیر شیڈر

کہ آپ اس سے ٹیلی فونک رابطہ بھی نہیں کر پائیں گے۔“

”آپ یہ باتیں اسنے دثوق سے کر رہے ہیں!“ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

”وہ اس لیے کہ آج کل اس نوعیت کے بہت فراا

ہو رہے ہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ اس سے پوچھیں کہ اس نے یو این کے ساتھ کون کون سے پراجیکٹ میں کام کیا ہے؟ وہ آپ کو تفصیل نہیں بتائے گا۔

آپ اس سے پوچھیں کہ وہ یورپ کی کن کمپنیز کے ساتھ منسلک ہے؟ وہ آئیں، بائیں، شاخیں کر کے نکل جائے گا۔“

”بھائی! آپ تو اسنے اعتماد کے ساتھ یہ باتیں

کر رہے ہیں جیسے آپ ولیم آر تھر کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔“

..... علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”میں اس شخص کو ذاتی طور پر ہرگز نہیں جانتا۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن میں ایسے لوگوں کی ذہنیت اور طریقہ

واردات سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔ یہ لوگ معصوم افراد کو

لاکھوں اور اربوں کے دل کش جھانے دے کر اپنے شیشے

میں اتارتے ہیں اور ان کی زندگی بھر کی جمع پونجی ہتھی

لیتے ہیں۔“

”مگر کیسے؟“ علی نے اصراری لہجے میں کہا۔ ”بھائی!

میں ان نو سربازوں کے طریقہ کار کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ ابھی

تک ولیم آر تھر نے ہم سے ایک ڈالر کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔“

میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”ولیم آر تھر جیسے

دھوکے باز بھی اپنے شکار کو اپنے جال میں جکڑنے کے لیے

بڑے دل فریب گر آزماتے ہیں۔ میرے اندازے کے

مطابق، اگر آپ لوگوں نے ولیم آر تھر کی نیت پر شک نہ کیا

اور اس کے بچھائے ہوئے جال میں آ گئے تو وہ آپ لوگوں

سے پانچ دس ہزار ڈالرزا ایٹھنے کے لیے کوئی خوب صورت

جال چلے گا اور آپ کروڑوں اربوں کے منافع کے لالچ

میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچیں گے کہ وہ آپ کے

ساتھ کون سا ہاتھ کر رہا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے، ہمیں اس پراجیکٹ سے ہاتھ

کھینچ لینا چاہیے؟“ علی نے مجھ سے پوچھا۔

”میرا مشورہ تو یہی ہے بھائی۔“ میں نے غلوص دل

سے کہا۔ ”مجھے اس پراجیکٹ میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔

ویسے اگر آپ اپنی سلی کرنا چاہتے ہیں تو دو کام کر کے دیکھ

لیں۔“ میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی

بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”نمبر ایک، اس سے کہیں کہ ”ای میل، ای میل“

بہت کھیل لیا۔ اب تم اپنا ڈائریکٹ کالنگ نمبر دوتا کہ

سنہری باتیں

☆ ایک ہاتھ اللہ کی طرف ہے کے لیے پیارا
اور دوسرا مخلوق کو دینے کے لیے کھولو۔ عاجزی کے
ذریعے اللہ سے لو اور سخاوت سے بندوں کو دو۔
عبادت کر کے اللہ کے محبوب بن جاؤ اور عمدہ اخلاق
سے مخلوق کے محبوب بن جاؤ۔

☆☆☆

☆ عقل کی کروڑوں دلیلیں اللہ سے ایک گناہ
معاف نہیں کرا سکتیں لیکن عداوت کا ایک آنسو زندگی
بھر کے گناہ معاف کرا سکتا ہے۔ لوٹ آؤ اللہ کی
طرف اس سے پہلے کہ لوٹ جاؤ اللہ کی طرف۔

☆ مسئلہ: ام حرم شفیق۔ نیو کراچی
☆ مشکل وقت میں ہمیشہ رب کریم کے ساتھ رہنے
ہاتھ پھیلا کر دعا کیا کرو کیونکہ جہاں انسان کا حوصلہ
جواب دے جاتا ہے، وہیں سے رحمت خداوندی
شروع ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

☆ خوب صورت عمل انسان کی شخصیت بدل
دیتا ہے اور خوب صورت اخلاق انسان کی زندگی۔

☆☆☆

☆ اپنے رب سے جو مانگو ہر دے کے ساتھ
مانگو کیونکہ وہ جب بھی دیتا ہے جب تم نہیں مانگتے پھر یہ
کیسے ممکن ہے کہ تم مانگو اور وہ عطا نہ کرے۔ (سبحان
اللہ)۔

☆ مسئلہ: راحیلہ شفیق۔ سندھی ہوٹل نیو کراچی

طور پر یہ خیال آیا کہ وہ مقبول بھی ہوگا۔ اس نے اپنے
دامیں کان میں آواز سماعت بھی لگا رکھا تھا۔ میں نے
مذکورہ شخص سے مصافحہ کیا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ علی
نے بھی اس شخص کو سلام کیا تھا۔

علی نے گاڑی کی چابی فتح صاحب کے حوالے کی تو
انہوں نے پوچھا۔ ”بیٹا گاڑی میں بیٹروں کو ڈال دیا تھا نا؟“
”جی انکل! میں نے ٹینک فل کر دیا ہے۔“ علی نے
جواب دیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اسد بھائی! آپ بیٹھو۔ میں پاپا کو بھیجتا ہوں۔“

حفظ کپور اس وقت ڈرائنگ روم میں موجود نہیں
تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ گھر کے اندرونی حصے میں
ہوں گے۔ علی کے جانے کے بعد اس اجنبی نے گہری نظر
سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

اکتوبر 2017ء

م سے فون پر بات ہو سکے۔ نمبر دو، اس سے پوچھیں کہ وہ
ان پرائیکٹس کے بارے میں بتائے جو اس نے لوائن
(پوائنٹڈ نیشنز) کے ساتھ کیے ہیں اور یورپ کی ان کمپنیز
کے نام بتائے جن کے ساتھ وہ کام کر رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے بھائی۔ میں پاپا سے بات کرتا
ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”وہیم آرتھر کی شکل
بڑی حد تک ان بڑے میاں سے ملتی ہے جو“ کے ایف
سی“ کے لوگوں میں نظر آتے ہیں۔ میں سمجھا تھا وہیم آرتھر بھی
ان بڑے میاں کی طرح کا کوئی کامیاب بزنس مین اور
شریف آدمی ہوگا۔“

”تم نے جن بڑے میاں کا ذکر کیا ہے ان کا نام
کرنل ہارلینڈ سینڈرز ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس
خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”جنہیں کرنل تک بھی کہا جاتا
ہے۔ اس شخص نے ایک معمولی سے بچپن سے اپنے کام کا
آغاز کیا تھا۔ محنت ضرور ایک دن رنگ لاتی ہے۔ لوہیں
دل کیننگی کے باسی اس شخص نے بھی ان تھک محنت کی
اور اپنے ہنر کا لوہا پوری دنیا سے منوالیا۔ اس وقت“ کے
ایف سی“ یعنی کیننگی فرائیڈ چکن کے دنیا کے ایک سو
پندرہ ممالک میں اٹھارہ ہزار سے زیادہ آؤٹ لیس دن
رات کام کر رہے ہیں۔“

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر علی کا نیا گھوسل فون بیدار
ہو گیا۔ دوسری ٹھنڈی پر علی نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

”جی پاپا!.....!“

گويا بڑے کپور صاحب کا فون تھا۔ علی نے چند
سیکنڈ تک دوسری طرف کی بات سنی پھر بڑی فرماں
برداری سے بولا۔

”پاپا! بس ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔“

ٹھیک پانچ منٹ کے بعد ہم گھر کے سامنے تھے۔

☆☆☆

دیوار گیر کلاک چھ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ منظر
ڈرائنگ روم کا تھا اور وہاں ذوالفقار شیخ کے علاوہ ایک
اور شخص بھی موجود تھا۔ مناسب بدن اور دراز قامت اس
شخص نے سفید سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ مناسب سائز
کی سفید ڈائمی اس کے چہرے پر بہت بچ رہی تھی۔ اس
کے سر کے بال بھی سفید ہی تھے مگر سر کے وسطی حصے پر
بال تانبید تھے تاہم سر کے گرد سفید بالوں کی دبیز جھال
موجود تھی۔ اس اجنبی شخص کے چہرے پر مصوویت اور
آنکھوں میں ہلاکی ذہانت تھی۔ میرے ذہن میں فوری

”آپ ٹھیک ہیں نا؟“

”جی..... مالک کا کرم ہے۔“ میں نے مختصر کہا۔

”آپ شیخ صاحب کے ساتھ آئے ہیں؟ اس نے پوچھا۔

”نہیں!“ میں نے نفی میں گردن ہلائی اور جواب

دیا۔ ”میں شیخ صاحب کے ساتھ آیا تو نہیں مگر پچھلے چند گھنٹوں سے انہی کے ساتھ ہوں۔“

شیخ صاحب نے کہا۔ ”سائیں! یہ حفیظ بھائی کے

مہمان ہیں۔ امریکا سے آئے ہیں۔ ان کا نام اسد علی ہے۔“

”ماشاء اللہ.....!“ وہ شخص خوش دلی سے بولا پھر شیخ

صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”یہ عظم کے

دوست ہیں؟“

”جی سائیں۔“ شیخ صاحب نے اثبات میں گردن

ہلائی پھر مجھے بتادیا۔ ”یہ مقبول بھی صاحب ہیں۔“

میں نے بھی صاحب کی طرف دیکھا پھر زیر لب

مسکراتے ہوئے سر کو اٹھائی جیش دی اور کہا۔ ”بھئی صاحب!

آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ تھوڑی دیر پہلے شیخ صاحب

اور گپور صاحب آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔“

کمزور سماعت رکھنے والے افراد کے ساتھ ایک

نفیاتی مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں، دوسرے بھی اونچا

ہی سنتے ہوں گے لہذا مقبول بھی بھی خامے بلند آہنگ لہجے

میں بات کرتے تھے۔ میری بات کے جواب میں انہوں

نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”سائیں! میں اللہ کا بندہ ہوں۔ سب تعریفیں اللہ

کے لیے ہیں۔ میں تو بہت گناہ گار انسان ہوں۔“

اسی لمحے حفیظ کپور ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور

”آؤ میری جان“ کہتے ہوئے مقبول بھی کی جانب

بڑھے۔ بھئی صاحب بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے

بڑی گرم جوشی کے ساتھ معاف کیا پھر آسنے سامنے بیٹھ گئے۔

”کہاں غائب ہو سکرار۔“ حفیظ کپور نے کہا۔ ”کافی

دنوں سے ادھر کا چکر بھی نہیں لگایا، کوئی اتنا پتا ہی نہیں۔ مجھے

اس طرح نظر انداز نہ کیا کریں۔ مجھے آپ کی دعاؤں کی

شد ضرورت ہے۔“

”حفیظ بھائی! میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔“

بھئی صاحب نے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ اللہ کرم کرے گا۔“

”یہ تو مجھے بھی پتا ہے کہ اللہ کرم کرے گا۔“ حفیظ کپور

نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن یہ کرم کب تک ہوگا، اس

راز سے پردہ تو آپ ہی اٹھاؤ گے نا.....“

”حفیظ بھائی! میں نے آپ کے لیے دعا کی ہے۔“

”پہلے تو آپ کی ہر دعا قبول ہوتی تھی.....!“

کپور نے شکایت بھری نظر سے بھئی صاحب کی طرف

دیکھا۔ ”اب کیا رکاوٹ ہے؟“

”رکاوٹ.....“ بھئی صاحب جملہ ادھورا چھوڑ کر

خاموش ہو گئے۔

میں نے دیکھا کہ خاموشی اختیار کرنے کے بعد وہ

کچھ بے چین سے ہو گئے تھے۔ ان کے چہرے کے

تاثرات سے اضطراب جھلک رہا تھا۔

”میں بڑے مضبوط اعصاب کا مالک ہوں میری

جان۔“ حفیظ کپور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں

نے بہت سے مالی اور معاشرتی بحران دیکھے ہیں۔ جیل بھی

کاٹی ہے اور عدالتوں میں بڑے خطرناک مقدمات کا سامنا

بھی کیا ہے اس لیے دعا کی قبولیت کے راستے میں جو بھی

رکاوٹ آپ کو نظر آ رہی ہے اس کا کھل کر اظہار کریں۔ میں

بڑی ہمت اور حوصلے سے سن لوں گا۔“

”حفیظ بھائی! آپ بیابان سے جان چھڑالیں۔“ بھئی

صاحب نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”بیابان یعنی سوڈ؟“ حفیظ کپور نے سوالیہ نظر سے ان

کی طرف دیکھا۔

”جی جی..... میرا یہی مطلب ہے۔“ بھئی صاحب

نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”سوڈی

معاملات اللہ کو سخت ناپسند ہیں۔ سوڈی کوئی بھی قسم ہو، اللہ

نے اس سے منع فرمایا ہے بلکہ یہاں تک کہا ہے کہ جو لوگ،

سوڈ کے معاملات یا سوڈ کا کاروبار کرتے ہیں، میں ان کا

کھلا دشمن ہوں جس کا دشمن اللہ ہو وہ کیسے چپ سکتا ہے،

کیسے خوش رہ سکتا ہے؟“ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنی

بات مکمل کی۔

”میں آپ کا نقطہ اچھی طرح سمجھ رہا ہوں اور اس

نقطے کے اندر چھپا ہوا نکتہ بھی مجھے صاف دکھائی دے رہا

ہے۔“ حفیظ کپور نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

”لیکن میں بری طرح سوڈی معاملات میں پھنسا ہوا ہوں۔

گھر کو بینک میں گروی رکھوا کر میں نے بینک سے جو رقم

حاصل کی تھی وہ کب کی اڑن چھو ہو چکی۔ اب تو ہر ماہ مارک

اپ کی لاکھوں کی قسط میرے سر پر کھڑی ہوتی ہے۔“

مقبول بھی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”جب

تک آپ اس لعنت سے جان نہیں چھڑائیں گے، آپ کے

معاملات سیدھے ہوتے مجھے نظر نہیں آتے۔“

میرے لیے یہ ٹاپک نیا اور دلچسپ تھا لہذا میں

کا ذکر نکل آیا اور نہ میں خود آپ سے بات کر کے اس سلسلے میں آپ کو خبردار کرنا چاہتا تھا۔“

”حتیک یو پیٹا! میں تمہاری رائے کو ضرور اہمیت دوں گا۔“ حفیظ کپور نے احسان بھرے انداز میں کہا۔ ”اور پھر بھی صاحب بھی منع کر رہے ہیں تو میں اس کام میں ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔ میں پُر خلوص دوستوں اور سچے خیر خواہوں کے مشوروں کی بہت قدر کرتا ہوں۔“

”میں نے علی کو بہت سی پیس دی ہیں۔“ میں نے حفیظ کپور سے کہا۔ ”علی آپ سے ڈسکس کرے گا۔ اگر آپ ولیم آر تھر کی اصلیت تک پہنچنا چاہتے ہیں تو ان ٹیس کو ٹرائی کیجیے گا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔“

”ضرور پیٹا جی! میں علی سے بات کروں گا۔“ حفیظ کپور نے یقین دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔

پھر ان لوگوں میں سیاست اور پاکستان کے موجودہ حالات پر گفتگو ہونے لگی۔

”ملک میں امن و امان کی صورت حال ہو تو کوئی کاروبار بھی چلے۔“ حفیظ کپور جو صمل لہجے میں بولے۔ ”ملکی حالات کو دیکھ کر بہت دلی کڑھتا ہے۔“

اسی لمحے حفیظ کپور کے فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے کال ریسیو کی اور سٹن فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... ہیلو!“

پھر انہوں نے بڑے اطمینان سے دوسری طرف کی بات سنی اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”سیدھے اوپر.....!“

بس ایک جملہ ادا کرنے کے بعد حفیظ کپور نے فون ایک طرف رکھ دیا اور بے آواز بلند نعرہ لگایا۔

”اکبر بادشاہ.....!“

یہ نعرہ میں نے کل رات بھی ان کی زبان سے سنا تھا اور مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اکبر ان کے ایک وفادار گھریلو ملازم کا نام ہے۔ میں یہ پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ انہوں نے ”سیدھے اوپر“ کس کو بھیجا ہے کہ اسی وقت اکبر نامی ملازم ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

وہ حفیظ کپور کے سامنے باادب کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”جی صاحب!“

”پرندوں کے کھانے پینے کا بندوبست کر دیا نا؟“ حفیظ کپور نے استفسار کیا۔

”جی صاحب! سارے برتن باجرے اور پانی سے

پوری توجہ سے دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ حفیظ کپور نے استفسار کیا۔

”اس اجنت سے کیسے جان چھڑاؤں میں؟“

”جس گھر کو گروی رکھوا کر آپ نے سود پر قرض لیا تھا، اسے فروخت کر دیں۔“ مقبول بھی نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ”مزارعہ کرنے کے لیے کسی چھوٹے سے گھر میں چلے جائیں اور سارے قرضے اتار کر سکھ کی سانس لیں۔“

”سامیں! بھی صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ شیخ صاحب نے بڑے کپور سے کہا۔ ”اللہ آپ پر کرم کرے گا اور بہت جلد آپ اپنے قدموں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ جب آپ کی روزی روٹی میں اللہ برکت ڈالے گا تو سارے مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے۔“

”چند روز پہلے میں یہ گھر فروخت کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا کیونکہ مالی مسائل کے عفریت سے بچنے کے لیے میرے پاس کوئی آپشن باقی نہیں تھا۔“ حفیظ کپور نے کہا۔

”لیکن ولیم آر تھر والے منصوبے کے بعد میں نے یہ گھر بیچنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔“

ولیم آر تھر کی اسٹوری میں علی کی زبانی سن چکا تھا اس لیے میرے کان کھڑے ہو گئے۔ بھی صاحب نے پوچھا۔ ”یہ وہی صاحب ہیں نا جن کا آپ نے پہلے بھی ذکر کیا تھا۔ جو امریکا میں ہوتے ہیں؟“

”جی بھائی وہی۔“ حفیظ کپور نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”حفیظ بھائی! آپ خوش رہیں مگر کسی خوش فہمی میں نہ رہیں۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ حفیظ کپور نے پوچھا۔

”بھئی صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ولیم آر تھر ایک فراڈ شخص ہے۔“ میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ”وہ

آپ کو سہانے خواب دکھا کر آپ کے جذبات سے میل رہا ہے اور جب آپ اس پر اندھا بھروسہ کرنے لگیں گے تو وہ آپ کو دس بیس ہزار ڈالر کا جو نالگا کر فو پکڑ ہو جائے گا۔“

مقبول بھی نے چونک کر مٹی خیز نظر سے مجھ دیکھا پھر میرے تبصرے کی تائید میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اسد

سامیں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرا یہی مطلب تھا۔“

حفیظ کپور میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

”آپ کو کس نے بتایا ولیم آر تھر کے بارے میں؟“

”اس موضوع پر علی سے میری تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”اچھا ہوا، ولیم آر تھر

”شاباس!“ حفیظ صاحب نے سراجے والے انداز میں کہا۔ ”اب ذرا تم اوپر چلے جاؤ۔ چھوٹے عظیم نے جھپٹ پر جو کبوتر، چڑیاں اور خرگوش پال رکھے ہیں، ذرا ان کو دکھاؤ۔“

مقبول بھٹی نے کہا۔ ”حفیظ بھائی! عظیم نظر نہیں آ رہا۔
کیا وہ کہیں گیا ہوا ہے؟“

”ماشاء اللہ!“ بھٹی صاحب نے کہا۔
حفیظ پور نے ”چھوٹے عظیم“ کا ذکر کرتے ہوئے مجھے یہ سمجھنے

میں ذرا سی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس تذکرے سے اس کی مراد عظیم کا بیٹا عظیم تھی۔ عظیم کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ عظیم کو پرندے اور جانور پالنے کا بہت شوق ہے لیکن حفیظ صاحب کو اپنے پوتے کا یہ شوق قطعی پسند نہیں تھا اور اس موضوع پر خاصی بد مزگی بھی ہو چکی تھی۔ شاید تھوڑی دیر پہلے کپور صاحب نے اپنے پوتے عظیم ہی کو ”سیدھے اوپر“ جانے کی ہدایت کی تھی۔

”صرف“ ماشاء اللہ“ سے کام نہیں چلے گا سائیں۔“
حفیظ کپور نے مقبول بھٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ
بتائیں کہ آخر کب تک ایسا چلتا رہے گا۔ عظیم کی طرف سے
میرے نصیب میں کوئی کچھ بھی لکھا ہوا ہے یا نہیں؟“

میں محتاط نظر سے بڑے کبوتر صاحب کو دیکھنے لگا۔ پتا نہیں کیوں، اچانک انہوں نے عظیم کے خلاف لٹھ اٹھالی تھی۔ میں نے اس حوالے سے کچھ کہنے سے گریز کیا۔ فتح صاحب نے کہا۔ ”سامعین! میری بات کا یقین کریں۔ میں آپ کو بچ بٹارہا ہوں، عظیم کی بیوی ناکام ہو کر امریکا سے واپس آنے کی پھر ان دونوں میاں بیوی کا دماغ ٹھکانے پر آ جائے گا۔ عظیم اس سے پہلے امریکا کا ایک تجربہ کر کے واپس آ چکا ہے۔“

”آپ کیا کہتے ہیں بھٹی صاحب؟“ حفیظ کپور نے پوچھا۔
 ”وہ واپس آئے گی اور پھر دوبارہ جائے گی۔“ بھٹی صاحب نے جواب دیا۔

”آپ کا مطلب ہے کہ وہ دوبارہ امریکا جائے گی؟“
 ”جی حقیقت بھائی۔“ بھٹی صاحب نے اثبات میں
 گردن ہلائی۔ ”اس کا بار بار امریکا آنا حانا لگارے گا۔“

”اچھا.....“ حفیظ کپور کے چہرے پر تفکر کی
پرچھائیں نمودار ہوئیں۔ اس نے پوچھا۔ ”اور عظیم کیا کہے
گا..... یہ بھول اپنی سزا کے بغیر کیسے زندہ رہے گا؟ آپ تو
میری پریشانیوں میں اضافے کا اعلان فرما رہے ہیں۔“

”عظیم دوسری شادی کرے گا۔“ بھٹی صاحب نے
انکشاف انگیز کجے میں کہا۔

حفیظ کپور نے آنکھیں سیڑ کر مقبول بھٹی کی طرف دیکھا اور استفسار کیا۔ ”کیا مہر النساء عظیم کو دوسری شادی کرنے کا اجازت دو رہی؟“

”سائیں! اجازت دینے کا کیا سوال.....!“ بھی
نے کہا۔

”میرا مطلب یہ کہ مہر النساءِ عظیم کو ایسا نہیں کرنے
دے گی۔“ حفیظ کپور نے وضاحت کی۔

”وہ رہے کی تو روکے گی نا.....!“
 ”وہ کیوں نہیں رہے گی؟“ حفیظہ کپور نے الجھن زدہ
 نظر سے بھٹی کی طرف دیکھا۔ ”میں آپ کی بات سمجھ نہیں
 سکا۔ آپ ذرا وضاحت کر دیں۔“

”سائیں! امیر النساء، عظیم کو چھوڑ دے گی۔“ مقبول
 ٹٹی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ خود کو
 نس میں اس طرح مصروف کر لے گی کہ اسے عظیم کی
 ضرورت نہیں رہے گی اور نہ ہی عظیم کا خیال آئے گا۔“
 ”اور جا رہا، ایکا ایکا جا رہا؟“

”سچے دادا دادی اور پھوپھیوں کے پاس پرورش
میں گئے۔“ مقبول بھٹی نے جواب دیا۔ ”مگر نانی کے
سہمیں نہیں جائیں گے۔“

”آپ نے بڑی خطرناک خبر سنا دی ہے سائیں۔“
 مظہر پور نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں اندر سے
 کر رہا گیا ہوں۔ بچے چھوڑوں کے پاس کیوں چلیں گے،
 عظیم ان کا خیال نہیں رکھے گا؟“

”عظیم بھی دور چلا جائے گا۔“ بھیٹی صاحب نے بتایا۔
”دور کہاں؟“ حفیظ کپور نے سوال کیا۔

”جنوبی ایشیا کے کسی ملک میں۔“ بھٹی صاحب نے
 ب دیا۔ ”جیسے تھائی لینڈ یا ملائیشیا یا انڈونیشیا وغیرہ.....“

اور اب آپ اسے جنوبی ایشیا بھیج رہے ہیں۔ یہ کیا اسے سنا کر؟“

کہا اور خاموشی سے اٹھا اور ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ میں عظیم سے بہت کچھ پوچھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن یہاں اچانک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ اس کا موقع نہیں مل سکا۔

حفیظ کپور نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔ ”آپ لوگوں نے اس کا رویہ دیکھ لیا۔ اس کے اسی مزاج نے ساری گزریڑ پھیلا رکھی ہے۔ یہ نہ خود سکون میں رہتا ہے اور نہ ہمیں چین سے رہنے دیتا ہے۔“

میں اس امر کا چشم دید گواہ تھا کہ کم از کم اس پھوٹن میں عظیم کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ بڑے کپور صاحب خوا خواہ اسے مطعون کر رہے تھے۔

”چھوڑیں حفیظ بھائی! آپ ٹیشن نہ لیں۔“ وہ مقبول بھئی نے کہا۔ ”ابھی اس کی سوچ بچوں والی ہے۔ جب پھوڑ ہوگا تو خود ہی سمجھ جائے گا۔“

”کیا اس کی پھوڑنی ساٹھ سال کی عمر میں اس کے پیچھے پردہ تک کی؟“ حفیظ کپور غصے آئیز لہجے میں بولا۔ ”اس اکتوبر میں یہ چوتیس سال کا ہو جائے گا۔ ماشاء اللہ! چار بچوں کا باپ ہے۔ میں کب تک اس چوتیس سالہ بچے کو فیزر پلانے میں لگا رہوں گا۔ غیر ذمے داری اور لا ابالی پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔“

میں نے ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کے لیے مقبول بھئی سے کہا۔ ”سر! آپ کچھ میرے بارے میں بھی تو بتائیں!“

”آپ کا دوست ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔“ بھئی صاحب گہری سنجیدگی سے بولے۔ ”اگر میری کوئی بات آپ کو بری لگ گئی تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔“

”آپ فکر نہ کریں سر!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے آپ کی کوئی بات بری نہیں لگے گی اور نہ ہی میں ناراض ہو کر یہاں سے اٹھ کر جاؤں گا۔ آپ میرے بارے میں جو بھی بتانا چاہتے ہیں، بلا خوف و خطر کہہ سکتے ہیں۔“

”ماشاء اللہ!“ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”سائیں! آپ اپنے دوست سے بہت مختلف ہیں۔ اللہ آپ پر بڑا کرم کرے گا۔ آپ بہت ترقی کریں گے۔ کیا ایسی حال ہی میں، آپ کے بیڑوم میں آتشزدگی کا کوئی واقعہ پیش آیا ہے؟“

میں نے چونک کر مقبول بھئی کی طرف دیکھا۔ اس کے سوال نے مجھے چکر اکر رکھ دیا تھا۔ وہ بہت اندر کی بات پوچھ رہے تھے۔ میرے ذہن میں وہ واقعہ گھوم گیا جب چند روز پہلے میں ڈیلز میں تھا۔ ویلفیٹا نے مجھے پریسٹن ہالو

”حفیظ بھائی! میں اللہ کا بندہ ہوں۔“ وہ دونوں ہاتھ جڑتے ہوئے بولے۔ ”میری اپنی طاقت نہیں ہے۔ میں کسی کو کہیں نہیں بھیج سکتا۔ عظیم اپنی مرضی سے جنوبی ایشیا کا رخ کرے گا اور وہاں جا کر وہ دوسری شادی کرے گا۔“

”کیا عظیم کی دوسری بیوی مسلم ہوگی؟“

”الحمد للہ! وہ ایک پردہ دار اور باحیا مسلم عورت سے شادی کرے گا۔“ مقبول بھئی نے بتایا۔ ”اسی عورت کی وجہ سے عظیم کو وہاں کی شہریت بھی مل جائے گی۔ بعد میں وہ اپنے چاروں بچوں کو بھی اپنے پاس بلا لے گا۔“

ادھر بھئی صاحب کی بات ختم ہوئی، ادھر عظیم ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس نے سب سے ہاتھ ملایا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ حفیظ کپور نے مقبول بھئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عظیم سے کہا۔

”بھائی نے تمہارے لیے ایک سنسنی خیز پیش گوئی کر دی ہے!“

”کیا؟“ عظیم نے سپاٹ آواز میں کہا۔

”بیٹا جی! سہرا باندھنے کی تیاری شروع کر دو۔“ حفیظ کپور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”بھئی صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ تم عنقریب فار ایسٹ جانے والے ہو اور وہاں جا کر تم ایک باحیا، پردہ دار عورت سے شادی کر دو گے۔“

”پاپا! آپ کے خیال میں کیا سہرا لٹا کوئی بے حیا اور بے پردہ عورت ہے؟“ عظیم کے استفسار سے اذیت جھلکتی تھی۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“ حفیظ کپور سنہلے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”میں نے تمہیں وہ بتایا ہے جو بھئی صاحب نے کہا ہے۔“

”بھئی صاحب پہلے بھی دو تین مرتبہ مجھ سے یہ بات کہہ چکے ہیں۔“ عظیم نے اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔ لیکن پاپا! میں آپ سب کو بتا دوں کہ مہر النساء مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتی اور جہاں تک میری دوسری شادی کا تعلق ہے تو یہ بھی نہیں ہوگا، چاہے میں پاکستان میں رہوں یا فار ایسٹ جاؤں یا امریکا شفٹ ہو جاؤں..... ڈیس فل اینڈ فائنل۔“

”نہ..... تم اتنی گری کیوں کھا رہے ہو۔“ حفیظ کپور نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”ہم کوئی زبردستی تمہاری دوسری شادی ٹھوڑی کر دار ہے ہیں۔“

عظیم نے اپنے باپ کے ریمارکس پر ایک لفظ نہیں

کسی ایک مقام پر زیادہ عرصہ قیام نہیں کر سکیں گے۔ ملکوں ملکوں گھومنا اور مستثنیٰ خیز واقعات میں ملوث ہونا ان۔
نصیب میں لکھا ہے۔

”مستقبل میں کیا پیش آئے گا اس کا فیصلہ تو آ۔
والا وقت ہی کرے گا۔“ بڑے پور صاحب نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”آپ ان کے حال کا احوال بتائیں۔ ا۔
کسی خاتون کی تلاش میں امریکا سے پاکستان آئے ہیں
یہ فرمائیں ان خاتون سے اسد کی ملاقات کب اور ک
حالات میں ہوگی؟“

حفیظ پور نے مقبول بھٹی سے ایسا سوال کیا تھا کہ میں
سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ میری زندگی کا سب سے حساس ا
سب سے زیادہ نازک پہلو تھا۔ میں اپنی ماں کی تلاش میں
ہزاروں کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے یہاں پہنچا تھا اور حالانہ
واقعات کے مطابق، بہت جلد میں اپنی ماں سے ملنے وا
تھا۔ حفیظ پور صاحب نے تو یہاں تک پیش گوئی کر دی تھی
کہ آج کی تاریخ میں ماں سے میری ملاقات ہو جائے گی
یہ ان کا بہت بڑا دعویٰ تھا۔ اسی سبب مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ
کہیں بھٹی صاحب کے منہ سے کوئی ایسی دیکھی بات نہ نکل
جائے جس سے، ماں سے ہونے والی ملاقات پر کوئی ٹرا
پڑتا ہو۔ میں نے ابھی بھٹی صاحب کی روحانی قوت کا ثبوت
دیکھا تھا۔ یہ شخص کوئی بہت ہی پہنچا ہوا بندہ تھا۔ اگر دل میں
خدا شات اور ذہن میں انڈیشے بھرے ہوں تو ایسے لوگوں کا
صحبت سے دور ہی رہنا چاہیے ورنہ تنگی کوار کسی بھی وقت آپ
کو کا جرموں کی طرح کاٹ کر چھینک سکتی ہے۔ ایسے لوگوں
کی سنگت صرف ان افراد کو راس آتی ہے جو اندر باہر سے
ٹرانسپیرنٹ ہوتے ہیں!

حفیظ پور کے سوال پر مقبول بھٹی ایک دم سنجید
ہو گئے تھے۔ میں یہی سمجھا کہ وہ میرے بارے میں کوئی
گہمیرا انکشاف کرنے والے ہیں۔ اس خیال نے میرے
دل کی دھڑکن کو خطرناک حد تک بڑھا دیا۔ ہم سب کی
نظریں مقبول بھٹی کے ہونٹوں پر لگی ہوئی تھیں۔ بالآخر ان
کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ وہ پور صاحب کو مخاطب کرتے
ہوئے بولے۔

”حفیظ بھائی! آپ ہمارا امتحان لے رہے
ہیں.....؟“

”نہیں بھائی! ایسی کوئی بات نہیں۔“ پور صاحب
نے جلدی سے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”میں ایسی
گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بس، ایسے ہی میں نے آپ

کے ایک بیٹکے میں ٹھہرایا تھا اور میں نے مذکورہ بیٹکے میں
ڈیلفینا کے ساتھ بہتر کھنے قیام کیا تھا۔ یہ بہتر کھنے ایک سے
بڑھ کر ایک حیرت انگیز واقعات سے بھرے ہوئے تھے۔
وہیں پر ربی آئزک بارون لاؤ سے بھی میری تفصیلی ملاقات
ہوئی تھی۔ ربی آئزک نے ڈیلفینا کو کسی پراسرار چکر سے
نجات دلائی تھی۔ بعد ازاں جب مجھے معلوم ہوا کہ ڈیلفینا
کس مقصد سے مجھ پر کام کر رہی تھی تو میں نے اس کی پیشکش
کو بڑی بے دردی سے ٹھکرا دیا تھا۔ اسی بیٹکے پر قیام کے
دوران میں ایک رات میرے بیڈروم کے برابر والے
کمرے میں آتشزدگی کا واقعہ پیش آیا تھا۔

مقبول بھٹی ایک نیک سوالیہ نظر سے مجھے دیکھے جا رہا
تھا۔ اس کے انکشاف نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ میں
نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”میرے بیڈروم میں تو نہیں البتہ میرے بیڈروم
کے برابر والے بیڈروم میں ایسا واقعہ پیش آیا تھا۔“
”اور یہ واقعہ جہاں پیش آیا تھا، وہ آپ کا اپنا گھر نہیں
تھا۔“ وہ بہ دستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔
”آپ کسی کے گھر میں مہمان بن کر ٹھہرے ہوئے تھے؟“

”جی۔ یہ درست ہے۔“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔
”آتشزدگی سے ایک دو روز پہلے آپ کی کسی شخص
کے ساتھ خوں ریز مارا ماری بھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے
آپ کے لیے کافی مشکلات کمزری ہو گئی تھیں؟“ بھٹی
صاحب نے پوچھا۔

”جی..... ایسا ایک واقعہ پیش آیا تھا۔“ میں نے کہا۔
مقبول بھٹی جس انداز میں میرے بارے میں بتا رہا
تھا، وہ حیران کن ہونے کے ساتھ تشویش کا بھی تھا۔ اس
سے اس کی باطنی قوت کا ثبوت ملتا تھا۔ وہ یقیناً پراسرار
صلاحیتوں کا مالک ایک روحانی شخص تھا۔

”آپ بہت خوش قسمت ہیں سائیں۔“ وہ معتدل
انداز میں بولا۔ ”اللہ آپ سے خوش ہے اور اس ذات پاک
کا بڑا اکرم ہے آپ پر۔“

”میں اس کرم پر مالک کا شکر گزار ہوں۔“ میں نے کہا۔
”بھٹی صاحب! آپ اسد کے ماضی کو چھوڑ دیں۔
ان کے حال اور مستقبل کے بارے میں کچھ بتائیں.....!“
حفیظ پور نے کہا۔

”ان کا حال اور مستقبل شاندار ہے۔“ مقبول بھٹی
نے زہرباب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن زندگی بھر انہیں
سخت محنت کرنا پڑے گی۔ ان کے پاؤں میں چکر ہے۔ یہ

سے پوچھ لیا۔ اگر آپ نہیں بتانا چاہتے تو آپ کی مرضی ہے۔ میں اصرار نہیں کروں گا۔“

”میں اللہ کا بندہ ہوں سائیں۔“ مقبول بھی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”میں کچھ نہیں جانتا۔ میرا اللہ سب جانتا ہے اور اس کی مرضی کے بغیر کچھ ہو نہیں سکتا۔“

”سائیں! اگر کوئی خطرناک بات ہے تو رہنے دیں۔“

بغ صاحب نے کہا۔ ”میں آپ کو جھوٹا بتا رہا ہوں۔ حفیظ بھائی کی نیت صاف ہے۔“

”اگر حفیظ بھائی کی نیت صاف نہ ہوتی تو میں ایک ملاقات کے بعد بھی ان سے ملنے کی کوشش نہ کرتا۔“ مقبول بھی نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”یہ میرے بھائی ہیں۔ میں ان سے محبت کرتا ہوں لہذا ان کے سوال کا جواب ضرور دوں گا۔“ پھر وہ کپور صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئے۔ ”آپ نے کیا پوچھا تھا حفیظ بھائی؟“

”میں نے آپ سے اسد کے بارے میں سوال کیا تھا۔“ حفیظ کپور نے اپنے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ ”یہ کسی خاتون کی تلاش میں امریکا سے پاکستان آئے ہیں۔ ان خاتون سے اسد کی ملاقات کب اور کن حالات میں ہوگی؟“

”حفیظ بھائی! آپ کے سوال کا سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ اسد صاحب کی ان خاتون سے ملاقات بہت جلد ہوگی اور انہی حالات میں ہوگی جو اس وقت موجود ہیں۔“

”بہت جلد سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ حفیظ کپور نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔ ”کوئی تاخیر فریم دیں!۔۔۔!“

”تاخیر فریم۔۔۔۔۔“ بھی صاحب نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مثلاً۔۔۔۔۔ افطار کے بعد کسی بھی وقت۔۔۔۔۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے سائیں۔“ شیخ صاحب نے کہا۔

”لیکن اسد صاحب کا مسئلہ صرف ایک خاتون سے ملاقات تک محدود نہیں ہے۔“ بھی صاحب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

حفیظ کپور نے پوچھا۔ ”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“

”میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ اسد صاحب اس وقت تین خواتین کی پہیلی ”سی ایس ڈی“ میں پھنسے ہوئے ہیں۔“ بھی صاحب نے کہا۔ ”سی ایس ڈی کے ہاتھ سے کھل گئی ہے، ڈی انہیں پہنچے ہاتھ میں کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور یہ خود ایس کی تلاش میں امریکا سے پاکستان آ گئے ہیں۔“

افسانچہ

”اوہ میرے جیون ساتھی! تم کہاں چلے گئے؟ تم تو جانتے ہی ہو کہ اگر ایک پل بھی تم میری نظروں سے اوجھل ہو جاؤ تو میں کتنا بے چین ہو جاتا ہوں۔ اس ڈر سے کہ کہیں کوئی تمہیں چرانہ لے، میں سوتے وقت تمہیں اپنے سر ہانے رکھ کر سوتا ہوں۔ تم نے دیکھا تھا نا کہ میں تمہاری خاطر مبین سے لڑ رہا تھا کیونکہ اس نے مجھ سے تمہیں آدمے کھٹے کے لیے ادھار مانگا تھا! تم تو ہر وقت میرے ساتھ ہوتے ہو نا! جو میں دیکھتا ہوں، وہ پہلے تم دیکھتے ہو۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ آج بھی مجھے وہ دن یاد ہے جب تم میرے ہاتھوں گر کر زخمی ہوئے تھے اور میں نے اپنے جب خرق سے پچاس روپے بھا کر تمہاری لوہار سے ویڈیو لگ کر انی ٹی۔ بس۔۔۔۔۔ بس، ایک مرتبہ تم مجھے مل جاؤ، پھر دیکھنا۔۔۔۔۔ میں تمہیں اپنی سر آنکھوں پر بٹھائے رکھوں گا۔ اوہ۔۔۔۔۔ اب مجھے یاد آیا! تمہیں مبین نے اٹھا لے جانے کی دھمکی دی تھی نا! اس لیے میں نے رات کو تمہیں ایک ڈبیا میں بند کر دیا تھا نا کہ مبین تمہیں اٹھا لے جا کر تمہاری توڑ پھوڑ نا کر سکے! اوہ میرے نظر کے چشمے!

پرنس تنویر احمد۔ دادو

سنہری موقع

ایک آدمی کو پاگل کتے نے کاٹ لیا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے کہا۔ ”آپ فوراً ٹکے لگوائیں ورنہ آپ پاگل ہو جائیں گے، لوگوں کو کاٹیں گے اور وہ مر جائیں گے۔“

آدمی نے کہا۔ ”مجھے کاغذ اور قلم دیجیے۔“

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”کیا آپ وصیت لکھنا چاہتے ہیں؟“

آدمی نے جواب دیا۔ ”جی نہیں! میں ان لوگوں کی فہرست بنانا چاہتا ہوں، جنہیں میں کاٹوں گا۔“

مرسلہ: اسماعیل نوید۔ کراچی

”آپ نے تو واقعی ایک پہیلی بیان کر دی ہے بھائی۔“
حفیظ پکڑنے لگا۔

”میں نے ”سی ایس ڈی“ کی جو پہیلی بیان کی ہے اسے اسد صاحب یہ خوبی سمجھ گئے ہیں۔“ بھئی صاحب نے حفیظ پکڑ کی بات کے جواب میں کہا پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔ ”کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں..... نہیں.....“ میں نے گڑبڑائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کا اشارہ سمجھ گیا ہوں۔“

”اسد صاحب! آپ اس وقت ایک محفل میں بیٹھے ہوئے ہیں۔“ حفیظ پکڑ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹائی! محفل کے آداب کا تقاضا ہے کہ اشاروں کنایوں میں گفتگو سے اجتناب برتا جائے۔ آپ سی ایس ڈی کے اشارے سے جو سمجھ پائے ہیں وہ ہمیں بھی سمجھائیں۔ یہ ”سی ایس ڈی“ یقیناً گرومری والا اسٹور تو ہو نہیں سکتا.....!“

”جی واقعی۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”سی ایس ڈی دراصل تین ناموں کا مخفف ہے۔“

”کون سے تین نام!“ حفیظ پکڑ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”ایس کا مطلب تو مجھے معلوم ہے۔ یعنی سلی ٹی نامی وہ خاتون جس کی تلاش میں آپ امریکا سے یہاں آئے ہیں۔ کیا باقی سی اور ڈی بھی خواتین ہی ہیں؟“

”جی بالکل! یہ دونوں بھی خواتین ہی ہیں۔“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

حفیظ پکڑ نے پوچھا۔ ”یہ کن خواتین کے ناموں کے اشارے ہیں؟“

اس سے پہلے کہ میں حفیظ پکڑ کے سوال کا جواب دیتا، علی پکڑ رائٹنگ روم میں داخل ہوا اور حفیظ پکڑ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”پاپا! افطار میں دس پندرہ منٹ کا وقت رہ گیا ہے۔ آپ سب لوگ ڈائننگ میں آجائیں۔ ڈائننگ ٹیبل پر افطاری لگا دی گئی ہے۔“

علی کے اس اعلان پر ڈرائنگ روم کی محفل برخاست ہوئی۔

☆☆☆

مقبول بھئی میری توقع سے زیادہ گہرا آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس نے ”سی ایس ڈی“ کا ذکر کر کے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ نہ صرف اس نے ”سی ایس ڈی“ کا کوڈ استعمال کیا تھا بلکہ تمام انداز میں اس کی وضاحت بھی کر دی تھی کہ ”سی“ یعنی

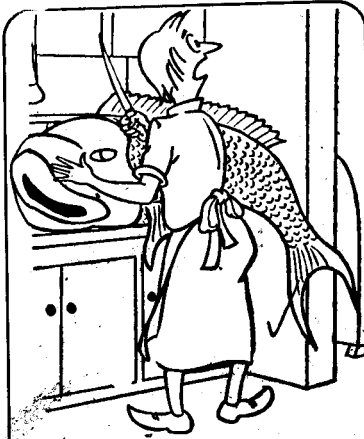
شارو میرے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ ”ڈی“ یعنی ڈیلفینا مجھے اپنے ہاتھ میں کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور ”ایس“ یعنی سلی صاحب کی تلاش میں، میں امریکا سے پاکستان آیا ہوں۔

یہ کوئی معمولی اشارہ نہیں تھے۔ یہ میری زندگی کے ماضی قریب کا ایک کھلا باب تھا جو مستقبل قریب کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ میں آج سے پہلے بھی مقبول بھئی سے نہیں ملتا تھا اور نہ ہی یہ باتیں میں نے یہاں کسی سے شیئر کی تھیں پھر بھئی صاحب میری زندگی کے اس راز سے کی طرح آگاہ ہو گئے تھے؟ عظیم کے ذریعے حفیظ پکڑ تک صرف اتنی بات پہنچی تھی کہ میں جس خاتون کی تلاش میں امریکا سے کراچی آیا ہوں، ان کا نام سلی ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ شارو ڈیلفینا کا معاملہ مقبول بھئی تک کیسے پہنچا؟

اس سوال نے میرے ذہن میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔ یہ ایسا سوال نہیں تھا جسے نظر انداز کیا جاسکتا۔ بھئی صاحب نے جس اعتماد کے ساتھ مجھ سے آتھنزدگی والے واقعات کے بارے میں پوچھا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص پریسٹن ہالو والے اس بنگلے میں موجود تھا۔ یہ عین، بھئی نے کسی شخص سے میرے سنگین جھگڑے کا ذکر بھی کیا تھا اور اس کے لیے ”خون ریز مارا ماری“ کے الفاظ استعمال کیے تھے اور کہا تھا کہ اس واقعے کے بعد میرے لیے کافی مشکلات کھڑی ہو گئی تھیں۔

بھئی صاحب کا انکشاف مبنی بر حقیقت تھا۔ میرے ماضی قریب میں یہ واقعی ظہور پذیر ہو چکا تھا۔ شارو کی کشمکش کے بعد میں بہت پریشان ہو گیا تھا۔ شارو میری عزیز از جان دوست تھی۔ اس سے میری دوستی بھی ایک ہنگامی پیمائش میں ہوئی تھی۔ لیونارڈو نامی ایک غنڈا ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور میں نے لیک بنچس کے وئی لائونج ریسٹورنٹ میں لیونارڈو اور اس کے ساتھی غنڈوں کی خوب درگت بنائی تھی۔ اس واقعے نے مجھے شارو کا دوست اور لیونارڈو کا دشمن بنادیا تھا۔ شارو وئی لائونج ریسٹورنٹ میں گنار بجانی تھی اور گلوکاری کرتی تھی لیکن لیونارڈو سے میری بڑبھڑ کے بعد شارو نے اس ریسٹورنٹ کی ملازمت چھوڑ دی تھی اور میرے ساتھ بے سٹی آگئی تھی۔ لیونارڈو میرے ہاتھوں ہونے والی اپنی ہزیمت کو بھولا نہیں تھا اور مجھ سے انتقام لینے کے لیے اس شیطان نے شارو کو بے سٹی سے اغور کر کے کیوبا کے شہر ہوانا پہنچا دیا تھا۔

ڈیلفینا کے مطابق، لیونارڈو کے ارادے نیک نہیں تھے۔ وہ شارو کو ہوانا سے بہماز کے شہر ناسٹفٹ کرنا چاہتا تھا اور اسے ”اسکن برنس“ کے مذموم کام پر لگانا چاہتا تھا۔ میرے لیے یہ تصور کرنا سوہان روح تھا کہ میری دوست شارو کو آبروریزی



”مک کے ہر شکاری نے اس بھلی کو پھرنے کی کئی
بچتے تک مسلسل کوشش کی۔“ ایک شکاری نے گھر آکر
اپنی بیوی کو بتایا۔ ”درجنوں شکاریوں کے کانٹوں میں
وہ پھنسی مگر ہمیشہ ڈونڈا کر بھاگ نکلی۔ میں واحد
خوش قسمت ہوں جو آج سہ پہر اُسے
پھانسنے اور کن رے تک لانے میں کامیاب ہو گیا۔“
بیوی نے تعریفی لفظوں سے شوہر کو مبارکباد
کی طرف دیکھا۔ ”کہاں ہے وہ بھلی؟“
”انٹوں تو می ہے کہ میں اُسے کھانے کے
لیے گھر نہیں لاسکتا تھا۔“

”کیوں؟“

”کہیں کہ اس کے جسم میں لوہے کے ایسے کاٹے
پیوست تھے کہ مجبوراً میں نے اُسے کباڑی کے ہاتھ
فروخت کر دیا۔“

میرے ذہن نے مقبول بھلی کے بارے میں جس انداز
میں سوچا یہ موجودہ پبلیشن کے زیر اثر تھا ورنہ میرے پاس اپنی
بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ مبین ممکن
تھا کہ وہ سیدھے سادے اللہ والے ہوں اور ایک مخصوص
وجدانی کیفیت کے تحت ایسی باتیں کرتے ہوں جن کا تعلق
انسان کے ماضی، حال اور مستقبل سے جڑا ہوتا ہے۔ ایسا ہونا
ناممکن نہیں۔ اگر کسی انسان کا وجدان اور چھٹی حس تیز ہو تو وہ ان
معاملات پر قادر ہو جاتا ہے۔

میں مقبول بھلی کے خیال کو ذہن سے جھٹک کر ڈانٹنگ

اور عصمت فروشی کے دھندے میں دھکیل دیا جاتا۔

بھلی صاحب نے جس بندے کے ساتھ میری خون ریز
مارا ماری کا ذکر کیا تھا اس کا نام پیلو تھا۔ پیلو، لیوٹاڈو کا سا مٹی
تھا۔ میں جب شاردو کی تلاش میں بے بسی سے لپک جیکسن آیا تو
پیلو پر میری نگاہ پڑ گئی تھی اور میں اس کا تعاقب کرتے ہوئے
چرچ چکن نامی ایک ریسٹورنٹ کے کچن تک پہنچ گیا تھا۔
زبردست لڑائی کے بعد میں پیلو کو زیر کرنے میں کامیاب ہو گیا
تھا۔ میں اس سے شاردو کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن
میری مارنے اس کی حالت غیر کر دی تھی۔ اس نے زبان نہیں
کھولی اور زندگی کی بازی ہار گیا۔ اس واقعے کے بعد میں واقعی
کافی مشکلات کا شکار ہو گیا تھا اور اس جھیلے سے ڈیلفینا نے مجھے
ایسے نکال لیا تھا جیسے کوئی کھن میں سے بال کو کھینچ کر نکالتا ہے۔
ڈیلفینا نے یہ سب مہربانی مجھ پر کس مقصد کی خاطر کی
تھی، یہ ایک طویل قصہ ہے۔ ڈیلفینا کا تعلق ”اسکل اینڈ بونز“
نامی ایک سیکرٹ سوسائٹی سے تھا اور وہ مجھے بھی اپنی سوسائٹی کا
ممبر بنانا چاہتی تھی لیکن میں اس کا فردا ہسپانوی دو شہزادہ کے
ارمانوں پر اوس ڈال کر پریسٹن ہالو والے پٹنگلے سے نکل آیا
تھا۔ پریسٹن ہالو والے اس پٹنگلے پر گزرے ہوئے بہتر کھنے
میری زندگی میں بہت اہمیت کے حامل تھے لیکن سوال یہ پیدا
ہوتا تھا کہ کراچی میں رہنے والا مقبول بھلی میری زندگی کے ان
رنگین اور سنگین معاملات سے کس طرح واقف تھا۔ اگرچہ بھلی
صاحب نے کھل کر کوئی بھی بات نہیں کی تھی۔ بس اشارے
دیے تھے اور یہ اشارے اپنے اپنے نشانے پر بڑے فٹ پیٹھے
تھے!

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں اس سوال نے بھی
سراٹھایا کہ کہیں مقبول بھلی کا تعلق بھی ”اسکل اینڈ بونز“ سوسائٹی
سے تو نہیں؟

یہ سوال بڑا خطرناک تھا کیونکہ میری معلومات کے
مطابق، مذکورہ سیکرٹ سوسائٹی صرف انہی افراد کو اپنا ممبر بناتی
تھی جو بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہوں اور ان کا تعلق دنیا
کے کسی نہ کسی مذہب سے لازمی ہو۔ لادین افراد کی اس سوسائٹی
میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ اس لحاظ سے مقبول بھلی اس
سوسائٹی کے مطلوبہ معیار پر پورے اترتے تھے۔ وہ بے پناہ
وجدانی صلاحیتوں کے مالک تھے اور انتہائی مذہبی بھی۔ مجھے پتا
چلا تھا کہ وہ بیچ وقت نماز کے پابند ہیں۔ اس وقت بھی وہ مجھے
ڈانٹنگ ٹیبل پر نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم سب تو ڈرانگ روم
سے اٹھ کر ڈانٹنگ ہال میں آ گئے تھے اور مقبول بھلی وضو کرنے
کے لیے واش روم کی طرف چلے گئے تھے۔

”شاید عظیم کو میری بات بری لگ گئی ہے!“
صاحب نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”وہ آئے تو میں اس
سے معافی مانگ لوں گا۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے بھائی۔“ حفیظ کپور نے...
دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ ”آپ ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔
آپ میرے دوست ہیں۔ عظیم کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے باپ
کے دوستوں کا احترام کرے اور ان کی باتوں کو توجہ سے سنے۔
یہ کیا بات ہوئی کہ آپ اس سے معذرت کریں گے۔“ لچائی
توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر میری طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ نے تو اسد کے بارے میں بھی کتنی باتیں کی
ہیں۔ انہوں نے کوئی بُرا مانتا؟ آپ کی ہر بات کا جواب اسد
نے مقبول انداز میں دیا ہے لیکن عظیم کا رویہ انسانوں والا
نہیں۔ بھائی! ہم کب کہتے ہیں کہ تم دوسری شادی کرو۔ تمہاری
قسمت میں مہر انسا کے تلوے چائنا ہی لکھا ہوا ہے تو ہم کیا
کر سکتے ہیں.....؟“

میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ جہاں بھی
عظیم کا ذکر آتا، وہاں بڑے کپور صاحب اس کی بیوی کا تذکرہ
بھی لے آتے تھے۔ اس سے ایک بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی
تھی کہ انہیں عظیم سے کم اور مہر انسا سے زیادہ مسئلہ تھا۔ یہ میرا
خیال تھا۔ ممکن ہے، صورت حال اس کے برعکس ہو۔ ان لوگوں
کے حوالے سے میرا تجربہ محض دور روزہ تھا۔ میں اس فیملی کے پس
منظر اور مخصوص خاندانی تعلقات سے مکاحقہ آگاہ نہیں تھا۔ میں
نے یہ بھی دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ حفیظ کپور جب بھی عظیم یا اس
کی بیوی کے بارے میں کوئی بات کرتے تھے علی بالکل خاموش رہتا
تھا۔ وہ ان تنازع معاملات سے اپنی کلی لاتعلقی کا اظہار کرتا
تھا۔ علی کا یہ رویہ فطری اور نارٹل نہیں تھا۔ اچھا یا برا کوئی نہ کوئی
رد عمل ضرور ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ باپ کا حد سے بڑھا ہوا احترام
اپنی جگہ لیکن حق کا ساتھ دینے کے لیے علی کو اپنی زبان کا
استعمال کرنا چاہیے تھا۔ مگر نہ اس امر کے امکانات روشن تھے کہ وہ
ایک دن بھائی کو کھوپٹھے گا اور..... اکیلا رہ جائے گا.....!

”سامعین! آپ نے اسد صاحب کے بارے میں
بالکل غمبک کہا کہ انہوں نے ہمیشہ صاحب کی کسی بات کا برا نہیں
منایا۔“ شیخ صاحب نے حفیظ کپور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”لیکن میں آپ کو بالکل سچ بتا رہا ہوں کہ یہ بہت گہرے انسان
ہیں۔ ابھی تک انہوں نے ہی اس ڈی کارا نہیں اگلا.....“
میں شیخ صاحب کی شرارت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔
حفیظ کپور نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”جی بھائی! آپ کا کیا ارادہ ہے۔ ایس کا راز تو میں
اے اکتوبر 2017ء

ہال کا جائزہ لینے لگا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک وسیع و عریض اور
عالی شان ہال تھا جس کے ایک حصے میں ٹی وی لاؤنج کی سیٹنگ
بنائی گئی تھی۔ ایک دیوار پر رنگ ساز ٹی وی ای ڈی آویزاں تھا
اور اس کے سامنے دوسری دیوار کے ساتھ آرام دہ ویئر صوفے
لگے ہوئے تھے۔ ان صوفوں پر ہر یک وقت پندرہ سے بیس
افراد نشست جما کر ٹی وی پر درگزر اس سے لطف اندوز ہو سکتے
تھے۔

کچھ ایسی ہی صورت حال ڈاننگ ٹیبل کی بھی تھی۔
میرے محتاط اندازے کے مطابق، لگ بھگ چھپیس افراد وہاں
بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ مذکورہ ٹیبل اس وقت خوردوش کی مختلف
چیزوں سے بھری ہوئی تھی۔ گجورہ، پکڑے، سموسے، روٹز، دہی
بڑے، فروٹ جاٹ، تازہ پھل، الغرض انواع و اقسام کی نعمتیں
ڈاننگ ٹیبل پر سجی ہوئی تھیں۔ تین چار قسم کے تو خٹڑے
مشروب ہی تھے۔ آج کا دن خاصا گرم تھا۔ مجھے بھوک کا تو
زیادہ احساس نہیں ہوا تھا لیکن پیاس نے اچھا خاصا ٹھک کیا
تھا۔ اپنی ہاؤ، وہ روزہ کیا جو محسوس نہ ہوا!

مقبول یعنی ڈاننگ ٹیبل پر پہنچے تو ہمارے بیچ دوبارہ
باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑانے
کے بعد حفیظ کپور سے استفسار کیا۔
”انگل! عظیم کہیں نظر نہیں آ رہا۔ کیا وہ ہمارے ساتھ
روزہ افطار نہیں کرے گا؟“

حفیظ کپور نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے
علی سے پوچھا۔ ”عظیم کہاں گیا ہے؟“
”چنانچہ پایا۔“ علی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے
ہوئے کہا۔ ”میں نے تو انہیں کافی دیر سے نہیں دیکھا۔“
اگر اور اس کا بیٹا اصغر اور نزدیک ہی موجود تھے تاکہ کسی
چیز کی کمی محسوس ہو تو وہ فوراً سرود کر دیں۔ زیریں منزل کا چکن
ڈاننگ ہال سے ملحقہ تھا جہاں پر گھریلو ملازمین مصروف کار
تھیں۔

”اصغر!“ حفیظ کپور نے اپنے ملازم سے پوچھا۔ ”عظیم
کو تم نے دیکھا ہے؟“

”صاحب جی! عظیم صاحب باہر بیٹھے ہیں۔“
”باہر کہاں؟“ حفیظ کپور نے بڑے ہوئے انداز میں
دریافت کیا۔

”گیٹ کے باہر۔“ اصغر نے بتایا۔ ”لان کے ساتھ
کرسی پر بیٹھے ہیں۔“

”وہ وہاں بیٹھ کر انڈے دے رہا ہے۔“ حفیظ کپور نے
خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ”جاؤ..... اس سے کہو، پاپا بلار ہے
ہیں۔“

سنہری باتیں

☆ بھوک ہر ایک کے لیے بنیادی محرک ہے، اس کے بغیر زندگی کا تصور مشکل ہے۔
☆ کھانا صرف جینے کے لیے کھایا جائے نہ کہ کھانے کے لیے جینا چاہیے۔
☆ کھانا کھانے میں احتیاط لازم ہے۔
☆ دیر سے کھانا غسل مندی، آدھا پیٹ کھانا عبادت ہے۔

(حکایات سعدی سے انتخاب)

(مرسلہ: ریاضِ بٹ - حسن ابدال)

تھا کہ روزہ لگ رہا تھا۔
”جی سائیں!“ شیخ صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”راز پر سے پردہ اٹھاؤ نا!“
میں نے ٹھٹھکا کر گلا صاف کیا اور کہا۔ ”شیخ صاحب! بھئی صاحب نے بالکل ٹھیک کہا کہ میری زندگی میں تین عورتوں کا بڑا عمل دخل ہے، اس یعنی سلمیٰ صاحبہ کے بارے میں تو آپ جان چکے ہیں کہ میں ان کی تلاش میں امریکا سے یہاں آیا ہوں۔ باقی دو عورتوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ ڈی یعنی ڈیلفینا ایک ہسپانوی دوشیزہ ہے جو مجھ سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی خواہشمند ہے لیکن میرے کچھ تحفظات ہیں اس لیے میں اس سے دور رہنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہوں۔ جہاں تک ”سی“ کا تعلق ہے تو یہ دراصل ”سی ایچ“ یعنی شارو ہے۔ شارو میری ایک بہت اچھی دوست ہے جو چند روز پہلے اچانک غائب ہو گئی تھی۔ اغلب امکان یہی ہے کہ شارو کو میرے کسی دشمن نے اغوا کر لیا ہے۔“

”اوہ.....!“ شیخ صاحب نے ہوردی بھرے لہجے میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو بہت بُرا ہوا۔“ پھر پوچھا۔ ”کیا ڈیلفینا سے آپ کے تحفظات کا سبب یہی شارو ہے؟“
”ایسا کبھی بھی کہتے ہیں اور نہیں بھی کہہ سکتے۔“ میں نے ذومعنی انداز میں جواب دیا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ شیخ صاحب نے الجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

اسی لمحے ٹی وی پر افطار کے نام کا اعلان ہونے لگا۔ حفیظ پور نے کہا۔ ”سب لوگ دعا کریں۔ روزہ افطار ہونے والا ہے۔ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔“
ہم سب نے پور صاحب کی ہدایت پر عمل کرتے

نے کھول دیا کہ آپ سلمیٰ صاحبہ کی تلاش میں امریکا سے پاکستان آئے ہیں۔ شیخ صاحب سی اور ڈی کا راز جاننے کے لیے بہت بے تاب ہو رہے ہیں۔ آپ ان کی بے چینی دور کر دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

حفیظ پور کے سیدھے ہاتھ پر میں اور اگلے ہاتھ پر علی بیٹھا تھا۔ جبکہ مقبول بھئی اور شیخ صاحب سامنے والی نشستوں پر براجمان تھے۔ بات ختم کرتے ہی پور صاحب نے علی کے کان میں کوئی سرگوشی کی اور گھر کی بالائی منزل کی طرف دیکھا۔ میں سن نہیں سکا کہ انہوں نے اپنے بیٹے سے کیا کہا تھا۔ جواب میں علی نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

”جی بابا.....!“

اسی لمحے اصغر نے آکر بتایا۔ ”عظیم بھائی آرہے ہیں۔“

”بڑی مہربانی تمہارے عظیم بھائی کی۔“ حفیظ پور نے اصغر کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا پھر شیخ صاحب اور بھئی صاحب کی جانب روئے سخن موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”غل بھائی تشریف لارہے ہیں۔ باادب، با ملاحظہ ہو شیخ!.....!“

شیخ صاحب اور مقبول بھئی نے حفیظ پور کے زہر میں بچھے ہوئے الفاظ پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ شیخ صاحب نے اکبر سے کہا۔

”سائیں بابا! ٹی وی کی آواز ذرا بڑھا دو۔ افطار کا نام ہونے ہی والا ہے۔“

دیوار پر آویزاں ایل ای ڈی آن تھا۔ اکبر حکم کی تعمیل میں ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔ ڈائمنگ ٹیبل پر بیٹھے ہم سب ایل ای ڈی کو بآسانی دیکھ رہے تھے۔

اسی لمحے عظیم وہاں پہنچ گیا اور بہ آواز بلند کہا۔ ”السلام علیکم!“

سب نے اپنے اپنے انداز میں اس کے سلام کا جواب دیا۔ وہ شیخ صاحب کے پہلو میں بیٹھ چکا تو حفیظ پور نے کہا۔ ان کا مخاطب عظیم ہی تھا۔

”تم عجیب پاگل انسان ہو۔ سب اندر بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور تمہارا کچھ پتہ ہی نہیں۔ کیا مہر النساء کے ساتھ افطار کرنے کا ارادہ ہے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے بابا۔“ عظیم نے اپنے موبائل کے کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مہر النساء اس وقت ٹیکساس کے علاقے شوکر لینڈ میں بیٹھی ہے اور وہاں اس وقت صبح کے نو بج کر تیس منٹ ہوئے ہیں۔ میں تو باہر اس لیے بیٹھ گیا

ہوئے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ مجھے حفیظ کپور سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا۔ ان لمحات میں، میں نے خالصتاً حفیظ صاحب کے لیے دعا کی۔

”مالک! تو قادر مطلق ہے۔ تو اپنے خاص کرم سے حفیظ کپور کی مشکلات کو ختم کر دے۔ انہیں مالی استحکام کے ساتھ صحت اور تندرستی عطا فرما۔ یہ اس وقت محتاجی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہیں قرض اور سود کی لعنت سے نجات دلا اور اس خاندان کے تمام افراد میں باہمی محبت کو مسلّمہ کر دے، خاص طور پر حفیظ کپور اور عظیم کے بیچ جو بے اعتمادی اور تناؤ کی کیفیت ہے اسے زائل کر کے باپ بیٹے کے دلوں کو آپس میں جوڑ دے۔ بے شک! تو ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔“

روزہ افطار ہو گیا۔ میں نے خورد و نوش کے معاملات میں بہت احتیاط برتی تھی۔ میں نے مجھ سے روزہ افطار کیا پھر ایک دو پکڑے کھائے۔ اس کے بعد ٹھنڈے شربت کا ایک گلاس پیا اور تازہ پھلوں سے انصاف کرنے لگا۔ حفیظ کپور نے میری چوری پکڑی اور بے صدا صراحت مجھے کھلانے لگا۔ میں نے کہا۔ ”سرا میرے پیٹ میں جتنی مچائش ہے اتنا ہی کھاؤں گا نا!“

”کیا تم یہ مانتے ہو کہ اس وقت ڈائننگ ٹیبل پر کھانے پینے کی جو بھی چیزیں بچی ہیں، سب اللہ کی نعمتیں ہیں؟“

اس نے بے لگشی سے پوچھا۔
”بے شک! یہ سب نعمتیں مالک ہی نے پیدا کی ہیں۔“
”اور تمہیں یہ بھی پتا ہے نا، یہ ساری نعمتیں اللہ نے انسانوں کے لیے پیدا کی ہیں؟“
”جی جی..... بے شک!“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”بس تو پھر آپ یقین کر لیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی نعمتیں پیدا کی ہیں، انسان کے معدے میں ان نعمتوں کے لیے اتنے ہی خانے بھی بنائے ہیں۔ ہر نعمت کے لیے ایک الگ خانہ اس لیے.....“ لمحاتی توقف کر کے انہوں نے آنکھ ماری اور ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”لہذا کھانے پینے کا ایکسلرٹر دبا کر رکھیں اور جب تک معدے کا ہر خانہ لبالب بھر نہ جائے، ہاتھ کو روکنے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ آئی بات سمجھ میں؟“

ان کا فلسفہ خورد و نوش میری سمجھ میں تو آ گیا تھا مگر ظاہر ہے، میں اس پر صمد فیصد عمل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنا میرے بس کا کام نہیں تھا تاہم ان کی دلجوئی اور اطمینان کے

لیے میں نے حصہ بہ قدر چشہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہاتھوں کو بوجھ کر حرکت کر دیا۔

افطار کے بعد ڈنر کا بندوبست بھی کیا گیا تھا لیکن بھی صاحب نماز مغرب کی ادائیگی کے لیے مسجد کی طرف چلے گئے تو حفیظ کپور نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جب تک بھی صاحب نماز پڑھ کر واپس آتے ہیں، ہم ایک ضروری کام کر لیتے ہیں۔“

اپنی بات کے اختتام پر وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور مجھے بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ان کی تقلید میں کرسی چھوڑ دی اور سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”کون سا ضروری کام انکل؟“

”ہمارے درمیان ڈرائنگ روم میں ایک کاروباری معاہدہ ہوا تھا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ”آپ کو میرے لیے افطار سے پہلے ایک خصوصی دعا کرنا تھی!“

”جی بالکل۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”میں نے بڑے بھرپور انداز میں دعا کر دی ہے۔“

”آپ نے اپنا کام کر دیا ہے تو ذیل کے مطابق، اب مجھے اپنا کام کرنے کا موقع بھی تو دیں۔“ وہ بدستور سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ”آئیں میرے ساتھ۔“

بات کے اختتام پر انہوں نے اس زینے کی جانب قدم بڑھا دیے جو زیریں منزل کو بالائی منزل سے ملاتا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کے تیور بدلے بدلے سے نظر آتے تھے۔

”آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟“ میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ ”آپ کو میں آپ کی والدہ صاحبہ سے ملوانے لے جا رہا ہوں۔“

”کک..... کیا.....“ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سالگا۔
”یہ..... کیا مذاق ہے.....؟“ میں نے اضطرابی لہجے میں استفسار کیا۔

”بیٹا جی! یہ مذاق نہیں، حقیقت ہے۔“ وہ شفقت بھرے لہجے میں بولے۔ ”اوپر عظیم کے کمرے میں سلمیٰ صاحبہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں.....!“
میں بے یقینی سے ایک منگ حفیظ کپور کو دیکھتا چلا گیا۔

امنگوں حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلائی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مندر گیت سنائی اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

کھیل کھیلا تھا۔ اس کے سہانے سنے بج ہونے لے۔ جھانے،
زنگ آلود ہو کر رہ گئے۔ ساری نوکری اردلی کے طور پر گزار
کر ریٹائر ہو گیا۔ اسے عضو معطل کی طرح فوج سے علیحدہ کر
دیا گیا۔ نو سال قبل جب اس کی رجسٹر ترک فوج کے

وہ کچھ کر دکھانے کا عزم لے کر فوج میں بھرتی ہوا
تھا لیکن تقدیر کا لکھا، بدلنا انسان کے بس میں نہیں۔ بندہ جو
سوچتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو ہو رہا ہوتا ہے وہ اس نے بھی
سوچا بھی نہیں ہوتا۔ سائنس کے ساتھ بھی وقت نے عجیب

فرض شناس

وسیم بن اشرف

وہ جو آپس میں یک جان دو قالب تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں
بہت بڑا سہارا تھے جانے کیسے ایک ہی منزل کی مسافت کے لیے الگ
الگ سمتوں کا تعین کر بیٹھے لیکن... ان میں سے ایک نے ثابت کر دیا
کہ رشتہ بنانے سے رشتہ نبھانا کس قدر اہم اور کٹھن ہوتا ہے اور وہ
اپنی اس آزمائش میں پورا اتر کر ہمیشہ کے لیے اس کے دل میں پچھتاوا
چھوڑ گیا۔

مناشرقی رویوں کے خلاف ایک کم ہمت انسان کا جارحانہ انداز



ٹرائی میں بیٹھ کر (جو پڑی پر دھکا لگانے سے چلتی ہے) اپنے سرکاری کوارٹر میں پہنچ گئے۔

☆☆☆

اس کا کوارٹر ایک ریلوے اسٹیشن سے دس میل دور اور دوسرے اسٹیشن سے بارہ میل کی مسافت پر دونوں اسٹیشنوں کے درمیان ریلوے لائن کے ساتھ ہی تھا۔ دو میل کے فاصلے پر گھنا جنگل تھا جس کے پار ایک فیکٹری کی بلند وبالا چمنی اس کے کوارٹر میں جھانکتی محسوس ہوتی تھی۔ بطور گیٹک مین اس کو جس سامان کی ضرورت تھی وہ اسے فراہم کر دیا گیا۔ مثلاً جھنڈیاں، ہتھوڑا، بگل، ریلوے ٹائم ٹیبل اور وہ تمام اشیاء جو دورانِ ڈیوٹی اس کے کام آ سکتی تھیں، اس کو اپنے مخفی وجود میں طاقت کی رتی سی محسوس ہوتی۔ اتنی لمبھی اور جوش و خروش ہے اس نے اپنا کام شروع کر دیا کہ ٹرین کی آمد سے دو گھنٹے قبل ہی کوارٹر سے نکل پڑتا۔ اپنے علاقے میں ریلوے لائن کا بغور معائنہ کرتا اور جب سب ٹھیک محسوس ہوتا تب مطمئن ہوتا۔ وہ ریل کی پڑی سے کان لگا کر آنے والی ٹرین کی گونج سنتا، یہ گونج نغمہ بن کر اس کی سماعت کو لطف پہنچاتی۔

کچھ روز گزر کرنے کے بعد سائمن نے سوچا پڑوس میں بھی تعلقات بنانے چائیں۔ اس کے ہمسائے بھی دو گیٹک مین ہی تھے جن کے علاقے اس کا سیکشن ختم ہونے کے بعد دونوں طرف شروع ہوتے تھے۔ ایک جانب تو ایک ضعیف شخص تھا جو سٹاژ و ناڈر ہی اپنے کوارٹر سے نکلتا تھا۔ اس کی بیوی کام میں اس کا ہاتھ بٹاتی تھی، افسرانِ بالا سوچ رہے تھے کہ چونکہ اب وہ ضعیف ہو چکا ہے اسے ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ دوسری جانب گیٹک مین نو جوان و یزلی کا کوارٹر تھا۔ کم گواتا جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو اور ہمیشہ اپنے خیالات میں یوں کھویا رہتا جیسے سارا مال و متاع کھو کر اسے پانے کی سوچ میں ہوش کھو بیٹھا ہو۔ سائمن اکثر اس سے ملتا، اس کو اپنے گاؤں کی تاروں بھرے آسان کے نیچے گزری راتوں کی باتیں اور جنگ و جدل کے قصے سناتا۔ ویزی سناتا رہتا مگر بولتا بہت کم اور جب لب کھولتا تو سائمن اس کی جھلجھکی باتیں سمجھنے سے قاصر رہتا۔ ایک دن دونوں پڑی پر بیٹھے جو گفتگو تھے۔

”مجھے میری زندگی میں بھی کوئی سکھ نہیں ملا..... شاید خدا کی یہی مرضی ہے۔ تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔“ سائمن نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

”یہ تقدیر کیا بلا ہے۔“ ویزی جھٹ سے بولا۔

ساتھ برسرِ پیکار تھی تو وہ ایک افسر کا اردلی تھا۔ بارش کی طرح برسی گولیوں میں وہ روزانہ تین بار کھانا لے کر اپنے افسر کے پاس جاتا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے ناغہ کیا ہو، فرض شناسی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جب تک جنگ رہی وہ اپنے افسر کے ساتھ رہا۔ برسی آگ اور بہتے خون میں بھی اس کے استقلال و استقامت میں کبھی لغزش نہ آئی۔ جنگ و جدل کے میدان کی تمام سختیاں برداشت کرتا رہا۔ تیر کی طرح چبھتی دھوپ نے اس کا چہرہ جھلسا کر رکھ دیا تھا اور بج بے شب و روز نے اس کے خون کی حرارت چھین لی تھی۔ جب وہ فوج سے ریٹائر ہو کر اپنے گاؤں آیا تو وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گیا تھا۔ اسے گھٹیا کا مرض بھی لاحق ہو چکا تھا۔ وہ اس قابل بھی نہیں رہا تھا کہ آبائی کھیتوں پر محنت و مشقت سے پیٹ کا جہنم سرور کر سکے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میاں بیوی نے اپنے گاؤں کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ تلاشِ معاش میں دونوں شہر چلے آئے۔ روزی روٹی کا بندوبست نہ ہوا تو پریشانیوں نے بوڑھے وجود پر نچے گاڑ لیے، ناچار سائمن نے بیوی کو ایک تاجر کے ہاں ٹھہریلو کام کاج کے لیے چھوڑ دیا اور خود کسی موزوں کام کے لیے رخت سفر باندھا۔ دورانِ سفر ایک ریلوے اسٹیشن پر سائمن کو جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ آنکھیں چار ہوئیں تو دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ یہ اسٹیشن ماسٹر تھا جو سائمن کی رجسٹر میں افسر رہ چکا تھا۔

”کیا تم سائمن ہی ہو؟“

”جی جناب!“

”یہاں کیسے آتا ہوا؟“

سائمن نے تمام حالات بتا دیے۔

”تو اب کہاں کا قصد کیے ہوئے ہو؟“

”میں تو خود بھی نہیں جانتا جناب کہ میری منزل مقصود کہاں ہے؟“

”بیوقوف.....“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں جناب..... زندہ رہنے کے لیے کام کی ضرورت ہے، جیسا بھی ہو جہاں بھی مل جائے۔“

”اچھا تو تم یوں کرو اپنی پڑی کو بھی بلاو، یہاں ایک گیٹک مین کی جگہ خالی ہے۔“ پھر اسٹیشن ماسٹر نے اس کی امید بند مائی۔

”میں متعلقہ افسر سے بات کر کے یہ نوکری تمہیں دلوانے کی کوشش کرتا ہوں، کام بن جائے گا۔“

پندرہ روز بعد اس کی بیوی بھی آگئی اور وہ دونوں ایک

پانی نکالنے کے بعد سائمن اور ویزی لیوے لائن کے ساتھ خراباں خراباں چلتے، موسم سے لطف اندوز ہوتے دور نکل آئے۔ ویزی پھر نیا دکھڑا لے کر بیٹھ گیا۔ ”سائمن! یہ مکان جن میں ہم رہتے ہیں، انسانوں کی رہائش کے قابل نہیں۔“ سائمن ویزی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اسنے شک نہ بھی نہیں ہیں، بہر حال ان میں گزارہ تو ہو ہی رہا ہے۔“

وہ چڑ کر بولا۔ ”بڑی تنگی ترشی سے گزارہ ہو رہا ہے، یہ صرف تمہارے ہی گزارے کے قابل ہیں کسی دوسرے کے لیے نہیں، سائمن تمہاری عمر تو زیادہ ہے لیکن تمہارا علم بہت کم ہے۔ تم نے سیر تو بہت کی لیکن دیکھا کچھ نہیں۔ تم نہیں جانتے کہ مردم خور مختلف طریقوں سے تم کو دیکھ کی طرح کھا رہے ہیں۔ تمہاری رگوں سے خون چوس رہے ہیں۔ جب تم نا کارہ ہو جاؤ گے تو یہ لوگ تم کو پھینک دیں گے۔ کیا فوج میں تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوا؟ اچھا تم یہ سوچو کہ تمہیں تنخواہ کتنی ملتی ہے صرف تیرہ روپے..... کیا تم نے بھی سوچا اتنی قلیل تنخواہ میں تم کتنے عرصے تک روح اور جسم کا رشتہ قائم رکھ پاؤ گے؟ میں تو اس زندگی سے تنگ آ گیا ہوں..... کسی روز یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

سائمن اس کی باتوں کی گہرائی میں گرنے کے بجائے بولا۔ ”تم جاؤ گے کہاں؟ یہاں تمہارے پاس مکان ہے، قریب ہی زمین ہے، جہاں تم اپنی ضرورت کے لیے سبزیاں کاشت کر سکتے ہو۔ تمہاری بیوی ایک محنتی عورت ہے، ہر کام میں تمہارا ہاتھ بٹاتی ہے۔“

”جس زمین کی تم بات کرتے ہو اس میں پچھلے موسم بہار میں میں نے کو بھی کاشت کی تھی کہ انپکڑ آ گیا۔ میرے کھیت کو دیکھ کر جل بھن گیا۔ جو منہ میں آیا بلکا چلا گیا۔“ ویزی نے سانس لیا پھر کڑوے کیلے لہجے میں بتانے لگا۔ ”انپکڑ نے پوچھا یہ کو بھی تم نے کسی کی اجازت سے کاشت کی ہے اس کو اسی وقت اکھاڑ بیٹھو۔ وہ دوبارہ آیا اور مجھے دو روپے جرمانہ کر گیا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جہیز زمین کا ہر ابھرا ہوتا اس کی طبع ناز پر شاید بہت گراں گزرا تھا۔ اس مرتبہ اس نے زبان درازی نہیں کی ورنہ وہ میرے ہاتھوں شدید نقصان اٹھاتا۔“

”تم بہت چڑچڑے اور بد مزاج ہو۔“ سائمن نے کہا۔ ویزی نے ترکی یہ ترکی جواب دیا۔ ”میں بد مزاج نہیں ہوں نہ ہی بد خو، میں صرف سچ بولتا ہوں اور اگر اب انپکڑ آیا اور مجھے پریشان کیا تو میں اس کا منہ فوج لوں گا۔ میں چیف سے اس کی شکایت کروں گا۔“

”سائمن! تقدیر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ہم ہی ہیں جو غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے کے تعاقب میں لگے ہوئے ہیں۔ برا نہ مانا، اس روئے زمین پر انسان سے زیادہ خونخوار اور ظالم جانور کوئی نہیں۔ بھڑیا بھی بھڑیے کو نہیں کھاتا لیکن میں ثابت کر سکتا ہوں کہ انسان انسان کو کھاتا جاتا ہے۔“

”ایسے لفظ تو زبان سے نکالو دوست!“ سائمن نے کہا۔ ویزی دل آ زدہ تھا، نیچے دل سے بولا۔ ”میرے دماغ میں ایک خیال آیا جو میں نے تم پر ظاہر کر دیا۔ اس دنیا میں زندہ رہنا کتنا مشکل ہو جاتا اگر انسان میں مکاری، لالچ کے بجائے انسانیت اور خلوص ہوتا۔ حالات و واقعات دیکھ کر دل الٹ پلٹ ہوتا ہے۔ ہر شخص تم کو ذک پہنچانے، دل دکھانے کی کوشش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ تمہارے وجود کو اپنی خواہشات کی بھٹی میں بھسم کر کے اپنی ہستی کو نکھارے۔“

سائمن چند لمحے کے لیے جیسے کہیں کھوسا گیا پھر کہنے لگا۔ ”میرے بھائی تمہاری باتیں کسی جیت طیارے کی طرح ”زوں“ کر کے میرے سر سے گزر جاتی ہیں۔ ممکن ہے جو تم کہتے ہو وہ ٹھیک ہو، شاید خدا کی یہی مرضی ہو۔“

ویزی نے برا سامنہ بنایا اور بولا۔ ”تمہارے ساتھ بات کرنا گویا ہمیں آگے آگے بین بجاتا ہے۔ تم برا خوشگوار واقعے کو خدا سے منسوب کر کے بری الذمہ ہو جاتے ہو۔ دکھ جھیلے ہو..... مصیبتیں اٹھاتے ہو اور مقدر راستے پر آنے کا انتظار کرتے ہو۔ تم آدمی نہیں جانور ہو جس کو کسی چیز کا احساس نہیں ہے۔“

سائمن نرم دلی سے بولا۔ ”مقدر زور سے نہیں چلتا، تقدیر کے سامنے تدبیر کار گز نہیں ہوتی۔ جو قسمت میں ہے ہو کر رہے گا۔“

”تم بھی مفت کار دوسر ہو۔“ ویزی یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ وہ بغیر کچھ کہے چلا گیا، سائمن چلا تارہ گیا۔ ”دوست! تم ناراض ہو گئے ہو..... غصہ ٹھوک دو۔“ ویزی نے اس کی آواز پر کان نہ دھرے اور لیوے لائن کے موڑ کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

دوسرے روز موسم بڑا سہانا تھا۔ گہرے نیلے آسمان نے سورج کو جیسے اپنی کوکھ میں چھپا لیا تھا۔ بادل گہر کر آ رہے تھے جب جھوم کر برسے تو ہر طرف جل جل کر دیا۔ بارش کی تو ہر چیز نہا دھو کر یوں چمک رہی تھی..... جیسے ستار کی دکان پر زیورات دک رہے ہوتے ہیں۔ کوارٹروں میں جمع ہونے والا

پندرہ روز ہی گزرے ہوں گے کہ چیف دورے پر...
 ۱۰۔ پلزمی ساتھ تھا۔ ریلوے کے بڑے افسروں کی ایک
 ایئر برگ سے ریلوے لائن کے معائنے کے لیے آنے
 والی تھی۔ وہ دونوں اس معائنے کی تیاریوں کا جائزہ لینے آئے
 تھے۔ ریلوے لائن کے نٹ بولٹ کسے جا رہے
 تھے۔ پھاٹکوں، ٹھیکوں اور عمارتوں پر ایسے رنگ و روغن کیا جا
 رہا تھا جیسے کسی بڑھیا کو میک اپ میں ڈبو کر نئی ٹوپی دینا یا چا
 رہا ہو۔ سائن اور ویزیٹی بھی اپنے اپنے علاقے میں آگئی
 تھیں۔ یوں میں مصروف تھے۔ چیف ٹرائی مین سائن کی پوسٹ
 پر آیا۔ سائن نے فوجی انداز میں ٹھک سے سیلوٹ کیا، سب
 بول ٹھیک تھا۔

چیف نے پوچھا۔ ”کب سے یہاں کام کر رہے ہو؟“
 ”دو مئی سے جناب!“ سائن نے جواب دیا۔
 ”کوارٹر نمبر 164 پر کس کی ڈیوٹی ہے؟“ چیف نے پوچھا۔
 ”ویزیٹی کی جناب!“ انسپٹر نے جواب دیا۔
 چیف نے پوچھا۔ ”کیا یہ وہی ہے جس کی تم نے گزشتہ
 برس شکایت کی تھی؟“

”جی جناب! وہی بددماغ ہے؟“ انسپٹر نے نفرت
 سے ہونٹ کھینچ کر۔

”چلو آج پھر اس کی خبر لیتے ہیں۔“ چیف نے حکم دیا۔
 ملازمین نے پڑیوں پر چلنے والی ٹرائی دھکیلتا شروع
 کر لیا، سائن کو فکر اور اندیشوں نے گھیر لیا۔ وہ دور تک نہیں جاتا
 تھا۔ اسے خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ آج ضرور یہ افسر ویزیٹی
 لی ہڈیاں توڑیں گے۔

دو گھنٹے بعد سائن حسب معمول اپنے حلقے کی
 ملازمت چیک کر رہا تھا کہ اس نے دور سے ویزیٹی کو اپنی
 طرف آتے دیکھا۔ اس کے سر پر سفید کپڑا باندھا ہوا تھا،
 ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ کندھے پر ایک چھوٹی سی ٹھنڈی لٹکانی
 ہوئی تھی۔ بائیں رخسار پر رومال بھی باندھا ہوا تھا۔ سائن کو
 اپنے اندیشے حقیقت میں ڈھلتے نظر آئے۔ قریب پہنچنے پر
 سائن نے دیکھا اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے
 دھشت ٹپک رہی تھی۔

سائن نے غمزدہ لہجے میں پوچھا۔ ”یہ سب کیا ہے،
 ایسے ہوا؟“

”میں ہیڈ آفس ماسکو جا رہا ہوں۔“ ویزیٹی نے کہا۔
 ”تم ہیڈ آفس شکایت کرنے جا رہے ہو۔ کس کس کا
 امن پکڑ کر اپنا رونا روتے پھرو گے۔ سب ایک ہی قتالی کے پٹے
 پر ہیں۔ اس ارادے سے باز آ جاؤ۔ جو کچھ ہوا اسے ایک

بھیا نک خواب سمجھ کر بھولنے کی کوشش کرو، اسی میں بھلائی ہے۔“
 ویزیٹی تھوڑی سی چڑھتا ہوا دھاڑا۔ ”کیسے بھول
 جاؤں، ہر چیز کی کوئی حد ہوتی ہے۔ میرے زخمی سر اور چہرے
 کو دیکھو، کیا میں اس کو بھول سکتا ہوں۔ انسپٹر نے چیف کے
 کان بھرے، اس کو اشتعال دلایا۔ کپڑا منہ پر رکھ کر رونے
 سے بہتر ہے کہ کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو ہی جائے۔“

”تم کیا سمجھتے ہو ماسکو میں تمہیں انصاف ملے گا، حق رسی
 ہوگی، تمہاری شکایت سے جو نتیجہ نکلے گا وہ تمہارے بچے سمجھے
 سکون کو بھی غارت کر دے گا۔ تم غریب ہو، اچھا کی تو توقع نہ
 رکھو۔“ سائن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

ویزیٹی نے کہا۔ ”میں جھکے والا ہوں نہ ہی ڈر پوک۔ جانتا
 ہوں انصاف کی چھک نہیں ملے گی لیکن اپنے حق کے لیے لڑنے
 میں جو راحت ملے گی اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ آخر ہوا کیا ہے؟“ سائن نے پوچھا۔
 ”چیف اپنی ٹرائی سے اترا۔“ ویزیٹی نے بتانا شروع
 کیا۔ ”میرے کوارٹر کا معائنہ شروع کر دیا، مجھے پہلے ہی
 اندازہ تھا کہ یہ بڑا کڑا معائنہ ہوگا، اسی لیے میں نے دن رات
 ایک کر کے ہر شے کو درست کر دیا تھا۔ اس کو موقع ہی نہ ملا کہ
 مجھ سے کسی بات پر باز پرس کرے۔ جب واپسی کے لیے
 اپنی ٹرائی کی طرف گیا تو میں نے انسپٹر کی شکایت کر دی۔
 میری بات سننے ہی وہ آگ بگولا ہو گیا اور تشدد پر اتر آیا، مجھے
 تین گھنٹے تشنگ بنا کر دل کی میز اس اچھی طرح نکال لی، میں کم
 کھڑا مارا کھاتا رہا۔ مزاحمت بالکل نہ کی، یہی سوچتا رہا کہ اونٹ
 کبھی تو پہاڑ تلے آئے گا، بس یہی کچھ ہوا۔“

سائن رقت سے بولا۔ ”تم نے اپنی ایک شکایت کا
 نتیجہ تو یہیں دیکھ لیا، تمہاری دوسری شکایت کا نتیجہ کیا نکلے گا، خدا
 بہتر جانتا ہے۔“

ویزیٹی بھی ضدی واقع ہوا تھا۔ ”اچھا سائن میں جا رہا
 ہوں، مجھے معلوم ہے ماسکو میں شاید ہی کوئی میری شکایت سنے
 مگر میں جا رہا ہوں۔ میری بیوی کا خیال رکھنا، میری غیر
 موجودگی میں وہ میرا کام نمٹائے گی۔“

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی، خدا کرے تمہاری مراد
 پوری ہو اور تمہیں انصاف ملے۔“ سائن نے بے بسی سے کہا،
 پھر دونوں گلے ملے۔ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور جدائی
 کے جنگل میں اپنی اپنی راہ پر چل پڑے۔

کافی عرصہ گزر گیا، ریلوے افسر بھی معائنہ کر کے جا
 چکے تھے لیکن ویزیٹی واپس نہ آیا۔ ایک روز لائن پر سائن کا
 آنا سامنا ویزیٹی کی بیوی سے ہو گیا۔ چہرے پر سو جن،

آنکھیں سرخ، کام کے بوجھ کے باعث وہ نیم جان نظر آ رہی تھی اور خاندان کی جدائی نے جیسے اس کا حسن گہنا دیا تھا۔ وہ افسردہ دکھائی دے رہی تھی۔

”ویزیلی کا کچھ اتنا چلا؟“ سائمن نے پوچھا۔

شدت غم سے اس کی آواز نہ نکلی، اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ کوئی خبر نہیں۔ سائمن نے اس کی ڈھارس بندھائی اور دونوں چل پڑے۔

سائمن نے بچپن میں ایک خاص قسم کی لکڑی سے بچوں کے لیے باجے بنانا سیکھے تھے۔ وہ فرصت کے لمحات میں باجے بناتا اور دوستوں کے ذریعے شہر میں فروخت کر دیا کرتا تھا۔ سائمن نے سوچا پھر سے یہ کام کیوں نہ شروع کر دوں۔ تھوڑی بہت آمدنی ہو جایا کرے گی۔ ایک روز کام ختم کرنے کے بعد سائمن اس خاص لکڑی کی تلاش میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کچھ زیادہ ہی دور نکل گیا اور اس مقام پر پہنچ گیا جہاں پٹری ایک پل سے گزرتی تھی۔ اس پل کے ساتھ ہی جنگل تھا جہاں سے باجول کے لیے لکڑی مل سکتی تھی۔ سائمن پل سے اترا اور جنگل میں گھس گیا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی تلاش رنگ لائی اور اسے مطلوبہ لکڑی مل گئی۔ اس نے درختوں سے لکڑی کا ٹکڑا شروع کر دی۔ ضرورت کے مطابق لکڑیاں کاٹنے کے بعد ان کی ایک گٹھڑی بنائی اور ریلوے لائن کی طرف قدم بڑھا دیے، سورج غروب ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ فضا بالکل ساکن تھی۔ گھونسلوں کی جانب گامزن پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سائمن ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس کی سماعت سے عجیب سی آواز نکرائی۔ پہلے اس نے وہم سمجھا لیکن دوبارہ وہی سی ہی آواز نے اسے غصے میں ڈال دیا۔ یہ آواز کیسی؟ اس نے سوچا، وحیان دیا سے لگا جیسے لوہے سے لوہے کو ٹکرایا جا رہا ہے۔ اس کی چال میں تیزی آگئی۔ وہ جانتا تھا کہ ریلوے لائن پر مرمت کا کام نہیں ہو رہا پھر ان آوازوں کے کیا معنی؟ وہ پل پر آ گیا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کوئی شخص ریل کی پٹری کے ساتھ ٹھوک پیٹ کر رہا تھا۔ وہ تیز قدموں سے اس شخص کی جانب بڑھا، وہ بھونچکا رہ گیا جب اس نے ویزیلی کو دیکھا۔ وہ پٹری اکھاڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور ایک ٹکڑے کو پل سے نیچے پھینک دیا تھا۔ سائمن کی حالت ایسی تھی جیسے کالو تو بدن میں اہو نہیں۔ ویزیلی نے سائمن کو دیکھا، اندھیرا بہت گہرا نہیں ہوا تھا۔ کبھی فضا بھی، ویزیلی کچھ دیر سائمن کو گھورتا رہا اور پھر بات کیے بغیر پل سے اترائی کی جانب چل دیا۔

سائمن نے پکارا۔ ”دوست واپس آ جاؤ۔“ ویزیلی

یہ تم نے کیا کیا؟

☆ اے انسان تو نے رب کو پہچانا مگر معرفت کا حق ادا نہ کیا۔

☆ قرآن پڑھا مگر اس پر عمل نہ کیا۔

☆ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کھائیں مگر شکر ادا نہ کیا۔

☆ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تو کی مگر

ان کی سنت پر عمل نہ کیا۔

☆ شیطان سے دشمنی کا دعویٰ تو کیا مگر اس کی

بھرپور مخالفت نہ کی۔

☆ جنت کی آرزو تو کی مگر اسے حاصل کرنے کا

سامان نہ کیا۔

☆ جہنم سے پناہ تو مانگی مگر گناہ نہ چھوڑے۔

☆ موت کو برحق جانا مگر اس کی تیاری نہ کی۔

☆ عزیز و اقارب، دوستوں کو دفن کرتا رہا مگر

عبرت حاصل نہ کی۔

☆ اپنے عیب نظر نہ آئے اور ساری عمر دوسروں

کے عیب تلاش کرتا رہا۔

(مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ پاکستین شریف)

پیٹ کا غلام

اگر پیٹ نہ سنا تا تو کوئی پرندہ شکاری کے جال میں نہ آتا بلکہ شکاری جال ہی نہ بچھاتا۔ پیٹ ہاتھ کی ہتھکڑی اور پیر کی بیڑی ہے۔ پیٹ کا غلام اللہ تعالیٰ کی عبادت بہت کم کرتا ہے۔ عقل مند لوگ بہت دیر میں کھاتے ہیں اور عبادت گزار آدھا پیٹ کھاتے ہیں اور متقی صرف جینے کے لیے کھاتے ہیں اور جوان اس وقت تک کھاتے ہیں جب تک طباق نہ اٹھالیں۔ بوڑھے اس وقت تک کھاتے ہیں جب تک پینا نہ آ جائے۔ کیا خوب بات ہے کہ پیٹ کے قیدی کو دو راتیں نیند نہیں آتی۔ ایک رات تو معدہ ہماری ہونے کی وجہ سے اور دوسری رات بے چینی کی وجہ سے۔

(مرسلہ: ریاض ہٹ۔ حسن ابدال)

نے سنی ان سنی کردی، سائنس پھر رنج و غم سے چٹا۔ ”ویزیلی
مت کرو ایسا، ملک الموت کو دعوت نہ دو، خدا کے لیے لوٹ
آؤ۔ لاؤ تھوڑا مجھے دو، ہم دونوں مل کر اس پڑوسی کو بچ چکے
پر لگا دیں گے۔ ابھی تک سوائے میرے تمہیں کسی نے نہیں
دیکھا۔ ابھی تو کچھ نہیں بگڑا، تم نہ آئے تو جاتے ہو کیا
قیامت آ جائے گی، سیکڑوں گھروں میں جلتے چراغ گل ہو
جائیں گے۔ مائیں باگل ہو جائیں گی۔ ہتے ہتے گھرا جڑ
جائیں گے۔ نہ جانے کتنے بچے یتیم ہو جائیں گے اور یہ
سب تمہاری گردن پر ہوگا، واپس آ جاؤ میرے دوست!
تمہاری بیوی تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھی
ہے۔“ ویزیلی نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور تیز تیز قدم
بڑھاتا ہوا جنگل میں گم ہو گیا۔

سائنس کے اوسان خطا ہو گئے۔ سمجھ نہ آیا کہ کیا
کرے؟ کیا اس قابل نہ تھا کہ پڑوسی کے ہماری بھرم
کھڑے کو پیچھے سے اٹھا کر مل پر لانا اور لائن کو خشک کر دیتا۔
وہ مدد کے لیے سینے کا پورا زور لگا کر چلایا، کوئی ہے؟ کوئی
ہے؟ وہ پھر زور سے مدد کے لیے پکارا مگر اس کی جھنجھکیاں
کس نے کان دھرنے تھے۔ آس پاس کیا دور دور تک کوئی
ذی نفس موجود نہ تھا۔ اس کا کلیجہ سٹپنے لگا، اس کڑی مشکل
میں کچھ بھائی نہ دیا تو مدد کے لیے اپنے کوارٹر کی جانب
بھاگ پڑا۔ تھوڑی دور بھی نہ گیا ہوگا کہ کارخانے کے
ساڑھے سات بجانے والے گھنٹے کی ٹن ٹن سائی دی۔ اس
کا مطلب تھا کہ مسافر ٹرین کے آنے میں صرف پانچ منٹ
رہ گئے ہیں۔ پانچ منٹ میں تو وہ بمشکل کوارٹر تک ہی پہنچ
پاتا، وہ واپس بھاگا۔ بدحواسی کے عالم میں گرتے پڑتے،
اس مقام پر پہنچا جہاں سے لائن ٹوٹی ہوئی تھی۔

”اب کیا کروں؟“ اس نے خود کو بھی اتنا بے بس نہ پایا
تھا، اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ حل بھائی دے
گیا تھا۔ تیز رفتار گاڑی کے ڈرائیور کو صرف سرخ جھنڈی ہی
ٹرین روکنے پر مجبور کر سکتی تھی مگر سرخ جھنڈی کہاں سے لائی
جائے؟ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ چہرہ پسینے سے
جھبک گیا۔ آنے والے قیامت خیز مناظر اک ہل کے لیے
اس کی آنکھوں میں گھوم گئے۔ ہر طرف خون، جھج و پکار، زخمی،
لاشیں، بے بسی سے مرتے بے گناہ لوگ، گاڑی پوری رفتار
سے آئے گی اور چشم زدن میں پڑی سے اتر کر پچاس فٹ
اونچے ہل سے نیچے کی طرف ایسے جائے گی جیسے آسمان سے
ٹوٹا ہوا تارا زمین کی طرف آتا ہے۔ ریل کی بوتلیاں نہ جانے
کتنے انسانوں کو مہنتی ہوئی ایک دوسرے میں پیوست ہو

جائیں گی اور پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ادھر ادھر بکھر جائیں گی۔
ریلوے لائن پر بہت دور ایک چھوٹا سا سیاہ دھما
نمودار ہونا شروع ہوا جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ قیامت خیز
گھڑیاں ایک بڑے سانچے کو جنم دینے والی تھیں۔ سائنس
پتھر کا بت بنا گھنٹی باندھے دھبے کو بڑا ہوتے دیکھتا رہا۔
اچانک اسے ایک خیال ہوجھا۔ اس نے اطمینان کی ایک لہر
سی دوڑتی محسوس کی۔ فیروزمندی کا تمغا اس کے سینے پر
چھنے والا تھا۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے دوڑتا ہوا لکڑی کے
گٹھے تک گیا۔ سب سے لمبی لکڑی نکالی، لکڑی کا ٹٹے والا تیز
دھار چاقو اٹھایا اور تیزی سے بھاگتا ہوا ریلوے لائن پر
آیا۔ کمر پر بندھی چینی سے سفید رومال نکالا۔ رومال کو لکڑی
پر باندھ کر جھنڈی بنائی۔ نظریں آسمان کی طرف اٹھائیں،
چند لمبے کے لیے ان بے کراں دستوں کے مالک کو یاد کیا،
چاقو والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور پلک جھپکتے ہی اس کے
پیٹ میں پیوست ہو گیا۔ سائنس نے دیدہ دلیری سے چاقو
نکالا اور گھاؤ والی جگہ پر سفید جھنڈی رکھ دی۔ زخم سے جاری
خون کی دھار نے ہل بھر میں سفید جھنڈی کو سرخ کر دیا۔
اب وہ عام سرخ جھنڈیوں کی نسبت زیادہ سرخ ہو کر ہوا
میں لہر ا رہی تھی۔ سائنس ایک ہاتھ سے سرخ جھنڈی لہرا رہا
تھا۔ دوسرا ہاتھ گہرے گھاؤ پر رکھا ہوا تھا۔ خون بہت تیزی
سے بہہ رہا تھا، اس پر نقاب تھامی ہوئی تھی۔ سر چکرانے
لگا۔ وہ ہر ممکن کوشش کر رہا تھا کہ ڈرائیور ٹرین کی تیز روشنی
میں خطرے کی جھنڈی دیکھ لے۔ اس کی آنکھوں کے
سامنے گول گول سیاہ دائرے بننا شروع ہو گئے تھے۔ وہ
کوشش کرنے لگا کہ کچھ دیر اور کھڑا رہے، اس نے تب تک
ہمت نہ ہاری جب تک اس کی ٹانگوں نے ساتھ نہ چھوڑ
دیا۔ بالآخر سر وہ گر گیا۔ اس سے پہلے کہ جھنڈی بھی گرتی
ایک ہاتھ آگے بڑھا اور جھنڈی کو تھام لیا۔ سرخ جھنڈی ہوا
میں لہر ا رہی تھی۔ ریلوے لائن پر سیاہ دھما ریلوے انجن کی
شکل اختیار کر چکا تھا۔ ڈرائیور نے دور سے سرخ جھنڈی
دیکھتے ہی ٹرین کی رفتار کم کرنا شروع کر دی۔ ٹرین ریستے
ریستے تین اس جگہ پر آ رہی جہاں سے پڑوسی کا ٹکڑا اکھاڑا
گیا تھا۔ ادھر ٹرین رکی ادھر سائنس کی سانسیں رک گئیں۔
مسافر نیچے اتر آئے۔ ٹرین کا علمہ بھی آ گیا۔ سبھی نے دیکھا
ایک لاش خون میں لت پت پڑی تھی اور دوسرا شخص خون
آلود جھنڈی ہاتھ میں لیے لاش کی پیشانی کو بوسہ دے رہا
تھا، یہ دوسرا شخص ویزیلی تھا۔





جواہری

شاہ زین رضوان

کھیل چاہے جو بھی ہو آخری بات اس کی جیت اور ہار پر ختم ہو جاتی ہے مگر بہ ظاہر ختم ہونے والی یہ بات کچھ لوگوں کے لیے انا کا ایسا مسئلہ بن جاتی ہے جو شاید زندگی کے نشیب و فراز سے الجھے ہوئے آخری سانس پر آکر تھمتی ہے وہ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا جسے بساط چاہے کوئی بھی ہو شکست کسی حال میں منظور نہ تھی۔

زندگی کی بساط پر جال بچھانے والے جواہری کا مہرا

تھی۔ اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ”کیا ٹرین کے آنے کی کوئی اطلاع ہے؟“
کٹ گھر کی کھڑکی پر بیٹھے ہوئے کلرک نے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

کورے کالان نے نظر گھما کر اپنے برابر میں بیٹھی نوجوان لڑکی... کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر بہ مشکل اٹھارہ سال ہو گی۔ اس نے بہترین لباس زیب تن کر رکھا تھا لیکن وہ سب سے زیادہ بے چین اور گھبراہٹی ہوئی نظر آ رہی

”کوئی نئی اطلاع نہیں، سوائے اس کے کہ ٹرین پینتالیس منٹ دیر سے آئے گی۔“

یہ سن کر ایک شخص نے جلاہٹ میں اپنا کاؤبوائے ہیٹ زمین پر پھینک دیا۔ اس کی بیٹی کے ساتھ ہولسٹر بندھا ہوا تھا اور کورے نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ وہ آرمی کولٹ ہے۔ اس شخص کے چہرے پر غصہ نظر آ رہا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ بہ مشکل تمام ٹرین کی روانگی کے مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے ریلوے اسٹیشن پہنچنے میں کامیاب ہو سکا تھا اور اب اسے یہ اطلاع مل رہی تھی کہ ٹرین پینتالیس منٹ لیٹ ہے۔ اس نے زمین پر پیر پیر جھٹکتے ہوئے کہا: ”ہمیں مزید کتنی دیر انتظار کرنا ہو گا؟“

کھڑکی کے ساتھ کھڑی ہوئی نوجوان عورت نے اسے غور سے دیکھا اور اس کے برابر میں کھڑے شخص کے تاثرات کچھ یوں تھے جیسے وہ ریلوے والوں کو اس تاخیر کا مزہ چکھا دے گا لیکن وہ خود ایک طویل قامت اور دھلا پتلا شخص تھا اور اس نے ایک بوسیدہ ماسوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے گفتگو میں حصہ لینے ہوئے کہا: ”کتنی عجیب بات ہے کہ ریل گاڑی ہمیں ایک بندر گاہ سے دوسری بند گاہ تک تو پہنچا دیتی ہے لیکن کنڈیکٹر چاہے کتنی کوشش کرے، وہ مقررہ وقت پر اس کی آمد اور روانگی کو یقینی نہیں بنا سکتا۔“

پہلے شخص نے اسے گھور کر دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر فرش سے اپنا ہیٹ اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔ کورے بڑے غور سے یہ سب باتیں دیکھ اور سن رہا تھا۔ اسے باکسنگ کیریئر شروع کرنے کے بعد ٹرین سے سفر کرنے کا اکثر موقع ملتا رہتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ دھلا پتلا شخص ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ٹرینیں اور کوچز بھی وقت پر نہیں آتیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے گزشتہ برسوں میں کافی وقت سفر میں گزارا ہے اور وہ جانتا ہے کہ ٹرین لیٹ ہونے کی وجہ سے جو مایوسی اور یوریت ہوتی ہے، اس سے کیسے نمٹنا جائے۔ وقت گزارنے کے کئی طریقے تھے جن میں مسافروں کو دیکھنا ان سے باتیں کرنا، دیوار سے لگ کر اوگھنا، کتاب پڑھنا یا پھر کسی بھی کھیل میں شامل ہو جانا تھا۔

”تم جانتے ہو کہ تیزی سے وقت گزارنے کا بہترین طریقہ کون سا ہے؟“ سختی شخص نے کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”ہم تاش کھیل سکتے ہیں۔“

کورے نے اپنی بائیں جانب دیکھا۔ مس پنڈورا

ہارن اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے اپنی بھویں اوپر اٹھائیں۔ کورے نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر ایک جھٹکے سے سر گھما کر اپنے باکسنگ فیئر پیٹرک سولیون کی طرف دیکھا جو اس کی دائیں جانب نیند کے مزے لے رہا تھا۔

مس ہارن مسکرائی اور دوسری جانب دیکھنے لگی۔ دہلے آدمی نے اپنا بیگ کھولا اور ہیز برش کے ڈبیر میں تاش کی گڈی تلاش کرنے لگا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ میرے پاس ایک گڈی ہے۔“ اس نے انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ کیا کہتے ہو؟ کیا کوئی ایک بازی لگانے کے لیے تیار ہے؟“

جس شخص نے کچھ دیر پہلے اپنا ہیٹ پھینکا تھا، وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں ایک دو بازیاں کھیل سکتا ہوں۔۔۔۔۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہارے پاس اتنی رقم ہے۔“ پھر اس نے اپنے بھاری بیگ اٹھائے اور اپنے بھائی کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ”چار! تم ان کا خیال رکھنا، جب تک میں کچھ اور پیسے بنا لوں۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ کوئی اچھی بات ہے برٹ؟“ اس نے پچھپچاتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمارے پاس کافی رقم ہے۔“

”الحق۔“ برٹ نے تکی سے کہا۔ ”بھی کسی کے پاس کافی رقم نہیں ہوتی۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ مل گئے۔“ برٹ والے شخص نے ایک پرانی گڈی دکھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ میں نے اسی بیگ میں رکھی تھی۔“

کورے نے مس ہارن کے تھوڑا قریب ہوتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ”تم کھیل رہی ہو؟“

اس نے اپنے سرخ بال پیچھے کی طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”ہم دیکھیں گے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کا اصرار اس پر ہے کہ کون اس کھیل میں شریک ہو رہا ہے۔ مجھے تو برش والا کوئی پیشہ ور جواری لگتا ہے۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“ کورے نے سرگوشی میں کہا۔ اسی دوران وہ شخص اپنے برش واپس بیگ میں رکھنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک برش اس طرح ہاتھ میں پکڑا کہ وہ سب لوگوں کو نظر آجائے۔ اس وقت وہاں تقریباً بیس افراد تھے، وہ سب برٹ اور اس شخص کی حرکتیں دیکھ رہے تھے۔

”جو کچھ میں یہ برش باہر نکال چکا ہوں۔“ دہلے شخص

نے اعلان کیا۔ ”اس لیے میرا خیال ہے کہ مجھے یہ پوچھ لینا چاہیے، کیا تم میں سے کوئی یہ برش خریدنا چاہتا ہے؟ یہ بہت اچھی کوالٹی کے ہیں اور کسی بھی مشہور برانڈ کے مقابلے میں بہت عمدہ ہیں۔ خاص طور پر اب مجھے ہوئے بالوں کو سیدھا کرنے کے لیے بہترین ہیں۔“

برٹ نے بے صبری سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں کھیل شروع کرنا چاہیے۔ کیا تمہیں ایسا لگتا ہے کہ میرے بالوں کو کسی برش کی ضرورت ہے؟“
کورے نے طنز یہ انداز میں مسکرا دیا۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ اور جارج کس طرح بھاکم بھاکم جھگڑنے کے لیے اسٹیشن پہنچے تھے اور اب وہ وقت سے فائدہ اٹھانا چاہ رہا تھا۔
دبے فحش نے برٹ کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ تم اپنے لیے یہ برش خریدو گے لیکن یقیناً تمہاری زندگی میں کوئی خاص عورت ہو گئی جسے یہ تحفہ پسند آئے گا۔“

”یہ صحیح کہہ رہا ہے برٹ۔“ جارج بولا۔ ”میں شرطیہ کہتا ہوں کہ جب ہم مس این سے ملے پورٹ لینڈ جائیں گے تو وہ تمہارا خریدنا ہو اور برٹ دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔“
برٹ کو اپنے بھائی کا تمبرہ پسند نہیں آیا اور وہ ناگواری سے بولا۔ ”کیا تم اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتے؟“
”میرا مقصد تو صرف اچھا مشورہ دینا تھا۔“ جارج ڈھٹائی سے بولا۔

”پھر تم کیا کہتے ہو؟“ سلیزمین اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم اپنی مس این کے لیے ایک برش خریدنا چاہو گے؟“

”خالی نہیں۔“ برٹ جھلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں تم سے اس کھیل میں رقم جیتنا چاہتا ہوں۔“
جارج کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ ”تم واقعی سمجھتے ہو کہ یہ کوئی اچھا خیال ہے۔ تمہیں.....“

برٹ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اپنی زبان بند رکھو اور مجھے تنگ مت کرو۔“

جارج نے اسے غصے سے دیکھا لیکن کچھ نہیں بولا۔
برٹ نے ایک چھوٹی میز اپنی طرف کھینچی تو اس پر رکے ہوئے بہت سے پھلٹ زمین پر گر گئے۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ کلرک اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اس پر چلایا۔

برٹ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”اب اگر تم کچھ

بولے تو اچھا نہیں ہو گا۔ بہتر ہو گا کہ تم ہمیں ٹرین کے آنے کے بارے میں بتاؤ۔“

”میرا خیال ہے کہ ہمیں ٹرین کے آنے کا پتا چل جائے گا۔“ جارج نے کہا۔ ”اسٹیشن کے قریب آ کر وہ دسل دیتی ہے۔“

برٹ اسے گھور کر رہ گیا۔ سلیزمین نے ابھی تک برش پیچنے کا ارادہ ترک نہیں کیا تھا۔ وہ کورے کی جانب مڑا اور برش اس کے قریب لاتے ہوئے بولا۔ ”تم کیا کہتے ہو۔ شاید یہ خاتون تمہاری جانب سے اس طرح کا تحفہ لینا پسند کریں۔ ان کے سرخ بال بہت ہی خوب صورت ہیں۔ جب یہ روزانہ رات کو ان میں برش کریں گی تو یہ دوپہر کی دھوپ میں پتیلی کی طرح چمکیں گے۔“

مس ہارسن نے کورے کی طرف تڑپ کر دیکھا۔ سلیزمین کے طرزِ مخاطب پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ کورے سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ان کے درمیان اس طرح کی کوئی بات تھی۔ گو کہ انہیں ایک ساتھ سفر کرتے ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ ایک خاتون پیشہ ور جواری ہونے کی وجہ سے وہ ایک یا کسر اور اچھے کے میجر کے ساتھ سفر کرنا سودمند سمجھتی تھی اور کورے بھی ایک دوست کی حیثیت سے اس کا ساتھ پسند کرتا تھا۔

”تم کیا کہتی ہو مس ہارسن؟“ اس نے پوچھا۔ ”کیا تم ایک برش لینا پسند کرو گی؟“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری پیشکش کا شکریہ مسٹر کالان لیکن میرے پاس پہلے سے ایک برش موجود ہے۔“

”لیکن اس جیسا نہیں ہو گا۔“ سلیزمین نے اصرار کرتے ہوئے کہا پھر وہ ایک چھوٹا برش اس کے قریب لاتے ہوئے بولا۔ ”تم ذرا اس پر ہاتھ پھیر کر دیکھو۔“

جب مس ہارسن نے اپنا ذہن تبدیل نہیں کیا تو سلیزمین نے کورے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”تم کیا کہتے ہو..... اگر اس وقت پیسے کم ہیں تو تم ہمارے ساتھ تاش کیوں نہیں کھیلتے۔ شاید تم اتنی رقم جیت جاؤ جو اس خوب صورت خاتون کے برش خریدنے کے لیے کافی ہو۔“

کورے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں تاش نہیں کھیلتا۔“

برٹ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”کیوں نہیں؟“

”تمہارا کیا خیال ہے مس ہارن؟“ پیٹرک نے پوچھا۔ ”تم ہمیشہ اچھا چلتی ہو۔“

پیٹرک کے سوال پر برٹ تالی بجاتے ہوئے بولا۔ ”جہیں معلوم ہے کہ ہم پوکر کھیلنے کی بات کر رہے ہیں؟“ پیٹرک نے مس ہارن کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ بہت اچھا چلتی ہے۔“

”تمہارا شکریہ مسٹر سویلون۔“ مس ہارن نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت میں بہت تھکن محسوس کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ آج تمہارے ساتھ اس کھیل میں شامل ہو سکوں گی۔“

”لیکن تم۔۔۔۔۔“ کورے خاتون کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور بولا۔ ”جہیں اس کے بغیر ہی کھیلنا ہو گا۔ اس کے علاوہ ٹرین میں اس وقت آسکتی ہے جب تمہاری پہلی بازی چل رہی ہو۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر یہ نہیں کھیلنا چاہتی تو کوئی بات نہیں۔“ پیٹرک نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ہمیں اب بھی ایک کھلاڑی کی اور ضرورت ہے۔“ سلازمین نے اونچی آواز میں کہا لیکن وہ براہ راست کھڑکی کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”کیا کوئی اور ہمارے ساتھ کھیل میں شامل ہونا چاہتا ہے؟“

یہ دعوت بظاہر اسی شخص کے لیے تھی۔ اس نے لڑکی کا بازو جھکاکار کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں کچھ بازیاں کھیلنا چاہوں گا۔“

لڑکی نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اوہ ڈیوی! تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس اس کھیل کے لیے کافی رقم نہیں ہے۔ اگر ہمارے تو کیا ہو گا؟“

”ہم جیت بھی تو سکتے ہیں ایسا۔“ مرد نے بحث کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہماری نئی زندگی شروع کرنے میں مددگار ہو گا۔“

”یہی جذبہ ہونا چاہیے دوست۔“ سلازمین نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

کورے نے اسے گھورا اور مس ہارن کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے خیال میں اس کے جیتنے کا کوئی امکان ہے؟“

وہ کھری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”میں نہیں سمجھتی کہ وہ مسٹر سویلون سے زیادہ برا کھلاڑی ہو گا۔“

کورے نے اپنی جگہ سے اٹھے بغیر اسے دیکھا۔ سب سے پہلے اس کی نظریں اس کے ہوشیار مگنی جس میں سے اس کی کن جھانک رہی تھی۔

”پوکر دیکھنے میں آسان لگتا ہے لیکن یہ ایک کافی پیچیدہ کھیل ہے۔ میرا حجب ہمیشہ سے کمزور ہے اس لیے میں اسے نہیں سیکھ سکا۔“

برٹ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال میں یہی سیکھنے کا وقت ہے۔“

اب کورے کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ قد میں وہ اس سے دو انچ زیادہ تھا اور اس کے مقابلے میں مضبوط جسمات رکھتا تھا۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے تاش کھیلنا سکھاؤ گے؟“ برٹ کو یہ امید نہیں تھی کہ کورے اس سے قدوار جسمات میں بڑا ہو گا۔ اس نے ڈھیٹ بنے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایسا لگا کہ تمہیں ایک سبق کی ضرورت ہے۔“

”ہمیں کسی مشکل میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے برٹ۔“ اس کے بھائی نے کہا۔ ”یاد کرو تم نے مجھ سے کیا کہا تھا کہ جب تک ٹرین نہیں آجاتی، ہمیں خود کو لڑائی جھگڑے سے دور رکھنا ہے۔“

”کیا تم اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتے؟“ برٹ نے کورے پر سے نظریں ہٹائے بغیر اس سے کہا۔

”سلازمین۔“ سلازمین مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ ”لڑنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ صاحب کھیلنا نہیں چاہتے تو مجھے یقین ہے کہ کوئی اور ہمارے ساتھ کھیل میں شامل ہو جائے گا۔“

اسی اثنا میں پیٹرک کی آنکھ بھی کھل گئی اور وہ چوکتے ہوئے بولا۔ ”کیا ہو رہا ہے کورے؟“

”کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ سلازمین بولا۔ ”ہم صرف تاش کھیلنا چاہ رہے ہیں۔“

”ایک دو نیم تو میں بھی کھیل سکتا ہوں۔“ پیٹرک بولا۔

”بہت عمدہ۔“ سلازمین نے کہا۔ ”اب ہم صرف ایک یا دو مزید۔۔۔۔۔“

گٹ گھر کی کھڑکی کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا لیکن اس کے برابر بیٹھی ہوئی لڑکی نے اسے دوبارہ بیچ پر بٹھا دیا اور اس کے کان میں سرگوشی کرنے لگی۔

”اور اس کا دباؤ اے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
 ”اسی کی وجہ سے میں نہیں کھیل رہی۔“ مس ہارن نے کہا۔
 ”میں نہیں سمجھتی کہ وہ سانی سے ہارن لے گا۔“
 برٹ کو کرسیاں تلاش کرنے میں کوئی وقت نہیں ہوئی۔ وہ سیدھا ان کرسیوں کی طرف گیا جہاں دو لڑکے اپنے والدین کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ان دونوں کو دھکا دے کر فرش پر گرادیا۔ ان کے باپ نے احتجاج کرنا چاہا لیکن برٹ کی آنکھوں سے جھانکتی خوشخبری دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ وہ کورے کی طرح طاقتور نہیں تھا۔
 اس نے بیٹوں سے کہا کہ وہ فرش پر ہی بیٹھ جائیں۔ چند لمحوں بعد برٹ اس کی کرسی بھی لینے آ گیا تو اس نے کسی احتجاج کے بغیر پسپائی اختیار کر لی۔

جب چاروں کھلاڑی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو سٹیزمین نے کارڈ کی گڈی ہاتھ میں پکڑی اور انہیں اوپر نیچے کرنے لگا۔ کورے نے مس ہارن کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ شاطر ہے؟“
 ”ہاں..... مجھے ایسا ہی لگا۔“ اس نے جواب دیا۔

کورے کو اس پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ کارڈ کے ساتھ دلچسپ کمالات کر سکتی تھی اور تاش کی میز پر بیٹھ کر اس سے بہتر زندگی گزار رہی تھی۔

مس ہارن نے ہلکے سے کندھوں کو جھٹکا دیا اور بولی۔ ”اس کی بہت سی نشانیاں ہیں اور ان میں سب سے بڑی یہ ہے کہ وہ کس طرح گڈی اٹھاتا اور پتے تقسیم کرتا ہے۔“

کورے نے اس شخص کو غور سے تاش جھینٹتے ہوئے دیکھا لیکن اسے کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی، سوائے اس کے کہ وہ گڈی کے نصف حصوں کو آپس میں ملانے سے پہلے اپنی انگلیوں کی پوزیشن تبدیل کرتا تھا۔

مس ہارن اس کی انجمن بھانپ گئی اور بولی۔ ”وہ گڈی کو اس طرح اوپر اٹھاتا ہے جیسے پتوں کو اوپر نیچے کرنے والا ہو لیکن پھر اپنی انگلیاں ان کے گرد رکھ کر انہیں جھینٹتے لگتا ہے۔ یہ ایک سوچا سمجھا طریقہ ہے تاکہ وہ نا تجربہ کار اور شوقین نظر آئے۔“

کورے نے اپنا سر ہلایا اور بولا۔ ”اب تک میں نے جنہیں اور پیئرک کو جتنی بار پو کر کھیلے دیکھا، اس میں کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ پتوں کو جھینٹنے کے ایک سے زیادہ طریقے بھی ہیں۔“

”اس کی وجہ یہ ہے کہ کارڈز تمہارے لیے اہمیت

نہیں رکھتے مسٹر کالان۔“ مس ہارن بولی۔
 ”درحقیقت مسٹر سویلون کو ہر تادیکہ کر چھیں یہ کھیل غیر دلچسپ لگتا ہے۔“

ڈیوی کی محبوبہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ جوا کھیلے لیکن وہ پہلی بازی جیت گیا۔ اس نے ایما کی جانب ایک مسکراہٹ بھیجی اور بولا۔ ”تم نے دیکھا ایما..... میں جانتا ہوں کہ کیا کر رہا ہوں۔“

ایما کی آنکھوں میں امید کی چمک ابھری لیکن وہ اب بھی خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ مس ہارن مسکراتے ہوئے بولی۔ ”مجھے حیرت ہے۔“

”کس بات پر؟“ کورے نے پوچھا۔
 ”اگر وہ واقعی جانتا ہے کہ کیا کر رہا ہے۔ سٹیزمین نے بڑی ہوشیاری سے دونوں بادشاہ اسے پکڑا دیے تھے۔“

کورے نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی ہیں جس پر مس ہارن بھی مسکرا دی۔

سٹیزمین نے دوبارہ تاش کے پتے اکٹھے کیے اور انہیں جھینٹنے لگا۔ برٹ نے دوسری اور تیسری بازی جیت لی اور بولا۔ ”تم نے دیکھا چلچل کہ کس طرح اپنے پتے استعمال کیے جاتے ہیں۔“

”تم بہت اچھا کھیل رہے ہو برٹ۔“ جارج نے اس سے اتفاق کیا۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور ان کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ”اگر اعتراض نہ ہو تو میں تم لوگوں کے ساتھ ایک دو بازیاں کھیل لوں؟“

برٹ کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بولا۔ ”تم واپس بیچ پر جاؤ اور ہمارے سامان کی نگہبانی کرو۔“

”تھیک نہیں ہے برٹ۔“ جارج نے شکایت کیا۔
 ”میں بھی ٹھیکانا چاہتا ہوں۔“

”بے وقوف۔ ہم یہاں جیتنے کے لیے بیٹھے ہیں۔“
 برٹ نے پوچھا کرتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے نہیں کہ ساری رقم ہار کر ان احمقوں کے حوالے کر دیں۔“

جارج بحث کرنے سے باز نہیں آیا۔ اس نے کہا۔
 ”لیکن ہمارے پاس کافی.....“

”میں نے کھانا خاموش ہو جاؤ۔“ برٹ چلایا۔
 جارج ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اس صورت حال سے ناخوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں صرف یہ چاہ رہا تھا.....“

”مجھے سبق سکھانے پر مجبور نہ کرو۔“ برٹ نے

اُسے دھمکی دی۔
 جارج نے تلخ مھوٹ لگا اور واپس بیٹج پر جا کر بیٹھ گیا۔
 ”کیا ٹرین کے آنے کی کوئی اطلاع ہے؟“ ایمانے
 کلرک سے کوئی دوسری پیادہوں ہار پوچھا تھا۔
 کھڑکی کے پیچھے بیٹھے ہوئے کلرک نے سرد آہ
 بھری اور نفی میں سر ہلا دیا۔
 کورے یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ٹرین کے
 آنے میں کتنی دیر ہے لیکن جوار یوں کے پاس اتنا وقت تھا
 کہ وہ کم از کم ایک درجن بازیوں مزید کھیل سکیں۔
 بیٹرک کے علاوہ سب ہی کچھ نہ کچھ جیت چکے تھے۔
 مس ہارسن نے سرگوشی میں کہا۔ ”مسٹر سولیون
 نے دوسری بار یہ حرکت کی ہے۔“
 ”کیسی حرکت؟“ کورے نے پوچھا۔
 ”یہ دوسرا موقع تھا کہ وہ جیت جاتا لیکن اس نے اپنے
 پتے پھینک دیے۔“
 ”کوئی بیٹرک کو جیتنے کا موقع کیوں دے گا۔ کیا
 تم سمجھتی ہو کہ سیلزمین کو اس سے ہمدردی ہے؟“
 ”ہاں مجھے شک ہے۔“ مس ہارسن بولی۔ ”میں یہی
 کہوں گی کہ وہ مسٹر بیٹرک کو کھیل میں رکھنا چاہ رہا ہے
 اور مسٹر برٹ کے لیے اس نے کھیل کے آخر میں ایک
 بڑے نقصان کا بندوبست کر لیا ہے۔“
 کورے نے اس طرح سر ہلایا جیسے وہ مس ہارسن کی
 بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ”وہ کیا کر رہا ہے؟“
 ”اب تک اس نے ہر بازی کو کنٹرول کیا ہے۔ وہ
 مسٹر سولیون اور اس نوجوان شخص کو کھیل میں رکھنے کے
 لیے جیت کا موقع فراہم کر رہا ہے لیکن اس کا اصل ہدف
 مسٹر برٹ اور وہ تیلے ہیں جن کی ٹکرائی جارج کر رہا ہے۔“
 کورے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اسے حیرت سے
 دیکھنے لگا۔ اس دوران بیٹرک ایک بازی ہار چکا تھا۔ مس
 ہارسن نے کہا۔ ”کیا تمہیں میرے نہ کھیلنے پر حیرت نہیں
 ہوئی؟“
 کورے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”شاید اس لیے
 کہ ایک پیشہ ور جوا ری پتے پھینٹ رہا ہے۔“ اس نے جان
 بوجھ کر بے ایمانی کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔
 ”اوہ نہیں۔“ مس ہارسن بولی۔ ”میں اس سے بھی
 آگے جاسکتی ہوں۔ اس کی حکمت عملی اسی وقت کام آسکتی
 ہے جب لوگ آخری بازی تک کھیلیں۔“

کورے فوراً سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کن لوگوں
 کی جانب ہے۔ بیٹرک اور شاید برٹ یا ڈیوی بھی جو نہیں
 جانتے تھے کہ جیتنے کے بعد انہیں کھیل سے الگ ہو جانا
 چاہیے۔ مس ہارسن میں یہ کمزوری نہیں تھی۔
 ”پھر تم آج ناش کیوں نہیں کھیل رہی ہو؟“
 ”کیونکہ بڑا وقت کبھی کہہ کر نہیں آتا۔“
 کورے بالکل نہ سمجھ سکا کہ مس کورے کس
 بارے میں بات کر رہی ہے۔
 ”اگر ٹرین کے آنے سے پہلے پولیس یہاں پہنچ جاتی تو
 وہ جیتی ہوئی تمام رقم ضبط کر لے گی۔“
 کورے کی سمجھ میں اب بھی پوری بات نہیں آئی
 تھی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن دور سے دسل کی آواز سنائی
 دی۔ یہ گویا ٹرین کی آمد کا اعلان تھا جو کچھ ہی دیر بعد
 اسٹیشن میں داخل ہونے والی تھی۔
 ”ٹرین آ رہی ہے۔“ کلرک نے ٹکٹ گھر کی
 کھڑکی کے پیچھے سے اعلان کیا۔ وہ ٹرین کا استقبال کرنے
 کے لیے اپنے چھوٹے سے بوتھ سے باہر آ گیا۔ ویننگ روم
 میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی اپنی نشستوں سے اٹھنے لگے۔
 سیلزمین نے ناش کی گڈی اٹھائی اور اسے اسی انداز
 میں پھینٹنے لگا جیسا کہ مس ہارسن نے بیان کیا تھا۔ ”میرا
 خیال ہے کہ ہمارے پاس ایک بازی کھیلنے کا وقت ہے۔“
 اس نے دوسرے کھلاڑیوں سے کہا۔ ”اور ہم ایک بڑی
 رقم کی بازی لگا سکتے ہیں۔“
 ”میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ ہمارے پاس اتنا وقت
 ہے۔“ برٹ متفق ہوتے ہوئے بولا۔ ”مجھے مزید ایک بازی
 جیتنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“
 بیٹرک طنزیہ انداز میں مسکرایا اور اس نے بھی ایک
 سکھ نکال لیا۔ کورے جانتا تھا کہ انہوں نے اس چھوٹے
 سے شہر میں جو کمائی کی تھی، اس کا بیشتر حصہ بیٹرک اڑا چکا
 ہے لیکن اسے مزید خطرہ مول لینے کا شوق تھا۔ ڈیوی نے
 بھی سکھ نکال لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے برتن میں
 ڈالے، ایمانے اس کا کندھا پکڑتے ہوئے کہا۔ ”تم پہلے ہی
 ان سب سے آگے ہو اور میں ٹرین میں بیٹھنے کے بعد اپنے آپ
 کو زیادہ محفوظ اور آرام دہ محسوس کروں گی تاکہ ہم ایک
 نئی زندگی کی ابتدا کر سکیں۔“
 ڈیوی نے فوراً ہی وہ سکھ اپنی جیتی ہوئی رقم میں ڈال دیا
 اور اپنی محبوبہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ”بالکل۔ میں کھیل
 روک سکتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ اب تک سب کچھ ٹھیک

ہے۔ اگر تمہارے بھائی ہمیں روکنا چاہتے تو وہ پہلے سے یہاں موجود ہوتے۔“

”بہر حال میں ٹرین میں بیٹھنے کے بعد اپنے آپ کو زیادہ پرسکون محسوس کروں گی۔“ انہا نے اپنا جملہ دہرایا۔
ڈیوٹی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور اپنی جیتی ہوئی رقم سینٹے ہوئے بولا۔ ”مجھے افسوس ہے دوستو..... میں مزید نہیں کھیل سکوں گا۔ ٹرین آرہی ہے اور ایسا کو میری ضرورت ہے۔“

”تم اب نہیں جاسکتے۔“ برٹ اور سیلز مین نے یک زبان ہو کر کہا۔

”ہم نے ایک اور بازی کھیلنے پر اتفاق کیا تھا۔“ برٹ نے اصرار کیا۔

”تمہیں ایک آخری موقع دینا ہو گا تاکہ میں اپنی باری ہوئی رقم کا کچھ حصہ واپس لے سکوں۔“

”اوہ۔ اسے جانے دو۔“ پیٹرک نے کہا۔ ”کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ اس کی سامی لڑکی سفر کی وجہ سے کتنی گھبرائی ہوئی ہے۔ ہم اس کے بغیر بھی ٹھیک ہیں۔“

ایسا اور ڈیوٹی دونوں نے تشکر آمیز نظروں سے پیٹرک کو دیکھا پھر اس میز سے دور چلے گئے۔ ڈیوٹی کی جیبیں سکوں سے بھر گئی تھیں۔

”میرا اندازہ ہے کہ ہم تین بھی کھیل سکتے ہیں۔“ سیلز مین نے کہا۔

کورے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”پیٹرک! ہمیں بھی اب چلنا چاہیے۔ ٹرین زیادہ دیر اسٹیشن پر نہیں رکے گی۔“

”لیکن میں تو پہلے ہی اپنا حصہ ڈال چکا ہوں۔“ پیٹرک نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”اب وہ نہیں جاسکتا۔ اس کے پتے میز پر پڑے ہوئے ہیں۔“ برٹ نے کہا۔

”اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“ سیلز مین نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

کورے کو انجن کی آواز قریب آتی محسوس ہوئی لیکن ان تین کھلاڑیوں کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ بازی ختم کر سکتے تھے۔ ان تینوں نے اپنے پتے اٹھائے تو برٹ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پیٹرک نے اپنے پتے دیکھ کر اوپری ہونٹ کاٹنا شروع کر دیا۔ کورے عرصہ دراز سے اپنے سامی کو تاش کھیلے ہوئے دیکھ رہا تھا اس لیے وہ

پیٹرک کی اس حرکت کا مطلب سمجھ گیا۔

”ہے۔“

”ٹرین قریب آچکی ہے۔ اس لیے میں تم دونوں کو جیتنے کا ایک اور موقع دیتا ہوں۔“ برٹ نے کہا۔ ”اس لیے میں تین ڈالر کی بازی لگا رہا ہوں۔“

کورے نے اپنے پیٹ میں عجیب سی گڑبڑ محسوس کی۔ تین ڈالر کی رقم ان تمام بازیوں سے بہت زیادہ تھی۔ وہ اب تک کھیل چکے تھے۔ پیٹرک نے اپنی تمام رقم برتن میں ڈال دی پھر جیب میں کچھ تلاش کرتے ہوئے بولا۔

”کورے! مجھے کچھ رقم ادھار چاہیے۔“

”تین ڈالر ایک بڑی رقم ہے۔“ سیلز مین نے کہا۔

”لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ اس سہ پہر کی آخری بازی ہے، میں تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں۔“

اس نے اپنے صے کی رقم میز پر ڈال دی اور گندی دوبارہ اٹھائی۔ برٹ نے دو کارڈ اٹائے اور انہیں دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ پیٹرک نے بھی ایسا ہی کیا اور اپنے پتوں کو دیکھتے ہی خوشی سے جھوم اٹھا جبکہ سیلز مین اپنے پتے دیکھ کر خنجر ہو گیا۔

برٹ نے اپنے سامنے رکھی ہوئی رقم کو دیکھا۔ اس میں اس کے جیتے ہوئے پیوں کے علاوہ داؤ پر لگائی ہوئی رقم بھی تھی۔ ”اسے ہم اور زیادہ دلچسپ بنادیتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”یہ دس ڈالر کے لگ بھگ ہیں۔ اس میں کچھ کمی بیشی ہو سکتی ہے لیکن یہ بات اتنی اہم نہیں ہے۔“

پیٹرک نے کورے کی طرف مڑ کر دیکھا اور اچھا آمیزچہ میں بولا۔ ”کورے! میرے دوست.....“

”نہیں۔“ کورے نے صاف جواب دے دیا۔

پیٹرک کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ”لیکن کورے.....“

”نہیں۔“ کورے نے اپنی بات دہرائی۔ ”ایک منٹ بھی نہیں۔ اپنا بیگ اٹھاؤ پیٹرک۔ ٹرین اسٹیشن میں داخل ہو رہی ہے۔“

”لیکن رقم تو پہلے ہی برتن میں ڈالی جا چکی ہے۔“ پیٹرک نے کہا۔

”میں نے کہہ دیا تاکہ ایک منٹ بھی نہیں دوں گا۔“ کورے اپنی بات پر قائم رہا۔

سیلز مین نے پیٹرک کی جانب سے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن جیسے ہی اس کی نظر کورے کے چہرے پر پڑی، اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور جھپٹتے ہوئے بولا۔ ”مجھے افسوس ہے بڑے میاں لیکن تمہارا دوست بہتر سمجھ سکتا ہے۔“

پیٹرک اس قدر دہشت زدہ نظر آ رہا تھا جیسے اس کا اکلوتا بیٹا کھو گیا ہو۔ سیزمین نے برٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم نے واقعی بہت اچھی بازی لگائی ہے لیکن میرے پاس بھی بہت اچھے پتے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے لہنی جیب میں ہاتھ ڈال کر مزید سکے نکالے اور انہیں گنتے ہوئے بولا۔
”میں نے تمہارے دس ڈالر دیکھ لیے ہیں۔ ان میں سات ڈالر کا اضافہ میری طرف سے۔“

برٹ نے اسے سختی سے گھورا اور اپنے بھائی کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ ”جارج! اپنا ایک تھیلے لے کر یہاں آؤ۔“
”تمہارے خیال میں یہ کوئی اچھا ٹیڈیا ہے برٹ؟“
جارج نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ ٹرین آچکی ہے اور ہمیں اس پر سوار ہو جانا چاہیے۔“

”تم صرف پیسے لے کر آؤ۔“ برٹ جھلاتے ہوئے بولا۔
جارج دونوں تھیلے لے کر اپنے بھائی کے پاس آ گیا۔
برٹ نے ان میں سے ایک کھولا۔ اس میں سے مٹی بھر سکے نکالے اور انہیں گن کر برتن میں ڈال دیا۔ جب سات ڈالر پورے ہو گئے تو سیزمین نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ بازی کافی بڑی ہو گئی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ کون جیتا۔“

”وہ میں ہی ہوں۔“ برٹ نے اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے پتے شو کر دیے جن میں دو بادشاہ اور تین دیپے موجود تھے۔ برٹ نے ہاتھ اگے بڑھا کر جیتی ہوئی رقم سمیٹنا چاہی۔

”اتنی تیزی دیکھانے کی ضرورت نہیں۔“ سیزمین نے اس سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ جب تم میرے پتے دیکھو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں نے یہ بازی جیت لی ہے۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے چار گلیاں لکڑی کی میز پر ڈال دیں۔ برٹ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ بولا۔ ”یہ بالکل بھی ممکن نہیں۔“

سیزمین نے کندھے اچکا دیے۔ کورے کو بھی اس کی جیت پر حیرت ہو رہی تھی۔ سیزمین نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”بھی بھئی ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“

برٹ اپنے قدموں پر اچھلتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔“

سیزمین بھی اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا لیکن اس نے برٹ کے چہرے پر سے نظریں ہٹائیں اور بولا۔

”کیا میں نے یہ شکایت کی کہ ایسا نہیں ہو سکتا جب تم اور وہ لڑکا کھیل کے دوران بازی پر بازی جیتتے رہے؟ نہ ہی ان بڑے میاں نے یہ شکایت کی کہ وہ پورے دن میں ایک بھی بازی نہ جیت سکے۔“

باہر سے کنڈیکٹر نے آواز لگائی۔ ”تمام مسافر ٹرین پر سوار ہو جائیں۔“ اس کے ساتھ ہی گھوڑوں کے جہنمانے اور زمین پر سم ہارنے کی آوازیں آئیں جیسے کچھ لوگ ٹرین تک پہنچنے کی جلدی کر رہے ہوں۔

برٹ نے ان آوازوں پر توجہ نہیں دی۔ وہ پاگلوں کی طرح پیٹرک کو گھور رہا تھا۔ ”تم بھی اس کے ساتھ ملے ہوئے ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”کس معاملے میں؟“ پیٹرک نے پوچھا۔ ”خوش قسمتی سے اس کے پاس اچھے پتے آگئے۔“ پھر وہ مس ہارن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیا ایسا نہیں ہے؟“

برٹ نے مس ہارن کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس کا ہاتھ اپنی گن کی طرف بڑھا۔ خوش قسمتی سے کورے اس کے لیے تیار تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ برٹ کا ہاتھ اس کی گن سے قریب ہو جاتا جا رہا ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ برٹ ان لوگوں میں سے ہے جو بے ایمانی کرنے والوں کو بھی معاف نہیں کرتے۔ اگر وہ پیٹرک کو اس معاملے میں نہ ٹھیکتا تو کورے بھی متاثر دیکھنے والوں میں شامل ہو جاتا۔ یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا لیکن اس نے پیٹرک کو اپنا نشانہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ اسٹیشن پر اور لوگ بھی تھے۔ اگر برٹ کا نشانہ خطا ہو جاتا تو وہ اس کی لپیٹ میں آ سکتے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنی داہمیں مٹی مضبوطی سے بچھائی اور برٹ کی گھوڑی پر وار کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ کورے کے عقب میں سڑک سے آنے والا دروازہ کھلا اور بھورے رنگ کے بالوں والے تین آدمی اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوئے۔ ”ایما! ان میں سے ایک چلا آیا۔“

”کیا تم یہاں ہو؟“
”وہ رہی۔“ دوسرے نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہم تمہیں گھڑے جانے کے لیے آئے ہیں۔“
”یہاں کوئی ایسا مائی کاٹل نہیں جو اسے بھاگ کر لے جاسکے۔“ تیسرا چلا آیا۔ ان تینوں نے ہال کا جائزہ لیا پھر ان کی نظریں ایما اور ڈیوی پر ٹھہر گئیں جو انہیں دیکھتے ہی خوفزدہ ہو گئے تھے۔

برٹ نے پستول نکال کر کورے کا نشانہ لینا چاہا لیکن اس نے ہاتھ مار کر نال کار خنجر کر دیا تاکہ اس سے نکلنے

والی گولی اس کے سینے میں گلتے کے بجائے ککڑی کے فرش میں ہوسٹ ہو جائے۔

”ہے۔ اب سنبھلو۔“ سلیمن نے کہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا پتول نظر آ رہا تھا لیکن تب تک پیٹرک بھی سمجھ چکا تھا کہ اس کے ساتھ بے ایمانی کی گئی ہے۔ اپنے وقت میں وہ بھی باکسر رہ چکا تھا چنانچہ اس نے وقت ضائع کیے بغیر سلیمن کی ناک پر پکے بعد دیکرے تین ضربیں لگائیں اور یہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا کہ اس کا حریف فرش پر گرا ہوا ہے۔

کمرے کی دوسری جانب ایما کے بھائیوں نے ڈیوی کو دیوار سے لگادیا اور اس کے پیٹ پر کچے برساتا شروع کر دیے جبکہ ایما چلا چلا کر انہیں روکنے کی کوشش کرتی رہی۔

”سب لوگ آ جائیں۔“ کنڈیکٹر نے ایک بار پھر آواز لگائی۔ ”ٹرین پہلے ہی لیٹ ہے۔ اب ہمیں روانہ ہونا ہے۔“

چند لوگ جو اس جھگڑے میں شامل نہیں تھے، وہ دروازوں کی طرف لپکے۔ باہر سڑک پر گاڑیاں رکنے کی آواز آئی لیکن کورے کے پاس اس پر توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر برٹ پر ضرب لگائی اور بائیں ہاتھ سے اس کی گن چھیننے کی ناکام کوشش کی۔ جارج بھی بھائی کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور اپنے قیمتی تھیلے بیچ کے پاس فرش پر چھوڑ کر کورے کی طرف لپکا جس نے جھک کر جارج کے پیٹ پر زوردار ضرب لگائی اور وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہوا گیا پھر وہ دوبارہ برٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

عمارت کا بیرونی دروازہ ایک بار پھر کھلا اور بہت سے باوردی سپاہی اندر داخل ہوئے۔ ”کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔“ ان میں سے ایک حکمانہ آواز میں چلایا لیکن کسی نے بھی اس کی آواز نہیں سنی۔ کورے اور برٹ کے درمیان گن چھیننے کے لیے کشمکش جاری تھی۔ جارج اپنی تکلیف سے نجات پا چکا تھا اور ان دونوں کو الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پیٹرک نے جھک کر سلیمن کی چھاتی پر ایک اور ضرب لگائی اور غصے میں اسے بڑا بھلا کہنے لگا۔

ادھر ایما پوری قوت سے چٹاری تھی کیونکہ اس کے ایک بھائی نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد ڈال رکھا تھا اور اسے زمین پر گھسیٹ رہا تھا۔ ”میری مدد کرو آفیسر۔ یہ لوگ مجھے اغوا کر رہے ہیں۔“

سپاہیوں نے ان پر بندوقیں تان لیں اور انہیں الگ کرنے لگے۔۔۔۔۔ انہیں زیادہ دیر نہیں ملے گی لیکن انہیں خاموش کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ سب اپنی بولی بول رہے تھے۔

”یہ لوگ میری مرضی کے خلاف مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہے ہیں۔“

”اپنی زبان بند رکھو بے وقوف لڑکی۔ ہم تمہیں واہیں گھر لے جا رہے ہیں۔ اما کے پاس۔“

”میں اس شاطر سے اپنی رقم واہیں لینا چاہتا ہوں۔“

”آخری بار کہا جا رہا ہے۔ سب مسافر ٹرین میں سوار ہو جائیں۔“

”اب ہم کیا کریں گے برٹ؟“

ایما تک ہی فاز کی آواز گونجی۔ کتنی سپاہی نے ان لوگوں کو خاموش کرنے کے لیے رائفل کی ٹہلی کا رخ چھت کی طرف کر کے گولی چلائی تھی جس سے یقیناً چھت کو نقصان پہنچا ہو گا لیکن اس طرح وہ لوگوں کو خاموش کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

”اب ٹھیک ہے۔“ ان کے افسر نے کہا۔ ”تم میں سے کس نے سویٹ واٹر کے بینک میں ڈاکا ڈالا تھا اور باقی لوگ کس بات پر جھگڑا کر رہے تھے۔“

اس کا یہ پوچھنا غضب ہو گیا۔ سب لوگوں نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا۔ کورے زمین پر لیٹا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کے تینوں بھائی آگے بڑھے۔ وہ چلا چلا کر آفیسر کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنا چاہا رہے تھے پھر اس نے دیکھا کہ ایک ڈپٹی نے برٹ اور جارج کو پکڑ رکھا ہے اور وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مس ہارن نے ایما کی طرف دیکھا اور تیزی سے برٹ کے تھیلوں کی جانب لپکی۔

”میرا خیال ہے کہ لوٹی ہوئی رقم ان تھیلوں میں ہے آفیسر۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک تھیلا کھول دیا۔ بہت سے سکے اور نوٹ زمین پر بکھر گئے۔ سب لوگ خاموش ہو گئے اور حیرت سے اس ڈھیر کو دیکھنے لگے جو بڑھتا جا رہا تھا۔

”برٹ۔ اس نے ہماری رقم تلاش کر لی۔“ جارج منٹایا۔

ایک ڈپٹی نے اس کے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اس وقت کسی کی توجہ ایما پر نہیں تھی اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈیوی کا بازو پکڑا۔ اسے لے کر اپنے سامان تک گئی اور خاموشی سے اسٹیشن سے باہر نکل گئی۔

اے مس ہارن سے کہا۔ ”تمہارا بہت بہت
کما تم بتا سکتی ہو کہ اس کے علاوہ یہاں کس
اور رہا تھا؟“
اصل بتا سکتی ہوں۔ ”مس ہارن نے جواب دیا۔
”ارغ کروں؟“ اسٹیشن سے باہر ٹرین نے وصل
اور دوع کر دیا۔

☆☆☆

اما تمہیں پہلے سے معلوم تھا کہ ان دونوں نے
اکا اکا رہا ہے۔ ”پیٹرک نے تین دن بعد ملنے والی
اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی۔“ مس ہارن
لے برابر والی نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”لیکن
لاحد و سکنات سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔“

اے اس کے سامنے والی نشست پر بیٹھتے ہوئے
اما تھی کہ تم نے کھیل میں حصہ نہیں لیا۔“
اگر کسی جواری کے پاس چرائی ہوئی رقم ہو۔“ مس
لہ وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”تو مقدمے کے
اصل میں لگائی گئی تمام رقم ثبوت کے طور پر پیش کی
اوقات بھی کہہ کر نہیں آتا۔ بینک والے موقع
والا کر اپنے نقصان کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں
میں گئی ہوئی ساری رقم اس میں شامل کر لی جاتی
ا طرح سبھی لوگ نقصان میں رہتے ہیں۔“
”تم نے مجھے خبردار کیوں نہیں کیا؟“ پیٹرک
لہا۔

”میں نے کہا تھا۔“ مس ہارن اسے یاد دلاتے ہوئے
”اب میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں اس کھیل میں
ا نہیں چاہتی۔“

”لیکن تم نے تو صرف یہ کہا تھا کہ تھک گئی ہو۔“
لے اعتراض کیا۔

”ہاں۔ میں کھل کر نہیں کہہ سکتی کہ ان لوگوں
امہ مت کھیلو۔ ان میں سے ایک لٹیئر اور دوسرا بے
ا کیا میں ایسا کہہ سکتی تھی؟“

”نہیں۔“ پیٹرک ہارنانتے ہوئے بولا۔ ”میں نہیں
ا ا تم اس طرح کہہ سکتی تھیں۔ یہ بھی غنیمت ہے
میرے پیسے واپس مل گئے۔“

”ہمیشہ اچھے پہلوؤں کو دیکھا کرو مسٹر پیٹرک۔“
ن بولی۔ ”سیلز مین کو تو اس کے پیسے بھی واپس نہیں
ا اس کا مطلب ہے کہ دنیا میں انصاف ہو رہا ہے۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ اس پوری کہانی میں دلچسپ بات
کیا ہے؟“ کورے نے کہا۔ ”صرف ایک شخص جیت کر گیا
جس کی بیوی نہیں چاہتی تھی کہ وہ کھیل میں حصہ لے۔“
”محبوبہ۔“ مس ہارن نے اس کا اصرار کیا۔
”کیا؟“ پیٹرک اور کورے ایک ساتھ بولے۔
”وہ اس کی بیوی نہیں محبوبہ تھی۔“

کورے کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا
جب اس لڑکی کے بھائی اسے ڈھونڈتے ہوئے آئے اور اسے
اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ ”میں سمجھتا
ہوں کہ تمہارا اندازہ درست ہے لیکن اس وقت میں اس پر
غور نہ کر سکا۔“

”صاف لگ رہا تھا کہ وہ دونوں مایا بیوی نہیں
تھے۔“ مس ہارن چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ لاتے
ہوئے بولی۔ ”لیکن میں یہ ظاہر کر کے ان کی بے عزتی نہیں
کرنا چاہتی تھی۔“

کورے اور پیٹرک اب بھی حیرت سے اسے دیکھ
رہے تھے۔ تب اس نے اپنی انگلیوں پر گننا شروع کیا اور اپنا
مشاہدہ بیان کرنے لگی۔ ”وہ دونوں ایک ساتھ سفر
کر رہے تھے اور لڑکا اسے متاثر کرنے کی کوشش میں لگا
ہوا تھا جبکہ وہ بیسوں کے بارے میں فکر مند تھی۔ ٹرین لیٹ
ہونے سے وہ دونوں غیر معمولی طور پر پریشان نظر آ رہے
تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں ٹرین آنے سے پہلے لڑکی کے
بھائی ان کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچ جائیں اور اسے اپنے
ساتھ واپس لے جائیں اور تم نے دیکھا کہ ایسا ہی ہوا۔ لڑکی
کے بھائی پہنچ گئے تھے اور اگر پولیس نہ آتی تو شاید وہ لڑکی
کو لے جاتے۔ اس انفراترین میں انہیں نکلنے کا موقع مل گیا
اور وہ ٹرین میں سوار ہو گئے۔“

پیٹرک نے اپنا سر نشست سے لگایا اور آنکھیں بند
کرتے ہوئے بولا۔ ”بینک لوٹنے والے، بے ایمان کھلاڑی
اور بھاگنے والے بچے۔ میں حیران ہوں کہ اگلے شہر میں
ہمیں کیا دیکھنے کو ملے گا۔“

”تاش کے کھیل میں بے ایمانی کرنے والے ہر جگہ
ہوتے ہیں۔“ کورے نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں وہاں
بھی ایسے لوگ مل جائیں گے۔ اس لیے تم محتاط رہنا۔ ضروری
نہیں کہ ہر مرتبہ پولیس تمہاری مدد کے لیے آئے۔“

مس ہارن نے سر ہلایا اور پیٹرک شرمندہ ہو کر رہ
گیا۔ اسے اس سفر میں اچھا سبق مل گیا تھا۔





قدر دان

محمد الیاس

دُہری شخصیت، دُہرا معیار رکھنے والے کبھی کبھی اصول پسند لوگوں کو تگنی کا ناچ نچا دیتے ہیں۔ یہاں بھی ایک چور کو یہی مسئلہ درپیش تھا گویا الٹا چور کو توال کو پری جھنڈی دکھا گیا اور ساتھ ہی شکوہ کناں بھی رہا۔

بہت طریقے سے لوٹنے والے ایک تہذیب یافتہ چور کا قصہ

قیمتی پلاٹ کی صورت میں آخری جائیداد بھی فروخت ہو گئی، تاہم میجر بابر اور اس کی بیوی کو اطمینان رہا کہ رہائش کے لیے ذاتی گھر ہے، گاڑی ہے اور گزر بسر کرنے کو معقول پنشن مل جاتی ہے۔ عمر کے آخری حصے میں ضرورتیں ہی کتنی رہ جاتی ہیں۔ میاں بیوی نے طے شدہ پروگرام کے مطابق پینتیس

لاکھ روپے کی رقم الگ کر کے بیڈروم کے وارڈروب میں دھلے ہوئے کپڑوں کے اندر رکھ دی تاکہ اگلے روز بیدار ہونے کے نام تو ہی بچت کی اسکیم میں جمع کرائی جاسکے۔ تنخواہ کے علاوہ ماہانہ منافع سے وہ اپنے دونوں بچوں کی تعلیم کا سلسلہ بہ آسانی جاری رکھ سکے گی۔ باقی کے بیس لاکھ روپے پنشن کی رقم کے ساتھ لاؤنج کی ہی سامنے والی الماری میں رکھ دیے، جن سے گھر کی مرمت کروانا اور ایک دو الیکٹرانکس کی اشیا خریدنا ملے ہو گیا۔

خریدار اور پراپرٹی ڈیلر ادائیگی کرنے کی غرض سے ایسے وقت پر آگئے کہ بینک میں رقم جمع کرانا ممکن نہ رہا۔ ہاؤسنگ اسکیم میں کیے گئے سخت سیکیورٹی اقدامات کی بدولت ماحول ہمیشہ پُر امن ہی رہا اور کبھی کوئی ایسا برادار اچھا بھی نہ ہوا کہ دونوں میاں بیوی بلاوجہ ہی تشویش میں مبتلا ہو جاتے۔ لیکن سچ کہا گیا ہے کہ بڑا وقت کبھی پوچھ کر نہیں آتا۔ سردیوں کے موسم میں رات کے دس بجے گلیاں دیسے بھی سونی ہو جاتی ہیں۔ وہ بیٹھ کے سامنے ٹی وی لاؤنج میں خاموشی سے کوئی ڈاکیومنٹری فلم دیکھ رہے تھے کہ ہاتھوں میں پسلل لیے چار نقاب پوش ڈاکوؤں نے انہیں گھیر لیا۔ انہوں نے جینز پہن رکھی تھیں اور جسمانی ساخت سے صاف پتا چل گیا کہ چاروں نوجوان ہیں۔

میجر نے بیوی کو بازو کے حصار میں لے کر پہلو سے لگا لیا اور ذرا سی بھی ایسی حرکت نہ کی جس سے ڈاکو مشتعل ہو جائیں۔ بڑے تحمل سے بولا۔ ”جس مقصد کے لیے آئے ہو، وہ کرو اور جاؤ۔ کسی بھی قسم کی بدتمیزی کرنے سے تم لوگوں کو کوئی اضافی فائدہ ہونے والا نہیں۔“

سامنے کھڑے ڈاکو نے کہا۔ ”میجر صاحب! ہم خاندانی لوگ ہیں۔ فوج کی دل میں بڑی قدر ہے۔ آپ صاف صاف بتا دیں، رقم کہاں پڑی ہے۔ بدتمیزی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

میجر نے الماری کی طرف اشارہ کیا اور کہنے لگا۔ ”اس میں پنشن کی ساری رقم پڑی ہے، آج ہی لایا تھا اور میں لاکھ روپے الگ سے

زبور وغیرہ گھر میں ہے ہی نہیں۔ پرانی گاڑی تمہارے کام کی نہ ہوگی۔“ میجر نے ذرا توقف کیا، تاہم کچھ سوچ کر دوبارہ بول پڑا۔ ”باقی یہ کہ میں نے 65ء اور 71ء کی دونوں جنگیں اگلے محاذ پر لڑی ہوئی ہیں۔۔۔۔۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ اب مہربانی کر کے تم رقم اٹھا کر جلدی نکلو، میری بیوی دل کی مریضہ ہے۔“

اسی ڈاکو نے جو پہلے مخاطب ہوا تھا، جواب دیا۔ ”سوری سر! بہت مجبوری ہے۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔“

میجر نے سر پر آئی آفت کو جلد ٹالنے کی غرض سے اسی طرح متوازن لب و لہجہ میں کہا۔ ”کوئی بات نہیں، میں سمجھتا ہوں۔ تم اچھے گھرانے کے بچے دکھائی دیتے ہو، بس ذرا جلدی کرو۔ میری پیگم کی حالت بگڑ رہی ہے۔“

اچھے گھرانے کے سپوت نے ایک ساتھی کو مخاطب کر کے حکم دیا۔ ”ہری آپ۔۔۔۔۔ آئی پریشان ہو رہی ہیں۔“

میجر بیوی کو ہلکے ہلکے۔۔۔۔۔ مسلسل ہتکتے ہوئے دلاسا بھی دیے جا رہا تھا۔ اتنے میں الماری کی صفائی کرنے والے نے رقم سمیٹ لی اور اپنے لیڈر سے کہا۔ ”میجر صاحب نے ٹھیک ہی کہا ہوگا لیکن جاتے جاتے سرسری نظر سے بیڈروم کو دیکھ لینے میں حرج نہیں۔“ لیڈر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایک آدھ منٹ بعد ہی بیڈروم سے پینتیس لاکھ روپے اٹھائے دو ڈاکو نکل آئے اور اپنے لیڈر کے سامنے نمائش کرتے ہوئے دبی دبی ہنسی ہنسنے لگے۔ لیڈر بدستور یرغمال بنے بوڑھے جوڑے کے سامنے تن کے کھڑا تھا۔ پسلل والے ہاتھ کو یکبارگی حرکت دی لیکن نہ جانے کیا خیال آیا اور کسی انتہائی اقدام سے باز آ گیا۔ بڑے زخم خوردہ لہجہ میں بولا۔ ”آنکھ! آپ نے سخت مایوس کیا۔ بندہ آخر کس پر اعتبار کرے۔“

میجر نے اپنا لب و لہجہ مزید۔۔۔۔۔ مگر سکون کرتے ہوئے کہا۔ ”آئی ایم سوری۔ یہ رقم دراصل کسی کی امانت رکھی تھی۔“

میجر نے بیوی کو بازو کے حصار میں لے کر پہلو سے لگا لیا اور ذرا سی بھی ایسی حرکت نہ کی جس سے ڈاکو مشتعل ہو جائیں۔ بڑے تحمل سے بولا۔ ”جس مقصد کے لیے آئے ہو، وہ کرو اور جاؤ۔ کسی بھی قسم کی بدتمیزی کرنے سے تم لوگوں کو کوئی اضافی فائدہ ہونے والا نہیں۔“

سامنے کھڑے ڈاکو نے کہا۔ ”میجر صاحب! ہم خاندانی لوگ ہیں۔ فوج کی دل میں بڑی قدر ہے۔ آپ صاف صاف بتا دیں، رقم کہاں پڑی ہے۔ بدتمیزی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

میجر نے الماری کی طرف اشارہ کیا اور کہنے لگا۔ ”اس میں پنشن کی ساری رقم پڑی ہے، آج ہی لایا تھا اور میں لاکھ روپے الگ سے

حضرت یوسف

رضوانہ صاحبہ

اللہ رب العالمین نے تمام انسانوں کی اصلاح کے لیے نہ صرف مختلف پیغمبر دنیا میں بھیجے کہ وہ اپنے رب کا پیغام حق لوگوں تک پہنچائیں بلکہ... ان پیغمبروں کی تمام زندگی بھی عملی طور پر اسی حق گوئی کی تفسیر بنادی گئی... جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا ہر لمحہ کٹھن آزمائشوں اور صبر و استقامت کی اعلیٰ مثال بن کے بنی نوع انسان کے لیے سبق آموز ٹھہرا... کیونکہ آپ کے لیے کڑی آزمائشوں کا سلسلہ تو بچپن سے ہی شروع ہو چکا تھا کہ جب آپ کے بھائیوں نے آپ کو مصر کے بازار میں پہنچایا اور بچپن کا وہ خواب کہ جس میں آپ کی عظمت کی بشارت دی گئی اور گیارہ ستاروں نے آپ کو سجدہ کیا... پھر دھیرے دھیرے وقت نے ثابت کیا کہ خوابوں کی تعبیر کا ایسا سچا علم آپ کو عطا کیا گیا جس کے ذریعے نہ صرف زلیخا کے دیے گئے جھانسنے سے نکلنے میں کامیاب ہوئے بلکہ قید و بند کی صعوبتوں سے بھی نکلنے کا راستہ نکلا اور آپ کی تمام دعائوں کو قبولیت بخشی گئی... سبحان اللہ۔

اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات کے سبق آموز پہلو

تیسرا حصہ



قرآن کا خود دعویٰ ہے کہ ہم نے اسے علم عطا کیا۔ ان علوم میں سب سے مشہور علم جو آپ کو عطا ہوا وہ خوابوں کی تعبیر کا علم تھا۔ خواب سب ہی دیکھتے ہیں۔ قیدی کچھ زیادہ ہی دیکھتے ہیں۔ قیدیوں میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی عقل مندی کے پیش نظر ان کے سامنے بیان کیا۔ آپ نے اس کی تعبیر بتادی۔ وہ تعبیر اسی طرح عمل میں آئی جس طرح بتائی تھی۔ اس قیدی نے دوسروں کو بتایا۔ اس کے بعد جو بھی خواب دیکھتا تھا اس کی تعبیر آپ سے پوچھتا تھا۔

لوگ آپ کے گردیدہ تو تھے ہی اس کے بعد مزید گردیدہ ہو گئے۔

اس قید خانے میں دو نوجوان قیدی بن کر آئے۔ ان میں سے ایک ساتی سلطان تھا یعنی بادشاہ کو جام اور مشروب باعہ پلانے والا تھا دوسرا شاہی باورچی خانے کا سردار یا داروغہ تھا۔ وہ دونوں جیسے ہی جیل میں آئے حضرت یوسف علیہ السلام کی شہرت دامن گیر ہوئی اور داروغہ کی مہربانی تھی کہ ہر قیدی حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات کر سکتا تھا۔ یہ دونوں بھی ان کے پاس پہنچے اور پھر اکثر آپ کی مجلس میں بیٹھنے لگے۔

ان دونوں نے ایک ہی رات میں ایک ایک خواب دیکھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی شہرت سے آشنا ہو ہی چکے تھے۔ اپنے اپنے خواب لے کر یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے۔

”ہم دونوں ایک ساتھ زنداں میں آئے تھے۔ ایک ساتھ فرعون کے معتب ہوتے تھے اور ایک ہی رات میں ایک ساتھ خواب بھی دیکھے ہیں۔ خواب بھی اتنے عجیب ہیں کہ تعبیر ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔“ ان دونوں نے کہا۔

”تم خواب سناؤ۔ اللہ تعالیٰ نے خوابوں کی تعبیر کا علم مجھے خوب دیا ہے۔ جب تک تمہارا مقرر رکھنا تم تک پہنچے، میں تمہارے خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔“

ساتی نے اپنا خواب سنایا۔ ”میں نے خواب میں دیکھا کہ انگور کی بیل میرے سامنے ہے اور اس بیل میں تین شاخیں ہیں اور ایسا دکھائی دیا کہ اس میں کلیاں لگیں اور پھول آئے اور اس کے سب کچھوں میں بکے بکے انگور لگے اور فرعون کا پیالہ میرے ہاتھ میں ہے اور میں نے فرعون کا پیالہ لے کر اس میں نچوڑا اور وہ پیالہ میں نے فرعون کے ہاتھ میں دیا۔“

یوسف علیہ السلام نے خواب سن کر اسے مبارک باد دی۔

”اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ تین شاخیں تین دن ہیں۔ خواب میں ظاہر ہوتا ہے کہ اب سے تین دن کے اندر فرعون تجھے سرفراز فرمائے گا اور تجھے پھر تیرے منصب پر بحال کر دے گا اور پہلے کی طرح جب تو اس کا ساتی تھا پیالہ اس کے ہاتھ میں دیا کرے گا۔“

جب ساتی اپنا خواب سن چکا تو اس کے ساتھی کی باری آئی جو شاہی باورچی خانے کا سردار تھا۔

”میں نے دیکھا ہے کہ میرے سر پر سفید روئی کی تین نوکریاں ہیں۔ اوپر کی نوکری میں ہر قسم کا پکا ہوا کھانا فرعون کے لیے ہے اور پرندے اس نوکری میں سے کھا رہے ہیں۔“

حضرت یوسف علیہ السلام اس کا خواب سن کر اداس ہو گئے لیکن وعدہ کر چکے تھے، تعبیر تو دینی تھی۔

”تیرے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ وہ تین نوکریاں تین دن ہیں۔ صواب سے تین دن کے اندر فرعون تیرا سر تیرے تن سے جدا کر کے تجھے ایک درخت پر لٹکوا دے گا اور پرندے تیرا گوشت نوچ نوچ کر کھائیں گے۔“

یہ تعبیر ہی ایسی تھی کہ اسے سننے والا سننے ہی بے ہوش ہو گیا۔

”افسوس کہ اس کی تقدیر میں جو کچھ لکھ دیا گیا، وہ تو ہو کر رہے گا۔“ یوسف علیہ السلام نے کہا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔

ساتی کو انتظار تھا کہ کب تین دن گزریں اور اسے رہائی ملے۔

دوسرا کہتا تھا کہ تیرا دن بھی نہ آئے۔

وقت کسی کے روکے رکھتا ہے؟ تیرے دن فرعون کی سالگرہ تھی۔ فرعون نے ان دونوں کو طلب کیا کہ ان کے بارے میں فیصلہ کیا جائے۔

دو بار کے سپاہی ان دونوں کو لینے کے لیے آئے پہنچے۔ داروغہ ان تو حضرت یوسف علیہ السلام سے تھا تھا کہ انہوں نے اس کے بارے میں ایسی تعبیر کی لیکن ساتی خوش تھا لہذا حضرت یوسف علیہ السلام سے ملنے آیا۔ وہ خوش تھا کہ تعبیر کے مطابق اسے رہائی ملنے والی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے ساتی سے کہا۔ ”جب تو باہر جائے تو اپنے آقا (فرعون) سے میرا ذکر کرنا۔ اسے بتانا کہ ایک بے گناہ اور بے قصور شخص کو مجرم بنا کر زنداں میں ڈال دیا گیا ہے۔ یہ بھی بتانا کہ وہ شخص دین حق کی تلقین کرتا ہے اور خوابوں کی تعبیر دیتا ہے۔“

توریت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

”جب تو خوش حال ہو تو مجھے یاد کیجیو اور مجھے اس سے منجھلی دلوانیو کہ وہ غبرانیوں کی ولایت سے مجھے چھالائے اور یہاں بھی میں نے ایسا کام نہیں کیا کہ وہ مجھے اس قید میں رکھیں۔“
کہا جاتا ہے کہ ساقی اور داروغہ باورچی خانہ پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے بادشاہ کے کھانے پینے کی چیزوں میں زہر ملا ہے۔

جب تحقیقات ختم ہو گئی تو داروغہ پر جرم ثابت ہو گیا اور ساقی کو بری کر دیا گیا جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر کے طور پر بیان فرمایا تھا۔
ساقی پھر سے ساقی گری پر بحال ہو گیا لیکن وہ اپنی خوشی میں ایسا مست ہوا کہ فرعون سے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کرنا بھول گیا۔

”مگر شیطان نے اسے (ساقی کو) ایسا غفلت میں ڈالا کہ وہ اپنے رب (شاہ مصر) سے اس کا (یوسف) ذکر کرنا بھول گیا اور یوسف کئی سال قید خانے میں پڑا رہا۔“
”کئی سال“ کی تفسیر میں تین قول بیان کیے جاتے ہیں۔ تین سے نو تک اور ایک قول ہے تین سے سات اور ایک قول یہ ہے کہ دس سے کم پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ بہر حال اس کی صراحت نہیں کی جاسکتی کہ ساقی کی رہائی کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کتنے سال جیل میں رہے اور کتنے سال بعد ”ساقی“ نے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر فرعون سے کیا۔
توریت کے مطابق دو سال بعد فرعون نے خواب دیکھا تھا اور ساقی کو حضرت یوسف علیہ السلام کی یاد آئی تھی۔ باورچی خانے کے داروغہ کو پھانسی دے دی گئی اور اس کی لاش کو ایک درخت پر لٹکا دیا گیا۔ ساقی کے منصب و اعزاز میں مزید اضافہ ہو گیا اور وہ فرعون کی خدمات میں شب و روز گزارتا رہا۔
توریت کے مطابق دو سال گزرے تھے کہ فرعون نے ایک پریشان کن خواب دیکھا۔
اس خواب کا ذکر قرآن میں بھی ہے۔

”ایک روز بادشاہ نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دہلی گائیں کھا رہی ہیں اور انا حج کی سات بالیاں ہری ہیں اور دوسری سات سوکھی۔“
فرعون یہ خواب دیکھ کر جاگا تو سخت پریشان ہوا۔ وہ اس خواب پر غور کرتا رہا لیکن کوئی معنی سمجھ میں نہ آئے۔ اس نے پورے مصر کے جادو گروں، کلاہنوں اور منجموں کو طلب کیا اور اپنا خواب ان کے سامنے دہرایا۔ سب نے اس خواب پر غور کیا مگر تعبیر بتانے سے قاصر رہے۔ کسی نے تعبیر بتائی بھی تو دوسرے لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ کئی دنوں تک یہ اجلاس چلتے رہے۔ کئی تعبیریں سامنے آئیں لیکن کوئی ایسی نہیں تھی جس پر سب متفق ہو جاتے۔ ان محفلوں میں ”ساقی“ بھی مستقل شریک ہو رہا تھا۔ ایک دن اچانک اسے حضرت یوسف علیہ السلام کا خیال آ گیا۔
”اگر آپ مجھے کچھ مہلت دیں تو میں اس خواب کی تعبیر لاسکتا ہوں۔“ ساقی نے فرعون سے عرض کیا۔

”میں تو مایوس ہو چکا ہوں۔ درباری منجم کہتے ہیں یہ خواب نہیں بلکہ پریشان کن خیالات ہیں۔ تو بھلا اس کی تعبیر کہاں سے لا دے گا؟“

”آپ نے جب مجھے قید کیا تھا تو قید خانے میں میری ملاقات یوسف نام کے آدمی سے ہوئی تھی جو خوابوں کی تعبیر بتانے میں یدِ طولیٰ رکھتا ہے۔ سب لوگ اسی سے تعبیر پوچھا کرتے تھے۔ میں نے بھی ایک خواب دیکھا تھا اور اس سے تعبیر پوچھی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ میں رہا ہو جاؤں گا۔ تعبیر بالکل سچ نکلی۔ آپ کی مہربانی سے میں رہا ہو گیا۔ ممکن ہے آپ کے خواب کی تعبیر اس کے پاس ہو۔ آپ اگر مجھے قید خانے جانے کی اجازت دیں تو میں اس سے پوچھ لوں۔“
”اتنے بڑے بڑے منجم عاجز آ گئے تو وہ معمولی سا قیدی بھلا کی تعبیر بتائے گا۔ مجھ بھی تو پوچھ کر دیکھ لے۔“
”اس نے یہ بھی کہا تھا کہ رہائی کے بعد میں اس کے بے قصور ہونے کا حال آپ تک پہنچاؤں لیکن افسوس! اتنے سال گزر گئے۔ میں اس کو بھول ہی گیا تھا۔“

”تو اس کے پاس جا اور تعبیر لے کر آ۔ میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ اگر اس نے تعبیر بتادی اور وہ دیکھا ہی ہے جیسا کہ تو بیان کر رہا ہے تو میں اسے اپنے پاس بلاؤں گا اور اس سے اس کا حال پوچھوں گا۔“
فرعون کی اجازت ملنے۔ وہ شخص قید خانے میں پہنچ گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے شرمندگی کا اظہار کیا۔

”میں نے آپ جیسے نیک آدمی سے اپنا عہد توڑا۔ اس کے لیے میں شرمندہ ہوں۔ میں یہاں سے نکلنے ہی اپنے حال میں ایسا مست ہوا کہ فرعون کو آپ کے بارے میں بتانا بھول گیا۔ آج جب اس نے خواب دیکھا اور تعبیر کی ضرورت پیش آئی تو مجھے آپ کا خیال آیا۔“

”بھلے آدمی۔ اس میں حیرانہ طور نہیں۔ حیرانہ طور نہیں۔ اللہ خود چاہتا ہوگا کہ میں اتنے عرصے قید میں رہوں تو مجھے وہ خواب سنا جس کی تعبیر کے لیے تو یہاں آیا ہے۔“

حضرت یوسف علیہ السلام نے صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا۔ ساقی کو نہ ملامت کی اور نہ برسوں تک بھولے رہنے پر جھڑکا اور نہ یہ سوچا کہ جن ظالموں نے مجھ کو بے قصور زندان میں ڈالا ہے، وہ اگر تباہ ہو جائیں اور اس خواب کا حل نہ پا کر برباد ہو جائیں تو اچھا ہے بلکہ اسی وقت نہ صرف خواب کی تعبیر دی بلکہ خواب کے نقصانات سے بچنے کی تدبیر بھی بتلا دی۔

”خواب کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ تم لوگ سات سال متواتر کھیتی کرتے رہو گے۔ یہ تمہاری خوش حالی کے دن ہوں گے۔ جب کھیتی کے کٹنے کا وقت آئے تو جس قدر تمہارے سال بھر کھانے کے لیے ضروری ہو اس کو اگ کر لیتا اور باقی غلہ کو ان کی بالیوں میں ہی رہنے دینا تاکہ گلنے مڑنے سے محفوظ رہے۔ اس کے بعد سات برس خوب مصیبت کے آئیں گے۔ قحط سالی ہوگی۔ وہ تمہارا جمع کیا ہوا تمام ذخیرہ ختم کر دیں گے۔ پھر ایک برس ایسا آئے گا جب خوب پانی برے گا۔ کھیتیاں ہری بھری ہوں گی اور لوگ پھلوں اور دانوں سے عرق اور تیل بہتا ہے ساتھ نکالیں گے یعنی موٹی گاٹیں (جو خواب میں دیکھیں) اور بالیں خوش حالی کے سال ہیں اور دلی گاٹیں خشک سالی کے برس ہیں جو خوشحالی کی پیداوار کو کھا جائیں گے۔“

”تم کھیتی کرو گے سات برس جم کر۔ سو جو کاٹو اس کو چھوڑ دو اس کی بال میں مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ۔ پھر آئیں گے اس کے بعد سات برس سختی کے۔ کھا جائیں گے جو رکھتا ہے ان کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بیج کے واسطے پھر آئے گا ایک برس اس کے پیچھے۔ اس میں بینہ (بارش) برے گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑیں گے۔“

ساتی نے یہ تعبیر اور تدبیر سنی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی جلالت قدر کا قائل ہوا اور یہ سب معاملہ بادشاہ کی خدمت میں جا کر سنا دیا۔ فرعون نے ساتی کی زبانی حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں چند کلمات سنے تھے، اب جو اپنے خواب کی ایسی جامع تعریف سنی اور قحط سالی سے بچنے کی تدبیر یوسف علیہ السلام نے بتائی تو وہ ان کا قائل ہو گیا اور انہیں دیکھنے کا مشاقق ہوا۔ ساتی کو حکم دیا۔ ”تم اسی وقت جاؤ اور اس نادر روزگار شخص کو میرے پاس لے کر آؤ۔ یہ شخص تو دانائی اور اعلیٰ انتظامی لیاقت کے سبب اس لائق ہے کہ میں اسے سرکاری مناصب میں سے کوئی عہدہ عطا کروں۔“

ساتی ایک مرتبہ پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو قید میں رہتے ہوئے آٹھ سال ہو چکے تھے۔ جب ساتی نے بادشاہ کا پیغام آپ تک پہنچایا اور قید سے نجات کی خوشخبری دی تو آپ خوشی سے بے قابو نہیں ہوئے بلکہ استقامت سے ٹھہرے رہے۔

”میں چند شرائط کے ساتھ ہی باہر جاؤں گا۔ اس طرح تو باہر جانے کو تیار نہیں۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ ساتی نے کہا۔ ”آپ ان بادشاہوں کو نہیں جانتے۔ فرعون آپ کی شرطیں ماننے میں برسوں لگا سکتا ہے۔ ویسے ہی آپ میری بھول کی وجہ سے اتنا عرصہ قید میں رہ چکے ہیں۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اس وقت رہائی قبول کیجیے اور شرائط کا معاملہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔“

”اگر میں اس وقت رہا ہو گیا تو اسے بادشاہ کی مہربانی سمجھا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں حقائق سامنے آئیں۔ جن لوگوں نے مجھ پر بہتان باندھے اور مجھے یہاں تک پہنچایا اگناہ گاروہ ٹھہریں۔ میری بے گناہی ثابت ہو۔ اگر میں اس وقت باہر نکل گیا تو میرا بے قصور اور صاحب عصمت ہونا پردہ نقاب میں رہ جائے گا۔ اس طرح صرف عزت نفس ہی کو ٹھیس نہیں لگے گی بلکہ دعوت و تبلیغ کے اس اہم مقصد کو بھی نقصان پہنچے گا جو میری زندگی کا نصب العین ہے۔“

”آپ کی شرائط کیا ہیں۔ آپ مجھے بتائیں تاکہ میں وہ شرائط بادشاہ تک پہنچا دوں۔“

”بادشاہ سے کہنا کہ وہ تحقیق کرے کہ ان عورتوں کا معاملہ کیا ہے جنہوں نے مجھے دیکھ کر اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں۔ اس تحقیق کے لیے ان سب عورتوں کو بلایا جائے اور ان سے پوچھا جائے کہ بھلا اس وقت کیا ہوا تھا۔ اس وقت انہوں نے میرا کردار کیا دیکھا تھا، جب انہوں نے مجھے اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا اور اپنے ہاتھ کاٹ کر یہ باور کرانا چاہا تھا کہ وہ میرے

حسن پر عاشق ہو گئی ہیں، یہ ان کا کر تھا۔ وہ میری تعریف کر کے میرے نفس کو ابھارتا چاہتی تھیں۔ ان کی کواں میں قصور وار اور بے قصور ٹھہروں گا۔“

ساتی آپ کا یہ پیغام لے کر بادشاہ کے پاس چلا گیا۔

بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس واقعے کا ذکر فرماتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کے ضبط و صبر کو بہت سراہا اور تواضع و کسر نفسی کی حد تک اس کو بڑھا کر پیش کیا اور یہ ارشاد فرمایا۔

”اگر میں اس قدر دراز مدت تک قید میں رہتا جس قدر کہ یوسف رہے تو بلانے والے کی دعوت فوراً قبول کر لیتا۔“

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی براہ راست گناہ گار زلیخا تھی لیکن آپ نے اس کا ذکر تک نہیں کیا کہ اسے بلا کر پوچھو بلکہ ان مصری عورتوں سے تحقیق کا مطالبہ کیا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ یہ اس لیے کہ عزیز نے ان کے ساتھ مکہ حسن سلوک کیا تھا۔ آپ کو کیا آئی کہ اپنے اس حسن کی بیوی کا نام میں اور اس کی رسوائی کا باعث بنیں۔

بادشاہ کے پاس جب حضرت یوسف علیہ السلام کا پیغام پہنچا تو اس نے مصری عورتوں کو بلانے سے قبل یہ موزوں سمجھا عزیز مصر سے اس معاملے کی تفصیل پوچھی جائے کہ ان مصری عورتوں نے ہاتھ کیوں کاٹے تھے اور وہ عورتیں کون کون سی ہیں۔

بادشاہ نے عزیز مصر کو طلب کر لیا اور اس سے اس معاملے کی وضاحت چاہی۔ عزیز مصر پوری تفصیل بتانے سے قاصر تھا کیونکہ اس طرح اس کی بیوی پر الزام آتا۔ اس نے اپنی گفتگو کو مصری عورتوں تک محدود رکھا۔

”ان عورتوں نے یوسف کے حسن کی بے پناہ تعریف کر کے اس کو بھڑکانے کی کوشش کی تھی اور اس پر اپنی عاشقی ظاہر کرنے کے لیے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے (اس واقعے کی پوری تفصیل سنادی)۔“

”یہ جرم تو ایسا نہیں تھا کہ یوسف کو قید کیا جاتا۔“ بادشاہ نے کہا۔

”مجھے یہ گمان ہوا تھا یوسف ان کے بہکاوے میں آجائے گا اور میری رسوائی ہوگی۔ اس لیے میں نے یوسف کو ان عورتوں سے الگ کرنے کے لیے زندان میں ڈال دیا۔“

”اتنے عرصے تک تمہیں اس کا خیال ہی نہ آیا؟“

”میں ملک کے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا۔“

”مجھے تو یہ معاملہ کچھ اور لگتا ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ وہ مصری عورتیں کون کون تھیں۔ اصل حقیقت شاید ان سے معلوم ہو جائے۔“

عزیز مصر نے ان عورتوں کے نام بتانے سے بھی پس و پیش کیا اور پھر یہ بہانہ کر کے بادشاہ کے پاس سے اٹھ گیا کہ وہ اپنی بیوی سے پوچھ کر ان عورتوں کے نام بتائے گا۔

وہ گھر پہنچا تو سخت گھبرایا ہوا تھا۔ جس معاملے کو وہ سمجھ رہا تھا کہ دب گیا تھا، وہ پوری شدت سے ابھرا تھا۔ بات بادشاہ تک پہنچ گئی تھی۔ زلیخا کا نام نہیں لیا گیا تھا لیکن مصری عورتوں کا کیا بھروسہ۔ وہ زلیخا کا نام بھی لے سکتی ہیں۔

زلیخا کی نظروں سے اس کی پریشانی چھپی نہ رہ سکی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بتاتا، زلیخا نے خود ہی پوچھ لیا۔

”آپ کو میں نے اس قدر پریشان بھی نہیں دیکھا۔“

”ابھی تک ملکی معاملات درپیش ہوا کرتے تھے، اس مرتبہ مسئلہ میری اور تمہاری ذات کا ہے اور بات ہے رسوائی کی۔“

”ایسی کیا بات ہے؟“

”تمہیں یوسف یاد ہے۔ ہمارا غلام یوسف ہے۔“

”اسے میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ وہ تو قید میں اپنی سزا بھگت رہا ہوگا۔“

”بادشاہ نے اس کی رہائی کا فیصلہ کیا ہے۔“

”تو تمہیں کیا۔ اب تک تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہوگا۔“

”صرف اس کی رہائی عمل میں نہیں آ رہی ہے بلکہ بادشاہ نے اس معاملے کی چھان بین کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم نے جس رسوائی سے بچنے کے لیے یوسف کو قید کیا تھا وہ پھر ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔“

”آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ یوسف ہمارا غلام ہے۔ وہ ہمارے خلاف زبان نہیں کھولے گا۔“

”اس نے تو اب بھی ہمارے خلاف زبان نہیں کھولی ہے مگر اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ان مصری عورتوں سے بلا کر پوچھا

جائے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ مجھے ڈر ہے وہ اپنی جان بچانے کے لیے تمہارا نام نہ لے وس۔“
 ”آپ اس کی بھی فکر نہ کریں۔ وہ سب میرے کہنے سے باہر نہیں ہیں۔ میں انہیں سمجھا دوں گی۔ وہ ہرگز میرا نام درمیان میں نہ آنے دیں گی۔“

”تمہیں جو کچھ کرنا ہے، آج ہی آج کر لو۔“

زلیخا نے اسی وقت سواری منگوائی اور ان عورتوں میں سے ایک ایک کے پاس جا کر سمجھا دیا کہ انہیں کیا کہنا ہے۔
 ”تم کہہ دینا کہ یوسف نے تمہیں درغلانے کی کوشش کی تھی اور خیردار یہ ذکر نہ آنے کے میں اس کے لیے بے قابو تھی۔“
 وہ عزیز مصر کی بیوی تھی۔ بادشاہ کے بعد اس کے شوہر ہی کا نام آتا تھا۔ یہ عورتیں اس سے دشمنی مول نہیں لے سکتی تھیں۔ انہوں نے وعدہ کر لیا کہ جو اس نے کہا ہے وہی کہیں گی۔

زلیخا نے گھر آ کر ان عورتوں کے نام اپنے شوہر کو بتا دیے جو اس نے بادشاہ تک پہنچا دیے۔ بادشاہ نے ان عورتوں کو پیغام بھجوادیا کہ وہ کل اس قید خانے میں پہنچ جائیں جہاں یوسف قید ہے۔
 حضرت یوسف علیہ السلام نے چونکہ اس وقت تک زنداں سے باہر آنے سے انکار کر دیا تھا جب تک کہ تحقیق نہیں ہو جاتی اور بادشاہ چاہتا تھا معاملے کی تحقیق یوسف کے سامنے ہو۔

زلیخا اس رات بہت بے چین رہی۔ اس کا ضمیر بار بار اسے ملامت کر رہا تھا کہ ایک بے قصور کو میں نے پہلے زنداں میں ڈلوایا اور اب اس کے خلاف گواہی دینے کے لیے عورتوں کو تیار کر لیا ہے۔ تقریباً آٹھ یا نو سال بعد جب اچانک حضرت یوسف علیہ السلام کا نام اس کے سامنے آیا تو عشق کی دبی ہوئی چنگاریاں شعلہ بن گئیں۔ بے اختیار جی چاہا کہ یوسف میرے سامنے ہو اور میں اسے دیکھوں اور اگر دنیا کا خیال نہ ہو تو اقرار جرم بھی کروں۔ قصور میرا تھا سزا اے ملی ہے۔ اس نے اپنی جوانی کے کتنے سال زنداں میں گزار دیے۔

زلیخا کو بادشاہ نے نہیں بلوایا تھا لیکن صبح ہونے تک وہ یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ صرف مصری عورتیں ہی زنداں نہیں جائیں گی بلکہ وہ بھی وہاں پہنچے گی۔

یہ عجیب لطیفہ شبی تھا کہ یوسف کو زنداں کی طرف روانہ کرنے والی آج خود زنداں کی طرف جا رہی تھی جہاں اسے یوسف کے سامنے جوابدہ ہونا تھا۔

بادشاہ بذات خود زنداں میں پہنچا اور ان عورتوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے روبرو کر کے ان سے پوچھا۔
 ”صاف صاف اور سچ بتاؤ کہ اس معاملے کی حقیقت کیا ہے جبکہ تم نے یوسف پر ڈورے ڈالے تھے تاکہ تم اس کو اپنی طرف مائل کر لو۔“

ان عورتوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ زلیخا بھی یہاں موجود ہے اور وہی کچھ سننے کی مشتاق ہوگی جو وہ ہمیں سکھا چکی ہے لیکن انہوں نے آپس میں فیصلہ کر لیا کہ وہی کہیں گی جو حقیقت ہے۔ انہوں نے یوسف اور زلیخا کے عشق کی پوری داستان سنانے کے بعد کہا۔

”جب ہمیں معلوم ہوا کہ زلیخا اپنے غلام کو دل دے بیٹھی ہے تو ہمیں یہ بات صریح گمراہی لگی کہ ایک خاندانی عورت اپنے غلام پر فدا ہو گئی ہے۔ ہم نے اسے لعن طعن کی کہ یوسف کے حسن کے قصے سنا کر ہمیں اس کا تمنا ہی کر دیا اور وہ اسے ہمارے سامنے لائی۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارا بھی وہی حال ہوا جو زلیخا کا ہوا تھا۔ ہم نے یوسف کو متاثر کرنے کے لیے اپنے ہاتھ کاٹ لیے لیکن وہ پاکباز تھا۔ اس نے ہماری حوصلہ افزائی نہیں کی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے یوسف میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔“

یہ گواہی دوسروں کی زبانی تھی۔ زلیخا قریب ہی کھڑی تھی۔ اس نے سوچا اگر میں یوسف سے عشق کی دعویٰ دے دوں تو حقیقت آشکار کر دوں تاکہ یوسف بے قصور ثابت ہو۔ میری رسوائی ہوتی ہے تو ہوا کرے۔
 وہ بے اختیار بول اٹھی۔ ”اب حق کھل چکا ہے۔ وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی۔ بے شک وہ بالکل سچا ہے۔“

زلیخا کے اس بیان پر زندان میں سنانا چھا گیا۔ بادشاہ بھی اس طرح خاموش تھا جیسے وہ بولنا بھول گیا ہو۔ عزیز مصر کے ہونٹوں پر بھی خشکی جم گئی تھی۔

قدرت نے یہ اہتمام کر دیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام..... کی عصمت و پاکبازی اور صداقت و طہارت کا معاملہ تہمت لگانے والوں کی زبان ہی سے واضح ہو جائے۔ خود مجرم (ذلیخا) اقرار کر چکی تھی البتہ ایک اندیشہ پھر بھی رہ گیا تھا کہ اس قدر آسامیوں کا قافلہ کہیں حضرت یوسف علیہ السلام نے تو نہیں اٹھالیا۔ اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے اس سناٹے میں حضرت یوسف علیہ السلام کی آواز گونجی۔

”میں نے حقیقت حال جاننے کی خواہش اس لیے نہیں کی تھی کہ میں پاکیزہ سمجھا جاؤں بلکہ اس سے میری غرض یہ تھی کہ عزیز یہ جان لے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی تھی اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں ان کی چالوں کو اللہ کا مہابی سے ہم کنار نہیں کرتا۔ میں کچھ اپنے نفس کی برات نہیں کر رہا ہوں۔ نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے مگر یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو۔ بے شک میرا رب بڑا غفور الرحیم ہے۔“

عزیز مصر نے جس بات کو چھپانے کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کر لیا تھا، وہ حقیقت علی الاعلان ظاہر ہو گئی اور وہ بھی خود اس کی بیوی کی زبانی۔

”میں نے ہی اس کو اپنے نفس کے لیے پھسلا یا تھا اور بلاشبہ وہ سچا ہے۔“ عزیز مصر وہاں زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا۔ فرعون پر جب حقیقت حال مکشف ہوئی تو اس کے قلب میں حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت جا گزری ہو گئی۔ اپنے خواب کی بہترین تعبیر سن کر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عقل و دانش کا متعرف پہلے ہی ہو چکا تھا، اب ان کی دیانت و پاکیزگی دیکھ کر ان پر فریفتہ ہو گیا۔

بادشاہ نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ یوسف کو خوب بنا سنوار کر اور دربار کے لائق بنا کر میرے دربار میں پیش کر دو۔ آپ نے غسل فرمایا۔ زنداں کی میل پچھل صاف ہوئی۔ شاہی پوشاک زیب تن کرائی گئی اور بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

بادشاہ سے بات چیت کا آغاز ہوا تو بادشاہ حیران رہ گیا کہ اب تک جس کے حسن کے چرچے سنے تھے، جس کی امانت داری ملاحظہ کی تھی، وہ عقل و دانش میں بھی اپنی نظیر آپ ہے۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

”بلاشبہ آج کے دن تو ہماری نگاہوں میں بڑا صاحب اقتدار اور امانت دار ہے۔“

بادشاہ نے دریافت کیا۔ ”میرے خواب میں جس نقطہ سالی کا ذکر ہے اس کے متعلق مجھ کو کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ تو کوئی مشورہ دے کہ میں اس پر عمل کروں۔“

”پہلے تو آپ یہ کریں کہ کسی دانشور اور عقلمند آدمی کو تلاش کر کے اسے ملک مصر پر مختار بنائیے۔ اس آدمی کو اختیار ہو کہ وہ ملک میں ناظروں کو مقرر کر دے اور ازرانی کے سات برسوں میں سارے ملک مصر کی پیداوار کا پانچواں حصہ لے لے اور وہ ان اچھے برسوں میں جو آتے ہیں، سب کھانے کی اچھی چیزیں جمع کرے اور شہر شہر میں غلہ جو آپ کے اختیار میں ہو فراہم کر کے اس کی حفاظت کرے۔ یہی غلہ ملک کے لیے ذخیرہ ہوگا اور ساتوں برس کے لیے جب تک ملک میں کال رہے گا، کافی ہوگا تاکہ کال کی وجہ سے ملک برباد نہ ہو جائے۔“

آپ کی ان تجاویز سے فرعون اور اس کے خادموں نے اتفاق کیا۔

”کیا ہم کو ایسا آدمی جیسا ہے جس میں خدا کی روح ہے، مل سکتا ہے؟“ فرعون نے خادموں سے پوچھا پھر وہ حضرت یوسف علیہ السلام سے مخاطب ہوا۔ ”چونکہ خدا نے تجھے یہ سب کچھ سکھادیا ہے اس لیے تیرے مانند دانشور اور عقل مند کوئی نہیں لہذا آج سے تو میرے گھر کا مختار ہوگا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی۔ فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا۔“

عزیز مصر نے اپنی انکشتی اپنے ہاتھ سے نکال کر حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں پہنادی اور انہیں باریک کتان کے لباس میں آراستہ کر دے سونے کا طوق ان کے گلے میں پہنایا اور رتھ میں سوار کرایا۔ دوسرے رتھ میں وہ خود سوار تھا۔ منادی آگے آگے آواز لگا تا جا رہا تھا۔

”کھنکھو۔ ملک مصر کا حامی آتا ہے۔“

اہل کتاب کہتے ہیں اس وقت آپ کی عمر تیس سال تھی اور بادشاہ نے آپ کی شادی ایک بہت عظمت والی عورت سے کرادی تھی۔

توریت میں ہے۔

”لوں کے بھاری فوطیخیر کی آستانہ سے یوسف کے دو بیٹے پیدا ہوئے اور یوسف نے پہلوٹھے کا نام ”مفتی“ کہہ کر رکھا کہ خدا نے میری اور میرے باپ کی سب مشقت مجھ سے بھلا دی اور دوسرے کا ”افرائیم“ یہ کہہ کر رکھا کہ خدا نے مجھے میری مصیبت کے ملک میں پھل دار کیا۔“

ایک قول یہ بھی آتا ہے کہ بادشاہ نے زلیخا کے میاں کے مرنے کے بعد زلیخا کی شادی حضرت یوسف علیہ السلام سے کرادی تھی۔

محمد بن اسحق فرماتے ہیں کہ اس وقت کا بادشاہ ”ریان“ حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا۔ قدرت کا کیسا عطا و کرم ہے کہ کل جس ہستی کو مصر کی متمدن قوم، بدوی و صحرائی بھتیجی تھی اور غلام بھی وہ پہلے ایک سردار کے گھر میں شان و شوکت سے پہنچا دیا گیا۔ پھر قید خانے کی زندگی سے نکلا تو مملکت مصر اور قوم مصر کا مالک و مختار بنادیا اور اس مرتبے پر پہنچا دیا اسباب دنیوی کے لحاظ سے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اسی لیے حق باری تعالیٰ نے فرمایا۔

”اور اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف علیہ السلام کے قدم جمادے کہ جس جگہ سے چاہے حسب مرضی رہنے سہنے کا کام لے۔ ہم جسے چاہتے ہیں اپنی رحمت سے فیض یاب کرتے ہیں اور نیک عملوں کا اجر بھی ضائع نہیں کرتے اور جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور بد عملیوں سے بچتے رہے ان کے لیے آخرت کا اجر تو اس سے کہیں بہتر ہے۔“

حضرت یوسف علیہ السلام نے سلطنت مصر کے عیاری کل ہونے کے بعد خواب سے متعلق وہ تمام تدابیر شروع کر دیں جو چودہ سال کے اندر مفید کار ہو سکیں اور قحط سالی کے ایام آرام سے گزر جائیں۔

کام سنبھالتے ہی انہوں نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے سارے ملک مصر کا دورہ کیا۔ یہ ارزانی کا دور تھا۔ خواب کی تعبیر کے مطابق سات برس تک اس خوش حالی کو رہنا تھا۔ افراط سے فصل ہو رہی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے سات برس تک وہ تمام کھانے کی چیزیں جو سرزمین مصر میں تھیں، جمع کر کے شہروں میں ذخیرہ کرتے رہے۔ ہر شہر کی غذائی اجناس اسی شہر میں ذخیرہ کیں۔ غلہ سمندر کی ریت کی طرح ذخیرہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ حساب رکھنا بھی چھوڑ دیا کیونکہ وہ بے حساب تھا۔

سات سال ان انتظامات میں گزر گئے تو خوش حالی کا دور رخصت ہوا، قحط سالی کا آغاز ہوا۔ جب اجناس کی قلت ہوئی اور لوگ بھوکوں مرنے لگے تو روٹی کے لیے فرعون کے آگے چلائے۔ فرعون نے مصریوں سے کہا کہ یوسف کے پاس جاؤ۔ جو کچھ وہ تم سے کہے وہ کرو۔ یہ لوگ روتے بکلتے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ذخیروں کے منہ کھول دیے اور مصریوں کے ہاتھ پہنچے۔ تمام ملکوں میں قحط پڑا ہوا تھا۔ ٹھیکیاں سوکھ گئی تھیں۔ خلق خدا دانے دانے کو محتاج ہو رہی تھی۔

جب دوسرے ملکوں کے لوگوں نے سنا کہ مصر میں اناج کی بہتات ہے۔ جو بھی قیمت ادا کرے خرید سکتا ہے تو دوسرے ملکوں سے لوگ اناج خریدنے آنے لگے اور ادنانوں پر لاؤ کر لے جانے لگے۔

☆☆☆

کنعان کے آسمان پر آج چاند نہیں چمکا تھا۔ تیل کی کمی نے چراغ خانہ کو بھی سرشام ہی بجھا دیا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ اس سوال نے سب کو پریشان کر دیا تھا۔ حضرت یعقوب نبی تھے اور تمام بستی والوں کے محافظ و نگراں بھی۔ انہیں صرف اپنی بستی بستی کے لوگوں کی بھی فکر تھی۔ اس وقت بھی وہ اب کیا ہوگا؟ کے سوال کے جواب تلاش کرنے میں غلطاں تھے۔ بستی کے کچھ لوگ ابھی ابھی ان کے پاس سے اٹھ کر گئے تھے اور اب ان کے سامنے ان کے گیارہ بیٹے بیٹھے تھے اور کسی حکم کے سننے کے منتظر تھے۔

”ابھی تمہارے آنے سے قبل بستی کے کچھ لوگ میرے پاس سے اٹھ کر گئے ہیں۔“ حضرت یعقوب نے بیٹوں کو مخاطب کیا۔ ”ان سب کا برا حال ہے۔ گھروں میں کھانے کے لیے بہت کم رہ گیا ہے۔ وہ مجھ سے مدد کے طالب تھے۔ میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے۔“

”آپ نے کیوں وعدہ کر لیا۔ ہمارے کھیت تو خود ہمارے سامنے مٹھیاں باندھے کھڑے ہیں۔ ہم کسی کو کیا دیں گے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ سخت کال نے روئے زمین کا منڈ ڈھانپ لیا ہے۔ ہر ملک میں قحط پاؤں جمائے کھڑا ہے۔“

”میں نے جوان سے وعدہ کیا ہے کسی وجہ سے کیا ہے۔ ایک تدبیر ہے میرے سامنے۔“
 ”آپ کی تدبیریں ہماری سمجھ میں تو آتی نہیں ہیں۔ پھر بھی ہمیں معلوم تو ہو آپ نے کیا سوچا ہے۔ اب یہ مت کہہ دیجئے گا کہ ہم آسمان پر جائیں اور بارش برسانے کا کوئی انتظام کریں۔“
 ”تمہاری انہی گستاخوں نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ میری ہڈیاں اکڑ گئی ہیں ورنہ میں خود کچھ نہ کچھ کر لیتا۔ یا آج میرا یوسف ہوتا اور یقیناً جوان ہو چکا ہوتا تو وہ مجھے ہرگز ایسا جواب نہ دیتا۔“
 ”یوسف کا تو ب نام و نشان بھی باقی نہیں رہا اور آپ ہیں کس اسی کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ ہماری کوئی اہمیت ہی نہیں۔“
 ”کیوں نہ یاد کروں۔ وہ میری آنکھوں کی روشنی تھا۔ دیکھتے نہیں کہ وہ گیا تو اس کے ساتھ میری آنکھیں بھی چلی گئیں۔ جب دیکھتے کو وہ نہیں تو میں کیوں کسی کو دیکھوں۔“
 حضرت یوسف علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد روتے رہتا ہی حضرت یعقوبؑ کا شعار بن گیا تھا۔ روتے روتے پٹائی چلی گئی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا نام آتا تھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔ اس وقت بھی حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر آگیا تو آپ کا دل بھر آیا۔ جو گفتگو کر رہے تھے درمیان میں رو گئی۔
 تمام بھائی ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔
 پھر ایک نے دوسرے سے کہا۔ ”ابا جان کیا کہنے والے تھے معلوم تو ہو۔“
 ”اب وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ انہیں یوسف یاد آ گیا ہے۔“
 ”معلوم تو کرو شاید ہمارے فائدے کی بات ہو۔“
 ان میں سے ایک نے اہمیت کی۔
 ”ابا جان! آپ وہ بات بتا رہے تھے جو ہمیں نہیں معلوم۔“
 ”کیا تم نہیں جانتے کہ ہمیں قحط کا سامنا ہے؟“
 ”ہمیں معلوم ہے لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟“
 ”میں نے سنا ہے کہ مصر میں غلہ افراط سے مل رہا ہے۔ تم سب مل کر وہاں جاؤ اور ہمارے لیے غلہ لے کر آؤ تاکہ ہم زندہ رہیں ہلاک نہ ہو جائیں۔“

”یہ کیا ضمانت ہے کہ جب تک ہم مصر پہنچیں گے غلہ موجود ہوگا؟“
 ”تم جاؤ تو سہی۔ اللہ نے مدد کی تو غلہ وہاں بہت ہے۔“
 باپ کے حکم کے مطابق یہ کنعانی قافلہ عزیز مصر سے غلہ لینے کے لیے مصر روانہ ہوا۔ سب سے چھوٹا بھائی بن یامین اس قافلے میں شامل نہیں تھا۔ حضرت یعقوبؑ نے اسے اپنے پاس روک لیا تھا کہ سب کے چلے جانے کے بعد کوئی تو ان کی دیکھ بھال کے لیے ان کے پاس ہو۔

اس چھوٹے سے کنعانی قافلے نے مصر کی حدود میں قدم رکھا تو انہوں نے اپنی طرح کے کئی اور قافلے بھی دیکھے جو اناج خریدنے آئے تھے۔ انہیں امید ہو چلی کہ اناج وافر مقدار میں ہے۔ انہیں مایوسی نہیں ہوگی۔
 وہ ایک بڑے میدان میں پہنچ گئے جہاں غلہ تقسیم کیا جا رہا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام ایک جگہ مرصع کرسی پر بیٹھے پورے کام کی نگرانی فرما رہے تھے۔

مصر کے دستور کے مطابق جو قافلہ وہاں پہنچتا تھا، اس میں شامل لوگ سرزمین پر ٹیک کر حضرت یوسفؑ کے حضور آداب بجالاتے تھے اور جب وہ اجازت دیتے تھے تو کارندے ان کے ہاتھ اناج فروخت کرتے تھے۔
 خدا کی قدرت دیکھیے کہ برادران یوسفؑ اسی بھائی کے آگے سجدہ کرنے کے لیے اپنی باری کا انتقاد کر رہے تھے جسے وہ اپنی دانست میں کسی مصری گھرانے کا معمولی غلام بنا چکے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کل کا غلام آج مصر کے تاج و تخت کا مالک و مختار کل ہے اور اسی کے سامنے عرض حال کرنا ہے۔

وہ سب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے پہنچے اور سرزمین پر ٹیک کر آداب بجالائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا لیکن وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو نہ پہچان سکے۔ پہچانتے بھی کیسے۔ وہ جب کنعان میں تھے تو عمر

لڑکے تھے اور اب چالیس سالہ تجربہ کار انسان۔ ناک نقشہ بدل چکا تھا۔ بول چال کا انداز جدا ہو گیا تھا اور پھر یہ شائبہ بھی دھوکا تھا کہ تخت شاہی پر بیٹھنے والا یوسف ہو سکتا ہے۔

”وہ جب یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے فوراً ان کو پہچان لیا اور وہ یوسف کو نہ پہچان سکے۔“ (سورۃ یوسف)
حضرت یوسف علیہ السلام ابھی اپنی شناخت کرانا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے ڈانٹ کر ان سے پوچھا۔
”تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“

”ہر لوگ کھانا سے آئے ہیں۔ ہمارے ملک میں قحط ہے۔ ہمیں اناج کی کشت یہاں کھینچ لائی ہے۔“
”تم لوگ جھوٹ بولتے ہو۔ دراصل تم جاسوس ہو اور اس ملک کی بری حالت دریافت کرنے آئے ہو۔“
”نہیں خداوند! تیرے غلام اناج مول لینے آئے ہیں۔ ہم سب ایک ہی شخص کے بیٹے ہیں اور جاسوس نہیں۔“
”تم کتنے بھائی ہو۔ جس شخص کے تم بیٹے ہو اس کے کتنے بیٹے ہیں؟“
”تیرے غلام بارہ بھائی تھے۔“

”مگر تم تو دس ہو۔“
”ایک بھائی گھر پر رہ گیا ہے۔“
”پھر بھی گیارہ ہوئے۔“

”ایک بھائی بچپن ہی میں غائب ہو گیا جو آج تک نہیں ملا۔“
”مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم نے اسے قتل کر کے کہیں پھینک دیا تھا۔“
”بھلا ہم کیوں ایسا کریں گے جبکہ وہ ہمارا بھائی تھا۔ ہمارے باپ کی آنکھوں کا تار تھا۔“
”شاید تم ہی سچے ہو مگر میں کہہ چکا کہ تم جاسوس ہو۔“
”اب ہم آپ کو کیسے یقین دلائیں۔“

”تمہاری آزمائش اس طرح کی جائے گی کہ فرعون کی قسم تم اس وقت تک یہاں سے جانیں پاؤ گے جب تک تمہارا سب سے چھوٹا بھائی یہاں نہ آجائے اور میں اسے دیکھ نہ لوں۔“
”یہ کس طرح ممکن ہے جبکہ وہ بھائی ہمارے ساتھ آیا ہی نہیں۔“
”تمہارے اس بھائی کا نام کیا ہے؟“
”اس کا نام بن یا مین ہے۔“

اب حضرت یوسف علیہ السلام کو پوری طرح یقین ہو گیا کہ انہوں نے اپنے بھائیوں کو صحیح پہچانا ہے۔ یہ وہی ہیں۔ ایک ایک بھائی کو غور سے دیکھتے تھے اور دل ہی دل میں ایک ایک کا نام دہراتے تھے۔ پھر آپ نے انہیں اپنے پاس روک لیا۔
”تم اپنے میں سے ایک کو بھیجو اور اپنے چھوٹے بھائی کو بلا لو تا کہ تصدیق ہو کہ تم سچے ہو اور نہ فرعون کی قسم تم جاسوس ہو۔“
حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں قید میں رکھا اور کرید کرید کے گھر کی باتیں پوچھتے رہے۔
”اچھا یہ بتاؤ تمہارے والد کی حالت کیسی ہے؟“

”وہ غائب ہو جانے والے بیٹے سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب وہ غائب ہو گیا اور گھر نہیں پہنچا تو اس وقت سے اب تک اسے یاد کر کے برابر روتے رہتے ہیں۔ ہر وقت کے رونے سے ان کی بینائی زائل ہو گئی ہے۔“
”تمہارا بھائی غائب کیسے ہو گیا تھا؟“

”وہ اکیلا جنگل میں نکل گیا تھا۔ کوئی کہتا ہے اسے بھیڑ یا اٹھا کر لے گیا۔ کوئی کہتا ہے مصر آنے والے قافلے کے ہاتھ لگ گیا اور انہوں نے یہاں لا کر غلام بنایا اور بیچ دیا۔ خدا کرے اسے بھیڑ یا نہ لے گیا ہو۔ زندہ ہو چاہے غلام ہی کیوں نہ ہو۔“
”اگر وہ تمہیں مل جائے تو تمہاری کیا حالت ہوگی؟“

”ہم اپنی آنکھیں اس کے قدموں میں رکھ دیں گے۔ اس سے معافی مانگیں کہ ہم اس کی حفاظت نہ کر سکے۔“
حضرت یوسفؑ جانتے تھے کہ ان کے بھائی ان کے بارے میں جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ بااختیار بھی تھے لیکن کوئی سزا نہیں دی ان کے جھوٹ پر گرفت نہیں کی۔

حضرت یوسفؑ کے خواب کا ایک جز پورا ہو چکا تھا۔ ان کے بھائی انہیں تقطی سجدہ کر چکے تھے۔ تعبیر کے مطابق عظمہ

وزیرگی ان کے نصیب میں آ چکی تھی۔ اب شمس و قمر باقی تھے جو دراصل ان کے ماں باپ تھے۔ ان سے ملاقات ہاتی تھی۔ ان کی سنگی ماں تو دنیا میں نہیں تھیں لیکن سوتیلی ماں تو تھیں جنہیں ابھی مصر آ تھا۔

جب تین دن گزر گئے تو حضرت یوسفؑ کو اپنے بھائیوں پر رحم آیا۔ یہ خیال بھی آیا کہ یہ لوگ انا ج لینے آئے تھے۔ نہ جانے گھر میں کچھ کھانے کو ہے یا نہیں۔ انہیں جلد سے جلد اناج دے کر رخصت کیا جائے تاکہ گھر کا چولہا جلے۔ میرے والد کس شدت سے ان کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ بھائی ان کے اختیار میں تھے ان سے بدلہ لیتے یا کم از کم احسان تو جتا ہی دیتے لیکن وہ تو کریم ابن کریم ابن کریم تھے۔

حضرت یوسفؑ نے حکم کیا کہ ان کے بوروں میں ان کے حسب مرضی غلہ بھر دیں۔ حضرت یوسفؑ کے ملازموں نے ان کے بوروں میں غلہ بھر دیا۔

جب ملازم غلہ بھر رہے تھے تو حضرت یوسفؑ نے ان سے کہا کہ ان کے بوروں میں وہ پونجی (رقم) بھی رکھ دو جو انہوں نے قیمت کے طور پر ادا کی ہے۔ کیا جب کہ یہ رقم دیکھ کر وہ دوبارہ چلے آئیں۔ ہو سکتا ہے دوبارہ ضرورت پڑے اور رقم نہ ہونے کے سبب نہ آ سکیں۔

جب بھائی رخصت ہونے لگے تو حضرت یوسفؑ نے انہیں روک لیا۔ ”خدا اس قدر رحمت ہے کہ تمہیں دوبارہ آنا پڑے گا۔ اس لیے یاد رکھو کہ اب کی مرتبہ اگر تم اپنے چھوٹے بھائی بن یا مین کو ساتھ نہ لائے جس کے متعلق تم نے مجھ سے کہا ہے کہ اس کا بھائی تم ہو گیا ہے اور اس لیے تمہارا باپ اس کو کسی طرح جدا نہیں کرتا تو تم کو ہرگز غلہ نہیں ملے گا نہ میں تمہیں اپنے پاس جگہ دوں گا۔“

اور جب یوسف (علیہ السلام) نے ان کا سامان مہیا کر دیا تو کہا اب کے آنا تو اپنے سوتیلے بھائی بن یا مین کو بھی ساتھ لانا۔ تم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ میں تمہیں پوری تول دیتا ہوں اور باہر سے آنے والوں کے لیے بہتر مہمان نواز ہوں لیکن اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو پھر یاد رکھو نہ تو تمہارے لیے میرے پاس خرید و فروخت ہوگی نہ تم میرے پاس جگہ پاؤ گے۔“ (سورۃ یوسف)

بھائیوں کو کچھ خبر نہیں تھی کہ ان کے بوروں میں ان کی رقم جو انہوں نے قیمت کے طور پر ادا کی تھی، رکھ دی گئی ہے۔ انہوں نے خوش خوشی بوروں کو اونٹوں پر لادوا اور اپنے ملک کنعان کی طرف چل دیے۔ وہ راستے بھر حاکم مصر کی باتیں کرتے رہے جسے وہ پہچان نہ سکے تھے، جسے انہوں نے سخت بھی پایا تھا اور نرم بھی۔

واپسی میں جب وہ اس کنوئیں کے پاس سے گزرے جہاں انہوں نے حضرت یوسفؑ کو ڈال دیا تھا تو کچھ دیر کے لیے رک گئے۔ وہ کئی مرتبہ یہاں سے گزرے تھے۔ انہیں خیال بھی نہیں آیا تھا لیکن اس وقت آ گیا۔

”اچھا ہوا ہم نے حاکم مصر کو یہ نہیں بتا دیا کہ بن یا مین کے بھائی کو فلاں کنوئیں میں پھینک دیا گیا تھا ورنہ وہ تو عجیب آ دی ہے۔ یہاں تک تحقیق کرنے آ جاتا۔“ راوین نے کہا۔

”ہم نے تو سنی سنی بات کہہ دی کہ لوگ یہ کہتے ہیں۔“ شمعون بولا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اسے ہماری ذات میں اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی تھی؟“ زبولون نے پوچھا۔

”اس لیے کہ وہ ہمیں جاسوس سمجھ رہا تھا۔“ لادی نے کہا۔

”یہ مصروالے ہم کنعانیوں کو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔“ ولسیا کرنے منہ بنا کر کہا۔

”اس سے تو اچھا ہے ہم دوبارہ نہ جائیں۔ وہ اب کے کچھ اور نہ سمجھ لے۔“ شمعون پھر بولا۔

”اگر قحط ختم نہ ہوا تو جانا تو پڑے گا۔“

”اس نے یہ بھی تو کہہ دیا ہے کہ اب کے آؤ تو بن یا مین کو ساتھ لانا۔“

”یہ تو اور بھی مصیبت ہو گئی۔ ابا جان اسے ہمارے ساتھ جانے دیں گے؟ نہ جانے دیا تو ہم تو غلہ لا چکے۔“

”ابھی تو گھر چلو۔ دیکھا جائے گا جو ہونا ہوگا ہو جائے گا۔“

گھر بھی قریب آ گیا تھا لہذا انہیں خاموش ہونا پڑا۔

گھر جاتے ہی وہ حضرت یعقوبؑ کی خدمت میں پہنچ گئے اور جو کچھ مصر میں ان پر گزری تھی ایک ہی سانس میں سنا دی۔

”مصر کے والی نے اس مرتبہ تو ہمیں اناج دے دیا ہے لیکن دوبارہ نہیں مل سکے گا۔“

”کیوں، کیا وہاں بھی اناج ختم ہو گیا؟“

”ختم نہیں ہو گیا بلکہ اس نے ایک عجیب شرط عائد کر دی ہے۔ اس نے کہا ہے اس وقت تک یہاں نہ آنا جب تک اپنے بھائی بن یامین کو اپنے ساتھ نہ لاؤ۔ ہمیں معلوم ہے آپ اسے ہمارے ساتھ نہیں آنے دیں گے اس لیے غلہ بھی دوبارہ نہیں آسکا۔“

”جنہیں خدا سمجھے۔ تم نے یہ کیوں بتا دیا کہ تم ایک بھائی کو گھر پر چھوڑ کر آئے ہو۔ تم بتاتے اور نہ وہ یہ شرط عائد کرتا۔“

”ہم نے کب بتایا۔ اس نے جب ہمیں ایک ساتھ دیکھ کر جاسوس سمجھا تو اپنی جان چھڑانے کے لیے ہم نے اس سے کہا کہ ہم بارہ بھائی ہیں۔ ایک گم ہو گیا ایک گھر پر ہے۔ ہم کیا جانتے تھے کہ وہ کہے گا کہ اپنے بھائی کو لے آؤ۔“

”پھر بھی میں بن یامین کو تمہارے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔“

”آپ اس کو ہمارے ساتھ کر دیں۔ ہم اس کے ہر طرح نگہبان اور محافظ ہیں۔“

”اسی طرح نگہبان ہو گے جیسے یوسف کے وقت میں ہوئے تھے؟ اس وقت بھی تم یہی کہہ کر گئے تھے اور اس کی ممانعت نہیں کر سکے تھے۔ تمہاری حفاظت ہی کیا۔“

اس وقت ان بھائیوں نے بحث کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور اپنے اپنے بوروں سے اناج نکالنے لگے کہ اسے محفوظ کر لیا جائے۔ ایک بھائی نے بور اکھولا۔ دیکھا کہ اس میں وہ نقدی رکھی ہوئی ہے جو اس نے ادا کی تھی۔ وہ چیخا اور دوسرے بھائیوں کو بلا کر دوسرے نے بور اکھولا تو اس کی نقدی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اسی طرح تمام بھائیوں کے بوروں سے نقدی نکلی۔

”ہمیں اور کیا چاہیے۔ غلہ بھی مل گیا، نقدی بھی واپس آگئی۔“

”عجیب حاکم تھا۔ شاید ہمیں مسکین سمجھا ہو۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے، اس کے ملازموں نے غلطی سے یہ رقم واپس کر دی ہو۔“

”یوسفؑ نے اپنے غلاموں کو اشارہ کیا کہ ان لوگوں نے غلے کے عوض جو مال دیا ہے، وہ چپکے سے ان کے سامان میں لگا دو۔“ (سورۃ یوسف)

بعض حضرات فرماتے ہیں، اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ اس قیمت کو واپس جا کر اپنے ہی غلوں میں دیکھیں گے تو واپس دینے کے لیے مصراۓں گے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ خیال فرمایا تھا کہ شاید ان کے پاس دوبارہ واپس آنے کے لیے نہ ہوں تو یہ پیسے انہیں دے دو تا کہ دوبارہ آنے میں انہیں مدد ملے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بُرا لگا ہو گا کہ بھائیوں سے غلے کے پیسے لیں۔ غرض یہ کہ جب غلے سے رقم نکلی تو وہ بھگے ہوئے باپ کے پاس گئے اور شد و مد سے اصرار کرنے لگے۔

”ہمیں اور کیا چاہیے۔ ہمیں اناج بھی مل گیا اور پیسے بھی۔ ہم واپس جائیں گے اور مزید اناج لے کر آئیں گے کیونکہ یہ اناج کم ہے لیکن اس مرتبہ بن یامین کو لے جانا ضروری ہے۔ اس کے حصے کا غلہ بھی خریدنا ہوگا۔“

”تم نے مجھے بے اولاد کر دیا۔ میرا یوسف نہیں رہا اور اب تم بن یامین کو لے جانے کی ضد کر رہے ہو۔ یہ سب باتیں میرے خلاف ہیں۔ میں ہر گز اسے تمہارے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔“

راوی بن سامنے آیا اور اس نے عہد کیا۔

”اگر میں اسے آپ کے پاس نہ لے آؤں تو میرے دونوں بیٹوں کو قتل کر دینا۔ اسے میرے حوالے کر دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے واپس لا کر آپ کے حوالے کر دوں گا۔“

”نہیں، ہرگز نہیں۔ میرا بیٹا تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ اس کا بھائی مر گیا، اب وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ اگر راستے میں ہاتے جاتے اس پر کوئی آفت آ پڑے تو تم میرے سفید بالوں کو تم کے ساتھ گور میں اتار دو گے۔“

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن۔ قصص الانبیاء۔ توریت۔ پہلے نبی سے آخری نبی تک

ذو حان فوراً ہی مطلب کی بات کی طرف آ گیا۔ ”دکس قسم کی بلیاں تمہیں؟“

”عام سی سیاہ رنگ کی بلیاں۔“ ٹھیکہ نے جواب دیا۔ ”یہ بات جاننے کے لیے کروہ ایک مالدار خاتون ہیں، میں نے ان سے ہنگامی خریدنے پر اصرار کیا لیکن انہوں نے بتایا کہ انہیں سیاہ رنگ کی عام سی بلی چاہیے، بالکل ویسی ہی جیسی فرزانہ نے خریدی تھی۔“

”ریحانہ خاتون نے آخری بلی تم سے کب خریدی تھی؟“ ذو حان نے سوال کیا۔

”اب سے ایک مہینہ پہلے۔“ ٹھیکہ نے جواب دیا۔ ”اس کے بعد سے ان کا کوئی فون نہیں آیا، میں نے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن دوسری طرف سے کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ دونوں بہنیں پر اسرار طور پر غائب ہیں۔“

”اس کے علاوہ تم نے کیا عجیب بات محسوس کی؟“ ذو حان کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

”بڑی عجیب سی بات ہے!“ ٹھیکہ سوچتی ہوئی گویا ہوئی۔ ”نہ صرف ریحانہ خاتون نے اپنی بہن کو بلیوں کے متعلق کچھ بتانے سے منع کیا بلکہ مجھے تاکید کی کہ میں اس بات کا کسی سے بھی ذکر نہ کروں۔“

”اب میں یہ کیس لینے کے لیے تیار ہوں، مس ٹھیکہ!“ ... ذو حان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ ”تمہاری آخری بات نے کیس میں جان ڈال دی ہے۔“ ذو حان سرگرمیت کا کش لے کر بڑبڑایا۔

”ریحانہ خاتون نے آٹھ بلیاں خریدیں اور تمہیں یہ تاکید کی کہ اس بات کا اس کی بہن سے ذکر نہ کیا جائے

حالانکہ آٹھ بلیوں کو کسی صورت میں بھی چھپا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ تم اگر مناسب سمجھو تو ہم دونوں اسی وقت ریحانہ خاتون کے بنگلے پر چلتے ہیں۔“ ذو حان نے گفتگو آگے بڑھائی۔ ”تم میرا تعارف ایک گاہک کے طور پر کرنا جو ایک سیاہ بلی خریدنا چاہتا ہے اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت دینے کے لیے تیار ہے۔“

”ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔“ ٹھیکہ مطمئن نظر آنے لگی۔

”میں ریحانہ خاتون سے کہہ دوں گی، اگر آپ بلی فروخت کرنا چاہتی ہیں تو ایک بلی ان صاحب کو دے دیں، میں جلد ہی آپ کے لیے دوسری بلی کا انتظام کر دوں گی۔

وہیے بھی ریحانہ خاتون سے ملنے کے لیے یہ نہایت مناسب وقت ہے۔ فرزانہ اس وقت چھل قدمی کے لیے باہر جالی

وجہ یہ ہے کہ اس خاتون کو اتنی بلیاں خریدنے کی کیا ضرورت پیش آ سکتی تھی جبکہ میری معلومات کے مطابق وہ بلیوں سے شدید نفرت کرتی ہے۔“

”یہ بات تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟“ ذو حان قدرے سنجیدہ ہو گیا۔

”یہ بات ریحانہ خاتون کی سگی بہن فرزانہ نے مجھے بتائی تھی۔ فرزانہ کافی عرصہ پہلے مجھ سے ایک سیاہ بلی خرید کر لے گئی تھی، اس شرط پر کہ اگر ان کی بہن نے اس بلی کو گھر میں رکھنے کی اجازت دے دی تو وہ رکھ لے گی ورنہ مجھے بلی واپس کر کے اپنی رقم واپس لے جانے کی۔“

”اوہ!“ ذو حان دلچسپی محسوس کرنے لگا۔ ”مزید کوئی معلومات.....؟“

”ریحانہ خاتون ایک مالدار بیوہ ہیں۔“ دوسری طرف سے ٹھیکہ نے جواب دیا۔ ”پچھلے کئی سالوں سے وہ شدید بیمار ہیں۔ ان کا اپنی ایک بہن کے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔“

”کیا فرزانہ بھی لپتا ہے؟“ ذو حان نے سوال کیا۔

”اگر وہ دونوں بہنیں لپتا ہیں تو میرا خیال ہے کہ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ علاج کی فرض سے کسی اسپتال میں شفٹ ہوئی ہوں۔“

”ریحانہ خاتون ایک مالدار بیوہ ہیں۔“ ٹھیکہ نے اپنی پریشانی کی اصل وجہ بتائی۔ ”وہ اپنی سگی بہن فرزانہ پر بھی شک کرتی تھیں۔ یہ بات انہوں نے ٹیلی فون پر مجھے بتائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ فرزانہ انہیں قتل کر کے ان کی دولت پر قبضہ کرنا چاہتی ہے جو شاید وہ اپنے بستر کے نیچے رکھتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہیں بینک پر بھی بھروسہ نہیں تھا۔“

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“ انوسٹی گٹر پولیس ذو حان کے کان کھڑے ہو گئے۔ ”کیا تمہارے خیال میں فرزانہ اپنی بہن کو قتل کر کے اس کی ساری دولت لے کر فرار ہو گئی ہے؟“

”کیا یہ آپ کے خیال میں ناممکن ہے؟“ ٹھیکہ نے

الٹا سوال کر دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ ذو حان لا جواب ہو گیا۔ ”میں

تمہاری شاپ پر پہنچ رہا ہوں۔“ پھر مزید کہا۔

”تمہارے نام سے میرا خیال تھا کہ تم ایک عام سی کوئی خاتون ہو گی لیکن تم تو نہ صرف جوان بلکہ خوب صورت..... اور حسین بھی ہو۔“

”شکریہ۔“ ٹھیکہ جھینپ گئی۔

”ریحانہ خاتون نے تم سے آٹھ بلیاں خریدیں۔“

ہے۔۔۔۔۔“ ٹکیلے نے جلدی جلدی اپنی شاپ بند کی اور ذوحان کی اسپورٹ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ صرف پانچ منٹ بعد وہ دونوں ریحانہ خاتون کے ہنگلے پر تھے۔

”دودھ کی یہ بوتلیں!“ ذوحان کی نگاہ دروازے پر رکھی ہوئی دودھ کی بوتلیوں پر پڑی اور اس کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں نمودار ہو گئیں۔ ”یہ ایک خطرناک بات ہے۔۔۔۔۔“

”کیا مطلب؟“ ٹکیلے پریشان ہو کر ذوحان کی طرف دیکھنے لگی۔

”مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص اپنا گھر چھوڑ کر کہیں جاتا ہے تو دودھ سپلائی کرنے والے کو منع کر دیتا ہے کہ اس کے جانے کے بعد دودھ فراہم نہ کیا جائے۔“ ذوحان نے وضاحت کی۔ ”دودھ کی بوتلیوں کی یہاں موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ دودھ فراہم کرنے والے شخص کو اس گھر کے کمینوں کے کہیں جانے کی ہتھکڑی لگائی نہیں ہے۔“

”دروازہ بھی بند ہے۔“ ٹکیلے مزید پریشان نظر آنے لگی۔

”تم نے بتایا تھا کہ جب فرزانہ باہر جاتی ہے تو دروازہ بند نہیں کرتی یعنی لاک نہیں لگاتی۔“ ذوحان نے گفتگو آگے بڑھائی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ فرزانہ گھر کے اندر ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ ٹکیلے نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ڈور بیل کا تین دبا یا لیکن اندر کھنٹی بجتی رہی اور اس کا کوئی رد عمل نہیں ہوا۔

”شاید ریحانہ خاتون کے پڑوس سے کچھ پتا چل سکے۔“ ٹکیلے نے مشورہ دیا۔ ذوحان نے پڑوسی کے دروازے پر دستک دی جس کے جواب میں فوراً ہی ایک صحت مند عورت دروازے پر نمودار ہوئی۔

”فرمائیے؟“ عورت پوچھی۔

”آپ کے شوہر گھر پر ہیں؟“ ذوحان نے سوال کیا۔ ”لیاقت اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔“ عورت نے ذوحان کے سوال کے جواب میں کہا۔ ”وہ رات کو دیر سے گھر آتے ہیں، مگر آپ کو ان سے کیا کام ہے؟“ عورت پریشان نظر آنے لگی۔

”دراصل میں آپ کے پڑوس کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ ذوحان نے وضاحت کی۔ ”فرزانہ شاید گھر پر نہیں ہے اور دروازہ لاک ہے۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آ رہا۔۔۔۔۔“

”اوہ۔“ عورت خود بھی پریشان نظر آنے لگی۔ ”مگر ریحانہ خاتون کو جواب دینا چاہیے۔ وہ تو ہر وقت گھر پر رہتی ہیں۔ چل پھر نہیں سکتیں۔۔۔۔۔“

”تم نے فرزانہ کو آخری مرتبہ کب دیکھا تھا؟“ ذوحان نے سوال کیا۔ وہ آپ سے تم پر آ گیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ دودن گزر گئے ہیں۔“ عورت نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”دودن سے میں نے دونوں بہنوں کو نہیں دیکھا۔۔۔۔۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ دونوں بہنوں سے تمہاری دوستی ہے۔“ ذوحان نے مٹی خیز لہجے میں پوچھا۔ ”تم ریحانہ خاتون سے بھی ملنے جاتی ہو؟“

”ہاں۔“ عورت نے اثبات میں جواب دیا۔ ”میں اکثر ریحانہ کے پاس جاتی رہتی ہوں۔ آخر وہ میری پڑوس ہے۔ اکثر جب ریحانہ کو کوئی کام ہوتا ہے تو وہ مجھے ہی فون کرتی ہے۔ فرزانہ کی غیر حاضری میں دو چار دن پہلے ریحانہ خاتون نے ایک خط پوسٹ کرنے کے لیے مجھے دیا تھا۔ وہ کچھ پریشان بھی تھیں۔“

”وہ خط اب کہاں ہے؟“ ذوحان نے پوچھا۔ ”وہ خط کس کے نام تھا؟“

”وہ خط میں نے پوسٹ کر دیا تھا۔“ عورت۔۔۔۔۔ پریشان نظر آنے لگی پھر مزید کہا۔

”وہ خط ریحانہ کے نواسے فرقان کے نام تھا جو لاہور میں رہتا ہے مگر یہ سب تم کس لیے پوچھ رہے ہو؟ تمہارے سوال و جواب کا انداز تو پولیس والوں جیسا ہے؟“

”میں واقعی پولیس والا ہوں۔“ ذوحان نے اپنا کارڈ نکالا اور عورت کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر جیب میں رکھ لیا۔

”پولیس۔“ عورت خوفزدہ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ”معاملہ کچھ گڑبگڑا لگا ہے۔ ٹھہرو، میں ریحانہ کے ہنگلے کی چابی لے کر آتی ہوں۔۔۔۔۔ ریحانہ نے مجھے یہ چابی خود ہی دی تھی۔ خدا کرے ریحانہ خیریت سے ہو۔“ عورت بڑبڑاتی ہوئی اندر گئی اور ایک چابی لاکر ذوحان کے ہاتھ پر رکھ دی۔۔۔۔۔

ذوحان نے ریحانہ خاتون کے ہنگلے کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ اندر شور کی آواز سن کر خشک گیا۔ ”شاید اندر کوئی ہے۔“ ذوحان آگے بڑھا ہی تھا کہ ریحانہ خاتون کے بیڈروم سے ایک سایہ نمودار ہوا اور ذوحان سے ٹکراتا ہوا دوسرے کمرے میں غائب ہو گیا۔

ذوحان نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ جو کوئی بھی تھا، پھٹکے کے نقشے سے زیادہ واقف تھا۔ ذوحان کی گرفت میں آنے سے پیشتر ہی وہ سایہ چھت کے راستے فرار ہو گیا۔

”ریحانہ اپنے بستر پر نہیں ہیں۔“ ٹھیکہ نے ریحانہ خاتون کے بیڈ روم سے باہر نکلتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں ذوحان کو اطلاع دی۔ ”وہ تو بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتیں، بھلا وہ کہاں جاسکتی ہیں؟“

”اور یہ دوسرا بستر!“ ذوحان نے ایک دوسرے بستر کی طرف اشارہ کیا۔

”اس بستر پر یقیناً دودن سے کوئی نہیں لیٹا اور یہ بستر یقیناً فرزانہ کا ہے۔۔۔۔۔ اور اس بستر کی طرف دیکھو۔“ ذوحان نے ٹھیکہ کی توجہ دوبارہ ریحانہ کے بستر کی طرف دلائی۔ ”اس بستر کا گدا تیز دھار چاقو سے کاٹا گیا ہے نیچے سے۔۔۔۔۔ اپنی بات کہہ کر ذوحان نے مسہری کا گدا پلٹ دیا۔

”بستر کے نیچے فوم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ اس کدے کو کاٹا گیا ہے اور اس ٹکڑے میں بھی سوراخ ہے۔“ ذوحان نے ٹکڑے اٹھا کر چیک کیا۔

”گناہ ہے کہ کسی نے ریحانہ خاتون کی دولت کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے مگر ریحانہ کہاں ہیں؟“ ریحانہ کی موتی پڑون نے تبصرہ کیا۔

ذوحان دونوں عورتوں کو اسی کمرے میں ٹھہرنے کی ہدایت کر کے خود گھر کی تلاشی لینے لگا مگر ناکام رہا۔

”ریحانہ کہاں جاسکتی ہے؟“ ٹھیکہ نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

”زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ریحانہ خاتون کی آٹھ عدد سیاہ بلیاں کہاں غائب ہیں!“ ذوحان عجیب سے لہجے میں بڑبڑایا۔ ”ان بلیوں کو اس وقت گھر کے اندر ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس کمرے میں جو شخص موجود تھا، وہ گھر کی کاشی توڑ کر اندر داخل ہوا۔۔۔۔۔“

”ہوسکتا ہے کہ اس شخص کے اندر داخل ہونے کے بعد بلیاں گھر سے باہر چلی گئی ہوں۔“ ٹھیکہ نے تبصرہ کیا۔ ”مگر وہ سب پالتو بلیاں تھیں، رات گہری ہونے پر سب لوٹ آئیں گی۔“

”تم نے دودن سے دودن بہنوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا لیکن تم نے یہ تو دیکھا ہوگا کہ اس دوران ریحانہ خاتون کے گھر کون آیا تھا۔۔۔۔۔ کسی گاڑی یا رکشے وغیرہ میں؟“ ذوحان نے پولیس والوں کے مخصوص لہجے میں پڑوسی عورت

کو مخاطب کیا۔

”پچھلے دودن کے اندر ریحانہ کے گھر کے باہر کوئی گاڑی آ کر نہیں رکی۔ یہ بات میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں۔۔۔۔۔“ پڑون گہری سوچ میں پڑ گئی۔

”ہوسکتا ہے کہ تمہارے شوہر لیاقت نے کسی کو آتے جاتے دیکھا ہو!“ ذوحان نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”یقیناً لیاقت کے بھی ریحانہ سے اچھے تعلقات ہوں گے۔ مجھ سے بھی زیادہ۔“ عورت نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

”لیاقت اکثر ریحانہ کی خدمت کرتا رہتا تھا۔ باہر کے اکثر کام ریحانہ خاتون لیاقت کے ذریعے ہی کرائی تھیں، کبھی کبھار ریحانہ کی جائداد کا کرایہ بھی لیاقت ہی وصول کر کے لاتا ہے۔ ریحانہ لیاقت پر بہت اعتماد کرتی ہیں۔ کچھ دن پہلے اس کے پھٹکے کے ہاتھ رومر کے تل ٹپکنے لگے تھے، ریحانہ پلبر کے بجائے لیاقت سے ہی اصرار کرتی رہیں کہ وہ نئے تل خرید کر خود ہی تبدیل کر دے۔۔۔۔۔ بے چارہ لیاقت۔۔۔۔۔ کیمیکل فیکٹری سے آنے کے بعد کئی کئی ٹھنوں تک یہاں مصروف رہتا تھا۔“

”اس پھٹکے میں یقیناً چوہے بہت زیادہ ہیں؟“ ذوحان نے اچانک ہی عورت سے ایک عجیب و غریب سوال کیا۔ ”تم اس بارے میں کیا کہتی ہو۔۔۔۔۔؟“

”مجھ سے بھی ریحانہ خاتون نے چوہوں کا تذکرہ نہیں کیا۔“ پڑون پریشان ہو گئی۔ ”میں نے تو یہاں کبھی چوہا نہیں دیکھا۔“

”پھر۔۔۔۔۔ آٹھ بلیاں۔۔۔۔۔ ریحانہ خاتون نے کہاں۔۔۔۔۔؟“ ذوحان کچھ کہتے کہتے اچانک خاموش ہو کر کچھ سننے لگا۔ ”دروازے پر کوئی ہے۔“

ٹھیکہ کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا اور ایک نوجوان کندھے پر سفری بیگ لٹکائے ہوئے اندر داخل ہوا مگر ذوحان اور دونوں عورتوں پر نظر پڑتے ہی خشک گیا۔

”معاف کیجیے گا۔“ نوجوان کے چہرے پر شرمندگی تھی۔ ”شاید میں غلط پھٹکے میں داخل ہو گیا ہوں۔ دراصل میں اپنی نانی کا بنگلا تلاش کر رہا ہوں۔ میں تقریباً پانچ سال بعد لاہور سے ان سے ملاقات کے لیے آیا ہوں۔“

”تم خشک جگہ پہنچے ہو نوجوان!“ ذوحان نے مسکراتے ہوئے نوجوان کا استقبال کیا۔ ”تمہاری نانی کا نام اگر ریحانہ ہے تو یہ ان ہی کا بنگلا ہے۔“

”مگر نانی کہاں ہیں؟“ نوجوان پریشان ہو کر ان

تینوں کی چٹکیں دیکھنے لگا۔

”نی الوقت کچھ نہیں کہا جاسکا۔“ ذوحان نے جواب دیا۔
”تم یہ بتاؤ کہ تم ان کے لیے اتنے پریشاں کیوں ہو، کیا ریحانہ خاتون نے تم سے اپنی کسی پریشانی کا ذکر کیا تھا؟“

”میرا خیال ہے کہ آپ یہ خط پڑھ لیں۔“
نوجوان نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور ذوحان کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ خط مجھے آج ہی ملا تھا۔ خط پڑھتے ہی میں شام کی فلائٹ سے روانہ ہو گیا۔“ اپنی بات مکمل کر کے نوجوان نے ایک بار پھر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ ”سب خیریت تو ہے نا؟“

ذوحان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لفافہ کھول کر خط کا مضمون پڑھنے میں مصروف تھا، لکھا تھا۔ ”ذیر فرقان..... جیتے رہو!“

میں بہت عرصے بعد تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے اس وقت تمہاری شدید ضرورت ہے۔ تم میرے واحد رشتے دار ہو، جس سے میں اپنی پریشانی کا ذکر کر کے مدد کی درخواست کرتی ہوں۔ میں سنگین خطرے میں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنی بوڑھی، بیمار نانی کی فوراً مدد کو آؤ گے۔ میرا یہ خط ملنے ہی کراچی آ جاؤ۔ پلیز فرقان دیر مت کرنا۔ میں تمہارا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں۔ فقط تمہاری نانی، ریحانہ۔“

خط کے آخر میں ریحانہ خاتون کے دستخط موجود تھے۔ خط پر تین دن پہلے کی تاریخ تھی۔ ذوحان نے خط واپس لفافے میں بند کیا اور نوجوان کی طرف بڑھا دیا۔

”مجھے افسوس ہے!“ ذوحان نے دھمی لہجے میں نوجوان سے کہا۔ ”تمہیں یہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ فرقان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”یہ خط مجھے آج دوپہر ہی ملا ہے..... اور میں.....“

”کیا یہ واقعی تمہاری نانی کی تحریر ہے؟“ ذوحان نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کیا۔

”جی ہاں۔“ فرقان نے جواب دیا۔ ”مگر نانی ریحانہ اور نانی فرزانہ کہاں ہیں؟“

”وہ دونوں یہاں سے پرسرا طور پر غائب ہیں۔“

ذوحان نے ہماری لہجے میں جواب دیا۔ ”اور میں ان دونوں بہنوں کی پرسرا کر کشدگی کے مجھے کوئل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر مناسب سمجھو تو، ریحانہ خاتون کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتاؤ۔ تم ان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

حکمت لقمان

حکیم لقمان کسی جنگ کے دوران گرفتار ہو گئے۔ ایک امیر تاجر نے انہیں خرید لیا۔ وہ مکمل وصورت سے سادہ نظر آتے تھے اور سیاہ فام تھے، جبکہ دوسرے غلام خوبصورت اور اچھی شکل وصورت کے مالک تھے۔ وہ ہمیشہ لقمان کا مذاق اڑایا کرتے اور مالک سے ان کی جھوٹی شکایتیں کرتے۔ لقمان خاموشی سے اپنا اور دوسرے غلاموں کا کام بھی کرتے رہتے اور زبان پر شکایت کا ایک لفظ تک بھی نہ لاتے تھے۔ ان کا ظاہر ہی رنگ پیچک سیاہ تھا مگر باطن انتہائی روشن اور چمکنا ہوا۔ وہ دانائی کی ایسی باتیں کرتے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے۔ لقمان کے آقا کے پہلوں کے باغات تھے۔ وہ غلاموں کو پہلی توڑنے کے لیے بھیجتا تو وہ زیادہ پھل خود ہی کھا جاتے تھے۔ ان غلاموں کے آقا کو اس کی خبر ہو گئی مگر ان سب نے مل کر سارا الزام لقمان کے سر تھوپ دیا۔ آقا لقمان سے بلاوجہ ناراض رہنے لگا تھا۔ اسے وقت بے وقت آؤنٹا رہتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر لقمان نے مالک سے کہا۔

”اے آقا! میں نے آج تک امانت میں خیانت نہیں کی۔ ہمیشہ سچ بولا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اللہ بے ایمان شخص کو کبھی نہیں بخشے گا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ ہم سب غلاموں کا امتحان لیں۔ وہ اس طرح کہ سب غلاموں کو پیٹ بھر کر گرم پانی پلائیں۔ آپ خود گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل کی طرف روانہ ہوں اور غلاموں کو حکم دیں کہ وہ گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوڑیں۔ اس طرح سچ اور جھوٹ سامنے آ جائے گا۔“

مالک کو اس غلام کی بات پسند آئی۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ جب تمام غلام آقا کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوڑنے تو سب نے تے کرنا شروع کر دی تھی۔ اس سے جو کچھ جس جس نے کھایا تھا، پیٹ سے باہر آ گیا۔ آقا نے سب غلاموں کو سزا دی اور لقمان سے معافی مانگی۔ صرف لقمان کی تے بالکل صاف تھی اس میں کچھ نہ تھا کیونکہ اس نے تو آقا کے باغات کے پھل کھائے ہی نہ تھے۔

اب آقا نے لقمان پر پورا اعتماد کرنا شروع کر دیا تھا۔ گھر کا سارا انتظام اس کے سپرد کر کے اسے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تھا۔ لقمان اب تمام غلاموں کا سردار تھا۔

سبق: جس طرح ان غلاموں کے آقا نے حکمت و دانائی سے جھوٹ اور سچ کو الگ کر کے دیکھ لیا تھا، وہ مالک حقیقی جب چاہے جس کا چاہے جھوٹ اور سچ کا پتہ کر دے۔

اقتباس حکایات رومی اور سعدی

از ذاکر نقی حسین

”کچھ زیادہ نہیں۔“ فرقان نے پریشان لہجہ میں کہا۔ ”پندرہ سال پہلے، میں میٹرک کی چھٹیاں گزرنے کراچی آیا تھا۔ اس وقت ریحانہ ثانی بالکل ٹھیک تھیں۔ چار، پانچ سال پہلے بھی میں چند دنوں کے لیے ان سے ملنے آیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے محض دو خط لکھے۔ پھر ثانی فرزانہ نے بھی ایک آدھ خط لکھا جس میں ریحانہ ثانی کی بیماری کا بھی ذکر کیا لیکن مجھے نہیں معلوم کہ انہیں بیماری کیا تھی۔ فرزانہ ثانی نے ہی مجھے اپنے خط میں لکھا تھا کہ ان کے پاس کچھ رقم ہے، کتنی رقم؟ اس کا فرزانہ ثانی کو اندازہ نہیں تھا۔ فرزانہ ثانی کو شکوہ تھا کہ ان کی بہن پیسوں کے معاملے میں بے حد کجیوں ہو گئی ہیں اور ان پر شک کرنے لگی ہیں کہ وہ ریحانہ ثانی کی دولت حاصل کرنے کے لیے ان کے گھر آ کر رہ رہی ہیں..... بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔“ فرقان اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہو گیا۔

”اچھا یہ بتاؤ۔“ ذوحان نے کہا۔ ”کیا ریحانہ خاتون کو بلیوں سے شدید نفرت تھی؟“

”ہاں۔“ فرقان پر حیرت کا شدید حملہ ہوا۔ ”لیکن یہ بات تمہیں کیسے معلوم ہوئی؟ ثانی ریحانہ واقعی بلیوں سے بہت نفرت کرتی تھیں جبکہ ان کے مقابلے میں فرزانہ ثانی کو بلیاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے خط میں اس بات کا ذکر کرتی تھیں کہ ریحانہ ثانی ان کی بلی پالنے والی عادت سے شدید نفرت کرتی ہیں۔“

”شکریہ مسز فرقان۔“ ذوحان نے نوجوان کا شکریہ ادا کیا۔ ”اگر تمہارے کوئی اور رشتے دار ہیں تو ان کے گھر ٹھہر جاؤ، ورنہ مناسب ہوگا کہ ہوٹل میں قیام کرو، جیسے ہی ریحانہ خاتون کے بارے میں پتا چلا میں تم سے فوراً رابطہ کروں گا.....“ جواب میں فرقان پریشان سا ہو کر ہنسنے لگا۔

”میرا خیال ہے کہ میں ایک بار پھر اس ہنگامے کو ایک نظر دیکھ لوں۔“ ذوحان نے ٹھیکہ کو مخاطب کیا۔ ”تم بھی میری مدد کرو..... اور کوئی بھی چیز جو تمہیں عجیب و غریب لگے، اسے فوراً میرے علم میں لاؤ۔ اسے ہاتھ مت لگنا۔“

”آل رائٹ سر۔“ ٹھیکہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”تم بھی ہماری مدد کرو میڈم!“ ذوحان نے پڑوسی عورت سے درخواست کی۔ ”تم تو یہاں آتی جاتی رہتی ہو، تم ہماری خاصی مدد کر سکتی ہو۔“

”مجھے پولیس کی مدد کر کے خوشی ہوگی۔“ پڑوسی

عورت، ٹھیکہ کے ساتھ ہنگامے کا معائنہ کرنے میں مصروف ہو گئی۔

ذوحان ابھی بیڈ روم میں ہی تھا، جب اس نے دونوں عورتوں کی چیخوں کی آوازیں سنیں۔ ذوحان دوڑتا ہوا ہاتھ روم کی طرف گیا جہاں ٹھیکہ منہ پر ہاتھ رکھے اپنی الٹی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”یہ..... وہ..... یہ..... وہ.....“ پڑوسی عورت کی حالت بھی کافی خراب تھی۔ باوجود کوشش کے وہ کوئی بات نہیں کہہ سکی..... ذوحان نے آگے بڑھ کر ہاتھ روم کے اندر جھانکا تو وہاں ایک سیاہ بلی کی لاش پڑی تھی۔ اس طرح کہ اس کا سر کسی بھاری چیز سے بری طرح پکلا گیا تھا۔ اطراف میں خون کے چھینٹے بھی واضح طور پر موجود تھے۔ بلی کی لاش بھی ضرورت سے کچھ زیادہ پھول گئی تھی۔

”ایک مصوم بلی کے ساتھ اس قدر ظالمانہ سلوک کون کر سکتا ہے؟“

”ریحانہ کو بلیوں سے نفرت تھی۔“ پڑوسی عورت نے تبصرہ کیا۔

”مگر وہ اس قدر خوفناک کام ہرگز نہیں کر سکتیں..... وہ معذور رہیں۔“

”ریحانہ خاتون کے بستر کے نیچے ان کے کھانے کے برتن رکھے ہوئے ہیں۔ پلیٹ میں کچھ کھانا بھی موجود ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ریحانہ خاتون نے کھانا کھایا تھا۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ کام کس نے کیا ہے اور کیوں؟“ ذوحان نے پُرسوج لہجے میں اپنا خیال ظاہر کیا۔

”میں نے پلیٹ میں موجودہ جانے والے کھانے کو ایک پلاسٹک بیگ میں پیک کر دیا ہے۔“ ذوحان نے مزید کہا۔ ”تم اس کھانے کو لیبارٹری تک لے جاؤ۔ وہاں سردار خان صاحب میرے دوست ہیں۔ ان سے میرا نام لے کر کھانا ٹیسٹ کروالو۔“

”کیا تمہارے خیال میں یہ کھانا زہر آلود ہو سکتا ہے؟“ ٹھیکہ نے سوال کیا۔

”ابھی کچھ کہنا قفل از وقت ہوگا۔“ ذوحان نے سگریٹ کا کش لیا اور ایک بار پھر بیڈ روم میں نظریں دوڑانے لگا پھر اس کی نگاہ پڑوسی عورت پر جا کر ٹھہر گئی۔

”میرا خیال ہے کہ تمہارا شوہر لیاقت اب تک گھر آ گیا ہوگا۔ اسے یہیں بلاؤ؟“

ذوحان کی بات سن کر عورت باہر نکل گئی۔

”ہیلو۔“ چند لمحوں بعد ایک طویل قامت شخص پڑوسی

عورت کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ”مجھے لیاقت علی کہتے ہیں۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا۔

”میرا تعلق پولیس کے محکمے سے ہے۔“ ذوحان نے اسے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے بتایا۔

”میری بیوی انعم کہہ رہی تھی کہ ریحانہ خاتون کے ہنگامے میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے، کیا واقعی کوئی مسئلہ ہوا ہے؟“

”فی الوقت میں معاملے کی تحقیق کر رہا ہوں اور تمہارا تعاون درکار ہے۔“ ذوحان بھاری لہجے میں بولا۔

”ضرور۔“ لیاقت کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

”کیا گزشتہ دنوں تم نے اس ہنگامے کے اندر یا باہر کوئی سیاہ بلی مردہ حالت میں دیکھی ہے؟“ ذوحان نے فوراً ہی سوال کیا۔ ”اس حالت میں کہ اس کا سر چل کر ہلاک کیا گیا ہو؟“

لیاقت جواب میں چند لمحوں تک کچھ نہیں کہہ سکا۔ اس کی کیفیت ایسی تھی، گویا ذوحان کا سوال اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔

انعم نے شوہر کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”ذوحان صاحب کو ہاتھ روم میں ایک مردہ بلی کی لاش ملی ہے۔ اسے دیکھ کر تو میں بھی ڈر گئی تھی، مجھے یقین ہے کہ یہ کام کسی عورت کا نہیں ہو سکتا۔“

”تمہاری خاموشی کا مطلب ہے کہ تمہارا جواب اثبات میں ہے۔“ ذوحان نے بات آگے بڑھائی۔ ”اب سوال یہ ہے کہ تم نے ایسی کتنی بلیاں دیکھیں؟ یقیناً تمہیں تعداد یاد ہوگی۔“ ذوحان توقف کرتے ہوئے بولا۔

”یقیناً تم نے سات مردہ بلیاں دیکھی تھیں؟“

”آپ کو یہ تعداد کس نے بتائی؟“ لیاقت کو حیرت کا شدید حملہ لگا۔

”یہ بلیاں تم نے کہاں دیکھیں؟“ ذوحان نے اس کی ان تہی کرتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔ ”کیا ان سب بلیوں کے سر بھی کچلے ہوئے تھے؟“

”ان کی..... تو گردنیں تک جسم سے الگ تھیں۔“

لیاقت کھٹی کھٹی آواز میں بولا۔

”میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ کسی نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ اس کی بلی غائب ہے لیکن بلیوں کے قتل کے یہ علامات منسلک نہیں ہوئے۔ ان کے درمیان آٹھ، آٹھ، دس، دس ان کا وقت تھا۔“

”اب تمہیں تعداد کے بارے میں یقین ہے؟“

ذوحان نے سوال کر کے بغور لیاقت کا چہرہ دیکھا۔

”جی ہاں۔“ لیاقت نے پریشان ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔“

شکریہ کہہ کر ذوحان نے لیاقت کو جانے کا اشارہ کیا اور خود سگریٹ سلگاتا ہوا کھیلے کا انتظار کرنے لگا جو لیمبارڈی گئی ہوئی تھی..... اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

”اس کھانے میں کوئی زہر وغیرہ شامل نہیں۔“ کھیلے نے اندر داخل ہوتے ہی رپورٹ پیش کی۔

”مس کھیلے! تمہارے یہاں سے جانے کے بعد میں یہی سوچتا رہا ہوں کہ ایک مالدار یوزمی بیوہ، جو ستر حالات پرستی، آخر وہ بلیوں کو کس مقصد کے لیے ہلاک کر رہی تھی اور کیوں کر رہی تھی؟“

”کیا تمہارے دماغ نے اس سوال کا کوئی جواب تلاش کر لیا ہے؟“ کھیلے نے انسا سوال کر دیا۔

”میں یقین سے ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ ذوحان نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے کہ دونوں نہیں، بلیوں پر کوئی سائنسی تجربہ کر رہی ہوں.....“ ذوحان نے مسخرہ پن اختیار کیا۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ تم کو اس بھی کر لیتے ہو۔“ کھیلے نے چڑکھا۔

”یہ میرے سوچنے کا انداز ہے۔“ ذوحان کسی خیال پر اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

”ریحانہ خاتون بلیوں سے نفرت کرتی تھیں۔ یہ بات طے ہے کہ انہوں نے بلیاں صرف دودھ پلانے کے لیے نہیں خریدی تھیں..... اب اگر فرض کر لیا جائے کہ انہوں نے جو بے ہلاک کرنے کے لیے خریدی تھیں تو مزلیات کے کہنے کے مطابق اس گھر میں جو بے نہیں ہیں۔ یہ بلیاں انہوں نے کسی کو تحفے میں دینے کے لیے بھی نہیں خریدیں.....“ ذوحان بڑبڑاتا رہا۔ کھیلے حیرت زدہ ہو کر خاموش کھڑی رہی۔ ذوحان کا ذہن بہت تیزی سے چل رہا تھا۔

”اس بات کو بھی دل تسلیم نہیں کرتا کہ ریحانہ نے اپنی بہن فرزانہ کو خوفزدہ کرنے کے لیے بلیاں خریدیں..... تمہارے بیان کے مطابق فرزانہ کو بلیوں سے محبت تھی.....“

”ہو سکتا ہے کہ ریحانہ خاتون نے محض اس لیے بلیاں خریدی ہوں کہ وہ انہیں ہلاک کر کے اپنی نفرت کو تسکین پہنچا سکیں۔“ کھیلے نے تہرہ کیا۔

”مگر سیاہ رنگ کی بلیاں خریدنے کا کیا جواز ہے؟ وہ کسی بھی رنگ و نسل کی بلی خرید کر یہ شوق پورا کر لیتیں.....“

”تم واقعی حیرت انگیز آدمی ہو۔“ کھیلے نے تعریف کی۔

شعبہ گز

ایک شعبہ گز اپنے ہنر کے کمالات دکھا رہا تھا۔ اس نے ایک لیو... کو کٹ کر آدھا کیا اور اس کو اتنا نچوڑا کہ ذرہ بھر بھی اس میں رس نہیں رہا پھر اس نے مجھے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اگر کوئی صاحب اس میں سے ذرا سا بھی رس نکالیں تو میں ان کو پانچ سو روپے انعام دوں گا۔“ ایک صاحب آگے بڑھے اور لیو... کے پھلنے کو اتنا نچوڑا کہ اس میں سے ایک قطرہ رس نکل آیا۔ شعبہ گز بہت حیران ہوا۔ اس نے پوچھا ”آپ کام کیا کرتے ہیں؟“ وہ صاحب بولے۔ ”میں انکم ٹیکس آفیسر ہوں۔“

مرسلہ: رعنا رضوی۔ یو کے

بلی خریدنے پر اصرار کیا۔ اس کے بعد دوسری بلی کی موت بھی زہری کی وجہ سے ہوئی اور مزید بلیوں کی ضرورت ریحانہ خاتون کو اسی مقصد کے لیے پڑی۔

”لیکن ریحانہ خاتون تو بیمار تھیں۔“ ٹھکیلے نے اعتراض کیا۔ ”کم از کم ان جیسی خاتون بلی کا سر اس قدر خوفناک انداز میں نہیں چل سکتیں۔“

”ریحانہ خاتون، جب فرقان کو خط لکھ سکتی ہیں تو یہ کام بھی کر سکتی ہیں۔“ ذوحان نے جواب دیا۔ ”ریحانہ خاتون نہیں چاہتی تھیں کہ جو شخص انہیں زہر دے رہا ہے وہ ان پر شک کرے کہ وہ اپنا کھانا بلیوں سے ٹیٹ کرانی ہیں۔ اس لیے مجبوراً وہ سر پھاڑنے کا مکروہ فعل انجام دے رہی تھیں۔“

”ریحانہ خاتون کو زہر کون دے سکتا ہے؟“ ٹھکیلے نے سوال کیا۔

”ریحانہ خاتون کو اپنی بہن پر بھی شک تھا۔“ ذوحان جوابا گویا ہوا۔ ”مگر فرزانہ یہ کام نہیں کر سکتی۔ اگر یہ کام اس کا ہوتا تو اپنی بہن کے ساتھ وہ غائب نہ ہوتی۔ اس کی پراسرار گمشدگی کا میرے نزدیک اس کے علاوہ کوئی مطلب نہیں کہ ریحانہ خاتون کے ساتھ فرزانہ بھی قتل کر دی گئی ہے۔“

”قتل... قتل کر دی گئی ہے!“ ٹھکیلے کے طعنے سے پھٹی پھٹی آواز برآمد ہوئی۔ ”یہ تم سے کس نے کہا؟“

”ان دونوں بہنوں کی گمشدگی نے۔ کسی زندہ انسان

”ابھی میری صرف مگنی ہوئی ہے۔“ ذوحان چڑانے والے انداز میں مسکرایا۔ ”سوچ رہا ہوں مس ٹھکیلے... کہ میں تم سے اپنے دل کی بات کہہ ہی دوں“

..... کچھ دیر چپ رہنے کے بعد ذوحان گویا ہوا۔ ”میرا دل کہتا ہے کہ ریحانہ خاتون نے آٹھ بلیاں اپنے تحفظ کے لیے خریدی تھیں۔“

”تحفظ کے لیے۔“ ٹھکیلے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”تمہارا یہ خیال نہایت احمقانہ ہے، اپنی حفاظت کے لیے لوگ کتے پالتے ہیں، بلیاں نہیں۔“

”ریحانہ خاتون بلیوں سے نفرت کرتی تھیں۔“

ذوحان اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ زندہ رہتا چاہتی تھیں اور انہیں بلیوں سے شدید نفرت تھی۔ ریحانہ خاتون کا منصوبہ تو بے حد سیدھا سادہ ہے، ہم خواجواہ ہی پریشان ہو رہے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ ٹھکیلے ذوحان کی طرف دیکھنے لگی۔

”مطلب یہ کہ ریحانہ خاتون نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔“ ذوحان جیسے خود کلامی کرتا ہوا بڑبڑایا۔

”اپنے خط کے مطابق، جو انہوں نے فرقان کو تحریر کیا، وہ کسی سے خوفزدہ تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی ان کی دولت کے لیے انہیں قتل کر دے گا۔ خوفزدہ ہونے کا میرے نزدیک ایک ہی مطلب ہے۔“ وہ کچھ توقف کرتے ہوئے بولا۔ ”قتل... کوئی شخص ریحانہ خاتون کو قتل کرنا چاہتا تھا اس دولت کے لیے جو ریحانہ خاتون نے اپنے بیروم میں کسی جگہ چھپا رکھی تھی۔“

”لیکن... بلیاں کیسے حفاظت کر سکتی ہیں؟“ ٹھکیلے نے قطع کلامی کی۔

”زہر۔“ ذوحان نے سگریٹ سلگاتے ہوئے

جواب دیا۔ ”بلیاں زہر سے حفاظت کر سکتی ہیں۔“

”زہر!“ ٹھکیلے کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”بلیوں سے زمانہ قدیم میں بھی زہر آلود کھانے چیک کروائے جاتے تھے۔ ریحانہ خاتون نے بھی یہ کام ان سے لیا۔ انہیں شک تھا کہ کوئی انہیں زہر دے رہا ہے یا دے دے گا۔ اس لیے خود کھانے سے پہلے وہ اپنے کھانے کو بلی سے ٹیٹ کر لیا کرتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ فرزانہ اس گھر میں جو بلی تم سے خرید کر لائی تھی، اس نے اتفاقاً زہر آلود کھانا کھالیا ہو۔ اس کے علاوہ سیاہ بلی خریدنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ ریحانہ خاتون اس بات کو اپنی بہن سے بھی چھپانا چاہتی تھیں۔ اسی مقصد کے لیے انہوں نے تم سے سیاہ

”اگر ریحانہ خاتون کو چھری کانٹے کے ذریعے زہر نہیں دیا گیا تو پھر ان پر سے فکر پرٹ صاف کرنے کی کیا ضرورت تھی..... جی جناب! ان پر کوئی نشان نہیں ہے۔“
ذوحان نے گویا انکشاف کیا۔

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ ٹھیکہ بڑبڑا کر رہ گئی۔
ذوحان نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

”قاتل اس بات سے واقف تھا کہ ریحانہ خاتون کھانے کے آغاز سے پیشتر کچھ کھانا بلی کے آگے ڈال دیتی ہیں..... اور وہ اس بات سے بھی آگاہ تھا کہ کتے بلیوں کو کھانے کی چیز دیتے ہوئے انسان چھری کانٹے کا استعمال نہیں کرتا..... پھر ریحانہ خاتون نے بھی ایسا ہی کیا۔ کانٹے سے انہوں نے کھانا کھایا تو زہر ان کے جسم میں چلا گیا اور اسی زہر سے ان کی موت واقع ہوئی۔“

”اگر یہ سب درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر ان کی لاش کہاں ہے؟“ ٹھیکہ کے لبوں سے بمشکل سرگوشی خارج ہوئی۔ ”اور فرزانہ کی لاش کہاں ہوگی؟“

”اہم سوال یہ ہے کہ قاتل کون ہے اور کہاں ہے؟“
ذوحان ٹھیکہ کو ہنسلے سے باہر ملنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”قاتل سے ہم آج ملاقات کریں گے۔“

”آج!“ ٹھیکہ نے حیرت زدہ ہو کر ذوحان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا آج ہی رات تم قاتل کو گرفتار کر لو گے؟“

”قاتل کی آج رات گرفتاری بے حد ضروری ہے ورنہ..... پھر وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ ویسے بھی میرا طریقہ کار عام پولیس والوں سے مختلف ہے۔ میں اس قسم کے خطرناک مجرموں کو ڈھیل نہیں دیتا۔“

”کیا میں رات ہی کو قاتل سے نہیں مل سکتی؟“ ٹھیکہ نے پوچھا۔

”اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ رات کالی کرنی ہوگی۔“ ذوحان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”میرا خیال ہے کہ تم ایک شریف آدمی ہو۔“ ٹھیکہ نے ذوحان کی بکواس کا کوئی ٹولس نہیں لیا۔

چند لمحوں بعد دونوں اسپورٹ کار میں سوار تھے۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ ٹھیکہ نے کار کا رخ اولڈ کلفن کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہم ہوٹل چل رہے ہیں، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

”لیکن تم قاتل کو کب پکڑو گے اور کیسے پکڑو گے؟“

”قاتل پر ڈورے ڈال کر گرفتار کروں گا۔“ ذوحان

کو اہل کرنے کے لیے ہی دیا جاتا ہے۔ قاتل اس سلسلے میں اتنا ہارنا کام ہو چکا تھا مگر آٹھویں مرتبہ وہ کامیاب ہو گیا۔“ ذوحان کسی خیال کے تحت چند لمحوں کے لیے مائل رہ کر دوبارہ بولا۔ ”آٹھویں مرتبہ قاتل نے زہر انا مال نہیں کیا..... بلکہ ریحانہ خاتون کو قتل کرنے کے لیے دوسرا طریقہ استعمال کیا اور بالآخر کامیاب ہو گیا۔“
”لیکن.....“ ٹھیکہ پریشان نظر آنے لگی۔ ”اگر تمہارے کہنے کے مطابق ریحانہ خاتون قتل ہو چکی ہیں تو ان کی لاش کہاں ہے، فرزانہ کہاں ہے؟“

”ریحانہ خاتون اپنی بہن پر بھی شک کرتی تھیں۔“
ذوحان پُر سوچ انداز میں بڑبڑایا۔ اس کا ذہن بہت تیزی کے ساتھ اس کیس کو حل کرنے میں مصروف تھا۔ ”ریحانہ خاتون کو شک تھا کہ فرزانہ ان کی دولت حاصل کرنے کے لیے انہیں زہر دے رہی ہے لیکن پھر کسی وقت انہیں یقین آ گیا تھا کہ فرزانہ یہ حرکت نہیں کر سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ ریحانہ خاتون نے قاتل کو دیکھ لیا ہو۔ اس کے بعد ان کے پاس، اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ فرزانہ کو اپنی پریشانی میں شریک نہ کرتیں.....“ ذوحان نے گفتگو ادھوری چھوڑ کر گریٹ سلگایا اور غور کرتے ہوئے بولا۔

”تین چار دن پہلے ریحانہ خاتون نے فرقان کو جو خط تحریر کیا، اس میں نے انہوں نے لکھا کہ تم میرے واحد رشتے دار ہو جس پر وہ بھروسہ کر سکتی ہیں لیکن خط پوسٹ ہو جانے کے بعد انہوں نے قاتل کو پہچان لیا۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے اپنی بہن فرزانہ کو اپنے راز میں شریک کر کے اس ہنسلے سے نکلنے کی کوشش کی..... اور فرزانہ فوراً ہی اپنی بہن کی مدد کے لیے تیار ہو گئی۔ فرزانہ صحت مند تھی۔ وہ اس ہنسلے سے باہر بھی جاتی تھی۔ قاتل کو فرزانہ سے زیادہ خطرہ تھا، اس لیے قاتل نے پہلے فرزانہ کو راستے سے ہٹایا اس کے بعد ریحانہ کو۔ قاتل جو کوئی بھی ہے، بہت چالاک اور ہوشیار ہے۔“ ذوحان نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
”قاتل جانتا تھا کہ ریحانہ خاتون اپنا کھانا بلی سے ٹیٹ کراتی ہیں۔ وہ سات مرتبہ ناکام ہو چکا تھا۔ آٹھویں مرتبہ اس نے ریحانہ خاتون کے کھانے میں زہر شامل کرنے کے لیے جھجے، چھری اور کانٹے کو کسی خطرناک زہر سے آلودہ کر دیا.....“

”جھجے، چھری اور کانٹے کو زہر آلود کیا؟“ ٹھیکہ نے پوچھا۔
”یہاں ہو کر استفسار کیا۔“ اس کا کیا مطلب؟“

”دونوں لاشیں یقیناً تم نے ضائع کر دیں لیکن انہیں غائب کرنے کے باوجود تم سزا سے نہیں بچ سکو گے۔“
 ذوحان توقف کرتا ہوا اپنے ماتحت افسروں سے مخاطب ہوا۔
 ”اس کی بیوی کو یہاں بلوا کر اس کی اصل شکل دکھا دو۔ ممکن ہے کہ آج کے بعد اس ذلیل انسان کی اپنی بیوی سے ملاقات نہ ہو سکے۔“
 ”خدا کے لیے اسے یہاں مت بلوائیں۔ وہ معصوم اور بے گناہ ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ ذوحان نے جواب دیا۔
 ”تمہاری بیوی ایک اچھی عورت ہے۔ جیسی تو ریحانہ خاتون نے اس کو اپنے بیٹکے کی چابی دے رکھی تھی جس کا تم نے غلط استعمال کیا۔۔۔۔۔ اور جس مقصد کے لیے تم نے دونوں عورتوں کی جان لی، وہ بھی پورا نہیں ہوا۔“ ذوحان اپنی بات مکمل کر کے بیڈ روم میں بستر کے نزدیک رکھے ہوئے ایک شیلف کی طرف بڑھا اور کتابوں کے درمیان سے چند موٹی موٹی کتابیں نکال کر لیاقت علی کے سامنے بیچ دیں اور کرخت لہجے میں بولا۔

”جس دولت کو حاصل کرنے کے لیے تم نے قتل جیسا بھیاک جرم کیا وہ دولت ان کتابوں میں دفن ہے۔“
 ذوحان کی اس بات پر ایک ماتحت نے حیرت زدہ ہو کر ایک کتاب کھول کر دیکھی۔

کتاب کے درمیان میں صفحات کاٹ کر اتنی جگہ بنائی گئی تھی کہ اس کے اندر ایک ہزار والے نوٹوں کی ایک گڈی آسانی سے سانسکے۔ ہر کتاب کے اندر ایک ہزار والے نوٹوں کی ایک ایک گڈی موجود تھی، جو ماتحت برآمد کر کے بستر پر ڈھیر کرتا گیا۔

”اس رقم کو فرقان کے پاس ہوٹل بھجوا دو۔“ ذوحان نے ماتحت افسر کو حکم دیا۔ ”اور صبح اس ذلیل انسان کا چالان پیش کرو۔“ اپنی بات مکمل کر کے ذوحان تیز تیز چلتا ہوا بیٹکے سے باہر نکل گیا۔ ٹھیکہ نے بھی اس کی تقلید کی۔

”بس ایک سوال اور!“ ٹھیکہ نے التجا کی۔ ”آخر تمہیں قاتل کی قمرقاری کا اتنا یقین کیوں تھا۔ کیا تم نے لیاقت کو پہچان لیا تھا؟“

”ایک معصوم اور بے زبان بلی کا سر کچل کر اس نے خود ہی اس قتل کا معاملہ کروا دیا تھا۔“ ذوحان نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”فرزانہ بیویوں سے محبت کرتی تھی وہ اس قسم کی گھناؤنی حرکت نہیں کر سکتی تھی۔“



موسیقی کا تیز ریکارڈ لگا کر چند لمحوں تک جھومتا رہا لیکن پھر سنجیدہ ہو گیا۔ ”جس وقت ہم ریحانہ خاتون کے گھر میں داخل ہوئے تھے، قاتل بیٹکے میں موجود تھا۔ وہ غالباً ریحانہ خاتون کی دولت تلاش کر رہا تھا لیکن ہماری مداخلت کی وجہ سے ناکام ہو کر بھاگ گیا۔ تاہم کچھ رات گزرنے پر وہ پھر تلاشی لینے بیٹکے میں داخل ہو گا لیکن اس بار وہ فرار نہیں ہو سکے گا۔ میرے آدمیوں نے اس بیٹکے کو گھیر لیا ہے۔“

”اوہ۔“ ٹھیکہ حیرت زدہ سی ہو کر ذوحان کی شکل دیکھنے لگی۔ ”تم ایک انٹیلی جنٹ آدمی ہو۔“
 ”شکریہ مس۔۔۔۔۔“ ذوحان نے ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی روکی اور کھانا کھا کر فریش ہوئے۔

”اگر تم قاتل کو پہچان گئے ہو تو مجھے بتائیوں نہیں دیتے؟“ ہوٹل میں دو ٹھکنے گزارنے کے بعد دوبارہ ریحانہ خاتون کے بیٹکے کی طرف جاتے ہوئے ٹھیکہ کے چہرے پر الجھنیں تھیں۔ ذوحان سوچ میں ڈوبا رہا اور کوئی جواب نہیں دیا۔

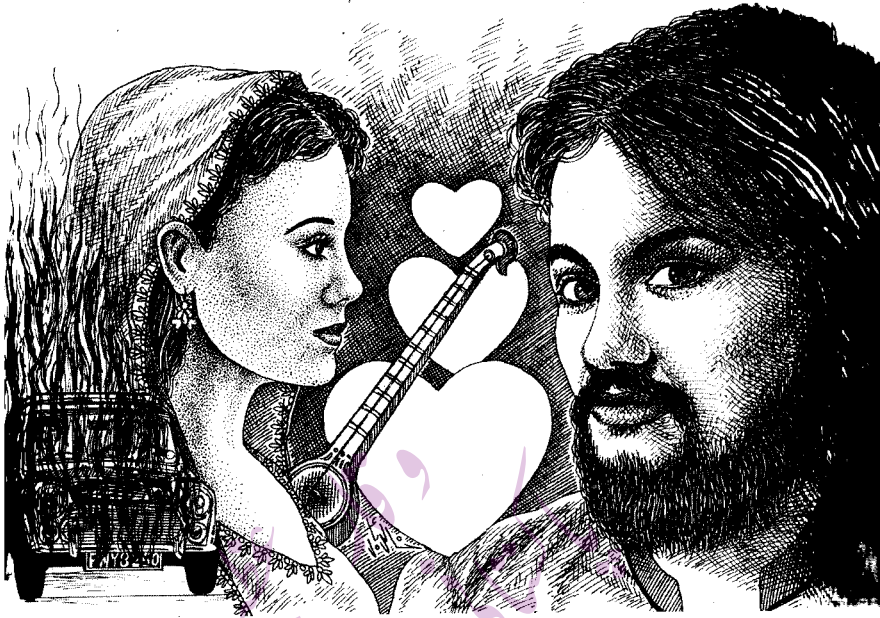
ریحانہ خاتون کے بیٹکے پر پہنچ کر ذوحان خاموشی سے گاڑی سے اتر ا۔ ٹھیکہ نے بھی تقلید کی۔ ذوحان نے آگے بڑھ کر ڈرائیبل کاٹن دبا دیا۔

چند ہی لمحوں بعد اندر سے دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک صحت مند اور طویل قامت شخص تھا۔ ذوحان کو سامنے دیکھتے ہی اس شخص کا ہاتھ سیلیوٹ کے لیے بلند ہو گیا۔ اس کے بعد ٹھیکہ کو ذوحان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ دروازہ کھولنے والا شخص کون تھا؟
 ”کیا رپورٹ ہے؟“ ذوحان نے سیلیوٹ کرنے والے شخص سے افسرانہ لہجے میں پوچھا۔

”جرم گرفتار کر لیا گیا ہے سر۔“ ماتحت، سیلیوٹ کر کے ایک طرف ہٹ گیا۔

”گڈ۔“ ذوحان اسے شاباش دے کر اندر بڑھ گیا۔ ٹھیکہ بھی ساتھ تھی لیکن ریحانہ خاتون کے بیڈ روم میں قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ بیڈ روم کے اندر چار افراد موجود تھے اور ان کے درمیان ریحانہ خاتون کا پڑوسی لیاقت علی سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔

”ہیلو مسٹر لیاقت۔“ ذوحان نے تلخ لہجے میں لیاقت کو مخاطب کیا۔ ”میں تمہاری بیوی کی زبانی سن کر کہ تم بمیکل ٹیکسٹری میں کام کرتے ہو، سمجھ گیا تھا کہ ریحانہ خاتون کے قتل کے پس پردہ تمہارا ہاتھ ہے۔۔۔۔۔“ لیاقت علی مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ذوحان کاب و لہجہ مزید کرخت ہو گیا۔



یکتارا

عبدالرب بھٹی

جہان رنگ و بومیں ہر روز ہزاروں پھول کھلتے ہیں... کچھ پھول سپروں میں سج جاتے ہیں اور
 ۴۰ ہزاروں پر مرجھا جاتے ہیں اسی طرح ہزاروں چہرے ملتے ہیں مگر کچھ چہروں پر ملن کی
 شہنی محبت بن کر چمکتی ہے کچھ پر نارسائی اور جدائی کی ایسی داستان رقم ہو جاتی ہے جو
 اہاں سے نہیں بلکہ آنکھوں سے جب جب پڑھی جاتی ہے تب تب دل خون کے آنسو روتا ہے۔ وہ بھی
 آسمان کا تارا بن کر چمکی تھی اور زمین پر رہنے والے اسے اپنی دسترس میں لانے سے لا چار تھے
 کہ مقدر کی بازی نے پلٹا کھایا اور زمین والے مائل بہ بلند پرواز ہوئے جبکہ وہ ٹوٹا تارا بن کر
 زمین بوس ہوئی اور ساز غم میں ڈھل کر یکتا را کی لے پر اپنے وجود کے بکھر جانے کا نوحہ
 سناتی رہی مگر... وہاں ایسا کون تھا جو اس کے بکھرے وجود کو سمیٹنے کی
 کوشش کرتا۔

دلوں میں پھانس بن کر اتر جانے والی..... ایک ایسی

داستان محبت جس کی ہر سطر سوچنے پر محسوس

کردے

اکتوبر 2017ء

244

سپینس ڈائجسٹ



ناری اور الماس کے درختوں میں گھری ہالا کی مخصوص
نہلی ٹانگوں سے حزمین ایک مشہور عمارت ”سندھیا لوجی
میوزیم“ میں اس وقت خاصی گہما گہمی دیکھنے میں آ رہی تھی۔
جامشور و میں سپر ہائی وے سے سپن شریف کو جانے
والی سڑک کے کنارے یہ مشہور عمارت ”سندھیا لوجی
میوزیم“ واقع ہے۔ سپر ہائی وے سے اس کا فاصلہ بہ مشکل
پانچ کلومیٹر اور کراچی سے ایک 160 کلومیٹر ہے۔
اس عجائب گھر میں وادی مہران کی تہذیب کے حوالے
سے تصاویر، تحاریر اور مجسموں کے علاوہ آڈیو ویڈیو مواد بھی
موجود ہے۔

فراک نہ تھیں کے نیچے مہین سا سیاہ رنگ کا چست ٹراؤزر پہن رکھا تھا اور گورے پاؤں میں اونچی ہیل کے سیٹھل تھے۔ ایک ہاتھ میں اس نے پیڈ بیگ تھام رکھا تھا۔ وہ بھی یہ ظاہر نہ کی کھلنڈرے لوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی طرح ہی دکھائی پڑتی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی، اپنی فیلوز کے ساتھ قہقہہ لگا رہی تھی اور باتیں بھی کر رہی تھی۔ کوئی فرق نہیں تھا اس کی حرکات و سکنات میں، جیسے کہ دوسرے طلبہ و طالبات کر رہے تھے، یعنی ہنسی مذاق اور انجوائے، ماسوائے اس کے حسن کے..... ہاں! وہ اپنے بے مثل حسن میں یکتا تو تھی..... یہی شے اسے اپنے دیگر ساتھیوں میں ممتاز کیے ہوئے تھی۔ اس کا نام مہر زادی تھا، یہ جاشورو کے ایک دور افتادہ کوشٹھی ڈیرے کے بااثر جاگیردار ڈیرے رئیس بنگل خان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھی۔ اسی لاڈلے پن نے اس کے باپ کو اس کی ضد کے آگے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے شوقِ تعلیم کو جاری رکھے۔

تھے۔ ان کے صوفیانہ وعاشقانہ کلام کی مطر میں بھی کندہ تھیں۔
 ”اری مہر! وہ تو دیکھو ذرا.....“ اس کی ایک سبیلی نے
 اسے کہنی کا ٹھوکا مارا۔

”کہاں.....؟“ مہر زادی نے بھی ہنسی کے انداز میں
 کہا تو اس کے ساتھ کھڑی ایک دوسری کلاس میٹ شبانہ چپک
 کر بولی۔

”یہ بھی ایک جیتا جاگتا ماڈل ہی لگتا ہے.....“ شبانہ کی
 بات پر سب ہلکھلا کر ہنس پڑیں۔ مہر زادی کی نظریں ہنسی بھی اس
 میں شامل تھی۔ ایسے میں لڑکوں کے گروپ نے ہانک لگائی۔
 ”ماڈل نہیں، عشق نا کام کی ایک تصویر کہو.....“

اس پر لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک مشترکہ قہقہہ پڑا۔ مہر زادی
 بھی اس طنز سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”دیے یہ شاہکار.....! آؤ ذرا اس طرف چلیں۔“
 کسی خلیج نے شرارت بھری تحریک دی اور سب اسی
 طرف بڑھے۔ انجی یہ سب پر شوخ چہلیں کرتے اس طرف
 بڑھ رہے تھے کہ ایک برسوز آواز ہال میں ابھری.....
 تنگی ایسی پریت نہ کر جسکی لمبی جھور.....

دھوپ لگے تو چھاؤ نہیں..... بھوک لگے پھل دور.....
 مگر کوئی اس برسوز آواز کی پرورد شاعری کے بول کو نہ
 سمجھ سکا، اسی طرح وہ اس ”ماڈل“ کو ستانے کی غرض سے وہیں
 جا کھڑے ہوئے۔

ان سب کا انداز تسخیر اڑانے والا تھا۔ وہ سب اس
 عجیب ماڈل کو تنقید لگے۔ وہ واقعی ایک جیتا جاگتا ماڈل ہی تھا
 جو سندھ کی مشہور لوک رومانوی داستان کے کردار میں ڈھلے
 ایک مشترکہ ”ڈپلے“ کے پاس ایک اسٹول پر چپ چاپ اور
 اپنے حال میں مست الٹ بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں یلکارا
 تھا۔ (ایک بڑے سے کدو کو خشک کر کے اس کے
 دو ٹکڑے کر دیے جاتے ہیں۔ پھر ایک پر باریک تار بچھ دیتے
 ہیں، بانس پر اسے لگا کر گونٹھے پریش چڑھا کر اسے بجایا
 جاتا ہے، یہ آج کے گٹار کی قدیم شکل ہے)۔ اس نوجوان کا
 سوز و گداز جاری تھا۔

اس بار سب اس کی شاعری پر مہوت سے ہو گئے
 تھے۔ اس بار اشعار نے ان کو صبحوز ڈالا تھا۔ ”واؤ..... شاعری
 تو زوردار ہے اس کی.....“ انجی میں سے ایک نے کہا۔

وہ سب پورے اشتیاق اور محویت کے ساتھ اس کی
 طرف متوجہ تھے۔

”مجھ پر مت ہنس لو گوا

کہ میں تو خود اپنی ہی تقدیر کی لاش پر

ہوں ماتم کنٹاں..... کچھ اس طور
 کہ میں اب وہ، وہ نہیں رہا، جسے ناز تھا کبھی
 اپنی قسمت پر.....

آہ..... کوئی جذبہ تو مجھ بد نصیب سے روراکھ.....
 الفت نامی سب نفرت ہی رکھ.....“

اس بار اس جیتے جاگتے شاہکار نے جیسے کسی
 کھلنڈرے، شوخ اور غیر سنجیدہ دل و دماغ پر بجلی گرا دی.....
 اور وہ بھی مہر زادی.....

وہ اسے اب یک ٹک تنکے جا رہی تھی، اس قدر محویت
 اور انہماک سے کہ..... اسے پتا ہی نہ چل سکا اس کے ہم جولی
 کسی اور طرف جا چکے تھے۔

وہ نوجوان جو بظاہر ایک دیہاتی ہی نظر آتا تھا، مگر اس کی
 مہر زادی سے دو، تین سال ہی بڑی لگتی تھی۔ سا نولا رنگ،
 روشن آنکھیں مگر ان آنکھوں کی چپک بڑی تاثراتی تھی۔ اس
 میں اداسی کا ایک نامعلوم سا شائبہ دیتی دقت تھی، چہاں کسی کم
 گشتہ درد کی پرچھائیاں سٹی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ چہرہ
 مردانہ و جاہت کا غماز نظر آتا تھا۔ آنکھوں کے اوپر مہموں
 کا رنگ گاڑھا تھا جو ناک کی بڑ کے ساتھ ملی ہوئی اس کی آتش
 مزاحی کا پتا دیتی تھیں۔ یہ اس کی ماں حاکم زادی نے اسے
 بتایا تھا کہ جن مردوں کی مہموں کا ڈھمی اور آپس میں ملی ہوئی
 ہیں، وہ بڑے ہی دار، جھٹک میں آتش مزاج اور دلیر ہوتے
 ہیں۔ ہونٹ اس کے مونٹے تھے جس پر باریک مہموں خوب
 چپتی تھیں۔ اس نے سادہ سی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ وہ
 اسٹول پر بس، تنک کر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کسی مجذوب فقیر
 جیسا ہی نظر آتا تھا۔ سر کے بال بھی اس کے مجذوب فقیروں کی
 طرح دراز اور گھنے تھے۔ چہرے پر بجلی ڈاڑھی بھی تھی۔ گلے
 میں رنگین منکوں کی مالائیں جھول رہی تھیں۔ ایک کھول بھی
 اس کی گود میں دھرا پڑا تھا۔

اس نوجوان کو نہیں معلوم تھا کہ کوئی اسے یک ٹک اور
 گہری نگاہوں کے سیاہ کھنکول میں لیے ہوئے تھا۔ وہ
 بس اپنے حال میں مست الٹ لیٹا رہا تھا اور قہوڑی دیر کے
 لیے چپ ہو جاتا تھا، جیسے اپنے اندر کوئی درد، زہر کی طرح
 گھونٹ گھونٹ اتار رہا ہو..... جیسے بچ کے زہر کا پیالہ پی
 رہا ہو۔

اس کی آنکھیں نیم دائیں۔ مہر زادی نے دیکھا، اس کی
 آنکھوں کے گاڑھے گاڑھے گوشے نرناک ہو رہے تھے۔

”بہت خوب..... بہت اعلیٰ.....“

وہ لمحہ..... شاید بے اختیاری کا ہی تھا کہ جس نے

مہبوت سی کھڑی مہر زادی کے دلشیں لبوں سے یہ الفاظ اس کے دل کی گیرائیوں سے نکال کر باہر دھکیل دیے تھے۔ ان الفاظ پر نوجوان نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور ایک ذرا گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ جیسے دو دلوں کے یکساں رے ایک ساتھ ہی بجے ہوں۔ جیسے سازِ غم کی پُر درد رے پر جذبات نو دمیدہ کی کوئی ایک ساتھ ہی کھلی ہوں۔ اور جیسے..... بے نام سے تعلق کو مستعار لہجہ نے کسی گم گشتہ یادوں سے تشبیہ دے ڈالی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نوجوان، مہر زادی کو دیکھتے ہی عجیب انداز میں شگفتہ تھا۔ عجیب اس لیے کہ اس کی رنجور اور مغموم سی آنکھوں کی اداس شام میں آشنائی کا جتنو چکا تھا۔ یہی جتنو مہر زادی کو بھی ایک حیرت آمیز، الجھن میں مبتلا کر گیا تھا۔ کیونکہ وہ اس نوجوان کے اس طرح دیکھنے اور چونک پڑنے کو کسی عامیاناہ پن کے تناظر میں دیکھنے کے بجائے، کچھ اخذ کرنے پر محمول کیے ہوئے تھی۔

پھر اس نے دیکھا کہ اس نوجوان کے چہرے پہ وہ اداسی، وہ ہیراگ پن اٹکا اٹکی ہوا ہو گیا، اس کی جگہ شوق وید اور بیاشت دوڑ گئی، بالکل اسی طرح جیسے کسی کی کوئی بھولی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی امید بر آئی ہو۔ وہ ایک ننگ مہر زادی کو تکتا رہ گیا۔ وہ بھی اسے کچھ حیران کن اور الجھن آمیز نگاہوں سے دیکھتی رہ گئی۔

”وہی آنکھیں، وہی چہرہ اور وہی ہونٹ، ایسے ہی بولنے کا انداز و لہجہ۔ تم دوڑے رئیس کی بیٹی ہونا..... مہر زادی..... مہرو!“

معانہ نوجوان نے اسے یہ کہہ کر چونکا دیا۔ اس کے بولنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اسے عرصے سے جانتا ہو۔

”تت..... تم مجھے کیسے جانتے ہو؟“ مہرو کی حیرت الفاظ بن کر نوک زباں پر آ گئی۔

ایک گہرے دکھ کا شائبہ دیتی اس کی مسکراہٹ نے مہرو کی نامعلوم سی الجھن کو فرو کر ڈالا۔ وہ اپنا جواب سننے کے لیے بے چین ہو گئی۔ وہ اسی لہجے میں بولا۔

”آپ کو بھلا کون نہیں جانتا ہوگا، اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہوا؟“ نوجوان نے کہا، کچھ اس طرح کہ اس میں مہرو کو میٹھا سا طنز بھی لگا اور کسی کے غم نہاں کا درد بھی محسوس ہوا۔

”لہل..... لیکن.....“ وہ کچھ بولتے بولتے رک گئی۔

پھر جیسے اس لاشعل موضوع کو چھوڑ کر چمکتے لہجے میں بولی۔

”تم بہت اچھا لگتا ہے، ہو، شاعری بھی اچھی کرتے ہو، کہاں سے سیکھا تم نے یہ سب؟“

”تم سے.....“ نوجوان جیسے اس کے یہ بولنے کا خنجر تھا۔ مہرو کو اس کا ایک دم یوں کہنا عامیاناہ سا لگا اور ناگواری کی شکن اس کی شفاف پیشانی پر ابھری مگر جانے کیا ہوا کہ وہ اسی تیزی سے غائب بھی ہو گئی۔ وہ نوجوان یہ کہہ کر..... اپنی آنکھیں موندے سر دھننے لگا۔

مہرو کو اس کا موضوع کیا ہوا..... ”دلی بکھور.....“ والا شعر پسند آیا تھا۔ بولی۔

”مجھے تمہارا وہ دلی بکھور والا شعر پسند آیا تھا۔ کیا تم اسے دوبارہ سنا سکتے ہو مجھے؟“

”وہ شعر آپ ہی کے لیے تو موضوع کیا تھا میں نے.....“ سانول نے اس پر اک دینا پُر شوق سی ڈالتے ہوئے کہا اور یہی شعر مکر کر کیا۔

تلسی ایسی پریت نہ کر جیسی دلی بکھور.....

دوب لگے تو چھاؤں نہیں، بھوک لگے پھل دور.....

”واؤ گریت.....“ بے اختیار مہرو کے نرم و گداز لبوں سے نکلا پھر وہ بولی۔

”اس کی تشریح بھی اس سے زیادہ اچھی ہوگی۔“

وہ مجذب سانول نوجوان اس کا مطلب سمجھ گیا، اس شعر کی تشریح بتانے لگا۔

”اس شعر میں ایک ایسے شخص کا درد سمویا ہوا ہے، جو نارسائی کا عذاب سہے ہوئے ہے۔ جس کے باعث وہ اپنے محبوب سے ایک طرفہ الفت رکھنے پر مجبور ہے، اظہارِ محبت کرنا بھی اسے عامیاناہ لگتا ہے۔ اس کا محبوب شان اور مرتبہ میں بھی اس سے اونچا ہے، اب وہ اسے صرف دیکھ سکتا ہے مگر پانہیں سکتا۔ وہ اپنی محبت کے تادور درخت تلے بیٹھ تو سکتا ہے مگر اس کی چھاؤں نہیں لے سکتا۔ وہ اس پر لگے پھل کو دیکھ سکتا ہے مگر توڑ کر کھا نہیں سکتا۔ اس کے لیے اسے بلندی پر چڑھنا ہوگا مگر وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتا۔ بس اوہ اپنے اندر کی آتش عشق کو دبائے مست مدام رہتا ہے۔“

”اوہ..... سو سید.....“ مہر زادی کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ تب ہی اس نے محسوس کیا کہ اس نوجوان مجذب کی کشادہ روشن آنکھوں میں نی چمکتے لگی تھی۔

اچانک وہ نوجوان اپنا یلکارا سنہال کر اٹھا اور ہال کے دروازے کی طرف یہ لگتا تھا ہوا چل دیا۔

”سادل مستون مست مدام..... سادل مستون مست مدام..... سادل مستون مست مدام.....“

مہرو اس کی طرف ایک جذب کی سی کیفیت سے بکتی رہ گئی۔ کچھ تو تھا اس کے لہجے میں ایسا جس نے مہرو کو بھی مست

ایک ہی لیکچر

باپ نے بیٹے سے کہا۔ ”مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا ہے کہ تم کو کلاس میں سب سے پیچھے بٹھا یا جاتا ہے۔“
بیٹے نے جواب دیا۔ ”ابا جان! آپ فینشن نہ لیں ہماری کلاس میں طالب علم چاہے سب سے آگے بیٹھے یا سب سے پیچھے، انہیں ایک ہی لیچر سننا پڑتا ہے۔“
(مرسلہ: دوزیر محمد خان۔ محل ہزارہ)

تھی، وہیں سے ان سب کا پروگرام سندھیا لوبی میوزیم کھونے کا بن گیا تھا۔ مہر اس وقت اپنی بھینسی کے ساتھ ہاسٹل روم میں ہی تھی، وہاں سے وہ بھی ان کے ساتھ ہی یونیورسٹی کے پوائنٹ پر سندھیا لوبی میوزیم چلی آئی تھی اور اپنی سیاہ رنگ کی کلش کار ہاسٹل کی پارکنگ میں ہی چھوڑ دی تھی۔ اس کے بعد جب وہ ہاسٹل لوٹی تو وہاں تھوڑی دیر رکنے کے بعد وہ اپنی کلش میں بھائی ٹگر لوٹ آئی تھی۔
”اوہ..... ادا سا میں آئے ہوئے ہیں۔ شامت ہی آگئی اب تو میری.....“

وہ کار سے اترتے ہوئے بڑبڑائی۔ اس نے اپنے بڑے بھائی مراد خان، البیروں، ”مہو لے رئیس“ کی میروں، طر انز کوکر، پچان کی مٹی، مہر اپنی ماں کے ساتھ یہاں رہتی تھی۔ جبکہ رئیس، ہنگل خان اور مراد خان، دونوں باپ بیٹا، اپنی جاگیر کوٹھ سی ڈرامیں رہتے تھے۔ زمینوں اور دیگر راجواڑی معاملات انہیں وہیں ہنگل سے لیتے تھے۔ یہاں ان کا آنا کم کم ہی ہوتا تھا۔ ماں عالم زادی، یعنی ”وڈے رئیس“ کی بیوی اپنی بیٹی کی وجہ سے بھائی گھر ہی میں رہتی تھی۔ یہاں بھی نوکروں اور مہاندلوں کی کوئی کمی نہ تھی۔

مہر آؤرس کی طالب علمی تھی۔ اسے یہ مطمئن ہے حد پسند تھا۔ اسے تصویریں اور انکچ بنانے کا ذوق، حد تک شوق تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے بڑے نمونہ بصورت لگائی اور لوک داستانوں کے انکچ بنا کر اپنے کمروں میں فریم کر کے لگائے ہوئے تھے۔ ان میں سی ہڈوں اور لوری ہام لہجائی کے انکچ بھی شامل تھے۔

بڑا بھائی آیا ہوا تھا اور ادب کا ایک روایتی تقاضا تھا کہ وہ اسے سلام کر کے اپنے کمرے کا رخ کرتی۔ اس وقت اسے تنہائی درکار تھی۔ وہ اکیلے بیٹھ کر کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ اس فقیر مش نوجوان سے متعلق نہیں بلکہ اس کی ان باتوں سے

سا کر دیا۔ وہ اس کے پیچھے لگی، بولی۔

”مہر..... کیا نام ہے تمہارا.....؟“

وہ رک گیا۔ آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ بہت گہری نظریں تھیں اس کی..... وجود میں اتنی ہوئیں، پھر وہ اسی لہجے میں جواب بولا۔
”سانول.....“

”سانول!“ مہر نے زیر لب دہرایا۔ ”تمہارا نام بھی لگتا ہی ہے۔“

”یہ نام تمہیں یاد نہیں رہا.....؟“ سانول نامی اس نوجوان نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ایک دکھ آمیز حیرت تھی۔ مہر کی پیشانی پر پھر کشمکش نمودار ہو گئی۔

”..... مہر.....! کیا اس بھول سے نوجوان پر دل آگیا ہے تمہارا.....؟ آجاء، ہم چارہ ہیں۔“

اچانک اس کی سبکی ریحانہ نے اسے پکارا..... وہ ہنسی بھی تھی۔ مہر چونکی اور پھر ایک الوداعی سی نگاہ سانول نامی اس مجذوب سے نوجوان کے چہرے پر ڈالتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ پائی اور پلٹ گئی۔

جب وہ میوزیم کے شیشے والے دروازے سے گزرنے لگی تو اس نے یونہی پلٹ کر دیکھا، سانول ایک ہاتھ میں بیکرا پکڑے ہوئے اپنے دوسرے ہاتھ کو ہلارے الوداع کہہ رہا تھا۔

”کیا اسے اعزاء ہو گیا تھا کہ میں ہال سے باہر نکلتے نکلتے اس کی طرف ایک آخری نگاہ ضرور ڈالوں گی؟ یا پھر یہ یونہی ہاتھ ہلارہا تھا؟“

اس نے عمارت سے باہر نکلتے نکلتے سوچا پھر سر جھٹک کر اپنے گروپ کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

مہر..... بھائی ٹگر والی کوٹھی میں پہنچی تو شام کے سائے جامشورو (حیدر آباد) کے مغربی افق پر اترنے لگے تھے۔ کوٹھی سفید اور ہلکے سبز رنگ کی تھی اور خاصے وسیع قدیمہ اراضی پر پھیلی ہوئی تھی۔ سانسے بڑا سالان تھا، جہاں کھنے درخت لگے ہوئے تھے۔ مخصوص خرد و ملی شکل کے کٹائی والے لمبے بیڑ بھی تھے۔ لان کیا تھا کو ایک سبزہ زار میدان سا تھا، جہاں نوبوع گل بوئے اور مچکتی ہوئی کیاریوں کی باڑیں اور ایک طرف مختلف قسم کے موسمی پھولوں کا باغ بھی بنا ہوا تھا۔ کارپورج میں دو لمبی لمبی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک نئے ماڈل کی ٹویٹا کرولا اور ایک ڈائی ہائوسکی۔ انٹرکری بھی تھی۔

مہر اپنی کار میں آئی تھی۔ ہاسٹل وہ اپنی کار میں ہی مکی

متعلق جو اس نے اس سے کہی تھیں۔ آخر کس برے پر اس نے اپنا لاحقہ اور تعلق اس سے جوڑنے کی کوشش کی تھی؟ وہ آخر کون تھا اور وہ اسے کس حوالے اور کس حیثیت سے جانتا تھا؟ کیا اس سانولہ..... نامی نوجوان کی اس ”جان کاری“ میں اجتماعیت کا دخل تھا یا انفرادیت کا؟ جانتے تو اسے سبھی تھے مگر ایک بڑے جاگیردار کی لاڈلی بیٹی کی حیثیت سے مگر اس نوجوان کی باتوں سے اندازہ یہی ہوتا تھا کہ اس کی جان کاری کی حیثیت وہ نہیں جو اوروں سے متعلق ہے۔

’اس ملازم نے اسے بتایا کہ “چھوٹے رئیس“ نشست گاہ میں “سرورانی جی“ کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ اس کی ماں کو “ارانی بی“ کہا جاتا تھا۔

مہرونے سیدھے وہیں کارخ کیا۔ کمرے میں اسے سی اٹھا۔ وہ اس پیش قیمت اشیاء سے سبکی سبکی نشست گاہ میں اٹھ بیٹھ کر اس نے ماں اور بھائی کو آپس میں باتیں کرتے دیکھے۔ اس پر رئیس نشست گاہ کی دیواروں پر خاندان کے ناموں کی رونق آئینہ تصاویر بڑے بڑے فریم کے ساتھ آویزاں نظر آتی تھیں۔ مہرونے اندر داخل ہوتے ہی بھائی کو سلام کیا۔

مراود خان ایک ستائیس اشٹائیس سالہ لپا چوڑا جوان تھا۔ جسم کسرتی تھا اور چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ رنگ گورا اور آنکھیں بڑی تھیں۔ سر کے بال گھنے اور سیاہ تھے، یہیں تیل چڑھ کر خوب بھایا گیا تھا۔ چہرے پر اپنے باپ ہی کی طرح کا رعب اور وہ بد بظن تھا۔ یہ قول لوگوں کے وہ اپنے باپ رئیس ہنگل خان کی ”ٹرو کاٹی“ تھا۔ چہرے اور آنکھوں سے روایتی سخت گیری مترشح تھی۔ اس نے پیش قیمت بڑی شلوار قمیص زیب تن کر رکھی تھی جس کی شلوار کٹے کھیر والی تھی۔ کاندھوں پر ابرج اور سر پر جاموٹ طرز کی سندھی ٹوپی تھی۔ بغل سے ہولٹر جھول رہا تھا، جہاں سے سیاہ پتوٹل کے دستے کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔

اس کے سامنے والے صوفے پر ایک دینگ قسم کی خاتون براجمان تھی۔ جسم بھاری، رنگ گورا، چہرہ بیضی، آنکھیں گہری تھیں۔ اس کا قد دراز تھا، اس نے بھی سندھی بلوچی کڑھائی والا پیش قیمت لباس پہن رکھا تھا اور مجموعی طور پر اس کی شخصیت میں ایک مردانہ اور رعب سا پایا جاتا تھا۔ اس کی عمر تو چالیس بیس تالیس سے چھوڑ دی تھی مگر اس کو دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ وہ دو نوجوان بچوں کی ماں بھی ہے۔ یہ رئیس ہنگل خان کی بیوی اور مہرون کی ماں حاکم زادی تھی۔

مراود نے بہن کے سلام پر کچھ کھردری سی نظروں سے

اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر روایتی انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کے سلام کا جواب دیا اور دوبارہ صوفے پر بیٹھ کر ماں سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اس کے رویے سے صاف جھلکتا تھا کہ اس نے بہن کو نظر انداز کر دیا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ یہاں زیادہ دیر نہ رہے۔ اسے اپنی بہن سے چڑھی، وجہ یہی تھی کہ وہ اس کے تعلیم جاری رکھنے اور شہر آکر پڑھنے کے حق میں ہی نہ تھا مگر چونکہ مہر کو اپنے باپ کی طرف سے اجازت مل گئی تھی اسی لیے وہ بہن کی زیادہ مخالفت نہیں کر سکا تھا مگر اس وقت وہ اپنے کسی اور ہی مطلب سے ماں کے پاس بیٹھا تھا۔ بولا۔

”بابا سائیں..... کوٹھڑا اٹھانے کی کوشش تو کریں ماں سائیں! ایک بنجر زمین کے بدلے میں ہمیں آباد اور قیمتی زمین مل رہی ہے۔“ مراد نے ماں سے کہا۔

”پت (بیٹے) اداہ پھر بھی نہیں مائیں گے، میں ان کا مزاج جانتی ہوں۔“ حاکم زادی بیٹے سے بولی۔ ”چاہے زمین کو تسم و شہر کا بجائے، رئیس سائیں، اس پردو گنا پیسا لگا کر بھی اسے بار آور کرنے کی کوشش کریں گے مگر ایک کلزائیک زمین کا نہیں بیچیں گے، وہ اسے اپنی اور خاندان کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔“

”اماں سائیں! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی.....“ مراد منہ پھلا کر بولا۔

”تم کیوں اس زمین کو بیچنے کے پیچھے بڑے ہو؟ پیسا لے کر جو زمین خریدنا چاہتے ہو، خرید لو۔“ ماں نے تجویز دی۔ مہر و خاموشی سے ماں کے قریب بیٹھ گئی تھی۔ اسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ تو بس میل ملاقات کی ایک خانہ پری کر کے جلد سے جلد اپنے کمرے میں جانا چاہتی تھی۔

”یہی تو مصیبت ہے کہ بابا بھائی پیسا بھی دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اس وقت.....“ مراد بولا۔

”ہاں تو تمہیں جاؤ کچھ دن، فصل اترنے والی ہے، پھر کیا پردا ہوگی۔“ ماں نے کہا۔

”مگر تب تک وہ پلاٹ بک جائے گا۔ موٹے کا پلاٹ ہے، ہاتھ سے کھل گیا تو کیا۔“

”کتنی قیمت کا ہے؟“ ماں نے کچھ سوچنے کے انداز میں استفسار کیا تو مراد بولا۔

”تو کروڑ.....“

”یہ تو خاصی رقم ہے۔“ حاکم زادی نے بھونچا اچکا کر کہا۔

”اسی لیے تو کہہ رہا تھا کہ درگاہ چیل شاہ والی زمین بک

گھر

سورج گرہن: جب چاند سورج اور زمین کے درمیان آ جاتا ہے تو سورج کی شعاعیں آزادانہ زمین پر نہیں آ سکتیں، اس صورت حال کو سورج گرہن کہتے ہیں۔

چاند گرہن: جب زمین سورج اور چاند کے درمیان آتی ہے زمین کے درمیان میں آنے سے چاند سورج کی کم شعاعیں لگنے سے متاثر ہوتا ہے، اس کو چاند گرہن کہتے ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر: سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت ہم مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔ سورج گرہن میں صلوٰۃ الکسوف اور چاند گرہن کے وقت صلوٰۃ الخسوف پڑھتی جاتی ہیں۔ ان دونوں نمازوں میں دو رکعت پڑھتی جاتی ہیں۔ نئے دور کے لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ چاند اور سورج گرہن تو طبی امور ہیں۔ ڈرنے اور نماز پڑھنے کی کیا نیکی بنتی ہے؟

اس بات کے جواب میں مولانا تقی عثمانی کہتے ہیں: بے شک یہ طبعی امور ہیں لیکن یہ اس وقت (قیامت) کی چھوٹی سی جھلک دکھاتے ہیں جس روز قیامت اجرام فلکی بے نور ہو جائیں گے۔ نمبر 2: جدید سائنس کی تحقیق کے مطابق سورج اور چاند گرہن کے لمحات بڑے نازک ہوتے ہیں کیونکہ سورج اور زمین دونوں میں کشش ثقل ہوتی ہے۔ اس طرح دونوں چاند کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اس دوران اگر ایک جانب کشش ثقل غالب آجائے تو اجرام فلکیہ کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے تو پھر ایسے نازک وقت میں اللہ تعالیٰ سے رجوع نہ کیا جائے تو پھر کیا کیا جائے۔

(مرسلہ: بیس خان، مانسہرہ)

ہائے توبہ آسانی یہ سودا ہو جائے گا۔ زمیندار اللہ وراپو تو تیار بیٹھا ہے اس زمین کو خریدنے کے لیے کیونکہ یہ اس کی جاگیر کے بہت قریب ہے جہاں اس نے حال ہی میں ایک بڑا وائر کورس بھی بنایا ہوا ہے۔ اس کے لیے اس بنجر زمین کو سرسبز کرنا مشکل نہ ہوگا۔

”اچھا تو اس درگاہ والی زمین کی بات تو نہیں کر رہا جہاں کچھ غریب لوگوں نے جموینڈیاں ڈال رکھی ہیں؟“ حاکم زادی نے پوچھا تو مراد نے اثبات میں سر ہلادیا۔ اس کے بعد حاکم زادی کچھ سوچتے ہوئے بیٹھ سے پولی۔

”اچھا ٹھیک ہے، میں رئیس سامع سے بات کرنے کی کوشش کروں گی مگر زیادہ امید نہ رکھنا ان سے۔“

”اماں سائز! آپ کوشش تو کر کے دیکھیں، وہ آپ کی بات نہیں ٹالتے۔“ مراد پُر امید لہجے میں بولا۔

مہر اوٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ دروازہ بند کیا اور آرام دہ بیڈ پر دراز ہوئی۔ بڑا سچائی نگینہ اس نے اپنے سر کے نیچے کر لیا اور سامنے دیوار پر لگا ہیں مجا دیں جدھر اسی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویر فریم کے ساتھ آویزاں تھی۔ اس میں کسی کوریٹ میں دفن ہوتے اور بچوں کو صحرا بہ صحرا سے مجنوں دار تلاشتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

”کون ہے وہ؟“ اس کے سوچتے ذہن نے جیسے خود سے سوال کیا۔

”کیوں اپنا تعلق مجھ سے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا؟“ دل میں ابھرنے کی صورت ابھری۔

”اور پھر یوں مجھ سے بے خبر اور لاپرواہی ہو گیا جیسے اس نے کوئی مذاق کیا ہو۔“

”ہاں! شاید اس نے کوئی مذاق ہی کیا تھا میرے ساتھ۔ جس طرح ہم اس کا تمسخر اڑا رہے تھے۔“

”ہوں! اگر یہ بات ہے تو پھر۔۔۔۔۔۔“

تاو بیلیں اور توجہات دیتے دیتے اس کے اندر بھی روایتی سی رعیت بیدار ہوئی۔ آخر کو اس کی رکوں میں ایک جاگیر دار گھرانے کا خون گردش کر رہا تھا۔

”مگر تو پھر۔۔۔۔۔۔“ کے بعد وہ کچھ نہ سوچ پائی۔ تاہم اس نے توجہ ضرور کر لیا تھا کہ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس مجنوب سے لوجان کو اس مذاق کا مزہ چکھا کر رہے گی۔

اسے ضدی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ہال خالی ہو گیا تھا۔

سائلوں نے اپنا ٹیکارا سنبھالا اور سر جھکائے

دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے فقیر منش دراز گیسو، جھکے ہوئے سر کی وجہ سے اس کے کاندھوں اور سینے تک کسی جنادر درخت کی شاخوں کی طرح جھول گئے تھے۔ وہ اب بھی زیر لب سندھ کے مشہور صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی کوئی کافی سنگتار ہاتھا۔

وہی بھید بقا کا پائیں

ہو گئے جوتا بود

وہی پٹنچے در پہ تیرے

بھولے جو بھی وجود

کرم ہو تیرا گمراہوں پر

آن کرے وہ وجود

(شاہ سائیں)

سندھیا لوجی کی عمارت سے نکل کر سانول، جب سڑک پر پہنچا تو اس کے کانوں میں چنگچی اور کیسے والوں کا شور پڑا۔

”لطیف آباد..... ٹھوڑی پھانک..... قاسم آباد.....

گاڑی کھاتے..... حیدر آباد..... گوشت سٹی ڈیرا۔“

وہ گوشت سٹی ڈیرا جانے والی ایک چنگچی کی طرف بڑھنے لگا تو کلیئر ٹائپ چھو کرے نے اسے سوار کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ شاید اسے جانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس فقیر لڑکے سے اسے کرایہ ملنے کی کوئی امید بھی عجیب بات تو یہ بھی خود سانول بھی جانتا تھا کہ اسے کوئی رکشا یا چنگچی والا سوار کرنے پر رضامند نہیں ہوگا، پھر بھی جانے کیوں وہ ہمیشہ اس میں سوار ہونے کی کوشش ضرور کرتا تھا۔

انکار پر وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا کر وہیں سڑک کنارے

تبی دھوپ کے نیچے کھڑا رہتا۔

ایسے میں کوئی خدا ترس چنگچی والے سے کہتا۔

”اڑے او..... چھو کر! بھالے اس گریب فقیر کو.....

ثواب ہی ملے گا تیرے کو.....“

اس پر وہ چھو کر ایہ کہہ کر اس خدا ترس مسافر کا منہ

بند کر دیتا۔

”اڑے بابا! تجھے ثواب کی اتنی فکر ہے تو بھر دے اس

کا بھی کرایہ..... بھالوں گا میں اسے.....“

”گھوڑا گھاس سے دوتی کرے گا تو کھائے

گا کیا۔“ کوئی منچلا مسافر جملہ بھی کس ڈالٹا۔ کچھ قہقہہ اٹھتے۔

چنگچی فل ہو کر آگے بڑھ جاتی۔ اس پر وہ مجذوب

سانو جوان زیر لب بڑبڑا کر رہ جاتا۔

”افسوس.....! دنیا کے نفع میں غرق یہ لوگ، کیسے خود

گزیدہ ہیں.....“

سانول اسی طرح دھوپ میں کھڑا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اب ہمیشہ کی طرح مسافر بس کے پیچھے لپک کر ہی کوٹھ ملی ڈیرا جانا پڑے گا۔ وہ اسی بس کا انتظار کرنے لگا۔

پچھلے کئی روز سے اس کا یہی معمول تھا۔ ٹھوڑی

دیر گزری ایک مسافر بس کھڑ کھڑاتی ہوئی وہاں آن پہنچی۔ لوگ

باگ چڑھنے اترنے لگے۔ اس نے بھی آگے بڑھ کر بس میں

سوار ہونا چاہا تھا کہ سخت دل کلیئر نے اسے بری طرح

دھکارتے ہوئے کہا۔

”اڑے ادھر کہاں آتا پڑا ہے بابا! جا ادھر پیچھے لگ۔“

اس کا اشارہ بس کے پیچھے لگے اس جھنگے کی طرف تھا جہاں

پاؤں لگا کر فقط کھڑے ہونے کی جگہ ہوتی تھی۔

”دھوپ کی وجہ سے لوہے کا وہ جنگلا بڑا تپ رہا

ہوتا ہے..... اسے پکڑ کر کھڑا ہونے سے میرے ہاتھ چلنے

ہیں..... مجھے اندر آنے دو، میں کسی سیٹ پر نہیں بیٹھوں گا،

کھڑا ہوں گا۔“ سانول نے اس سخت دل کلیئر سے انتہائی

گمراہ کادل نرم نہ ہوا اور اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ بھی

جانتا تھا کہ اس فقیر سے کوئی کرایہ نہیں ملے گا۔

مسافر بس چلنے لگی۔ سانول بھاگ کر جھنگے میں پاؤں

ٹکا کر سوار ہو گیا۔ لوہے کے اس رنگ آلود جھنگے پر نگ کر

کھڑے ہونے کے لیے ضروری تھا کہ اس پر دونوں ہاتھوں

کی گرفت بھی مضبوط کی جاتی۔ جب سانول نے ایسا کیا تو

لوہے کے، دھوپ میں تپتے ہوئے گرم سرے اس کے ہاتھوں

کو چلانے لگے۔ مجبوری تھی۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچنا تھا۔ وہ اسی

طرح جہا کھڑا رہا۔

ٹھوڑی دیر بعد بس سڑک کا ایک قوی موڑ کاٹ کر راک

گئی۔ سانول اتر گیا۔

اس کے سامنے بھر سا تپتا ہوا دیرانہ پھیلا ہوا تھا جہاں

کہیں کہیں بھر بھری مٹی والا میدان اور کچھ ٹیڈ منڈ سے

درخت بھی نظر آتے تھے۔ سڑک کے ایک طرف کھیت پھیل

ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کے پار گارے مٹی والے پختہ دھم

پختہ گھروں کی بے ترتیب قطاروں کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔

”اللہ سانیں! امیرا شکر ہے، خیریت سے اپنے ٹھکانے

پر پہنچاؤ یا اس فقیر کو.....“ سانول نے زیر لب کہا۔

”بہت خوب!“

اچانک عقب سے ایک آواز اس کے کانوں ۛ

کھرائی۔ سانول نے قدرے چونک کر اپنے عقب میں

دیکھا۔

و عاروح اور آرزو کی ہم آہنگی کا کام ہے۔ دینے والے اور لینے والے کے مابین ایک ایسے لمحے کی تخلیق کا پیش لفظ ہے جس سے خواہشوں کی تکمیل ممکن ہو سکتی ہے۔ دُعائے مانگنے والے کا تھرا ریگستان کی طرح خالی رہے ہیں جن پر پانی کی ایک بوند برسائے بغیر بادل تیزی سے گزر جاتے ہیں۔

پیدائش اور موت دو ایسے حادثے ہیں جن کے سامنے انسان خود کو بے بس پاتا ہے۔ نہ تو پیدائش کے وقت اس سے مشورہ کیا جاتا ہے اور نہ موت کے وقت اس کی رضا پوچھی جاتی ہے کہ وہ کس مقام اور کس ملک میں پیدا ہونا یا مرنا پسند کرے گا۔ چنانچہ انسان پیدائش کے وقت سچ کر اپنی جبری آمد پر مردائے احتجاج بلند کرتا ہے اور موت کے خوف میں مبتلا ہو کے اس دنیا کو چھوڑ دیتا ہے۔

خلیل جبران نے جمہوریہ لبنان کے قصبے بشریٰ میں 1883ء میں اپنی پہلی اجتماعی جج بلندی کر کے اس دنیا میں آئے کلمہ کھولی، اس روز دسمبر کی چوتھا تاریخ تھی۔

بشری وادی قادیشا کی ایک چھوٹی سی سطح مرتفع کی ایک پہاڑی کے عین کنارے پر اپنے بازو پھیلانے کھڑی ہے۔ آج وہاں تک جانے کے لیے ایک پختہ سڑک بھی موجود ہے لیکن جبران کے زمانے میں یہاں صرف ایک چھوٹی سی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی تھی۔ جو سائب کی طرح تل کھاتی ہوئی پہاڑی کی چوٹی پر چڑھتی چلی جاتی اور پھر شہر کے پہلو کو چھوتی ہوئی ایک تخت اپنا رخ پیچھے کی طرف موڑ لیتی اور سفید پتھروں اور سرخ ٹالکوں والے مکانات کے شہر کے عین دروازے میں جا داخل ہوتی۔ یہ شہر قدرتی طور پر قلعہ بند تھا۔

خلیل جبران کی تصنیف ”روح کے آئینے“ سے اقتباس
محمد آذین رضوان کے فلمی تعاون کا شکریہ

ایک چمیرے جسم کا قدرے دروازہ آدی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دھوپ کا سیاہ چشمہ لگا ہوا تھا۔ وہ کلین شیو اور بیش قیمت سوٹ میں بلیس تھا۔ عمر اس کی پینتیس، چالیس کے درمیان ہی رہی ہوگی۔ سانول نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر اس کے اطراف میں دیکھنے لگا۔ کچھ سوچ کر اس کی آنکھوں میں ابھمن سی تیر گئی۔ وہ سوچنے لگا، کیا یہ آدی اسی کچھ بچھری بس سے اڑا تھا؟ مگر اس کا قیمتی اور بے شک لباس اس کی نفی کرتا نظر آتا تھا۔ وہ خوش ہوشاک شخص بھی کوئی زیرک دماغ تھا۔ وہ سانول کی گردش نظروں میں بالکورے لپٹی ابھمن کا مطلب سمجھ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں اس بس میں سوار نہیں تھا مگر اس کے پیچھے ضرور چلا آ رہا تھا.....“ پھر اس نے اس طرف اشارہ کیا، جہاں قوسی موڑ پر اس کی بننے ماڈل کی کار کھڑی تھی۔ ”اس طرف میری گاڑی کھڑی ہے۔ آؤ، اس طرف چلتے ہیں۔“

سائل حیران حیران سا اس کے ساتھ چل دیا۔ چند قدموں کے فاصلے پر ہی وہ اس کار کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ وہ اپنی شخص کار کا دروازہ کھول کر اس سے مسکرا کر بولا۔ ”آجاؤ، اندر بیٹھتے ہیں۔ باہر سخت دھوپ اور گرمی

اور یہی ہے۔ میری کارائیر کنڈیشن ہے۔“
سانول اس کی طرف دیکھ کر ہوا۔

”صاحب! میں اس جلتی سلتی دھوپ اور گرمی کو برداشت کرنے کا عادی ہو چکا ہوں، اس کے لیے کسی ایئر کنڈیشننگ سہارا نہیں لیتا..... بس! ایک تصور کر لیتا ہوں اور پھر مجھے یہ جلتی دھوپ اور سلتی گرمی بالکل اثر نہیں کرتی۔“

”اچھا!“ وہ شخص ہنوز کار کا دروازہ کھولے اس کی طرف دلچسپ نظروں سے دیکھتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔ ”کیا تصور کرتے ہو تم؟“

”جہنم کی آگ کا.....“ سانول نے اپنی آنکھیں
موندنے کے انداز میں کہا اور بے اختیار اس اجنبی آدمی کے
منہ سے نکلا۔

”واہ..... سبحان اللہ.....“

”میرا خیال ہے تم مجھے ثواب کمانے کی تو توفیق سے محروم نہیں کرو گے۔ آؤ، کار میں بیٹھ جاؤ، میں تمہیں تمہارے ٹھکانے تک چھوڑ آتا ہوں۔“

آدمی ذہین تھا۔ اس نے اسی کے انداز میں کہا تھا۔
سانول سوچنے لگا پھر بولا۔

”اگر تم میری خاطر کوئی زحمت کرنے لگے ہو تو..... یہ ثواب کہیں مجھ پر بھاری نہ پڑ جائے کیونکہ ثواب اگر احسان کے ترازو میں آجائے تو ثواب کم اور احسان کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ احسان بہت جلد حساب کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور حساب چکنا کرنے کی مجھ غریب میں نہ طاقت ہے نہ اوقات..... اسی لیے مجھے اب باقی کاراستہ پیدل ہی طے کرنے دو تو زیادہ بہتر ہے۔“

یہ کہہ کر سائل واپسی کے لیے مڑا تو اس آدمی نے

۱۔ نگار۔

مگر بی بی جی! آپ کی شادی کو کبھی کئی سال بیت گئے ہیں۔ انسان کو اپنی ہی بھی تو کوشش کر کے دیکھنی چاہیے۔
”کیا مطلب؟“ حیانے کچھ اطمینان آمیزی لگا ہوں
سے اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے
ہوئے آگے بولی۔

”آپ نے..... میرا مطلب ہے، آپ اور صاحب
جی نے کبھی کسی ڈاکٹر سے رجوع نہیں کیا؟ کبھی کوئی مشورہ وغیرہ
اس سلسلے میں؟“
حیا اس کی بات سن کر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ
گئی۔ بولی۔

”میں تو کب سے یہ چاہتی آ رہی ہوں..... مگر.....“
”مگر کیا بی بی جی؟“ بخشناں نے حیرت سے اس کی
طرف دیکھا۔ ”اللہ سامعین کا دیا آپ کے پاس سب کچھ
ہے، آپ تو ایک سے ایک دڑے ڈاکٹر یا ڈاکٹرنی کو دکھا سکتے
ہیں۔ اس سے فائدہ ہوتا ہے بی بی جی! میں تو یہی نری جاہل
اور ان پڑھ مگر میں جس پنگلے میں پہلے کام کرتی تھی، وہاں ایک
بے اولاد جوڑا رہتا تھا۔ ان کی شادی کو کبھی بہت عرصہ بیت
چکا تھا مگر انہوں نے ڈاکٹروں سے رابطے میں خود کو دکھا تھا اور
ایک دن اللہ نے انہیں ایک بچہ دوںے دے دیے۔ طلاج
کا تو حکم ہے نالی بی بی جی! بانی دعا.....“

”تم ٹھیک کہتی ہو بخشناں!“ حیانے کہا۔ ”مگر تمہارے
صاحب جی نہیں مانتے، کہتے ہیں کہ اللہ نے جب دینا ہوگا
ایسے ہی دے دے گا۔“

”ان کی بات بھی ٹھیک ہے مگر بی بی جی!.....“ نائی
بخشناں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”ہاں..... ہاں، بولو۔ تم خاموش کیوں ہو گئیں؟“
حیانے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”پتا نہیں بی بی جی! آپ یقین کریں یا نہیں مگر سنا تو
ہے اور دیکھا بھی ہے ایک حد تک کہ اگر کوئی بے اولاد جوڑا کسی
ایسے غریب اور نیم لڑکے کو جو نیک اور پرہیزگار بھی ہو، اس کی
کفالت اپنے ذمے لے لے تو اللہ سامعین ایسے بے اولاد
جوڑے کی مراد ضرور پوری کرتا ہے۔“

”اچھا.....!“ حیانے دلچسپی لیتے ہوئے اس کی بات کو
بڑے دھیان سے سنا تھا۔

”جی بی بی جی! ہماری کٹھ میں بھی ایک زمیندار بی
تھی۔“ بخشناں آگے بولی۔ ”اس بے چاری کے بھی اولاد نہیں
تھی۔ کسی نے انہیں بھی مشورہ دیا تھا۔ اس کا شوہر تو نہیں
مانتا تھا مگر اس کی بیوی نے چوری چھپے ایک غریب اور نیم

ٹھاوی کو چار سال ہو چکے تھے۔ اولاد تو ابھی تک نہیں ہوئی تھی
تاہم وہ اب پچھلے چند ماہ سے امید سے تھی۔ وہ اسی کے پاس
رہتی تھی۔ ان تینوں کا دنیا میں اور کوئی نہ تھا اسی لیے دکھ سکھ میں
پوتیوں ہی ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔

اس وقت مائی بخشناں نے ہی اس کے کمرے کے
دروازے پر دستک دی تھی۔

”آجاؤ.....“ اس نے فریم بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھ
دیا اور جلدی سے اپنی آنکھوں کے گوشے پونچھ ڈالے۔

وہ بیڈ پر ہی بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلا اور ایک فریبی ادھیڑ
مرد یہاں عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے حیا کو سلام کیا۔ وہ
آج دیر سے آئی تھی۔

”خیریت تو ہے اماں! آج ٹوٹے آنے میں دیر
لگا دی؟“ حیانے پوچھا۔

مائی بخشناں قافین پر چند قدم چلتی ہوئی اس کے قریب
آگئی اور بولی۔

”بی بی جی! وہ بشر اس کی طبیعت خراب تھی نا..... آپ
کو بتاتا ہے آج کل میں وہ ماں بننے والی ہے..... بس، اسی
کی فکر رہتی ہے۔ دعا کرو بی بی! اللہ سامعین کبھی کبھیریت سے یہ
مشکل وقت نکال دے۔“

اس غریب عورت کا چہرہ اترا اترا سا تھا۔ حیا کو یہ بات
معلوم تھی وہ قدرے خوش ہو کر بولی۔ ”ارے تو اس میں اتنا
پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ ان شاء اللہ اچھا ہی ہوگا جو ہوگا۔
لہے خوش خبری دی ہے تو اسے پورا بھی وہی کرے گا۔“

”اللہ سامعین آپ کی زبان مبارک کرے بی بی
لی! آمین.....“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”اماں! تم سے ایک بات کہوں؟“ حیانے آخر میں
س سے کہا۔

”جی بی جی! کہو، کیا بات ہے؟“ وہ اس کی طرف دیکھ
کر بولی۔

”تم میرے لیے بھی دعا کیا کرو۔“

”ہائے بی بی جی! کیوں نہیں، میں تو اچھے بیٹھے آپ
کے لیے بھی دعائیں کرتی ہوں کہ اللہ سامعین آپ کی بھی گود
اللہ ہری کر دے۔“ مائی بخشناں بولی پھر ایک ذرا توقف کے
بعد اس نے کچھ کہنا چاہا مگر کہتے کہتے رک گئی جبکہ حیانے فوراً
ناپ لیا، وہ بولی۔

”ہاں..... کہو، تم کچھ کہنا چاہتی تھیں اماں؟“

اس کے اسانے پر مائی بخشناں کچھ کٹکٹ سے لہجے میں بولی۔

”بی بی جی! ہوتا تو یہ سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہی ہے

لڑکے کی کفالت اپنے ذمے لے لی تھی۔ بس پھر کیا تھا، سال
دوسال میں ہی اس کے آگن میں پھول گل اٹھا تھا۔“

”کیا ایسے لڑکے کو ساتھ رکھا جاتا ہے؟“ حیانے پوچھا۔
”نہیں بی بی جی! یہ ضروری نہیں ہوتا۔ بس، اس کے
ایسے کہیں بھی ایک مستقل ٹھکانے اور کھانے پینے کا بندوبست
کر دیا جاتا ہے۔ چاہے ایک چھپر ہی کیوں نہ ہو۔“

”اچھا!“ حیا گو کو سے لہجہ میں بولی اور سوچتی رہ گئی۔
تاہم اس نے مائی بخشاں کی یہ بات اپنے پہلے سے باندھ لی
تھی اور اس نے اپنے شوہر صنفدر سے بھی اس سلسلے میں بات
کرنے کا پورا تہیہ کر لیا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ وہ اس کی
بات رد نہیں کرے گا۔ مگر ایسا لڑکا جو نیک اور شریف، عبادت
گزار بھی ہو، کہاں تلاش کیا جاسکتا ہے۔؟

تاہم اس نے اسی دن یہ بات صنفدر کے بھی ذہن میں
ڈال دی اور اس نے حیا سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس کی یہ
خواہش بہت جلد پوری کرنے کی کوشش کرے گا۔۔۔۔۔

☆☆☆

وہ نئے ماڈل کی کروڑا کار کچے اور دھول اڑاتے بل
کھاتے راستے پر مناسب رفتار سے دوڑتی ہوئی چند ہی منٹ
میں ایک ایسی جگہ پہنچی جہاں ایک خالی پلاٹ پر گھر نما جگیاں
بنی ہوئی تھیں۔ گارے مٹی کے لیپ زدہ دیواروں اور گچی کی
چٹائیوں سے بنی چھتیں تھیں ان پر۔۔۔۔۔

سانول کار میں اس آدی کے برابر والی سیٹ پر گرم صم
سابٹھا تھا۔ آبادی آتے ہی اس نے ایک طرف اشارہ کرتے
ہوئے اس سے کہا۔

”بس سائیں! یہاں روک دیں گاڑی۔“

”ارے! یہ تو کوئی درگاہ لگتی ہے۔ تمہارا کوئی گھر نہیں

ہے؟“ اس آدی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ کار ایک
گارے مٹی کی چھار دیواری کے سال خوردہ سے پھاٹک کے
سامنے کچھ کررک گئی تھی۔ اندر مڑی سی بنی ہوئی تھی جس کی کھلی
چوکھٹ سے رنگین اور ریشمی چادر بچ چڑھی ہوئی ایک قبر کی
جھلک نظر آتی تھی۔ پھاٹک کی پیشانی پر کڑھائی کی ہوئی چادر
پر سنہری تاروں سے لکھے الفاظ میں ”سائیں جمیل شاہ درگاہ“
لکھا ہوا تھا۔ درگاہ کی جنوبی دیوار کی جانب کچی دیواروں کی
مجبوری بنی ہوئی تھی۔

”میری جھوپڑی اس کے پیچھے بنی ہوئی ہے۔“

سانول نے مختصر جواب دیا۔ ”میں اب اتروں گا یہاں۔“ یہ
کہتے ہوئے وہ دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈور پاور
لاکڈ تھے۔

”تم برائہ مانو تو میں بھی نیچے اتر کر ذرا اس کی زبا دھو
کر لوں؟“ اس آدی نے کہا۔

”ضرور سائیں! کیوں نہیں، یہ دروازہ نہیں کھل رہا۔“
سانول نے دروازے پر زور آزمائی کرتے ہوئے کہا تو آدی
نے ہاتھ بڑھا کر کٹن دیا یا اور دروازہ کھول دیا۔

تھوڑی دیر میں دونوں کار سے اتر آئے اور پھاٹک
سے اندر کچے احاطے سے گزر کر صحن میں آ گئے۔ وسط میں
پتیل کا چھتیار چبڑ تھا۔ ایک جانب چھوٹا سا حجرہ نما کمر بنا ہوا
تھا، وہاں اس آدی کو ایک عمر رسیدہ شخص بیٹھا کھاٹی دیا۔ اندر
تمباکو کا دھواں سا پھیلا ہوا تھا۔ یہ یہاں کا مجاور لعل تھی تھا۔ وہ
سانول کے ساتھ ایک خوش پوشاک آدی کو دیکھ کر ہاہ
آ گیا۔ جبکہ وہاں اور لوگ بھی موجود تھے۔ مرد عورت، بوڑھے
بھی تھے ان میں۔۔۔۔۔ وہ سب پتیل کے اطراف میں بچھی میلی
دری پر بیٹھے تھے نما تول پران کی نظر پڑتے ہی وہ سب اس کے
آگے ہاتھ جوڑنے لگے اور یہ آواز بلند کورس میں ”سائیں شاہ
آ گیا۔۔۔۔۔ سائیں شاہ آ گیا۔۔۔۔۔“ نکالنے لگے۔ خوش پوشاک بڑے
غور اور پرسوج نظروں سے یہ سب دیکھ رہا تھا اور ہولے ہولے
اپنا سر بھی دھن رہا تھا جبکہ سانول کے چہرے پر کچھ ناگواریت
اور پریشانی کے تاثرات ابھرے تھے۔

خوش پوشاک آدی نے مختصر سے مقبرے کے اندر تنگ
سی چوکھٹ کو سر جھکا کر پار کیا اور قبر کے پاس کھڑے ہو کر اپنا
دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا پڑھی پھر باہر آ گیا۔

سانول کے ساتھ وہ مجاور نما آدی کھسر پھسر کر رہا تھا اور
اس آدی کی طرف اشارہ بھی کیے جا رہا تھا جبکہ سانول اس
سے برہمی کے انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کا اشارہ وہاں
موجود ان لوگوں کی طرف تھا جو سی کھٹھ سے تعلق رکھتے
تھے۔ جب وہ خوش پوشاک ان کے قریب آیا تو اس نے
سانول کو اس ادھڑ عمر مجاور لعل تھی سے کہتے سنا۔

”تو ان کو یہاں آنے سے منع کیوں نہیں کرتا کیوں
لگا رکھا ہے تو نے یہ دھندا؟ میں یہ باتیں پسند نہیں کرتا۔“

”سلام بابو سائیں!“ ادھڑ عمر مجاور لعل تھی نے خوش
پوشاک کو قریب آتے دیکھ کر فوراً سلام کیا۔ وہ خاصا موٹا سا
تھا۔ رنگ خاستری اور جسم پر صرف ایک میلی پٹی سی صدری
اور نیچے لاک (لنگی) باندھی ہوئی تھی۔ ناک موٹی تھی اور
آنکھیں متورم سی نظر آتی تھیں۔

اس آدی نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر اپنی
جیب سے ایک بڑا نوٹ نکال کر صحن میں ایک طرف رکھے ٹھکانے
کے ڈبے میں ڈال دیا۔ مجاور لعل تھی کی متورم سی آنکھوں میں

اس آدی نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر اپنی
جیب سے ایک بڑا نوٹ نکال کر صحن میں ایک طرف رکھے ٹھکانے
کے ڈبے میں ڈال دیا۔ مجاور لعل تھی کی متورم سی آنکھوں میں

اس آدی نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر اپنی
جیب سے ایک بڑا نوٹ نکال کر صحن میں ایک طرف رکھے ٹھکانے
کے ڈبے میں ڈال دیا۔ مجاور لعل تھی کی متورم سی آنکھوں میں

واپس لوٹ رہا تھا۔ سارے راستے وہ اپنے ہونٹ بھیجنے کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد ایک گہری سانس خارج کر کے اس نے کاری رفتار بڑھا دی۔

کئی سڑک پر آتے ہی رفتار مزید تیز کر دی۔ اب وہ کار دوڑاتا ہوا اپنی رہائش گاہ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی کار جا مشورہ کی ایک بڑی سی رہائش گاہ کی کالونی میں داخل ہو گئی۔

سندھ یونیورسٹی ہاؤسنگ سوسائٹی کے فیزنبر آٹھ میں ”کاشانہ حیا“ کے نام سے موجود بنگلا تقریباً تین سو گز کی قطعہ اراضی پر بنایا ہوا تھا جس کے گیٹ کے سامنے اس خوش پوشاک شخص نے کار روک دی تھی۔ یہ ایک منزلہ بنگلا تھا اور حال ہی میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ فیزیکل طور پر ہائٹی پروجیکٹ تھا مگر یہاں اب بھی تعمیراتی کام زیر تکمیل ہی نظر آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بیشتر پلاٹ اب بھی خالی تھے اور کچھ میں مکانوں کے ڈھانچے استادہ نظر آتے تھے، کچھ کی بنیادیں کھدی ہوئی تھیں۔

مذکورہ بنگلے ”کاشانہ حیا“ کے ارد گرد کی زمین بھی خالی تھی۔ چند پلاٹ چھوڑ کر کچھ مکانات نظر آتے تھے۔

یہاں شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ بنگلے پر ویرانی سی اترنے لگی تھی۔ چونکہ ار نے ”صاحب“ کی کار پہنچاتے ہی فوراً گیٹ کھول دیا۔

کار پورچ میں روکنے کے بعد وہ خوش پوشاک بیچے اتر اور اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ہی اسے اپنی بیوی حیا کا اداس چہرہ نظر آ گیا۔ اس کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔

”صغدر! آپ آگئے.....“ حیا نے شوہر کو دیکھ کر ہولے سے کہا اور صغدر نامی اس خوش پوشاک آدمی نے محبت بھرے انداز میں اپنے دونوں بازو پھیلادے۔

☆☆☆

رات ہو چکی تھی۔ آبادی میں سناٹا طاری تھا۔ جھجیوں اور جھونپڑیوں پر مشتمل یہ آبادی پناہ گزین کا تارپش کرتی تھی۔ جمیل شاہ کی اس مختصر سی سال خوردہ درگاہ کے ناپختہ احاطے میں ہلکی روشنی متحرک تھی جو اندر قبر کے سرہانے رکھے چراغ سے آ رہی تھی۔

احاطے میں بنی ایک کٹھری میں فرش پر نیلی کچلی سی کچھی دری پر وہ موٹا سا مٹوم آٹکھوں والا مجاور بڑا خرائٹ لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سانول لیٹا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آج نیند کوسوں دور تھی۔ وہ آج بہت بے چین سا ہو رہا تھا۔ اسے کسی طور بھی فراموش نہیں مل رہا تھا۔ جب بے چینی بڑھ گئی تو وہ اٹھا اور کچے صحن میں آگیا جہاں پتیل کے درخت پر سوگاری

ہلک سی ابھری۔ وہ خوش پوشاک آدمی بڑے غور سے اطراف کا جائزہ لیتا رہا، تب ہی اسے حجرے نما کٹھری کی کھلی پوکٹ سے اندر کچھ کتابوں کی جھلک نظر آئی۔ اس نے سانول سے کہا۔

”کیا میں اس کٹھری کے اندر جا سکتا ہوں؟“
”ضرور بابو سامیں! کیوں نہیں، آئیں میرے ساتھ۔“ سانول نے کہا اور پھر اسے لیے اندر آ گیا۔
خوش پوشاک آدمی بڑی دلچسپی سے اس کچی اور مختصر کٹھری کا جائزہ لینے لگا۔

نا پختہ فرش پر کچھی کی مٹی سی چٹائی تھی..... اس پر رلیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف دیوار کی مٹی کھود کر کتابوں کی شیلیف سی بنائی گئی تھی۔ اس میں سندھ کے مشہور صوفی شاعروں کے صوفیانہ اور اللہ کی محبت میں کہے گئے کلاموں کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ دیگر شاعری اور فلسفے کی کتابیں بھی وہاں رکھی نظر آئیں، جنہیں دیکھ کر خوش پوشاک کو یقین ہی نہیں آیا کہ ایسی خاک پر جگہ میں علم و ادب کا یہ خزانہ بھی اسے دیکھنے کو ملے گا۔

”حیرت ہے، یہ کتابیں کس کی ہیں اور کون انہیں پڑھتا ہے؟“ اس نے پوچھا تو وہ خود اس کی حیرت پر حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”کیوں بابو سامیں! آپ کو کیوں حیرت ہوئی یہ کتابیں دیکھ کر؟ یہ عام سی کتابیں ہیں جن کا ہر کوئی مطالعہ کر سکتا ہے۔“

”ہاں! تم صحیح کہتے ہو۔“ خوش پوشاک کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ صادر کرتے ہوئے بولا۔ ”بس یونی، میں نے سوچا کہ یہاں کون پڑھا لکھا ہوگا۔“

”میں زیادہ تو پڑھا لکھا نہیں ہوں بابو سامیں! پردس جماعتیں میں نے پڑھ رکھی ہیں۔ یہ کتابیں پہلے سے ہی یہاں موجود تھیں۔ اب میں انہیں پڑھتا ہوں، بلکہ بار بار پڑھتا ہوں۔“ سانول نے جواب دیا۔ ایسے ہی وہ مٹوم آٹکھوں والا مجاور بھی اندر آ گیا تھا۔ خوش پوشاک بولا۔

”اچھی بات ہے، میں اب چلوں گا.....“
”بابو سامیں! کوئی لسی پاؤں سیو؟“ مجاور لعل تنی نے اس آدمی سے کہا تو اس خوش پوشاک آدمی نے ایک پرخوری ۵۰ اس کے چہرے پر ڈالی اور بولا۔

”نہیں! شکریہ..... شاید میں یہاں دوبارہ آؤں، ابھی ہلکا ہوں.....“

وہ یہ کہہ کر باہر آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کاریں

طاری تھی۔ ہلکی ہوا میں اس کے بچے سرسراتے تو یوں لگتا جیسے آہیں بھر رہے ہوں۔ اس کے سر پر کھلا تاروں بھرا آسمان تھا۔ وہ چوکت نما کھٹے پھاٹک سے باہر نکلا۔ دور کہیں آوارہ جانوروں کا شور ابھر رہا تھا۔ سانول درگاہ کی چمکی دیوار کے ساتھ ساتھ تاریکی میں چلتا ہوا، عقب میں بنی مسجد میں داخل ہو گیا۔ اندر بھی کی چٹائی بچی ہوئی تھی۔ یہاں بھی ایک حلقے میں چراغ روشن تھا۔ مسجد میں سناٹا تھا۔ اس نے ایک طرف احاطے کے کونے میں لگے ٹکے سے وضو کیا اور بھیجی کی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ پہلے دو نفل نماز پڑھی۔ اس کے بعد دعائیہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیے۔

”اللہ سامیں! میں تیرا گناہ گار اور ایک عاجز بندہ ہوں۔ میرے مقدر میں کیا لکھا ہے یہ تو ہی بہتر جانتا ہے۔ دنیا کی محبت میں بے چینی اور پریشانی کے سوا کچھ نہیں، لیکن تیری مخلوق سے محبت بھی تو ایک عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ مگر جب یہ محبت کسی فرد واحد کی ذات تک محدود ہونے لگے تو انسان خود سے بھی بے خود ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو بھلانے لگتا ہے۔ اسے محبوب کا درجہ دیتا ہے اور پھر بس وہ ہوتا ہے اور اس کا محبوب..... جو جسمانی طور پر نہیں تو روحانی طور پر ضرور ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اللہ سامیں! تیری عبادت کا جب سے مزہ چکھا ہے، ایک بات کا مجھ پر بھی انکشاف ہوا ہے کہ..... کبھی کبھی انسان اور اللہ کا معاملہ بہت ذاتی ہو جاتا ہے..... ایک بندہ اپنے رب سے وہ سب بلا جھجک کہہ ڈالتا ہے، جو وہ کسی بشر کے سامنے نہیں کہہ سکتا۔ میں بھی اپنے محبوب سے وہ سب نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ میری اور اس کی حیثیت میں بہت فرق تھا۔ میرا منہ چھوٹا تھا اور بات بڑی مگر اللہ سامیں! یہ صرف تیری ذات ہے جو جتنی بڑی ہے، اتنا ہی چھوٹا بشر بھی تجھ سے بلا جھجک اپنے دل کی بات کہہ ڈالتا ہے اور تو اس کی سزا بھی ہے۔ یہی وہ..... امید ہے چاہے کتنا ہی گناہ گار انسان ہو، تو بے کی امید پر تجھ سے ہمکلام ہو کر اپنا اور تیرا معاملہ ذاتی بنا ڈالتا ہے۔ میں بھی ایک ایسا ہی گناہ گار انسان ہوں اور اسی امید پر تجھے نکارتا ہوں کہ بس! مجھے ثابت قدم رکھ کہ میں تیری رسی کو پڑے رکھوں، آمین!“

سانول عبادت اور دعا سے ہڈی ہڈی ہوا ایک بار پھر دو کھٹ لٹل نماز پڑھی۔ اس کے دل کو اندر سے سکون پہنچا۔

☆☆☆

مہر نے اپنے دل و دماغ پر بہت زور دیا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے بچپن تک کی یادوں کو کھنگلاتا تھا مگر اسے کچھ یاد نہیں

آسکا تھا کہ وہ کس حوالے سے اس نوجوان فقیر سانول کو ہال رہی ہے یا وہ اسے جانتا تھا۔

”شاید میری موروثی امارت نے میری بچپن کی یادیں، کوئی فریٹش“ ہونے نہیں دیا۔“ وہ سوچنے لگتی۔

”یا پھر شاید میری یادوں کی پٹاری میں ایسا کچھ خاص تھا ہی نہیں کہ مجھے اسے یاد کرنے کی ضرورت پڑتی لیکن میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ میری یادوں کی خاموش جھیل میں کوئی نگر پڑا ہو۔ ایسا کچھ ضرور ہوا ہے، جس نے یاد رفتگاں کے دل میں کسی پہل کی گونج پیدا کی ہے۔ کچھ تو ہے پردہ زور نگار ہے۔“

پھر اچانک ہی یہ سب سوچتے ہوئے اس کے دل میں ایک خیال ابھرا..... کی اپنے کے ساتھ بچپن کی یادوں کو کرید ا جائے اور کچھ یاد بھی آئے تو وہ اپنا اسے تھوڑا بہت کچھ نہ کچھ تو یاد دلا ہی دیتا ہے۔ اگر خود سے کچھ یاد نہ آئے..... وہ اپنا کون تھا..... جو اس کے ساتھ بچپن کی باتوں کو شیرازہ کر سکتا تھا اور کچھ ہنسنا سکتا تھا تو..... وہ فی زمانہ اس کی سب سے پرانی، گہری اور وفادار سہیلی، کوئی اور نہیں اس کی ماں ہی تھی کیونکہ ہر ماں اپنی بیٹی کی ”بھئی“ بھی ہوتی ہے۔

حاکم زادی ابھی ادھر ہی تھی۔ وہ اس کے کمرے میں جا پہنچی۔

”اماں کی جان..... کیا بات ہے، تیرا چہرہ کچھ پریشان پریشان سا نظر آتا ہے؟“ حاکم زادی کی گھاگ ٹکا ہوں لے بیٹی کے چہرے کو دیکھتے ہی پوچھا تو مہر نے خود کو سنبھالا۔ وہ اپنی ”بھئی“ سے کچھ ایسا چاہتی تھی کہ اس سے اپنے مطلب کی بات بھی پوچھ لے اور اسے شک بھی نہ ہو۔ چنانچہ اس نے لہرا اپنے چہرے پر سرکراہٹ سجائی اور ماں کے قریب آکر اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں تو ماں نے بھی مستابھرے انداز میں اسے خود سے لپٹا لیا اور اسی لہجے میں بولی۔

”میری دھی رائیں! (میری رانی بیٹی)..... کیا بات ہے، اتنا پکارا کر ہے ماں پر.....؟“

”اماں جانی! ایک بات پوچھوں.....؟“ مہر نے فوراً کہا۔

”ہاں..... ہاں! پوچھو رائیں.....؟ کیوں نہیں.....؟“

حاکم زادی اپنی بیٹی کو پیار سے ”رانی“ ہی کہتی تھی۔ مگر اب آگے بڑھنے کی خدمت منوانا مجھ سے، میں نے مہر سے بیو (باپ) کو بچتا راضی کرنا تھا کر لیا..... اب بس یہ اگلے سال گزار لے، اس کے بعد ہم بھی تیرے فرض سے آزاد ہو جائیں۔“ حاکم زادی نے اپنی بیٹی کے دلا کر اور ہی مل دیے تھے۔

”پر یہ سب کم کیوں پوچھ رہی ہو؟“
”بس! ایسے ہی پوچھ رہی تھی اماں جانی!“ وہ مسکرا کر
بات بتاتے ہوئے بولی۔ ”میری یونیورسٹی کی سہیلیاں ہیں
..... اپنے اپنے بچپن کی باتیں شیئر کرتی ہیں مگر مجھے اپنے
بچپن سے متعلق ایسا کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ پھر وہ کہتی ہیں کہ
تمہارے جیسے بڑے اور جاگیدار گھرانوں کے بچے اپنی
مرات کی وجہ سے چھار دیواری سے باہر نکلتے ہی نہیں..... تو
میں ان کا یہ خیال غلط ثابت کرنا چاہتی تھی۔“ مہر نے بڑی
دلجوئی سے بات تالی تو اس بولی۔

☆ ☆ ☆
اگلے دن صبح یونیورسٹی کا ایک لکچر ”مول“ کر کے وہ سندھیالو جی جا پہنچی۔ اس لمحے اس کے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ وہ خود ایک ریشم زادی تھی۔ اسی سبب نے آپ پر اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ ایک فقیرنش جو جوان بن کر کیوں دلچسپی لینے لگی تھی؟ شاید وہ اس سے اسی لیے متاثر ہونے لگی تھی کہ وہ اس کا بچپن کا چاچا بنے والا تھا؟ اس بات کو دیکھی اگر ہنس اور مذاق میں اڑا دیا جاتا تو پھر یہ سوال ایک معلوم سے جذبے کو ابھارتے ہوئے اپنی یہ جگہ بناتا تھا کہ..... مائی وزیر اس کے بچے سچاول (سانول) نے اسے بیک پک یاد کرادھا تھا تو وہ بچکانہ جذبے دل آج ایک تناور درخت بن گئی تھی۔ اس لیے اس نے کیا بچپن کا اتنا پختہ ہو سکتا ہے؟ اس نے خود سے سوال کیا، جس کا جواب دماغ نے فوراً ہی رو کر دیا۔
”ہرگز نہیں، ہاں! ایسا تب ہو سکتا تھا جب بچپن کا یہ

”اماں سائے! میرا بچپن زیادہ تر کہاں بیتا تھا؟“ اس کی بات سن کر حاکم زادی ہنس پڑی۔

”یہ تجھے ایک دم کہاں کی سوچھی..... کیا کچھ کھو گیا ہے میرا بچپن میں.....؟“ اماں نے تو خدا جان کر یونی ازراہ نصیحت کہہ ڈالا تھا مگر اس نے مہر و کواپوں آپ ہی کچھ اگلنے پر مجبور کر ڈالا۔

”کسک..... کچھ نہیں اماں سائیں!“ وہ ایک دم سنبھلی
 لڑکھات رکھنے کے لیے مسکرا کر ماں سے بولی۔ ”ہٹاؤ اماں!
 بھرا بچپن کہاں اور کیسے مرزا؟ کیا کٹھ میں ہی اپنی سہیلیوں
 کے ساتھ کھیلے ہوئے ناچ رہا ہیں شہر میں.....؟“
 ماں کو پھر ہنسی آ گئی۔ ”تیرا بچپن نہیں گیا ابھی تک، وہی
 بچوں والی مندر کرنی نا..... اچھا بتاتی ہوں۔ تیرا بچپن شہر میں
 نہیں مگر کٹھ میں حویلی کے اندر ہی مرزا ہے۔“
 ”اس وقت حویلی کے اندر اور کون تھا بھلا میری
 لڑکھائی..... جس کے ساتھ میں کھیلے تھی؟“
 ”تیرا اچھا، مراد.....“

”اور..... اور.....“ ماں جیسے یاد کرنے لگی، پھر یک دم بولی۔

”اچھا.....!“ مہرونے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

نام..... نام..... حام زاوی سوچنے

”میرا نامی وزیرالدا سے ہے۔ اس سے رہنمائی کرو۔“

اس نام پر مہر وکاول یکمارگی زور سے دھڑکا تھا۔

۔ سانول تیرادل بہلانیے کی بہت کوشش کرتا تھا۔ مراد

9 سسپینس ڈائجسٹ

ساتھ لاکھنے تک اکٹھے رہتا تو اور بات تھی۔ وہ اسے پونہی متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہے، تاکہ وہ (مہرو) اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جائے۔

”یہ کوئی دلی دلچسپی تھوڑی ہے۔“ اس کے دماغ نے تاویل پیش کرنا چاہی۔ کچھ اتانے بھی اسے کھد بڑا تھا۔

”میں تو فقط یہ جانتا چاہتی ہوں کہ آخر اس انوکھے اور مہذب نوجوان نے اپنا لہجہ میرے ساتھ جوڑنے کی کیوں جرات کی ہے؟ یہ تو محض ایک کھوجنا ہے۔۔۔۔۔ اور بس۔۔۔۔۔“

دل نے معنی خیز مسکراہٹ سے توجیہ پیش کی۔
”اچھا!۔۔۔۔۔ تو ریس زادی تم کیوں اس بات کو اتنی اہمیت دینے لگیں؟ نہ جانے یہاں کتنے ہی لوگ کتنی ہی بے پرکی اڑاتے ہی رہتے ہیں، کون اس پر دھیان یا توجہ دیتا ہے تو پھر تم کیوں اس قدر سنجیدہ ہو گئیں بی بی؟ مت جھٹلاؤ اس حقیقت کو کہ تمہارے دل کے خانہ نہاں میں کوئی جذبہ گھر کر رہا ہے۔“

دل کے اس سوال پر اتانے غلبہ کیا۔
”کیسی قسم کی کوئی سنجیدگی نہیں ہے۔ محض ایک جستجس ہے اور جستجس انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔“

اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب اس کے پاؤں سندھیا لوجی موزیم کے چکنے اور نیلے ٹانگوں والے فرش پر پڑے۔ وہ چوگی اس وقت جب اس کے کالوں سے وہی صوفیانہ کلام گنگناتنے والی آواز نکلتی۔

سیپ سمندر میں ہوتی ہے۔۔۔۔۔ مگواس کا سہارا بادل ہے۔
اسے سچا موتی تب ہی نصیب ہوتا ہے۔۔۔۔۔
جب وہ گہرے پانیوں میں بھی پیاس سہتی ہے۔۔۔۔۔
(شاہ سائیں)

آہ۔۔۔۔۔ کیا ہے اس آواز میں، کیسا جادو ہے، کیا نفسوں ہے کہ یہ مجھے بے اختیار اس کی جانب کھینچے جانے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ اس کے دل کے نہاں خانے میں یہ سوال ابھرا۔ پھر اس کی مشتاشی ہی لگا نہیں اسی آواز کی جانب اٹھتی چلی گئیں۔ وہ مہذب سافیر منش نوجوان اسے نظر آگیا۔ اسی طرح دیکھتا رہا سنبھالے چوٹی اسٹول پر بیٹھا تھا وہ اور سندھ کے صوفی شاعروں کی کافیاں۔۔۔۔۔ گنگناتنے جا رہا تھا۔

”اسے اتنی اچھی شاعری آتی ہے، ذوق بھی اعلیٰ درجے کا رکھتا ہے۔۔۔۔۔ پھر تو یہ پڑھا لکھا بھی ہوگا۔ اس کا تو نام بھی شاعرانہ سا ہے، سانول۔۔۔۔۔“ مہرو نے اس نوجوان کے متعلق سوچا اور پھر کشاں کشاں اس کے قدم اسی کی طرف اٹھنے لگے۔

جن کاتن تیج، من تیج کا دانہ ہوتا ہے اور دل یکساں۔
ان کی طلب کی تائیں وحدت کے سر بر جنتی ہیں۔
رگوں سے وحدہ لا شریک کا راگ سنا لی دیتا ہے۔
جن کی نیندیں عبادت ہوتی ہیں، وہ سو کر بھی جاتے ہیں۔
(شاہ لطیف)

”واہ۔۔۔۔۔ تم اتنی اچھی اور بیک وقت عشیقی اور صولہا ز شاعری کیسے کر لیتے ہو؟ جس میں اللہ سائیں کی وحدانیت کے ساتھ محبوب سے پیاری جھلک بھی نظر آتی ہے؟“

مہرو کے لبوں سے بے اختیار ہی الفاظ اٹھتے تھے۔ اس پر سانول نے اپنی موندی موندی ہی آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ تارسانی کے ایک جاں نسل و کرناک احساس تلے سانول کا دل اسی کے صاعقہ بار وجود کے غور کا رنگاز بن گیا۔ نیم بازی آنکھوں سے بے نام سی اداسی کی جھلک ابھری۔ دل میں شوق وید بھی ابھری اور اپنی کم مائیگی کا احساس بھی جاگ اٹھا اس نے کچھ کہے بغیر ہی اپنی آنکھیں دوبارہ سے موندیں۔ اس کے بائیں ہاتھ میں دیکھتا تھا ہوا تھا۔ جس کا ایک سرا اس کی گود میں لٹکا ہوا تھا اور سیدھے ہاتھ کی شہادت والی انگلی پر نیش چڑھا ہوا تھا۔ جب وہ تار بجاتا تو اسے یوں لگتا جیسے وہ اس کیلئے نیش سے تار نہیں اپنے دل کے ان کہے سنگیت کے ذم کو پھیل رہا ہو۔

وہ پھر اسی جذب اور بے خودی کے عالم میں حضرت چل مرستے کی شاعری گنگناتنے لگا۔

ہے قیمت مجھ کو یار، دوستی دلدار کی
کیوں نہ بیگانہ رہوں جب یہ جہاں فانی ہوا
سیکھے گا عشق جو بھی، جھیلے گا وہ مصیبت
”کیا تم عشق میں مصیبت سے ڈرتے ہو؟“

مہرو نے شاعری کے بول کو سمجھے بنائی اس سے کہہ ڈالا تو سانول نے اپنی آنکھیں دوبارہ کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اب اس کے لیے جواب دینا ضروری قرار پایا تھا۔
اس نے یہ غور اپنے سامنے کھڑی مہرو کو گہری گہری آنکھوں سے دیکھا اور بولا۔

”عشق تو خود مصیبت کی نفی کرتا ہے۔ اس لیے کہ سچا عشق بڑی سے بڑی مصیبت کی بھی پروا نہیں کرتا۔۔۔۔۔ مگر“
”مگر کیا۔۔۔۔۔؟“ مہرو نے اسے نکلنے کا موقع نہیں دیا۔
اسے ابھی اپنا سوال وہیں پر ہی لٹکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”مگر۔۔۔۔۔ یہ کہ محبت کرنے والا انتہائے عشق کی اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا اپنے محبوب کے لیے اپنی محبت کو مصیبت بنائے جسے عشق کے نام پر بھجلیا رہے۔ اس

ہو.....؟“

اپنا جملہ مکمل کرتے ہی اس نے نیکی سی نگاہیں اس کے چہرے پر جمادیں۔ اسے بیک وقت سانول کے چہرے سے بے نوازی مگر بڑی بڑی روشن آنکھوں میں نامعلوم سی اداسی کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔

”فکرو ذکر میں صرف اللہ سامعین کا کرنا پسند کرتا ہوں۔ جس ذکر کی آپ بات کر رہی ہیں وہ ایک حوالہ ہے، ایک گم گشتہ حوالہ..... اللہ بس، باقی ہوں.....“

”اچھا ایک بات بتاؤ۔ تمہارا اصل نام سانول ہے نا.....؟“ اس نے جیسے دھماکا کیا۔ کم از کم سانول کے لیے یہ سوال دھماکے سے کیا کم ہی تھا۔ اس کے ہاتھ سے یکبارہ اگرتے گرتے بچا۔

”اور..... تم مائی وزیراں کے بیٹے ہو.....؟“ مہر دھن چلی گئی۔ وہ اب بھی یہی چاہتی تھی کہ سانول کو اس طرح جوش دلا کر اسے ”ڈھا“ دے۔ وہ جذباتی ہو جائے۔ پتا نہیں کیوں وہ اس میں عامیانہ پن دیکھنا چاہ رہی تھی یا پھر اس جذبہ جنوں کی حقیقت بے نقاب کرنے کے لیے کوشاں تھی۔

”جہیں یہ سب خود ہی یاد آیا ہے یا کسی نے بتایا ہے جہیں.....؟“ سانول نے اپنے یکتارے پر گرفت مضبوط رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”تمہارا دل کیا کہتا ہے؟ مجھے یہ سب یاد آیا ہوگا یا کسی نے بتایا ہوگا مجھے؟“ وہ ہر طرح سے اس کا امتحان لینے پر تلی ہوئی تھی۔

”میرا دل کہتا ہے، جہیں بتایا گیا ہے۔ یاد جہیں نہیں آسکتا..... کبھی نہیں.....“ سانول نے پورے یقین سے کہا تو مہر دھن اس کی سچائی پر ششدر رہ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ڈیٹیکٹس مارنا شروع کر دے گا کہ..... ”دیکھا مہر دھن! میری محبت سچی تھی نا..... بالآخر اس کی طاقت نے تمہیں اپنا بچپن یاد دلایا دیا۔“

مگر..... دوائے افسوس کہ مہر دھن کے سارے ہی اندازے قریب ترین ہونے کے باوصف غلط اور باطل ہی ثابت ہو رہے تھے لیکن..... مہر دھن کے پاس ابھی تپ کا ایک پتا باقی بچا تھا، بولی۔

”تم نے ٹھیک کہا ہے۔ مجھے میری اماں جانی نے ہی تمہارے بارے میں مختصر بتایا تھا۔“

”میرا بھی یہی خیال تھا۔“ سانول نے ہولے سے کہا۔

”لیکن..... ایک آخری بات بتا دو۔“

”پوچھو.....“

”جب مجھے وہ بچپن کا ایک قلیل ترین عرصہ یاد نہیں رہ

لیے کہ وہ اپنے محبوب کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے عشق کو اس کے لیے مصیبت نہیں بنانا چاہتا۔“ سانول نے لطیف سائیں کے ایک عشقیہ فلسفے کی کتاب سے کچھ لفظوں کا استعارہ استعمال کیا۔ یہ جواب سن کر مہر دھن کے سوچے ذہن میں ایک جھماکا ہوا..... ”کیا یہ اسے کسی مصیبت کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتا؟“

”تم مجھے کافی پڑھے لکھے لگتے ہو۔“ اس کا سانول سے باتیں کرنے کو جی چاہا۔

”دن جماعتیں پاس ہوں۔“ سانول نے بڑے دھیان سے جواب دیا۔ اسے بھی اس سے گفتگو اچھی لگ رہی تھی۔

”تم نے ادب اور شاعری کافی اچھی پڑھ رکھی ہے۔ مکتبات سے بھی اچھا ہو، یہ شوق تمہیں کیسے ہوا؟“

”آپ سے.....“ سانول نے بے اختیار کہا۔

”مجھ سے؟“ مہر دھن کے لہجے میں حیرت تھی۔ ایسے میں مہر دھن کے دل و دماغ میں اپنی ماں سے کی ہوئی باتیں گردش کرنے لگیں۔ تاہم ابھی وہ اس بارے میں چپ بھی مگر وہ چاہتی یہی تھی کہ پہلی ملاقات کی طرح اس بار بھی وہ ضرور کسی نہ کسی حوالے سے اس کا ذکر چھیڑے گا تو پھر وہ اس سے ضرور پوچھ کر رہے گی۔ سو اس نے موقع ملنے ہی پوچھ لیا۔

”ایک بات بتاؤ، تم یہ ہمیشہ میرے ماضی کا حوالہ دے کر خود کو زبردستی میرے ساتھ جوڑنے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟ کیا سمجھتے ہو تم کہ میں تمہاری اس حرکت سے متاثر ہو جاؤں گی؟“ مہر دھن کی بات میں طنز کا پہلو ہو سکتا تھا مگر انداز متعذرانہ ایسا نہیں تھا، بلکہ اس میں ایک ”کھوجنا“ تھی۔ سانول نے بھی یہ بھانپ لیا تھا۔ خفیف سی مسکراہٹ سے بولا۔

”تعلق رہا ہے تو تعلق جوڑا بھی جاتا ہے اور مہر دھن بی بی! مجھے آپ کو متاثر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ میں اس تعلق سے بے تعلقی میں ہی زیادہ پرسکون اور خوش ہوں۔“

سانول کی اس بات نے مہر دھن کو اندر سے چٹکا کر رکھ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے طنز کو محسوس کر کے مایوس ہو جائے گا اور مزید ڈھیٹ پنے اور عامیانہ پن کا مظاہرہ کرے گا لیکن اس نے اس کی بات کے طنز کا کوئی اثر لیے بغیر ہی جس قدر طمانیت بھری مسکراہٹ اور نہایت پرسکون انداز میں جواب دیا تھا، اس سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ اسے کوئی پروا نہ تھی۔ پھر بھی مہر دھن کے اندر ایک موہوم سے خیال نے سرا بھارا اور گویا وہ بھی اس کی بے پروائی کا بے ظاہر کوئی ٹلس لیے بغیر مسکرا کر بے نیازی سے بولی۔

”اچھا! تو پھر تم بار بار ہر بات پر میرا ذکر کیوں کرتے

کا تو پھر تمہیں کیسے یاد رہا؟ کیونکہ میری اماں جانی کے مطابق میرے بھائی ادا مراد نے بابا جانی سے تمہاری شکایت کردی تھی اور پھر تم جو بلی سے دور کر دیے گئے تھے، تمہاری ماں نے بھی احتجاجاً جو بلی آنا چھوڑ دیا تھا۔ یولو..... پھر کیسے تم نے اپنے دل و دماغ میں میرا خیال..... میرا تصور پالے رکھا تھا؟“

یہ سب کہتے ہوئے مہر و کوپوں لگا جیسے وہ کسی غیر مرئی ٹرانس میں آنے لگی تھی۔ کوئی لہر تھی، انجانی، جو اسے بہا دینا چاہتی تھی، زور محبت کی ایسی زور آوری کہ..... مہر و کو اپنا وجود چھوٹا ہوا سانسوں ہونے لگتا تھا۔

سانول نے جواب میں یلکارا، بجا کر..... ایک شعر نکلنا دیا۔
گھڑا ٹوٹا تو یہ آواز آئی.....
نہیں رہی، اب دونوں میں کوئی جدائی.....

دل ہے وابستہ غم محبوب
عالم جذب و شوق لا محدود
ہے کل انبار عشق کی زنجیر
جیش ہائے ناتواں سے سود
ہر تنہا جراحت صمد چاک.....
آرزو ایک شعلہ بے دود
بحرِ غم اور سیلِ اشک رواں
موج در موج گو ہر مقصود
(شاہِ لطیف)

شاعری کے بول اور اس کے معنی..... مہر و کے دل و دماغ.... کو تہ و بالا کیے دے رہے تھے لیکن اسے اب بھی اپنے سوال کا جواب نہ ملا یا پھر شاید اسے سمجھ نہ آیا۔ وہ یک تنک سانول کے اتھاہ گہرائی لیے چہرے کو نکستی رہ گئی تو سانول خود ہی آگے بول پڑا۔

”مجھے حویلی سے تو نکال دیا گیا تھا اور شاید تم سے بھی دور کر دیا گیا تھا مگر بحریل اشک رواں میں مجھے اپنا کو ہر مقصود موج در موج نظر آ رہا تھا۔ بے زنجیر عشق گراں بار ہے مگر میں بھی گریباں اپنا صمد چاک کیے رہا۔“ اتنا کہہ کر وہ جانے کے مڑا اور آخر میں بولا۔

”اب ذرا اپنی اماں جانی کے بجائے..... اپنے بابا جانی سے پوچھ لینا کہ ان کے باڑے میں گھوڑوں کی رکھوالی کے لیے گھسے رکھا تھا۔ بس اتم سے قریب رہنے کا جو بہانہ اس سر پھرے عاشق کو جو جہاد ہی اختیار کر لیا۔ تو مجھ سے بے خبر کسی پر میری پیاسی آنکھوں کے کھٹکول میں تیری دید کی بھیک تو پڑ ہی جاتی تھی۔ اس ملک کے لیے یہی بہت تھا..... چلا ہوں.....“

”سانول مستوں مست مدام..... سانول مستوں مسہ مدام.....“

کہتے ہوئے سانول نے اپنا یلکارا سنبھالا اور کوئی صوفیانہ کلام کا ورد کرتا ہوا ہال کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مہر و یک تنک اسے دیکھتی رہ گئی۔

وہ اس نگر و فریب کے ریاکار ساج میں جو گوہر مقصود تلاش چاہ رہی تھی، وہ اس کے قریب پہنچ رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ کی دنیا پوری شد و مد کے ساتھ زبردست برہم رہی تھی۔ نہ جانے پھر کیا ہوا..... وہ کسی انجانی دور سے بندھی اس

نوجوان مجذوب کے پیچھے چل پڑی۔ وہ دروازے سے باہر نکلا تو وہ بھی اس کے پیچھے باہر آ گئی۔ سانول شاہ سڑک کی طرف جاتا دکھائی دیا تو وہ بھی کار میں آکر بیٹھ گئی۔ سانول سڑک کے کنارے جا پہنچا تھا، وہاں اس کے ساتھ وہی ہکم ہوا جو ہر روز ہی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ یعنی نہ اسے کوئی پنکھا، والا بٹھاتا نہ ہی لاری والا..... مہر و بغور یہ سب دیکھتی اور سنی رہی تھی۔ گرمی اور دھوپ سے لوگوں کا برا حال ہو رہا تھا۔ ”اعطش..... اعطش“ کی سی یلکاری ہوئی تھی۔ اس کی کار ٹریفک کی بھیڑ بھاڑ میں کھڑی تھی، جس کی وجہ سے وہ اس کے قریب ہونے کے باوجود..... اسے دیکھ نہیں پایا تھا۔ ایک خیال آیا تھا مہر و کو کہ وہاں سے اپنی کار میں چھوڑ دے مگر پھر جانے کیوں وہ ایسا نہ کر سکی، بس خاموشی سے یہ تماشا دیکھتی رہی۔ اس کے بعد جب اس نے اسے ایک بھری پری سالر لاری کے پچھلے جنگلے پر لٹکتے دیکھا تو اس نے پُرسوج انداز میں اپنے ہونٹ سمجھنے لیے۔ اس کے جی میں تو آئی کہ وہ آگے بڑھ کر اسے اپنی کار میں بٹھائے مگر کچھ سوچ کر وہ ایسا نہ کر سکی۔ وہ خود سے پوچھنے لگی کہ وہ آخرا سے کیوں پرکھتا چاہتی ہے؟ وہ اس میں کیا دیکھنے کی منتی ہے؟ سچائی یا کوئی ریا.....؟ مگر کیوں؟ کیا وہ خود کہیں کسی بڑے فیصلے کے مقام سے تو نہیں گزر رہی ہے؟ یا پھر وہ ابھی تک اس ذرا بے کا ڈراپ سین کرنے کو تیار نہیں تھی؟ کیا ابھی تک وہ اس کی سچائی سے سیر نہیں ہوئی تھی اور کیا دیکھنا چاہتی تھی؟

لاری روانہ ہوئی تو اس نے بھی اس کے تعاقب میں اپنی کار آگے بڑھائی۔ حتیٰ کہ وہ اس کے تعاقب میں بابا عمیل شاہ کی درگاہ تک جا پہنچی۔ سانول کو ابھی تک اس کا نہیں پتا چلا تھا کہ وہ اس کے پیچھے یہاں تک چلی آئی تھی۔ سانول درگاہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ مہر و کی کار درگاہ کے دروازے سے ذرا پرے کھڑی تھی۔ اس کی کار میں انٹر کنڈیشن آن تھا، جھک کار سے باہر چلائی دھوپ اور گرمی کے سوا کچھ نہ تھا، ۱۱:۱۵

دوسرا بولا۔ ”سائیں! کیسی عجیب بات ہے کہ ہم یہاں آتے ہیں اور آپ ہمیں دھکا دیتے ہو۔ ہم مایوس لوٹ جاتے ہیں مگر حیرت انگیز طور پر تھوڑے دنوں بعد ہی ہماری تمام حاجتیں پوری ہو چکی ہوتی ہیں۔“ اس آدمی کے یہ کہنے کی دیر بھی کہ درگاہ کے پتیل والے لجن میں سائیں شاہ زندہ باد کے نعرے کو سنبھلے مگر سانول نے سختی کے ساتھ انہیں ایسا بولنے سے روک دیا۔ دروازے پر کھڑی مہرہ کے چہرے پر عی نہیں بلکہ لیوں پر بھی عجیب سا ارتعاش اٹھ آیا تھا۔

شور ایک دم گم گیا تھا۔ مہرہ ہنوز دروازے پر کھڑی تھی، ابھی تک کسی کی اس پر نگاہ نہیں پڑی تھی۔ درگاہ کا بڑا بھادر سخی لعل جی وہاں موجود تھا مگر وہ ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔ سانول اپنے حجرے کی طرف بڑھ گیا تو غلطی سے سب کو وہاں سے جانے کا کہا۔ لوگ نذر و نیاز ڈال کر جانے لگے۔ مہرہ ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔ جو لوگ مہرہ کو کونٹھ کے جاگیردار میں جنگل خان کی بیٹی کی حیثیت سے جانتے تھے، انہوں نے فوراً اپنا سر جھکا کر اسے سلام پیش کیا تھا اور آگے نکلنے چلے گئے تھے۔

”محکم اب دھوپ اور گرمی سے تپ رہا تھا۔ وہاں اب کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر وہاں حجرے سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ کچھ اور آگے بڑھی۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ سخی لعل اس سے کہہ رہا تھا۔

”یہ لوگ تم سے عقیدت رکھتے ہیں چھوکر! جنہیں ان کی باتیں سن لیں چاہئیں۔“

”ایک انسان ہونے کے ناتے یہ مجھ سے محبت کریں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا مگر یہ مجھ سے عقیدت کس بات کی رکھتے ہیں؟“

”تم اللہ والے اور نیک بندے ہو، کوئی تمہیں تکلیف پہنچائے بھی تو تم اس کے لیے دعائیں کلمات منہ سے نکالتے ہو۔ آج کے دور میں تو کوئی کسی کو ذرا سادہ سادہ چڑھا کر بھی کھولے تو دوسرا اسے کھانے کو دوڑ پڑتا ہے۔“

”میں وہی کرتا ہوں، جو ہر انسان کو کرنا چاہیے۔ یہ تو ایک عام سی بات ہے۔“ سانول یہ کہہ کر اپنے حجرے کی طرف بڑھ گیا۔ سخی لعل اسے گھور کر رہ گیا۔ وہ یہی کر سکتا تھا، اس میں بھی اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ سانول سے زیادہ سخت زبان استعمال کرتا یا اسے برا بھلا کہتا۔ حالانکہ ابتدا میں جب سانول نے یہاں آنا شروع کیا تھا تو وہ اس کے ساتھ اس طرح برتاؤ کرتا تھا جیسے وہ اس کا نوکر ہو۔ سانول اس کی ہر اونچی نیچی اور سخت گوئی خاموشی سے سن لیا کرتا تھا۔ سانول

اس کے وہ کار سے نیچے اتر آئی تھی۔

گرم لو کے پیٹروں نے اس کا استقبال کیا اور اسے اپنا نازک سا کول چہرہ اس باسوم میں بری طرح جھلٹا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مگر اس نے کوئی پروا نہ کی، کار سے اترنے کے بعد تو اس کی متلاشی نگاہیں درگاہ کے اس دروازے پر جمی رہ گئی تھیں جس سے گزر کر سانول اندر داخل ہوا تھا۔ مہرہ چند تائیں کھڑی سوئی بن گئی۔ وہ یہاں کیوں چلی آئی تھی؟ وہ بھی محض ایک عام سے فقیر منٹ لڑکے کے تعاقب میں۔۔۔۔۔ کیا رشتہ تھا اس کا سانول کے ساتھ؟ مہرہ کو اپنی حیثیت کا بھی فہم نہ تھا، وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ ایک جاگیردار اور معجز کھرانے سے تعلق تھا اس کا۔ پھر جانے کیا ہوا۔ اس کے قدم کشا کشا درگاہ کے دروازے کی طرف اٹھنے لگے۔

قریب پہنچی تو ٹھٹک کر رک گئی۔ درگاہ کے دروازے کی کھلی چوکت سے ہی اسے اندر کھلے صحن کا منظر نظر آنے لگا تھا، جس کے وسط میں پتیل کے ایک گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے درہ پر بہت سے لوگ بیٹھے تھے اور سانول کی طرف دیکھ کر اپنے ہاتھ جوڑے اسے ”سائیں شاہ آیا۔۔۔۔۔ سائیں شاہ آیا۔۔۔۔۔“ کہہ کر پکار رہے تھے۔ اس نے سانول کو ان سے پیادہ بلند یہ کہتے سنا۔

”میں یہاں کا ایک عام فقیر ہوں۔ ایک مجاور۔۔۔۔۔ اور ایک گناہ گار بھی۔۔۔۔۔ اللہ سائیں کی عبادت کرتا ہوں۔ یہاں مجھے روحانی سکون ملتا ہے، اسی لیے میں یہاں رہتا ہوں اور بس۔۔۔۔۔ تم بھی یہی کیا کرو اور ایک دوسرے کا دل مت دکھایا کرو۔۔۔۔۔ ہمارے سر شدہ سائیں جلیل شاہ کا بھی یہی فرمان تھا۔ اللہ سائیں بڑا مسبب الاسباب ہے اور وہی سب کا حاجت روا ہے۔“

ایک مجہول سے خستہ حال شخص نے اس سے بڑی لہجہ سے کہا۔ ”سائیں! اللہ ہمیں بھی عبادت کی توفیق دے۔ پر آپ لوگوں کی بات تو اور ہوتی ہے نا۔۔۔۔۔ ہمارے لیے بھی دعا کیا کرو سائیں! ہمارے بیڑے پار ہو جائیں۔۔۔۔۔ ہماری مصیبتیں، پریشانیاں اور دکھ درد دور ہو جائیں۔“

”ایک انسان ہونے کے ناتے ہم سب کا فرض ہے کہ کسی کو دکھ اور پریشانی میں دیکھیں تو اس کے لیے اللہ سائیں سے بہتری کی دعا کیا کریں۔ آخر کو ہم ایک دوسرے کو بھی دعا کے لیے کہتے ہیں، ہیں نا۔۔۔۔۔ پھر ہمیں اپنے لیے دعا مانگنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ میں بھی تم لوگوں کے لیے دعائیں کرتا ہوں اور اپنے لیے بھی۔۔۔۔۔“

سانول نے ایک جذب کی سی کیفیت میں کہا۔ ایک

یہاں جھاڑو لگاتا تھا، نماز پڑھتا تھا اور پھر محن میں ہی بڑکرو جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ لوگ پہلے اسے مستانہ (پاکل) سمجھنے لگے مگر پھر اسے ایک نیک اور سادہ لوح..... اس کے بعد اسے پہنچا ہوا تصور کرنے لگے تو سخی لعل نے بھی اس کے ساتھ اٹنا رویہ بدل لیا۔ اس ڈر سے کہ لوگ اس کا برا ہی نہ منائیں اور یہاں آنا چھوڑ دیں۔ آئیں گے نہیں تو نذر و نیاز کا سلسلہ بند ہو جانے کا ڈر تھا۔

دروازے کے قریب کھڑی مہرویہ سب دیکھ رہی تھی۔ وہ اس بار بھی اس نوجوان سانول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ وہ اندر محن میں آئی تو سخی لعل ہی کی نگاہ اس پر پڑی تھی۔ سخی لعل اسے دیکھ کر پہلے تو تنگ سا ہو کر رہ گیا، کیونکہ وہ بھی اسے رئیس ہنگل خان کی بیٹی کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اتنے بڑے باپ کی بیٹی یہاں بھی آسکتی ہے۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ مہر و یہاں زیارت کے لیے آئی ہے اور اب ضرور کوئی بڑا نذرانہ دے کر ہی جائے گی۔

”بیب..... بی بی جی! آ..... آپ..... سمجھ..... بھلی کری آپو..... بی بی جی!“

”سانول تمہارا کیا لگتا ہے؟“ مہرو نے سرد سے لہجے میں اس سے پوچھا۔ اس کی نگاہیں بار بار اسی حجرے کی طرف اٹھ رہی تھیں جہاں سانول گیا تھا۔ اب وہاں روشنی ہو گئی تھی۔ اسے لکڑی کے ٹیڑھے میز سے اور پیرنما سے ریک بنے نظر آ رہے تھے، جن میں کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کا ذہن تیزی سے کچھ سوچنے میں بھی جھوٹا۔

”وہ..... جی بی بی جی! ام..... میرا کچھ نہیں لگتا..... بس! اور ہر ہتا ہے اور عبادت کرتا ہے۔“ سخی لعل گھبرا ہوا یہاں آ رہا تھا اور مہرو کے رعب کا بری طرح شکار تھا۔

”کیا وہ یہاں تعویذ گنڈے کرتا ہے؟“ مہرو نے اس کی طرف دیکھ کر بیوس اچکا کر پوچھا۔

سخی لعل نے فوراً سوچا۔ شاید یہ سانول کی شہرت سن کر آئی ہے، ضرور کوئی تعویذ ہی لینے آئی ہوگی اور اس کے بدلے میں بہت سا نذرانہ بھی دے سکتی ہے۔ اس نے فوراً اثبات میں جواب دے کر جھوٹ بول دیا۔

”نکون ہے باہر، سخی لعل! اس طرح ڈر ڈر کے تم کس سے بات کر رہے ہو؟ یہاں تو صرف اللہ کا خوف کرنے والوں کی جگہ ہے.....“ اچانک اندر سے سانول شاہ کی پر جلال سی آواز ابھری۔ جبکہ سخی لعل کے جھوٹ پر مہرو کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ تو آج میں نے اس کا بہرہ پ

پکڑ لیا مگر وہ کچھ الجھی ہوئی بھی تھی۔ کیونکہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سانول کا رویہ آئے ہوئے ساتلین سے ملاحظہ کر چکی تھی۔ اس نے کسی کو کوئی بھی تعویذ وغیرہ نہیں دیا تھا۔ یہ یاد آتے ہی اس نے بڑے مجاہد..... کا جھوٹ پکڑ لیا، اس کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔

”مگر ابھی تھوڑی دیر پہلے تو سانول نے کسی سے بات کرتا بھی گوارا نہ کیا تھا تعویذ دینا تو دور کی بات ہے۔“ سخی لعل گڑ بڑا سا گیا۔ ایک وزیر ازا دی سے جھوٹ بولنا اسے مہنگا پڑ سکتا تھا مگر تھا وہ بھی چالاک، یکدم بات بتاتے ہوئے بولا۔

”وہ بی بی جی! اللہ کی بندے ہیں، اپنے موڈ سے چلے ہیں۔“

اثاثے راہ..... سانول بھی ان کے باتیں کرنے کی آوازوں پر اپنے حجرے سے باہر نکل آیا اور پھر محن میں کھڑی مہرو کو دیکھ کر وہ بھی ایک لمحے کے لیے تنگ سا ہو کر رہ گیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پہ آسودہ سی مسکراہٹ ابھری اور وہ اسی لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”مہرو! تم یہاں..... کیا مجھ سے کوئی کام ہے تمہیں؟“

ادھر سخی لعل نے جو سانول کو رئیس ہنگل خان کی لاڈلی بیٹی سے اس طرح مخاطب ہوتے دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ اسے خیال تھا کہ مہرو اس انداز میں مخاطب پر بری طرح ناراض ہو جائے گی اور اب ان دونوں کی خیر نہیں۔

”تم سے بھلا مجھ کیا کام ہوگا؟“ اس نے روکے طرز سے جواب دیا۔ ”میں تو یہاں عام لوگوں کی طرح اس درگاہ کی زیارت کرنے آئی ہوں۔“

”اچھی بات ہے، کرلو زیارت۔“ سانول نے کہا اور مہرو اس کے حجرے کی طرف بڑھنے لگی تو سانول نے کہا۔

”مقبرہ وہاں نہیں، یہاں ہے.....“ اس نے سیدھے ہاتھ کی طرف ایک مقبرے کی جانب اشارہ کیا، جس پر رنگین چادریں اور پھول چڑھے ہوئے تھے۔

”میں اس طرف بھی آتی ہوں۔“ مہرو نے ایک ذرا گردن موڑ کر کہا اور حجرے میں داخل ہو گئی۔ سخی لعل کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہولناکیاں کیا تھیں۔

مہرو حجرے کے اندر آئی تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

ادب، شاعری اور صوفیانہ کلام سے حجرہ بھرا پڑا تھا۔ ایک جانب بلب روشن تھا (کیونکہ اندر اندر میرا سا تھا) وہ ایک ایک کتاب کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔ ان میں شاہ جہاں سالو، چکل کی شاعری اور صوفیانہ کلام اور تصوف پر لکھی ہوئی کتابیں شامل تھیں۔

”تم نے سب پڑھ رکھی ہیں؟“ مہرو نے قدرے

کریں تو اچھا ہی ہے۔ مجھے یاد بارہ سب کچھ اور اب اسے بھلانے کے لیے یہاں پناہ لیے ہوئے ہوں۔ مجھ سے غلط ہوئی جو راز آج تک چھپا رہا تھا اسے چھپائی رہتا چاہیے تھا۔“ یہ کہہ کر سانول نے اپنی سیاہ مٹی ڈال دی اور آگ پر ہاتھ پھیرا اور آگے بولا۔

”میری عبادت کا وقت ہو رہا ہے..... میں سامنے والی مسجد میں جا رہا ہوں.....“ سانول یہ کہہ کر چلا گیا۔ مہر کو اس کا لہجہ ہی نہیں آواز بھی شدتِ کرب سے ڈوبی ڈوبی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ کچھ سوچ کر واپس چلی آئی۔ بھنائی مگر پہنچ کر وہ ایک بار پھر اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

”اف میرے خدا! میں آخر کیوں اس غریب سے فقیر منش لڑکے میں اتنی دلچسپی لینے لگی ہوں؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔ اس کے سچ میں ایک کرب ناک سی حقیقت پنہاں محسوس ہوتی ہے مگر مجھے اس سے کیا لینا دینا..... میرے اور اس کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔

وہ خود کو تسلیاں دینے لگی۔ ایک بات ملے تھی، جس کی گواہی اس کا دل بھی دیتا تھا کہ سانول کا یہ حیران کن والا روپ اسی کی وجہ سے ہے۔ اس کے بعد وہ سو گئی۔

☆☆☆

مصفور اور حیا، میسر پر کرسیاں ڈالے شام کی جانے لگی رہے تھے۔ جامشورو میں چاہے کتنی ہی گرمی پڑتی ہو مگر یہاں کی شام میں چلنے والی ٹھنڈی ہوا میں بھی مشہور ہیں۔ وہ دونوں میاں بیوی اس وقت اسی ٹھنڈی ہواؤں سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر مصفور نے دیکھا کہ حیا کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اپنی خوبصورت بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔ اسے دیکھی یاد اس نہیں دیکھ سکتا تھا، اگرچہ وہ اس کے دکھ اور اس کے اندر کے احساسِ محرومی سے اچھی طرح واقف تھا مگر بار بار وہ اس کا ذکر کر کے اس میں اضافہ نہیں کرتا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب بھی اسے کھو یا کھوس محسوس کرتا تو اس کا دھیان ادھر ادھر کی باتوں میں لگانے کی کوشش کرتا تھا۔

”لگتا ہے تمہارا یہاں دل لگ گیا ہے؟“ اس نے مسکرا کر حیا کے چہرے پر محبت پاش نظریں ڈالیں۔

”دل کا سکون سے تعلق ہوتا ہے مصفور اب مجھیں پامائیات تبدیل کرنے سے نہیں.....“ حیا نے اسی طرح کھوئے کھوئے سے لہجے میں جواب دیا۔ اس کی آنکھوں کی اداسی شام کے ڈھلے سائے کی طرح گہری ہونے لگی

جراتی سے سانول سے پوچھا جو اس کے پیچھے چلتا ہوا اندر داخل ہو چکا تھا۔

”ہاں! اور بار بار پڑھتا ہوں۔“

”میں ایک کتاب لے جاؤں؟“

”لے جاؤ مگر پڑھ کر واپس لوٹنا ہوگی۔“

”لوٹاؤں گی، فکر نہ کرو..... ایک بات بتاؤ گے؟“

”ہاں! کیوں نہیں.....“ سانول نے اس بار پُر اشتیاق سی نظروں سے مہر کے حسین و کش چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

”تم ہو کون.....؟“

”تمہیں کسی قسم کا شک ہے مجھ پر.....؟“ سانول نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں! مہر نے اثبات میں سر ہلایا۔

”مجھے تمہاری صاف کوئی اچھی لگی۔“ سانول نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“ مہر نے اپنا سوال دہرایا تو سانول بولا۔

”میں ایک عام سا غریب انسان ہوں..... بلکہ بیمار بھی..... یہاں میں سکون حاصل کرنے آتا ہوں۔ اللہ

سامنے کی عبادت کرتا ہوں اور مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ میں شفا پا جاتا ہوں۔“

”کیا بیماری ہے تمہیں.....؟“ مہر نے اپنی گھنیری پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

بیماری دل ہے یہ نہ پوچھ

کیا کزری اس ہے نہ پوچھ.....

سانول نے آنکھیں موند کر جیسے دل کی عمیق گہرائیوں تلے ایک شعر گنگنا دیا۔

”کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، ہنم ناک کرتے ہو..... مگر میرا دل کہتا ہے کہ میں غلط سمجھ رہی ہوں

تمہیں.....“ مہر اس کے شعروں کے بول کے معنی سمجھتے ہوئے بولی۔ اس کے دل میں تھر تھراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس نوجوان کے سامنے بے بس ہو جائے گی۔

”جو تمہارا دل کہتا ہے وہی سچ ہے، کیونکہ دل جھوٹ نہیں بولتا۔“ سانول نے کہا پھر فوراً ہی دوبارہ بولا۔

”مہر! آپ جیسی شہ کی قبر پر عیاقا تھا پڑھ کر چلی جائیں.....“ معافی سانول نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”جو آپ کو یاد نہیں ہے، اسے یاد کرنے کی کوشش بھی نہ

تھی۔ صفدر کو اب اس کی اداسی سے کوفت بھی ہوتی تھی مگر وہ اپنی بیوی سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرتا تھا، جس سے غصے یا بیزاری کا اظہار ہوتا ہو..... اسی لیے وہ دل بھانے والی مسکراہٹ سے بولا۔

”حاجان! کیا میرے ساتھ بھی تم بے سکون رہتی ہو؟“
 ”ہرگز نہیں.....“ وہ یکدم شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ کا ساتھ ہی تو میرا اسہارا اور امید ہے مگر جب آپ نہیں ہوتے ہیں نا..... پھر اندر کی اداسی مجھے مار ڈالتی ہے۔“
 ”اسی لیے تو اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ رات گئے گھر لوٹنے کے بجائے اب شام سے پہلے پہلے ہی گھر آجایا کروں گا۔“ صفدر نے جیسے اسے خوش خبری سنادی اور حیا کا چہرہ بھی واقعی خوشی سے چل اٹھا اور وہ بدستور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا بچ کہہ رہے ہیں آپ.....؟ کیا واقعی آپ اب شام سے پہلے ہی گھر لوٹ آیا کریں گے؟“
 ”ہاں! بچ کہہ رہا ہوں، بھلا تم سے میں جھوٹ بول سکتا ہوں.....“ اس نے محبت پاش نظروں سے حیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور حیا پورے دل سے، سکون کے ساتھ مسکرائی۔ صفدر کو بھی طمانیت ہوئی۔
 ”تمہاری ایک اور خواہش بھی میں پوری کرنے کی.. کوشش میں مصروف ہوں۔ ان شاء اللہ تم بہت جلد اس سلسلے میں بھی خوش خبری سنو گی۔“ صفدر نے کہا۔

”اچھا! وہ کوئی؟“ حیا بولی اور پھر جیسے اچانک اسے یاد آیا۔ ”اوہ..... ہاں! میں نے آپ سے مائی بخشاں والی بات بھی سنی..... اس کا کیا ہوا؟“
 ”اسی کی تو بات کر رہا ہوں میں تم سے.....“ صفدر نے مسکرا کر کہا اور پھر اسے اسی نوجوان مجذوب لڑکے سانول کے بارے میں بتا دیا۔

حیا کو صفدر کی بات پر تسلی ہو گئی۔ اسے اپنی خوش قسمتی پر ناز بھی ہوتا تھا کہ اسے صفدر جیسا محبت کرنے والا اور اس کی ہر خواہش پوری کرنے والا شوہر ملا تھا۔ بس اپنی خالی گود دیکھ کر اسے احساس محرومی ستانے لگتا تھا۔ وہ خود بھی چاہتی تھی کہ صفدر اس سے اتنی بے لوث محبت کرتا ہے مگر وہ اب تک اسے اپنی محبت کی کوئی نشانی بھی نہ دے سکی تھی۔ یہی سوچ کر اس کا چہرہ پھر اداس ہو جاتا۔

”کیا ہوا حیا جان..... کیا تمہاری تسلی نہیں ہوئی یہ سن کر؟“ صفدر نے ایک دم اس کا چہرہ اترتا دیکھ کر کہا۔ وہ حیا کو پیار سے ”حیا جان“ ہی کہتا تھا۔

”یہ بات نہیں صفی!“ حیا ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ ”بس ابھی بھی سوچتی ہوں کہ آپ مجھ سے کس قدر بے غرض محبت کرتے ہیں اور ایک میں ہوں کہ آپ کو ایک بچے کا تحفہ تک نہ دے سکی۔“

”مجھے تم سے کسی تحفے کی غرض نہیں ہے، بس تم ہو میرے لیے یہی بہت ہے اور پھر اس میں تمہارا کیا قصور ہے بھلا؟ تو نقد بر کے کھیل ہیں، اللہ جب چاہے گا ہمارے آگن میں بھی کوئی پھول کھلا دے گا۔ نہیں، نو شکریہ اس مولائے کریم کا کہ ہم دونوں کا ساتھ تو قائم ہے نا.....! مگر پلیز تم دیکھ نہ ہوا کرو.....“

صفدر نے دل کی گہرائیوں اور محبت سے لبریز لہجے میں اس سے کہا اور ساتھ ہی اپنی کرسی چھوڑ کر حیا کی کرسی کے پاس آ گیا اور بڑی محبت سے اس کا کاندھا تھپتھپانے لگا۔ حیا نے بھی اہانتا سے اپنا چہرہ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے اپنے نرم و گلدازلیوں کا بوسہ دے دیا۔

☆☆☆

سیاہ رنگ کی ٹریکٹر کو لڑا حیدر آباد جانے والی مین روڈ سے دائیں جانب ایک ذیلی سڑک پر مڑی اور ایک ہار پھر اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ یہ سڑک نسبتاً چھوٹی مگر پختہ تھی اور اس کی حالت دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ حال ہی میں پختہ کی گئی تھی اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اس سے پہلے یہاں دھول اڑاتا بل کھاتا کیا راستہ تھا۔

مذکورہ سڑک کے موڑ پر ہی گوشتی ڈیرا کا سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی آبادی کے آثار بھی نمودار ہونے لگے۔ اس سڑک سے ٹیڑھے میڑھے کچے راستے آبادی کی طرف بھی نکلتے تھے، جبکہ یہ پختہ سڑک سیدھی ایک بلند و بالا اور سررا پتھروں سے بنی جوہلی کے دیویدیکل چوبی گیٹ کے سامنے اختتام پذیر ہوتی تھی۔ گاڑی کو دیکھتے ہی وہاں موجود دو مسلہ اجرک پوش محافظوں نے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی اندر داخل ہو گئی اور وسیع و عریض احاطے کے ایک طرف، جہاں ایک نئے ماڈل کی ٹیوہنا کرولا اور ایک جیب کھڑی تھی، ان کے قریب جا کر رک گئی۔

گاڑی کے رکتے ہی اس کے اندر سے دو گن بردار اجرک پوش پھرتی سے اترے اور انہوں نے پچھلی سیٹوں کے دروازے کھول کر سر جھکا دیے۔ اندر سے دو خواتین برآمد ہوئیں۔ ایک رئیس بنگل خان کی بیوی حاکم زادی تھی اور دوسری اس کی بیٹی ہمر زادی تھی۔ دونوں جوہلی کے خوبصورت

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ نامہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیمت ملک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے چے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر ہماری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شری عاص (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیئر 11 ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کو رنگی روڈ کراچی
فون: 021-35895313 فکس: 021-35802551

محراب والے دروازے کی جانب بڑھ گئیں۔ حویلی کے اندر سے بھی ایک ادھیڑ عمر خدا مومن کا جوڑا برآمد ہوا تھا اور ہاتھ باندھے ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔

دونوں ماں بیٹیاں اک شان بے نیازی سے چلتی ہوئی حویلی کے اندر داخل ہوئیں اور ایک بلند چھت والے ہال کمرے سے ہوتی ہوئی ایک اور دوسرے کمرے میں آ گئیں۔ یہ ان کی نشست گاہ تھی، جو خاصی کشادہ اور آرام دہ تھی۔ یہاں کا فرنیچر نہایت اعلیٰ لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ فرش پر دبیز قالین اور دیواروں پر خاندان کے پرکھوں کی رحمت آمیز تصاویر آویزاں نظر آتی تھیں۔ ایک دیوار پر مارخور اور گورکھ بل میں پائے جانے والے آئی بکس کے بڑے بڑے سینگوں والے حلوہ شدہ سر بھی نصب کیے ہوئے تھے۔ چیتے اور شیروں کی کھالوں کو بھی ان کی کھوپڑیوں سمیت چسپاں کیا گیا تھا۔ ان شکاری درندوں کے حلوہ شدہ سروں کے خوفناک جڑے چنگھاڑنے والے انداز میں کھلے رکھے گئے تھے، جہاں سے ان کے بڑے بڑے ٹکیے شکاری دانت دیکھ کر ہی دلوں پر ہیبت سی طاری ہونے لگتی تھی۔

کمرے میں اسے سی آن تھا۔ بڑی سکون پر درخشا تھی۔ ادھیڑ عمر جوڑے نے ان کے لیے ٹھنڈے پانی اور مشروبات..... ایک تھیس قسم کی ٹرائی میں سجا کر ان کے آگے کھسکا دی تھی۔ مہر وئے مشروب پیا اور اس کی ماں حاکم زادی پانی پینے لگی۔

”زینس کہاں ہیں؟“

پانی پینے کے بعد کالج کا گلاس سامنے ٹرائی پر دھرتے ہوئے حاکم زادی نے قریب کھڑی ملازمہ سے پوچھا۔ لہجہ بارعب تھا۔

”وہ جی بڑے رئیس سامیں اوطاق میں ہیں۔ اچانک کوئی مہمان آگئے تھے۔“ ملازمہ نے احترام سے جواب دیا۔ ”کب تک فارغ ہو جائیں گے.....؟“ حاکم زادی نے پوچھا تو وہ ساتھ کھڑے اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی، اس کا نام پرمل تھا۔ وہ جھٹ سے بولا۔

”بی بی جی! اسماعیل بھوتاران سے باتوں میں مصروف ہیں۔ آپ کہیں تو میں اوطاق کا ایک چکر لگا کر معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”نہیں، رہنے دو۔ میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں، وہ فارغ ہو جائیں تو مجھے آکر بتا دیتا۔“ حاکم زادی نے کہا تو پرمل نے مودبانہ انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے تعظیم پیش کی۔ اس کے بعد دونوں ماں بیٹیاں وہاں

سے اٹھ گئیں اور اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا۔

حاکم زادی اپنی شانہ پارز کی خواب گاہ میں آکر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوئی۔ وہ تاقدانہ نظروں سے اپنے سر اپا کا جائزہ لے رہی تھی۔ چالیس، پینتالیس کے پچھلے میں بھی وہ کم خوب رو نہیں تھی۔ جسم تھوڑا بھاری ہو گیا تھا مگر اس میں بھی ایک حسن انگیز کشش نمایاں تھی۔ آرام طلبی اور عرصہ، رالی کے باوصف اس نے اپنے جسمانی خدو خال کا، ہال رکھا تھا۔ وہ دو جوان بچوں کی ماں نہیں لگتی تھی۔ اس کی دم، جسمی کمزوری کے متعلقات اس کی شادی بہت چھوٹی عمر میں ہوئی تھی۔ حاکم زادی خود بھی ایک کھاتے پینے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کا آبائی شہر نواب شاہ تھا۔ اپنی انہی جسمانی خصوصیات اور حسن دل آویز کے باعث شاید رئیس بنگل خان کو ابھی تک اس نے اپنا بیرونیار کھا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ رئیس بنگل خان کی ماں حاکم زادی کے ساتھ جوں سال چلی آ رہی تھی۔ وہ بہت بات بنی لگتی رہتی تھی، تاکہ اس کا شوہر اس کی زلفوں سے نہ سار ہے اور دوسری شادی کا خیال تک دل میں نہ لائے اور ابھی تک ایسا ہی تھا۔ اسے مردوں کو قابو کرنے کے سارے گرہ لگے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ بیٹی کے بہانے اکثر تھوڑے دنوں کے لیے شہر بھٹائی گھر والی کو بھی میں گزار آیا کرتی تھی۔ بڑوں سے اس نے سن رکھا تھا کہ زیادہ قربت کے ساتھ تھوڑی دوری بھی مرد کو باندھ دیتی ہے۔

قد آدم آئینے میں اپنا تاقدانہ جائزہ لینے اور ایک بار غور سے مسکراہٹ سے اپنے پرکشش سر اپا کو نوازنے کے بعد جب وہ بیٹی تو اسی ادھیڑ عمر خاوند نے آکر اسے رئیس کی واپسی کی اطلاع دی۔

”تم چلو، میں آتی ہوں.....“ اس نے بارعب لہجے میں کہا تو خاوند لائے پاؤں لوٹ گئی۔

رئیس کی آمد سے اس کے دل میں ایک خیال آیا تھا کہ وہ اس کی آمد کا کر یہاں کیوں نہیں آئے؟ کیا اب بھی کوئی مہمان رئیس کے ساتھ ہے؟ اس نے سر جھکا اور ایک بار پھر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے قریب آئی۔ چلے میک اپ کچھ لیا، خوشبو لگا لی اور سچ سج خواب گاہ سے نکل کر اسی کمرے میں آگئی جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ اپنی بیٹی کے ساتھ موجود تھی۔

وہاں پہنچی تو چونک گئی۔ خلاف توقع اس نے رئیس کو غصے میں بھرا ہوا دیکھا۔ کہاں تو وہ ہمیشہ نرم اور میٹھی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتے تھے، بلکہ حاکم زادی کی آمد کا سنتے ہی گویا کچے دھماکے سے بندھانے کی ”تلاش“ میں خواب گاہ

تک چلے آتے تھے مگر آج بالکل الٹ ہو گیا تھا۔

”مہمانوں سے بھی آج خلاف توقع جلد فارغ ہو گئے تھے۔“

”اللہ سائیں! کیا کوئی جھگڑا ہو گیا ہے کسی کے ساتھ.....؟“ حاکم زادی نے اندر قدم رکھتے ہی رئیس کی طرف دیکھ کر کہا تو سامنے کے صوفے پر بڑے ٹھسے کے ساتھ ہاتھ پاؤں پھیلائے بیٹھے رئیس بنگل خان نے بیوی کی آواز سن کر تیز اور پریش نظرؤں سے اسے گھورا..... حاکم زادی کا دل اچھل کر حلق میں آن لگا..... ابھی جو تھوڑی دیر پہلے اس نے اپنے دل میں جو مان بڑھایا تھا، وہ سب ہوا ہونے لگا۔ چل کے چل ہی اس نے بھانپ لیا تھا کہ رئیس کی اس ناراضگی کا تعلق اسی سے تھا۔

”ادھر آؤ.....“ رئیس نے بدستور اسی طرح اس کی طرف گھورتے ہوئے بیوی سے کہا تو حاکم زادی نے تب بھی آگے بڑھتے ہوئے محبت بھری مسکراہٹ کا ہتھیار ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور صوفے پر شوہر کے قریب بیٹھتے ہوئے اسی لہجے میں بولی۔

”خیریت؟ یہ آج اس کیز پر اتنا غصہ کس بات کا.....؟ محبت بھری مسکراہٹ سے استقبال کی جگہ یہ آگ..... کہیں ہم جل ہی نہ جائیں برہم کی اس آگ میں۔ کوئی غلطی ہو گئی ہے ہم سے؟“

”خیر دو دنوں ماں بیٹے میرے خلاف کیا کھجڑی بناتے رہے ہو؟“ رئیس بنگل خان کا غصہ پھر بھی کم نہ ہوا تو حاکم زادی نے بھانپ لیا کہ معاملہ اتنے بڑھ کر ذات تک جا پہنچا ہے۔ چل کے چل اس نے سوچنا چاہا کہ آخر اس سے یا اس کے بیٹے مراد سے کیا غلطی ہو گئی ہوگی اور تب ہی اس کے اندر ایک جھماکا سا ہوا مگر تعذیب سے پہلے وہ کچھ یقین سے نہ سوچ پائی تو بولی۔

”میں اور آپ کے خلاف کوئی کھجڑی بناؤں؟ سائیں ماں وارا.....! ایسا ممکن ہی نہیں، رہی بات پٹ مراد کی تو اس سے نادانی میں کوئی غلطی ہو گئی ہو تو اس کی میں آپ سے معافی مانگ لیتی ہوں۔“

”حاکم! میری طرف دیکھو..... غور سے.....“ رئیس بنگل خان نے اسی طرح جلائی لہجے میں بیوی سے کہا اور حاکم زادی جس کی نگاہیں پہلے ہی سے رئیس بنگل خان کے چہرے پر ہی جمی ہوئی تھیں، اسی طرح بیٹھی رہی۔ تاہم اس کا دل اندر سے بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ بولا۔

”حاکم! تمہاری مجھ سے شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

بہوی کی اس بات نے رئیس کو حیران کر دیا۔ وہ اس بات سے اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بھلو میں کرتے کے اندر بند سے ہولشر میں ڈالا اور جب دوبارہ برآمد ہوا تو اس کے ہاتھ میں سیاہ نال والا ایک خوفناک پستول نظر آ رہا تھا۔ حاکم زادی شوہر کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔

”لو حاکما! یہ پستول لو اور میرے سینے میں گولی اتار کر میری لاش کو زمین کے اس ٹکڑے کو بیچے پر رضامند کر لو۔“

”نن..... نہیں سائیں! میرے منہ میں خاک..... آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، سچ وہی ہے جو میں نے آپ سے کہا ہے۔ میں نے تو پت مراد کو اپنی طرف سے سمجھا دیا تھا، آپ کہیں گے تو میں میرے اسے سمجھا دوں گی مگر اللہ سائیں کا واسطہ ہے آپ کو..... یہ پستول واپس رکھ لیں، ان ہتھیاروں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا اور جوان پٹ کے سامنے ایسا مت کرنا۔“ حاکما نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ حالانکہ حاکم زادی نے اپنے سینے سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اس زمین کے ٹکڑے کو بیچنے کے لیے اپنے شوہر سے بات کرے گی مگر یہاں تو معاملہ ہی ایسا بگڑا تھا کہ اب تو وہ یہ بات شوہر سے کہنے کی بالکل بھی روادار نہیں رہی تھی۔

”تو پھر پڑیں اس جوان پٹ کو سمجھا دے مجھ سے ایسی بات بھول کر بھی نہ کرے۔“ یہ کہتے ہوئے رئیس نے پستول واپس اپنے بھلی ہولشر میں اڑس لیا۔ حاکم زادی جلدی سے اگلی اور قریب دھری ڈرائی پر رکھے کالج کے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور شوہر کی طرف بڑھا دیا۔

”لو پانی پی لو سائیں! اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کا بلڈ پریشر پہلے ہی ہائی رہتا ہے۔“

رئیس نے پانی کا گلاس لیا اور چند گھونٹ بھر کے گلاس دوبارہ بہوی کے حوالے کر دیا۔

”سائیں! بس اب اس بات کو بھول جائیں اور میں تو حیران ہوں کہ ابھی تو میں نے یا پت مراد نے آپ سے ایسی کوئی بات تک نہیں کی، پھر آپ کو کیسے پتا چلا.....؟“ حاکم زادی نے تھوڑی ہمت کرتے ہوئے پوچھ لیا۔ اسے اسی بات کا ہی تجسس ہو رہا تھا کہ آخر وہ بات اس کے شوہر کو پتا کیسے چلی جس کے بارے میں ابھی تک اس سے بات تک بھی نہیں کی تھی؟

”اچھا ہی ہوا کہ نہیں کی۔“ رئیس کا پارہ اب آہستہ آہستہ اترنے لگا تھا۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے زمیندار اللہ وراپو آیا تھا میرے

رئیس کے اس سوال پر حاکم زادی کو اپنا حلق سوکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کے اندر کوئی چیخنے لگا تھا کہ رئیس کے ایسے سوالات پوچھنے کا مطلب معاملے کی حساسیت کو ظاہر کرتا تھا۔

”بچ..... جی، سائیں! خیر سے آج پورے چھبیس سال، چھ ماہ اور بارہ دن.....“

”م نے کبھی اپنے پالتو کتے کا بھی سودا کیا ہے آج تک؟ گھوڑا بھی ہمارا کام کا نہیں ہوتا تو ہم اسے گولی مار دیا کرتے ہیں۔ تم نے اور مرد خان نے کیسے یہ سمجھ لیا کہ ہم زمین کا ایک ٹکڑا بھی فروخت کر سکتے ہیں۔ کیا رئیس اعظم کے چشم و چراغ رئیس بنگل خان کی حیثیت اب یہ ہوئی کہ لوگ اس پر نہیں کہ رئیس پر ایسا برا وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنے باپ داداؤں کی نشانی کو بیچنے پر مجبور ہو گیا ہے؟ جواب دو..... حاکما!“

رئیس کا جلال اور غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ اریب قریب کے خدمت گزار اور چاکر ”ڈوے رئیس“ کے تہور دیکھ کر ادھر ادھر کھسک گئے تھے۔ ماحول گرم ہو گیا تھا اور ڈوے رئیس کے جاہ و جلال سے حویلی کے دروازے پر لڑنے لگے تھے۔

”ہماری غیرت کا معاملہ ہے اور جب بات غیرت کی ہو تو ہمیں کسی کی بھی پردا نہیں رہتی۔ مراد تو چلو ہمارا پٹ ہے، پر تم تو بیوی ہو..... تمہیں تو اتنا عرصہ ہوا ہمارے ساتھ رہتے ہوئے ہم نے یہ کیسے سمجھ لیا تھا کہ ہم جھیل شاہ والی زمین کا سودا کر سکتے ہیں نہ چائیں گے مگر یہ زمین نہیں بیچیں گے۔ چاہے اسے ہم خود ہی کیوں نہ کھالے جواب دو مجھے حاکما! ہم نے بیٹے کو یہ سب سمجھانے کے بجائے اسے اس راہ پر کیوں لگایا؟“

رئیس اپنی بات ختم کر کے چپ تو ہو گیا تھا مگر اس کا غیظ و غضب، بجائے کم ہونے کے فزوت تر ہونے لگا تھا۔ حاکم زادی نے جو یہ سنا تو اس کا ہاتھ ٹھنک گیا۔ پہلے تو اسے حیرت ہوئی کہ اس کے بیٹے مراد نے تو نہیں باپ سے اس زمین کے سلیبل میں کبہ ڈالا ہے؟ مگر اس نے تو ابھی صرف مجھ سے بات کی تھی اور خود باپ سے ابھی کہنے کی یہ جرأت کہاں کر پایا تھا؟ پھر..... پھر کیسے رئیس کے کانوں تک یہ بات جا پہنچی تھی؟

بہر کیف..... اس نے سنبھال لیتے ہوئے شوہر سے کہا۔ ”میرے سر کے سائیں! تمہارے سر کی قسم ہے، مجھے اپنے سہاگ کی قسم ہے۔ میں نے تو مراد پٹ کو ایسی کوئی پٹی نہیں بڑھائی تھی بلکہ اس نے ابھی تھوڑے دنوں پہلے خود ہی مجھے یہ بتایا تھا اور ساتھ ہی مجھ سے ضد کی تھی کہ میں آپ سے ات کر کے آپ کو رضامند کروں.....“

پاس۔“ بالآخر وہ بتانے لگا اور حاکم زادی اس کی بات پر دھیان دینے لگی۔

”اسی جلیل شاہ والی زمین کی بات کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود پر قابو پائے رکھا تھا۔ مہمان بن کر آیا تھا اور ہماری اوطاق میں اگر دشمن بھی مہمان کی حیثیت سے قدم رکھ دے تو ہم سب کچھ بھلا دیتے ہیں، بس وہ ہماری اسی کمزوری سے کھیل گیا، ورنہ۔۔۔۔۔۔“ اپنا جملہ ادھر اور اچھوڑ کر وہ پھر جلال میں آنے لگا تو حاکم زادی نے اسے بہلانا شروع کر دیا۔

”چھوڑیں سائیں اب اس بات کو۔۔۔۔۔۔ اپنی لاڈلی دمی (بٹی) سے نہیں ملو گے؟ ابھی تو عورتی دیر پہلے آپ کا انتظار کر کے ہی اپنے کمرے میں گئی ہے۔“ مجلس وہیں چلتے ہیں۔۔۔۔۔۔“ وہ رئیس کو بازو سے سہارا دینے لگی۔ اس کے دو گھنٹے بعد حاکم زادی اپنے سیل فون پر بیٹے مراد خان سے بات کر رہی تھی۔

”یہ تم نے کیا بے وقوفی کر ڈالی پٹ؟ ابھی میں نے تمہارے بیو (باپ) سے بات بھی نہیں کی اور تم نے اس پھنچر زمیندار اللہ وریو کو یہاں بھیج دیا۔۔۔۔۔۔!“

”اوہو۔۔۔۔۔۔ اماں جانی! تو پھر کیا ہو گیا؟ وہ زمین کی بات کرنے ہی تو آیا تھا کوئی ڈاکار نے تو نہیں آیا تھا جو بابا جانی اتنا گرم ہو گئے۔“ مراد نے منہ بسورنے کے انداز میں جواب دیا تو ماں بولی۔

”اچھا ہی ہوا کہ ڈاکا پڑ جاتا۔۔۔۔۔۔“ کہتے ہوئے ماں نے اسے ساری بات بتادی اور آخر میں بیٹے کو خبردار کرتے ہوئے بولی۔

”خبردار۔۔۔۔۔۔! اب دوبارہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ تمہارے ساتھ میری بھی شامت آ جائے گی۔“

”تو کیا آپ بابا سے بات نہیں کریں گی اماں جانی؟“

”اب کہنے کو رہ ہی کیا گیا ہے پٹ مراد!“ ماں

بولی۔ ”میں بات کرتی تو طریقے سلیتے سے کرتی، یا کسی دوسری صورت پر رضامند کر لیتی رئیس کو مگر اب تمہاری جلد بازی کی وجہ سے سارا کام جیلے ہی خراب ہو چکا ہے۔ رئیس میری طرف سے بھی غلط فہمی میں پڑ گئے تھے۔ بڑی مشکلوں سے میں نے انہیں اور ان کے غصے کو سنبھالا، گولی چلنے کی دیر باقی رہ گئی تھی۔“

”تو پھر کیا اب آپ بات نہیں کریں گی بابا جانی سے؟“ مراد نے مایوس ہو کر کہا۔

”یہ بات کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا لیکن

کوشش کروں گی کہ تمہیں پیسے دلوا دوں۔۔۔۔۔۔“

”پیسے نہیں دیں گے وہ۔۔۔۔۔۔ یہ میں کر کے دیکھ چکا ہوں۔۔۔۔۔۔“ کہتے ہوئے مراد نے رابطہ ہی منقطع کر دیا اور

ماں۔۔۔۔۔۔ ”ہیلو۔۔۔۔۔۔ ہیلو۔۔۔۔۔۔“ کرتی رہ گئی۔

☆☆☆

”ہماری بیٹی کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟“ رات کے کھانے پر تینوں ڈانٹنگ ٹیبل پر اکٹھے ہوئے تو رئیس نے اپنی بیٹی مہرود سے پریشانی لہجے میں پوچھا۔ مہرود راصل تھوڑا آرام کی غرض سے لیٹ گئی تھی، اسی لیے باپ، بیٹی کی بات نہیں ہو سکی تھی۔

”بہت اچھی جا رہی ہے بابا جانی! اب آخری سال رہ گیا ہے، امتحانات کی تیاری کر رہی ہوں۔“

مہرود نے باپ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”بس! اب جلدی جلدی پڑھائی سے فارغ ہو جاؤ تو تمہارے بارے میں بھی سوچا جائے، بلکہ سوچنا کیا ہے۔۔۔۔۔۔“

سوچ ہی لیا ہے۔۔۔۔۔۔“ رئیس نے چاولوں کی ڈش کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو مہرود باپ کی بات کا مطلب سمجھ کر چونک سی گئی۔ اس نے پریشان سی نگاہوں سے۔۔۔۔۔۔ ساتھ بیٹھی ماں

کی طرف دیکھا تو ماں نے اسے کچھ نہ کہنے کا خفیف سا اشارہ کر دیا۔ تاہم اس نے بیٹی کو ابھی چند گھنٹے پہلے ہونے والی بد مزگی کے بارے میں بتا دیا تھا کہ اس کا باپ رئیس ایک معمولی سی بات پر کس قدر برا فروخت ہو گیا تھا اور بے اختیار

ایسے میں وہ فقیر لڑکا سانول اس کے چشم تصور میں گھوم گیا تھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے کھانا کھاتی رہی۔ کھانے کے

بعد مہرود اپنے کمرے میں آ گئی۔ تھوڑی دیر تک میوزک سے دل بہلاتی رہی مگر دل میں عجیب سی ایک بے چینی گھر کیے ہوئے تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار سانول کا تصور اس کے

دل و دماغ میں سمائے جا رہا تھا۔ مہرود نے بہت کوشش کی تھی کہ اس کے دل و دماغ میں سانول کی جو شخصیت کا پرتو آنے

لگا ہے، اسے کسی طرح باطل قرار دے ڈالے۔ اس کے لیے اس نے کھوجنا بھی کی تھی مگر جیسے جیسے وہ اس کی

کھوجنا کرتی، سانول کی شخصیت کی سچائی اور اس کا مجذوبوں والا روپ، بہر وہپ لگتا ہی نہیں تھا۔

کیوں۔۔۔۔۔۔؟ وہ اس کیوں میں اس قدر دلچسپی لینے لگی تھی۔ اس لیے کہ وہ اس سے بڑے دھڑلے کے ساتھ محبت

داری کا دعوے دار تھا۔ ایسی محبت جو اس نے اب سے نہیں بچپن سے اپنے دل کے خانہ نہال میں جاگزیں رکھی تھی۔

”انتہا بدعنوانی کرنے کے بعد پھر وہ پیچھے کیوں ہٹ

رہا تھا؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔
 ”میں تو بھی تھی کہ وہ ایسا مجھے متاثر کرنے کے لیے کہہ رہا تھا مگر نہیں، میں نے تو اس کے پیچھے جا کر بھی اس کا اصل روپ دیکھ لیا تھا..... اور پھر اس کے بعد اس کا رویہ مجھ سے ایک دم سرد ہو گیا تھا.....“

مہر دوسونے کے لیے لٹی تو بھی سانول کی ذمہ داری تھی، اس کی شاعری اسے تڑپانے لگی۔ درحقیقت سانول کی شخصیت میں مہر و کو ایک انفرادی نوعیت کی کشش محسوس ہوئی تھی۔ وہ فقیر تھا مگر اکتنے والا فقیر نہیں، بلکہ دینے والا..... فقیر۔ اس نے اسے مانگتے ہوئے دیکھا ہی نہیں تھا۔

شاہد مہر کی کسوٹی پر سانول پورا اترتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب اس کے بارے میں دل کی احتیاج گہرائیوں اور گیرائیوں سمیت اسے سنجیدگی کے ساتھ سوچنے لگی تھی۔ تمام تر جمالیاتی تصور اور نسوانی وجدان کی سوچ وہ سمجھ سمیت..... وہ بلا کا خود بھی تھا۔ دراز قد تھا۔ سینہ چوڑا اور آنکھیں بڑی بڑی اور روشن..... وہ گندا..... نہیں رہتا تھا۔ جیسا کہ عام طور پر فقیر ہوا کرتے ہیں۔ بالوں میں خوب تیل چڑا ہوتا۔ ڈانڈی اور موچیں سلپتے سے ترشی ہوتی تھیں۔ کپڑے میلے نہیں ہوتے تھے اس کے جو اگرچہ پرانے ضرور ہوتے تھے۔ اس نے یہ بہروپ کیوں بھر رکھا تھا؟

وہ اسے کسی کسوٹی پر رکھنا چاہتی تھی۔ مہر و کو پھر اس کی کھوجنا ہونے لگی اور رات گئے آنکھ لگنے تک بڑی شدت کے ساتھ ایک بار پھر اس سے ملنے کی خواہش اس کے دل بے قرار میں زور پکڑنے لگی۔

☆☆☆

سانول نے اب سندھیالوجی میوزیم جانا ترک کر دیا تھا۔ وہ ٹھوڑی پھانک جاتا، لاری اوڑوں کے چکر لگاتا اور پھر شام سے پہلے ہی درگاہ میں آ جاتا تھا۔ کسی نے اس کے سٹیکول میں کچھ ڈال دیا تو ٹھیک ورنہ وہ مانگتا نہیں تھا کسی سے۔ درگاہ آ کر وہ خاموشی سے سٹیکول ایک طرف صحن کے کونے میں رکھ دیتا یا پھر ٹین کے ڈبے میں ڈال دیتا تھا۔ وہ اس روز بھی جلدی درگاہ لوٹ آیا۔

بڑا محاورہ سنی لعل وہاں آئے ہوئے سالکین کے ساتھ ”معروف“ تھا۔ ان کی تعداد اگرچہ گنتی کی ہی تھی۔ جسے بڑھانے کی وہ پچھلے پانچ برس سے کوشش کر رہا تھا مگر چند لوگوں سے آگے یہ تعداد نہیں مٹ سکتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس میں سارا قصور سانول کا تھا۔ وہ ان پر توجہ نہیں دیتا تھا اور جو سنی لعل چاہتا تھا، وہی سانول نہیں چاہتا تھا۔ تنگ آ کر سنی لعل

”جی صاحب جی! خیریت؟ کیسے آتا ہوا.....؟“
 سانول نے اس کے قریب آ کر پوچھا تو صندوقدار کی طرح مسکرا

تھوڑی دیر بعد کار سندھ پونیورسٹی سوسائٹی میں داخل ہو رہی تھی اور اس کے ذرا ہی دیر بعد وہ کاشانہ حیا کے سامنے جا کر رک گئی۔

شام کے ڈھلتے سائے رات کی تاریکی میں بدلنے لگے تھے۔ صفدر سانول کو اینکسی میں لے آیا۔

”یہاں آرام سے بیٹھو، میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔ اس کے بعد آرام سے باتیں کرتے ہیں۔“ صفدر نے اس سے کہا تو سانول نے کچھ کہا چاہا مگر صفدر تب تک جا چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اندراپتی ہوئی حیا سے مخاطب تھا۔

”میں اسے یہاں لے آیا ہوں..... اس کے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کر داس کے بعد میں اس سے بات کرتا ہوں۔“

”کیا وہ مان جائے گا؟ میرا مطلب ہے..... آپ نے مجھے یہ بھی تو بتایا تھا کہ وہ فقیر منش آدمی ہے۔ کہیں برائہ منالے۔“ حیا نے کہا۔

”یہ ظاہر تو مجھے ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوتی، پر دیکھتے ہیں..... کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔“ صفدر نے کہا پھر اچانک اس کے دل میں ایک خیال آیا اور وہ آخر میں حیا سے بولا۔

”بلکہ تم ایک کام اور کرنا، جب وہ کھانا کھالے تو اسے ذرا سلام کرنے آجانا۔“ حیا نے شوہر کی بات پر ہولے سے اپنے سر کو پیش دی۔

اس کے تھوڑی دیر بعد صفدر نے ایک ملازم کے ہاتھ سانول کے لیے کھانا بیچوا دیا۔ سانول وہاں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے میز رکھی ہوئی تھی۔ ملازم نے کھانا وہیں اسی میز پر لگا دیا۔ سانول نے کھانا دیکھ کر بسم اللہ پڑھی اور کھانا کھانے لگا۔

کھانا ختم کیا تو اتنے میں صفدر بھی وہاں آ گیا۔

”کھانا تو خوب سیر ہو کر کھایا ہے نا آپ نے.....؟“ صفدر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں سائیں! بھلا روزی سے کیسی شرم، یہ تو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، جس کے نصیب میں لکھی ہوئی کولتی ہے۔“ سانول نے کہا۔

”بالکل ٹھیک کہا تم نے..... سانول! رزق دینے کی عطا اور طاقت صرف اللہ کی ہے، انسان بھلا کسی کو کیا دے سکتا ہے۔“ صفدر نے کہا۔

”سائیں! میں نے وضو کرنا ہے، عشا کی نماز پڑھنا

کر اس سے بولا۔

”سانول! میرا نام صفدر ہے۔ میں اس روز یہاں آیا تھا..... پچانے مجھے؟“

”جی صاحب جی! اچھی طرح پہچان گیا ہوں آپ کو..... بتائیے، کیسے آنا ہوا؟“ سانول نے شستہ لہجے میں دوبارہ پوچھا۔

”میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں.....“ صفدر نے اس سے کہا اور ساتھ ہی جانے کیوں اس نے دزدیدہ نظروں سے درگاہ کے دروازے کی طرف بھی دیکھا تھا جدھر سختی نعل کھڑا انہی کی طرف گھورے جا رہا تھا۔

”جی بولو سائیں! کیا بات کرنی ہے آپ کو مجھ سے؟“ سانول نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہاں نہیں، گھر پولیسرے ساتھ.....“ صفدر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”گھر.....؟ پر میرا تو کوئی گھر نہیں ہے؟“ سانول نے جواب دیا۔

”میں تمہیں اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں، وہیں آرام سے بات کریں گے۔“

”لل..... لیکن..... سس..... سائیں! آپ یہاں بھی تو وہ بات کر سکتے ہیں؟“

”نہیں، میرا خیال ہے وہی جگہ بہتر ہے کی۔ آؤ میرے ساتھ، دیکھو انکار مت کرنا۔ میں بہت امید لے کر آیا ہوں یہاں.....“

”امید اور مجھ سے؟ میں غریب بھلا کسی کی کیا امید بن سکتا ہوں؟“ سانول نے جواب دیا۔

”بن سکتے ہو، کیوں نہیں بن سکتے؟ آخر کو ایک انسان ہی دوسرے انسان کے کام آ سکتا ہے۔“ صفدر بولا۔ ”آجاؤ

میرے ساتھ، میرے گھر چلو، وہاں آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے، پھر تم کو مجھے تو میں تمہیں یہاں چھوڑ جاؤں گا۔“

”جا چلا جا سانول! صاحب کو تیرے سے کچھ کام کا..... کسی کے کام آنا اچھی بات ہوتی ہے۔“

قریب کھڑے ٹی لٹل نے بھی حیران پریشان کھڑے سانول سے کہا تو کچھ سوچ کر سانول نے اپنے سر کو اثبات میں نشان دے ڈالی۔

صفدر ایک دم خوش ہو گیا اور پھر اس نے اپنی نیپ سے ایک پانچ سو کا نوٹ نکال کر سختی نعل کو تھمایا اور پھر کھراتے ہوئے سانول کی طرف دیکھا وہ بے چارہ حیران

پریشان سا اس کی طرف بڑھا۔ صفدر نے کار کار دروازہ کھول دیا اور پھر دونوں اس میں سوار ہو گئے۔

”یہ میری بیوی ہے حیا..... اس کے لیے دعا کی درخواست کروں گا تم سے.....“ صفدر نے سانول سے کہا۔
”اللہ سائیں اس کی حیا اور پردہ سلامت رکھے۔“

سانول نے دعائے کہا اور پوچھا۔ ”کیا یہ پیار ہے؟“
”نہیں، پیار تو نہیں ہے، پر ہماری شادی کوئی برس بیت چکے ہیں مگر ابھی تک اس کی گود ہری نہیں ہوئی ہے۔“ صفدر نے یہ بات اس سے ڈرا ڈرتے ڈرتے کہی تھی، کیونکہ اسے پتا تھا کہ اس طرح کی باتوں سے سانول ناراض ہو جاتا تھا۔ تاہم ایسا کچھ نہیں ہوا اور سانول نے کہا۔

”یہ سب اللہ سائیں کی حکمتیں ہیں جسے ہم انسان سمجھنے سے قاصر ہیں۔ خوش وی لوگ رہتے ہیں جو ہر حال میں رب سائیں کا شکر ادا کرتے ہیں۔ انسانیت کے ناتجربہ افراد سے پتا ہے کہ میں اللہ سائیں سے آپ دونوں کی بہتری کی دعا کروں گا.....“

صفدر کا یہ وعدہ تھا کہ وہ اسے چھوڑ دے گا۔ اسی لیے وہ اسے اپنی کار میں بٹھا کر دوبارہ درگاہ چھوڑ گیا اور جب وہاں سے لوٹنے لگا تو رات کا کافی گہری ہو چکی تھی۔

ناپختہ راستے سے وہ جیسے ہی مین روڈ پر آیا اس نے کار کی رفتار بڑھادی۔ وہ جلدی گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ شاید اسی جلد بازی کے سبب وہ اچانک سامنے سے آنے والے ایک ٹرک کی ٹکڑ سے اپنی کار کو نہیں بچا سکا۔ اس نے بریک تو لگا دیے تھے مگر ٹرک بالکل سامنے آچکا تھا۔ ایک ساعت ٹھکن دھماکے سے صفدر کی کار ٹرک سے ٹکرائی اور صفدر کا دماغ تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

”یا اللہ سائیں.....! خیر ہووے.....“
درگاہ کے حجرے میں گجی کی چٹائی پر بیٹھے ہوئے سانول کے لبوں سے بے اختیار یہ دعائیں کلمات برآمد ہوئے تھے۔ ”لگتا ہے بڑی سڑک (مین روڈ) پر کوئی خطرناک ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔“

رات کے سائے میں کار ایکسیڈنٹ کے دھماکے کی آواز دور دور تک سنائی دی تھی جو سانول شاہ کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔ سختی سے ایک طرف نیند میں بے سدھ پڑا خراٹے لے رہا تھا۔

سانول کا دل بے چینی محسوس کرنے لگا کیونکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی صفدر اسے اپنی کار میں یہاں چھوڑ کر گیا تھا اور اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ حادثہ اسی کار کو پیش آیا ہوگا۔ بے چینی جب حد سے بڑھنے لگی تو وہ اپنے حجرے سے نکلا اور

تھی۔“ سانول نے کہا۔ صفدر نے اسے ہاتھ روم دکھا دیا۔ سانول نے جب تک وضو کیا، صفدر اس کے لیے جائے نماز اور تسبیح لے آیا۔ سانول نے نماز پڑھی، دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ صفدر ایک طرف کرسی پر خاموش بیٹھا اسے عبادت کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ زیر لب دعا پڑھنے کے بعد سانول نے ہولے سے آئین کہہ کر دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر لیے اور پھر وہیں مضلے پر بیٹھے بیٹھے گردن موڑے چاروں طرف دیکھنے لگا، پھر چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ صفدر ایک طرف کرسی پر بیٹھا بے غور اسی کی طرف نکلے جا رہا تھا۔

اس کے بعد سانول اٹھا اور صفدر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ صفدر اس کی نظروں کا اشارہ سمجھ کر ہولے سے ٹھنکھار کر بولا۔

”دیکھو سانول! میں اپنے لیے ٹیکو کار یا پار سائی کا دعویٰ تو نہیں کرتا مگر کوشش یہی ہوتی ہے کہ میری ذات سے نہ کسی کو نقصان پہنچنے نہ ہی کسی کا دل دنگے۔ پھر بھی بدہ بشر ہوں، خطا کا پتلا ہوں۔ اللہ کی آزمائش پر شاکر بھی رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ ٹھہرا پھر کہنا شروع ہوا۔

”تم ایک نیک اور شریف انسان ہو مگر جب تمہیں تنگ دقتی میں دیکھتا ہوں تو مجھے دکھ سا ہوتا ہے۔ بس، میری یہ خواہش ہے کہ تمہارا کھانا پینا، رہن سہن سب میں اپنے ذمے لے لوں۔ مجھے اس سے دلی سکون نصیب ہوگا۔ مجھے یقین ہے تم انکار نہیں کرو گے۔ یہی میں نے تم سے کہنا تھا۔“

سانول نے اس کی بات غور سے سنی، پھر مسکرا کر بولا۔

”سائیں! اللہ آپ کو خوشیاں دے، میں جس حال میں

بھی ہوں اس میں خوش ہوں۔ میرا خیال ہے مجھ سے زیادہ سختی لوگ دنیا میں پڑے ہیں۔ آپ نے ایسا کچھ کرنا ہی ہے تو ان کے لیے کروں۔ مجھے فقر کی تو یوں بھی احتیاجات بہت محدود ہیں۔ کھانا کھلانے کا شکر یہ..... میں اب چلوں گا۔“

یہ کہتے ہوئے سانول اٹھ کھڑا ہوا.....

”بیٹھو، ابھی رات ہو گئی ہے، کل صبح میں تمہیں

چھوڑ دوں گا۔“

”مجھے صرف اپنے ٹھکانے پر ہی نیند آتی ہے جہاں میں کچے فرش پر کبھی کی چٹائی بچھا کر سوتا ہوں۔ یہاں نرم بستر میرے لیے کانٹوں کا چھوٹا نہ بن جائے..... چلتا ہوں۔“
سانول یہ کہہ کر جانے لگا۔ اٹھانے راہ..... حیا سر بردو پٹار کھے وہاں آگئی۔ سانول نے فوراً اپنی نظریں جھکا لیں۔ حیا نے اسے سلام کیا، اس نے بھی ہولے سے جواب دیا اور صفدر کی طرف دیکھا۔

کمر پار ہی تھی۔ اس نے سوچا شاید ایسا کٹھی میں رہنے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کچھ دن ہاسٹل میں ہی کیونکہ نہ قیام کر لے۔ ریحانہ اس کی گہری سیکلی ہی نہیں روم میٹ بھی تھی۔ کلاس میٹ تو تھی ہی، وہ عموماً اسی کے روم میں نظر اگرتی تھی۔ باقی کھانا پینا کپس کی کینٹین میں مل جاتا تھا۔

لہذا وہ اپنا مختصر سامان اور کتابیں لیے ہاسٹل آگئی۔ ریحانہ اسے دیکھ کر خوش ہوگئی۔ یہاں آکر مہر کو کچھ سکون ملا اور ریحانہ کے ساتھ اس نے کباٹن اسٹڈی بھی شروع کر دی مگر باوصف اس کے وہ اچانک پڑھتے پڑھتے نہیں کھوجاتی۔ ”خیریت تو ہے مہر وہ..... تم اچانک کہاں کھوجا بی ہو؟“ ایک دن مہر کو اسٹڈی کے دوران ریحانہ نے ٹوکا، جب وہ کتاب سامنے کھولے ہوئے تھی مگر اس کا دھیان اور لگا بی کی اور جگہ پر مرکوز نہیں۔

”کک..... کچھ نہیں، بس یونی ایک ٹاپک ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔“ مہر نے فوراً بہانہ بنایا تو ریحانہ بھی آگے سے اور کچھ نہ بولی لیکن وہ بدستور اسے آبرور کرتی رہی۔

ایک دن مہر وہاں نہ جاتے ہوئے جی جاہا کہ وہ ایک چکر سندھیا لوجی میوزیم کا لگا آئے۔ اس لوجوان محظوب سانول کی شاعری کے بول اس کے کانوں میں گونجنے لگے، جنہوں نے اسے مزید بے چین سا کر کے رکھ دیا اور پھر وہ نہیں رہی۔

سندھیا لوجی میوزیم میں وہ اپنی کار میں ہی آئی تھی اور اسی تھی۔ وہ خود بھی کار چلاتی تھی۔ میوزیم کے اندر پہنچی تو وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ یوں وہ دوبارہ اور سربارہ وہاں آتی رہی مگر سانول سے پھر بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ اس کے اندر کی بے چینی تھی کہ رفع ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی، وہ جس قدر اپنے ان خیالات کو دبانے کی کوشش کرتی جو سانول کی ذات سے وابستہ ہوتے، وہ انتہائی ابھرتے اور اب تو وہ اسے جیسے بے دم کیے دیتے تھے۔

”جہیں تسلیم کرنا پڑے گا مہر وہ تم سانول سے محبت کرنے لگی ہو.....“

ایک رات جب اس کے اندر کی بے چینی حد سے بڑھنے لگی تو بے اختیار اس کے من میں کسی نے چلا کر کہا۔ ”تم اس محظوب فقیر لڑکے کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہو۔ یہ محبت ہی تو ہے کہ دل کی بے چینی ہر لمحے اسی کے لیے ہی جہیں ترپاتی رہتی ہے۔ تم کب تک اپنے اس جذبہ دل کو جھٹلاتی رہو گی جو ایک بچ کی صورت تمہارے دل میں نمودار ہو گیا ہے۔“

مہر درگاہ سے باہر تارکی میں نکل آیا۔ آوارہ کتوں کو بھگانے کے لیے اس نے موٹی شاخ ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ وہ تاریک اور ٹل کھاتے کچے راستے پر تیز تیز قدموں سے چلا جا رہا تھا۔

مین روڈ پر مشکل ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ وہ جب وہاں پہنچا تو وہاں خاصا شور مچا ہوا تھا۔ ایسولینس اور پولیس کی دو گاڑیاں وہاں موجود تھیں۔ پتا چلا کہ صرف ایک ہی شخص موجود تھا اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کی لاش ایسولینس میں رکھی جا رہی تھی۔ سانول نے کسی طرح حکم چلنے کے دوران آگے بڑھ کر دیکھا، کا تو وہ پہچان ہی چکا تھا مگر لاش دیکھتے ہی وہ سکتے میں آ گیا۔ وہ صفدر کی ہی لاش تھی۔ وہ بہت دھکی ہو گیا۔ اس نے وہاں سے بتانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس بد نصیب مرنے والے کو جانتا ہے اور اس کا گھر بھی دیکھا ہوا ہے مگر اس کا حلیہ ہی ایسا تھا کہ کسی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ آخر وہ ایسولینس کے ڈرائیور کے پاس پہنچا اور اس کی مٹیں کرنے لگا۔ ڈرائیور بھی غریب سہاوی آدمی تھا۔ اس نے کچھ سوالات کیے اور پھر اپنے عملے ہی کے ایک ذمے دار آدمی سے بات کی، جس نے فوراً وہاں موجود پولیس اہلکاروں کو بتایا تو انہوں نے اس کی بات کی تصدیق کی خاطر صفدر کی لاش کی جیبوں کی تلاشی لی تو اس کے اندر سے چند دیگر کاغذوں کے علاوہ شامی کارڈ بھی مل گیا اور یوں اس کی بات کا یقین کیا گیا۔ یوں سانول کو بھی ایسولینس میں سوار کر دیا گیا اور وہ سائرن بجاتی ہوئی سندھ یونیورسٹی سوسائٹی کی طرف روانہ ہوئی۔

جب ایسولینس ”کاشا نہ حیا“ پہنچی تو وہاں کہرام مچ گیا۔ حیاتو اپنے شوہر صفدر کی خون میں لت پت لاش دیکھ کر صدمے سے غش کھا کر گر پڑی۔ شوہر وغیرہ کی آواز سن کر ارباب قریب کے گھروں سے بھی لوگ نکل آئے تھے اور ان کی عورتیں حیا کو سنبھالنے میں لگ گئیں۔ سانول وہیں موجود رہا، حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔

☆☆☆

مہر امتحانات کی وجہ سے حویلی میں زیادہ دیر نہ رک سکتی تھی، اسی لیے وہ ایک دو دن بعد ہی شہر آگئی تھی۔ ہاں حویلی ہی میں رہ گئی تھی۔ بھٹائی گھر میں اب صرف مہر تھی یا اس کا بڑا بھائی مراد بھی کھارا جاتا تھا۔ باقی نوکر چاکر اور ساج گارڈ وہاں موجود رہتے ہی تھے۔

مہر کو دل پڑھائی میں نہیں لگ رہا تھا۔ اگرچہ وہ پڑھائی میں ملتی نہیں تھی اور ہمیشہ اچھے ہی نمبروں سے پاس ہوتی تھی مگر اس بار جانے کیوں وہ پہلے والی کیسوی قائم نہیں

”وہ جی، کوئی صاحب تھے، کار میں آیا کرتے تھے یہاں..... وہی اسے کل رات اپنے گھر بھی لے گئے تھے..... جب اسے یہاں چھوڑ کر چلے گئے تو اس کے بعد ہی دھماکے کی آواز آئی اور سانول بے چین ہو گیا کہ کہیں وہ خوفناک حادثہ اسی صاحب کی کار کے ساتھ تو نہیں پیش آ گیا، پھر وہ یہ دیکھنے جب کا گیا ہے تو ابھی تک نہیں لوٹا ہے.....“ جی لعل نے بالآخر اسے تھوڑی بہت صراحت بتائی دی، جسے سن کر مہرو کے چہرے پر کچھ تشویش آمیز سی الجھن تیر گئی۔ وہ چنٹائیے اسی طرح پُر سوچ انداز میں اپنے ہونٹ جیسے کھڑی رہی، پھر اس کے بعد جی لعل سے سوال کیا۔

”وہ صاحب کون تھے؟ کیا تم جانتے ہو اسے، کیا نام تھا اس کا.....؟“

”وہی اس کے بارے میں جانتا تھا زیادہ، مجھے تو اس آدمی کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں تھیں۔“ سخی لعل جواب بولا۔ ”ہاں! اتنا ضرور اندازہ ہے مجھے کہ وہ آدمی تھا کچھ پراسرار سا..... اور پیسے والا بھی بہت دھڑکتا تھا، پر پتا نہیں اسے سانول کے ساتھ کیوں اتنی دلچسپی ہو گئی تھی؟“

مہرو تھوڑی دیر بعد گوگوسے انداز میں وہاں سے لوٹ آئی۔

☆☆☆

”کاشا نہ حیا“ کے سامنے ایسولینس کھڑی تھی۔ اس کا سائزن تھوڑی دیر بیٹنے کے بعد بند ہو چکا تھا۔ اس کی آواز پر اندر موجود حیا کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ جیسی بھی اور جس حالت میں اندر بیٹھی لی دی ویکہ رہی تھی اسی طرح بغیر چادر اور دوپٹے کے گھر سے نکل کر باہر گیٹ پر آ گئی اور پھر سامنے کھڑی ایسولینس اور اطراف میں کھڑے لوگوں کو دیکھ کر یک دم دھک سے رہ گئی۔ اس کے قدم وہیں رک گئے۔ چہرہ حق اور منہ کھلا رہ گیا، آنکھیں پھیل گئیں۔ دل کو ہی نہیں اس کی روح تک کو دھچکا لگا تھا اور تب ہی اس کے حلق سے ایک ہذیانی چیخ بلند ہو گئی اور وہ ایسولینس کے ساتھ جاگڑائی شیشے کے پارائے اندر ایک اسٹریچر پر اپنے سہاگ کو خون میں لت پت دیکھا۔

”صص..... صنی..... مم..... میرے صفدر.....!“ وہ کھڑکی کے شیشے پر کے مار کر چلائی۔

قریب پولیس کی موبائل بھی کھڑی تھی۔ انہیں اب یہ تصدیق کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ ہائی وے پر ہونے والے اس جانناک حادثے میں جاں بحق ہونے والے شخص کو اس کے ٹھکانے تک پہنچا دیا گیا تھا۔ ایسولینس کا ڈرائیور اور عملے کے دو افراد بھی نیچے اتر آئے تھے۔

اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہاں کے منتظمین اور عملے کے کچھ لوگوں سے بھی پوچھا اور باہر دکانوں اور اسٹالوں پر بھی گئی۔ پتا کرنے کی کوشش کی تھی کہ ایک نوجوان فقیر منش سالاکا سانول، جس کے ہاتھ میں یکٹارا ہوتا تھا وہ اچانک کدھر غائب ہو گیا ہے مگر کسی کو معلوم نہ تھا۔ تاہم اسے یہ ضرور پتا چلا کہ سانول گزشتہ چند دنوں سے یہاں نہیں آتا۔ پھر کسی نے مہرو کو یہ بھی بتایا کہ اسے کچھ دنوں سے ٹھوڑی پھانک کی طرف دیکھا جاتا رہا ہے، نیز اس نے یہاں آنا چھوڑ دیا ہے۔ شاید میوزیم کی انتظامیہ نے اس پر پابندی لگا دی ہوگی..... وغیرہ۔

جبکہ حقیقت یہ تھی کہ سانول نے خود سے ہی یہاں آنا ترک کر رکھا تھا۔

بہر کیف..... مہرو نے ٹھوڑی پھانک جا کر بھی اسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہاں بھی اس کا کچھ اتنا پتا نہیں چلا تو..... اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ اسے اس کے ٹھکانے درگاہ جمیل شاہ جا کر ہی مل لے۔ اس کی ایک وجہ اس کے دل میں اچانک ابھرنے والی وہ تشویش بھی تھی کہ خدا جانے کہیں وہ بیمار تو نہیں ہو گیا۔

وہ کار دوڑاتی ہوئی درگاہ پر پہنچی تو وہاں اسے صرف بڑا عجیب و غریب لعل نظر آیا۔ اس نے سانول کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔

”پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے؟ کل سے غائب ہے۔ میں خود اس کے لیے پریشان ہو رہا ہوں۔“

”تم نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی اب تک.....؟“ مہرو نے پوچھا۔

”کیا تلاش کروں اسے بی بی جی! فقیر منش آدمی ہے، کبھی یہاں تو بھی وہاں..... آجائے گا خود ہی اور کدھر جانا ہے اس نے۔“

”پھر ٹی جی ہمیں اس کی فکر تو کرنی چاہیے، کہیں خدا ناخواستہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ وغیرہ نہ پیش آ گیا ہو.....“ مہرو نے اس کی طرف دیکھ کر تیشہا کہا تو اچانک ہی جیسے جی لعل کو کچھ یاد آ گیا اور وہ مہرو سے بولا۔

”اوہ..... ہاں بی بی جی! حادثے سے یاد آیا..... کل رات بڑی سڑک (مین روڈ) پر ایک خوفناک حادثہ پیش آیا تھا۔ شاید کسی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بڑے زوردار دھماکے کی آواز آئی تھی۔ سانول اسی رات نکل گیا تھا، وہ حادثے کی جگہ پہنچنا چاہتا تھا.....“

”کیوں؟“

کرمہ میں رکھا اور پھر ادھر بھرے آپ ارغواں کے پیک کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ”دیکھ لو سنگت! زمین کا وہ بھر کھڑا ہمارے لیے موقعے کا سودا ضرور ہے مگر اس سے زیادہ اچھا سودا اور بھی بابا سائیں کی نظروں میں ہے۔ دوستی کی وجہ سے ابھی تک میں نے بھی اپنے بابا سائیں کو منع کر رکھا ہے کہ خریدنی ہے تو تمہاری زمین..... مگر..... یار! میں بھی اپنے بابا سائیں کو زیادہ دیر تک نہیں روک سکتا۔“ اس نے آخر میں دانستہ اسے جوش دلائے کہا تھا۔

”اڑے یار! تیری ڈی مہربانی ہے، ارباب!“ مراد نے دوستانہ مسکراہٹ سے کہا۔ اس کے بھی بابا سائیں ہاتھ میں بلوریں پیگ تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ مونگ پھلی کے بننے ہوئے دانے نوک رہا تھا۔

”بابا جانی ضد کے پکے ہیں۔ وہ اپنی زمین کا ایک ٹکڑا بھی فروخت کرنا شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ چاہے وہ بھر ہی کیوں نہ ہو۔ سوچ رہا تھا اس کے بیٹے سے کچھ پیسے آجاتے، باقی کے میرے پاس تھے، یہ پیسے ملا کر تمہاری دالی زمین خرید لیتا۔“

”اڑے یار تو اماں جانی سے سفارش لگو اتنی تھی نا.....“ ارباب نے مہینے خیز مسکراہٹ سے کہا تو مراد نے جواب دیا۔

”وہی تو کیا تھا بابا جانی تو ایک دم چراغ پا ہو گئے تھے، ان کی بھی نہیں مانی۔“

”سوچئے سنگت! میں کتنا انتظار کروں؟“

”تھوڑے دن مبر کر لے۔ میں کچھ کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، دیکھ لے..... ورنہ میں بھی مجبور ہوں، دوستی اپنی جگہ..... مگر یہ زمین کے معاملات تو تجھے پتا ہی ہے کہ کیسے ہوتے ہیں۔“

”میں سمجھ گیا، بس ان دنوں میں کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بابا جانی کو اگر ضد ہو گئی ہے تو میں بھی ان کا ہی بیٹا ہوں.....“ مراد خان جوش سے بولا۔ ارباب مسکرانے لگا اور بولا۔

”جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بڑھے ضد کے پکے ہوتے ہیں، بلا وجہ گھر میں بد مزگی ہو جائے گی۔ یہ بتا تجھے کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟“

”وہ شہر والا موقعے کا پلاٹ خریدنے کے لیے مجھے ضرورت تو نو کروڑ کی ہے، تین میرے پاس ہیں، چھ کی زمین بک جاتی تو..... میری ضرورت پوری ہو جاتی۔“

”تو کیا تمہارے بابا جانی کے پاس اتنی رقم بھی نہیں ہے؟“

”تت..... تم لوگ اسے یہاں کیوں لے آئے..... دیکھتے نہیں..... مم..... میرا صفی کتنا زخمی ہے..... اسے اسپتال کیوں نہیں لے جاتے؟“..... حیانے ان سے چیخ کر کہا مگر وہ خاموشی سے اپنا سر جھکائے کھڑے رہے، تاہم غلے کے ایک آدی نے موبائل سے اترنے والے ایک پولیس افسر کی طرف ضرور دیکھا تھا اور وہ ہی حیا سے مخاطب ہو کر بولا۔

”بی بی! اس بد نصیب کو اب اسپتال لے جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ ادھر ہائی وے پراس کی کار کو حادثہ پیش آ گیا ہے، ہمیں افسوس ہے کہ یہ نہ جانیر..... ہو سکا.....“

”نہیں.....“ حیا اپنے دونوں ہاتھ کنپٹیوں پہ رکھ کر سٹریائی انداز میں چلائی۔ ”تت..... تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو..... میں کہتی ہوں اسے جلدی اسپتال لے جاؤ..... یہ نہیں مر سکتا..... میرا صفی مجھے اس طرح اچانک چھوڑ کر نہیں جا سکتا.....“

پھر وہ دوبارہ شیشے کی کھڑکی سے اندر اسٹریچر پر رکھی اپنے شوہر کی خون آلود لاش کو دیکھ کر دوبارہ پاگلوں کی طرح بولی۔

”دیکھو..... دیکھو..... میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں..... وہ زندہ ہے۔ آہ.....“

شدت غم و اندوہ کے مارے اس کی آواز گھٹ گئی۔ سر چکرانے لگا۔ حواس ساتھ چھوڑنے لگے اور پھر وہیں گرنے لگی تو وہ ہاتھوں نے اسے گرنے سے بچانے کے لیے ایک دم تھام لیا..... یہ سائلو تھا۔

☆☆☆

زمیندار اللہ وراپو کی اوطاق میں یار دوستوں کی مختصر سی محفل جی ہوئی تھی۔ یہ کل سات افراد تھے۔ ایک ٹھگنے سے قد کا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر کھٹی موچھیں تھیں۔ جسم بھاری تھا۔ رنگ تیز سولانا تھا۔ اس کے غلٹی ہولسٹر سے ریواور کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس نے شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ زمیندار اللہ وراپو کا نوجوان اکلوتا بیٹا، ارباب تھا۔ تین اس کے ہتھیار بدست حواری تھے۔ ارباب کے سامنے ایک سرکنڈوں کے مونڈھے پر رئیس جنگل خان کا بیٹا مراد خان براجمان تھا۔ دونوں گہرے دوست تھے۔ باقی دو سانبھی اس کے بھی موجود تھے، جن کے ہاتھوں میں گنیں موجود تھیں۔ ان کے درمیان میں ایک تپائی پر لوازمات آوارہ دھرے پڑے تھے۔ چوڑا اور بھٹی ہوئی مونگ پھلی کے دانوں کی دو پلیٹیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

”کمال ہے یار، مراد خان! ابھی تک تم اپنے بابا جانی کو رضامند نہیں کر سکے ہو۔“ ارباب نے پیچ سے ٹھوڑا چوڑا لے

ہو جائے۔ ناراض مت ہونا یا ر! میری بات بری لگے تو یہ سر حاضر ہے! ایسی کوئی غلط بات میں بھی منہ سے نہیں..... نکالوں گا جو میرے یا کرو مجھ سے دور کر دے۔ انکار بھی کر دے گا تو میرا دوست ہی رہے گا۔ قرض بھی دے دوں گا۔ اس کی فکر نہ کر.....

”تو آخر کہنا کیا چاہتا ہے ارباب؟ اب کھل کر کہہ دے۔“ مراد نے اس کی طرف دیکھ کر بے چینی سے کہا تو ارباب بولا۔

”تو اجازت دے تو..... میں اپڑیں ماں بیو کو اپنے رشتے کے لیے تمہاری طرف بھیج دوں؟ تیری بہن..... مہر زادی کے لیے..... چھ کروڑ قرض کی صورت میں دی ہوئی رقم بھی تو عوضے کے طور پر رکھ لیتا۔ لوٹانے کی ضرورت نہ ہوگی۔“

مراد اس کی بات پر ایک لمحے کو گنگ سا رہ گیا۔ سمجھ گیا معاملہ سووے بازی کا ہی تھا۔ ارباب نے چھ کروڑ کا قرضہ..... انکار کرنے کے باوجود دینے کا وعدہ کیا ضرور تھا مگر وہ اتنا سدا بھی نہ تھا کہ انکار کے بعد اسے دے بھی دیتا، تاہم عوضے کی صورت میں یہ قرض معاف کرنے کا بھی عندیہ دیا چکا تھا۔ مراد نے غصے سے دل سے تھوڑا غور کیا اور اسے یہ تجویز بری نہیں لگی۔ قاضی اسٹار ہوٹل کھولنا اس کا سب سے بڑا خواب ہی نہیں کمزوری بھی تھی اور خواہش بھی۔ اس نے کہا۔

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں..... پر بات وہی ہے کہ میرے بابا جانی یہ رشتہ مانتے ہیں یا ٹھکراتے ہیں۔“

”وہ مان جائیں گے۔“ ارباب جلدی سے بولا۔

”کیونکہ میں اپنے ماں بیو کو تمہاری حوالی بھیجنے سے پہلے سردار دسایو خان کے ذریعے یہ بات تمہارے بابا جانی کے کانوں میں ڈلوادوں گا۔ وہ ان کا کہا ٹال نہیں سکتے، ورنہ بھلا ہمارے اور تمہارے رتبے میں کیا فرق ہے۔“

”پھر بھی یا ر ارباب! زمین بیچنے کے معاملے میں تیرے باپ سے بابا جانی کی تھوڑی تو تو میں میں ہو گئی تھی۔“

”اڑے اس کی کیا فکر کرتا ہے، میرے بابا سائیں نے کون سا بیمنس مار دی تھی۔ ایک بات ہی تو کہی تھی تمہارے بابا جانی سے..... زمینوں کی باتیں زمیندار نہیں کریں گے تو اور کس سے کریں گے۔ کوئی برزدی تھوڑی کی تھی میرے بابا سائیں نے۔ رئیس نے انکار کر دیا، بات ختم ہوئی۔ ایسی باتیں کہاں دلوں میں رکھنے والی ہوتی ہیں، جس کا صرف تذکرہ ہو مگر کوئی تنازع نہ ہو۔ بے فکر رہ، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“

”ہوں.....“ مراد کے پر سوچ اور بیچنے ہوئے ہونوں سے یہ برآمد ہوا اور بولا۔

”پھر میری طرف سے بھی ابھی سے ہی ہاں سمجھ لو.....

”یا ر! انہوں نے ساری رقم جاسٹور والے سالونٹ پلانٹ پر لگادی ہے۔ کچھ اور رقم دوسرے منصوبوں پر..... فصل اترنے میں دیر ہے مگر وہ پلانٹ اتنا زیادہ دیر نہیں رہ سکتا..... اور بھی بہت سی پارٹیاں اس کے پیچھے لگی ہوئی ہیں۔“

”تو اس پلانٹ میں کرنا کیا چاہتا ہے؟“ ارباب نے پوچھا۔

”وہاں میں قاضی اسٹار طرز کا ہوٹل بنانا چاہتا ہوں اور انڈر گراؤنڈ ایک کلب بھی۔“ مراد نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”ہوں.....“ ارباب نے ایک معنی خیز ہنکارا بھرا۔

پھر پلو سوچ کر بولا۔

”دیکھ میرے یا ر! دوستی کی بات ہی کروں گا میں..... تو پہ تو میں چھ کروڑ کی رقم تجھے بے طور قرض دے سکتا ہوں..... فصل اترنے پر لوٹا دیتا مجھے.....“

مراد خان اس کی بات پر چونکا اور پھر اس کے چہرے پر سرت انگیزی مسکراہٹ ابھری اور وہ ممنون بھرے لہجے میں بولا۔

”یہ کی تاب تو نے یاروں والی بات..... نکلی اور پوچھ پوچھ..... یا ر ارباب! تیرا یہ احسان میں ساری عمر نہیں بھولوں گا۔“

”بات احسان کی ہے تو پھر تجھے بھی مجھ پر ایک احسان کرنا ہوگا۔“ ارباب نے مکاری سے کہا۔

”حکم کرو..... میرے یا ر! ایسے یاروں کے لیے تو سر بھی قربان ہے۔“ مراد خوشی سے بولا۔ اس کی ایک بڑی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ ارباب نے ایک نظر اپنے تینوں حواریوں کی طرف دیکھا، وہ اس کا اشارہ بھانپ کر خاموشی کے ساتھ اوطاق سے باہر چلے گئے۔ مراد بھی اس حرکت کا مطلب سمجھ گیا اور اس نے بھی اپنے دونوں حواریوں کو اوطاق سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اب اوطاق میں صرف یہ دونوں دوست باقی رہ گئے۔

”کوئی خاص بات ہے؟“ مراد نے سوالیہ نظروں سے ارباب کی طرف دیکھا۔

”خاص ہی سمجھ مگر ایسی باتیں نوکروں چاکروں کے سامنے کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ ارباب نے جواب دیا۔

”اچھی بات ہے، بول کیا راز کرنا چاہتا ہے؟“ مراد نے پوچھا۔

ارباب نے کہا۔ ”دیکھ یا ر! یہ بات کرنا مجھے اچھا تو نہیں لگتا، پر اپنے ماں بیو (ماں باپ) کو تیرے ماں بیچنے سے پہلے تمہ سے عندیہ لینا میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ آخر کو تم اچھے دوست اور اہم پلہ اور اہم کٹوہیں تو قوم ذات برادری بھی ایک ہی ہوتی ہیں نہ اس دوستی کو اور مضبوط بھی کر لیں اور تیرا کام بھی

قراری نے جکڑ لیا۔ سانول بار بار اس کے دھیان میں آتا، وہ اسے جھٹکنے کی کوشش کرتی تو آنکھیں کی طرح وہ اس کے دل و دماغ میں گھر کرنے لگتا۔

”وہ سچا ہے..... وہ اپنی محبت میں سچا ہے.....“ اس کے اندر کوئی گردان کرنے لگا۔

اس نے اب تک ایک طرفہ بحر الفت میں اپنی ایسی ناؤ ڈال رکھی تھی، جو بے پتہ تھی۔ آج اسے عمر سے بعد اس کی ناؤ امید کے ساحل پر پہنچی تھی مگر اب منزل ہی وہ کشتی شاید بھنور میں پھنسی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔

مہر سوچے جارہی تھی۔ ہر جوان دل انگیزوں سے بھرا ہوتا ہے اور پھر مہر بھی ایسی ہی عمر کی لڑکی تھی۔ جس کے دل دماغ کے..... کسی گوشہ بے نام میں یہ آرزو ڈھکی ہوئی ہے کہ کوئی اسے چاہے اور پھر سانول کی اس انوکھی محبت نے اسے انفرادی جذبے سے ہی آشکار کیا تھا۔

وہ یہ سب سوچ کر بے اختیار ہی ہونے لگی، تب ہی کوئی چپٹا۔ ”مہر.....! جو ایک طرفہ محبت کے ساتھ ساتھ عذاب نارسائی اور اتنا انتظار رہتا ہے نا..... تو پھر وہ عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف جانے لگتا ہے پھر..... وہ کسی اور دنیا کا لباس ہو جاتا ہے۔ عشق مجازی کی محبت تو اس کے دل سے نہیں نکلتی مگر وہ عشق حقیقی میں پناہ لینے کے بعد ذہنی و قلبی سکون محسوس کرتا ہے۔ تمام لے اس کا ہاتھ مہر دھنگ.....“

وہ دہل گئی۔ ”سانول..... سانول.....!“

بے اختیار دل کے خانہ خیم سے ایک صدا ابھری اور اس کے لبوں سے اس کا نام برآمد ہونے لگا۔ وہ آنکھیں موندے بستر پر موجود تھی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا تھا کہ اس کی روم میٹ ریحانہ، جو رادیر پہلے ہی کمرے میں داخل ہوئی تھی اور ٹیبل پر اپنی کتابیں درست کرنے میں مصروف تھی، یک دم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

مہر داغہ بیٹھی۔

”کیا ہوا..... مہر.....؟“ ریحانہ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کک..... کچھ نہیں.....“ مہر نے بات بنائی اور ریحانہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے گھور کر رہ گئی۔

☆☆☆

جنگی طرح ٹھناتا احساس جسے مسلسل جھلانے کی کوشش میں تھی، وہ اب پوری تب و تاب کے ساتھ اس کے دل میں بھی محبت بن کر روشن ہو چکا تھا۔ مہر وکال بے قرار..... ہر گھڑی اب سانول..... سانول پکار رہا تھا مگر وہ نہ

اکتوبر 2017ء

مگر کام جلدی ہو جانا چاہیے، مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔“

ارباب خوش ہو کر بولا۔ ”تو نے میرا ڈر ختم کر دیا دوست! اور اصل اس طرح کی رشتے داری کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ خاندان کی مرضی ایک ہو۔ تمہارے بابا جانی مان جاتے تو مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم یا تمہاری اماں جانی نہ اس رشتے سے انکار کر دیتے۔ اس معاملے میں ماں اور جوان بیٹے سے مشورہ کرنا گھر کا ہر سربراہ نہ صرف ضروری سمجھتا ہے بلکہ اس کی مجبوری بھی ہوتی ہے۔ باقی پیسوں کی تو پروا نہ کر، دو دن کی مہلت کافی ہوگی۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں، اماں جانی بھی میری مرضی پر ہی چلیں گی۔ باقی میرے بابا جانی کو رضامند کرنے کی وجہ ڈھونڈ ہی لی تو دیر کس بات کی ہے، کل ہی اپڑیں ماں بچہ کو بھیج دے۔“

”بے فکرہ.....“ ارباب نے کہا اور پھر دونوں دوست کھڑے ہو کر ایک دوسرے کے گلے ملے اور مراد وہاں سے رخصت ہو گیا۔

پیدا چیز ہی ایسی ہے، جس کی ضرورت صرف عام آدمیوں کو ہی نہیں پڑتی، وقت پڑنے پر یہ امراء کی بھی ضرورت بن جایا کرتا ہے۔

ارباب نے مہر کو دیکھ رکھا تھا۔ اپنی ماں کے علاوہ اس نے دیگر لوگوں سے بھی اس کے حسن و شباب کے چمچے سن رکھے تھے۔ یوں بھی وہ فطرتاً حسن پرست تھا۔ ہر اچھی چیز کو فوراً پالنے کی آرزو کر لیا کرتا تھا۔ اپنے حصول و مفاد کے لیے وہ ذرا سا بھی دقیقہ فرو گذاشت کرنے کا قائل نہ تھا۔ کوئی کی بھی نہ رہنے دیتا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس نے احتیاط کے پیش نظر ایک طرف اس رشتے کے لیے یکس بنگل خان کو راضی کرنے کے لیے سردار و ساہو خان کو بھی بیچ میں ڈالا تھا تو دوسری جانب مراد کو بھی رام کر لیا تھا مگر پھر بھی وہ ایک کی کر گیا تھا، وہ بھول گیا تھا کہ صرف انسانوں کو ہی نہیں، بلکہ تقدیر کو رضامند کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

☆☆☆

سچی لعل سے اس شخص کے بارے میں مہر کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ کون تھا اور کیوں سانول میں دلچسپی لے رہا تھا۔ پھر مہر وکال اس بات پر بھی حیرت تھی کہ سانول بھلا اس آدمی کے پیچھے کیوں لگ گیا تھا؟ آخر اس آدمی نے اس پر ایسا کیا جادو کر دیا تھا؟ پھر اس نے سوچا۔ ”مجھے اس آدمی سے کیا لینا دینا اور سانول بھی بھلا کہاں جا سکتا ہے، پھر کبھی سمجھا۔“

وہ لوٹ آئی۔ ہاشل پہنچی تو اس کے دل کو عجیب سی بے

جدائی کا ستم رسیدہ دکھ اس کے سوگوار چہرے پر ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔ مائی بخشاں اس کے پاس بیٹھی، اسے تسلیاں اور اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اماں!“ معافی کرے کی حمد واد رکھ بھری فضا میں حیا کی رنجور آواز ابھری۔ وہ اسے بخشاں کی جگہ اکثر اماں بھی کہہ دیا کرتی تھی۔

”جی، بی بی جی!“ وہ فوراً اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”اتنے پیار کرنے والے..... اتنی جلدی اور اچانک کیوں کھڑے ہو کر رہے ہیں؟“

حیا نے خلاؤں میں غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

”بی بی جی! اتنے پیارے لوگ اللہ سائیں کو بھی تو بہت

پیارے ہوتے ہیں۔ وہ شاید اسی لیے اتنی جلدی انہیں بلا لیتے

ہیں اپنے پاس..... دنیا فانی ہے بی بی جی! ایک دن سب

کو جانا ہے۔“ وہ اسے حوصلہ دلا کر دینے کی کوشش کرتی۔

”اماں! اب میرا کون رہا ہے اس دنیا میں؟ اور تم بھی

کون مہندر کے سوا..... تقدیر کو مجھ پر رحم بھی نہیں آیا؟“

”نہ نہ بی بی جی..... ایسا مت بولو۔ تقدیر کو موت

کوسو، یہ سب اس مقدر بنانے والے کے کھیل ہیں اور وہی ان

کے بھید جانتا ہے۔ وہی مصلحت رکھتا ہے، اپنے بندے کی

بہتری کے لیے۔ اس کی رضا میں راضی رہنے کی کوشش

کریں جو سرخ دور رہتے ہیں، وہی فلاح پاتے ہیں۔“ بخشاں

نے سمجھا۔ حیا سسک پڑی۔ مہندر اسے نہیں بھولتا تھا۔

”بی بی! کچھ کھا لو..... تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔

پاس کے ایک مکان سے ناشتا اور کھانا بھی آیا تھا۔ فرتج میں

رکھا ہے، میں گرم کر کے لاتی ہوں۔“ کہتے ہوئے بخشاں

اٹھنے لگی تو حیا کو اچانک کچھ یاد آیا، بولی۔

”اماں..... اوہ..... چلا گیا، باا بھی تک ادھر ہی ہے؟“

اس کی بات پر بخشاں کچھ یاد کر کے بولی۔ ”جی ہاں بی

بی جی! وہ فقیر تو بے چارہ کب کا جا چکا۔“

”اچھا!“ حیا کے لبوں سے ہولے سے نکلا، بخشاں کچھ

سوچتی بن کر پھر دروازے کی طرف پلٹی اور کچن میں آ گئی۔

کھانا گرم کیا اور ٹرے میں رکھے کمرے میں ہی لے آئی

پھر حیا کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

”بی بی جی! صاحب کے گزر جانے (فوت ہو جانے)

کا اس بے چارے کو بھی بڑا دکھ تھا۔ آپ نے بتایا تھا کہ

صاحب جی اسے بہت تلاش کے بعد اور مشکلوں سے راضی

کر کے یہاں لائے تھے ایک دن.....؟“

جانے کہاں تھا؟ کل سارا دن اس نے اسے تلاش کیا تھا۔ فاضل انگرام تھے اور ایک یادوہی پیش لکچر ہوتے تھے۔ بارہ بجے تک اسٹوڈنٹس لائبریری آ کر بیٹھ جاتے اور ”سیلف اسٹڈی“ میں مصروف ہو جاتے تھے۔

دوپہ بے ہوش جاتے کینٹین سے کھانا کھاتے کمرے میں جا کر

ایک گھنٹا قیلولہ کر کے پھر پڑھنے بیٹھ جاتے تھے۔ لوکل شہر میں

رہنے والے طلبہ بھی یکسوئی کے ساتھ پڑھنے کے لیے کمرے

بجائے ہاسٹل کو ہی ترجیح دیتے تھے، جیسا کہ مہزادی بھی آج

کل اپنی کلاس میٹ ریحانہ کے ساتھ ہاسٹل میں ہی مقیم

تھی۔ ورنہ تو مہر کا شہر میں عالیشان گھانا بھی تھا۔

مہرونے پڑھائی میں بہت دل لگانے کی کوشش کی تھی

مگر کتاب میں سر جھکا کر تو اس کی نگاہوں کے سامنے سانول

کا چہرہ قفس کرنے لگتا۔ وہ آنکھیں بند کر لیتی تو وہ پھر بھی

سامنے آ جاتا، وہاں بھی اسے سانول کی شبیہ کے سوا کچھ نظر نہ

آتا۔ اس کا پڑھائی میں بالکل بھی دل نہیں لگا۔

”مجھے کون سا پوزیشن لینا ہے۔ پاس ہی ہو جاؤں کافی

ہے۔ فائن آرٹس ہی تو ہے۔“ وہ سوچتی، تاہم حقیقت یہی تھی

کہ وہ بنیادی طور پر ”شارپ مائنڈ“ تھی۔ اسٹڈی کو کر رہی تھی

تھی۔ یوں بھی سارا سال اسی طرح ہی پڑھا کرتی تھی جیسے کچھ

ہی دنوں بعد انگرامز مہرونے والے ہوں۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کتابیں بند کیں، بیگ میں ڈالیں

اور لائبریری سے باہر نکل آئی۔ بارہ بج رہے تھے۔ گرمی اور

چائناٹی دھوپ نے ہر طرف ”اعطش..... اعطش“ کی پکار چا

ر لی تھی۔

اس کی کار ہاسٹل کی مارکنگ میں کھڑی تھی۔ وہ اس میں

ایک کرسندھیالو میوزیم آگئی۔ دھڑکتے دل سے اس نے

اندرونی ٹائلوں والے ہال میں قدم رکھا اور پیاسی نگاہوں نے

ایدا رجبوب کی تمنا چاہتے ہوئے تیزی سے گردش کی مگر وہ

ابہیں نظر نہ آیا۔ وہ تڑپ گئی۔

”کہاں چلا گیا ہے وہ.....؟ کل بھی نہیں آیا تھا۔“ اس

نے۔ جا۔ پھر وہ باہر نکلے اور کار میں روانہ ہو گئی۔ اب اس

کار میں ہلکے شاہ والی درگاہ کی طرف تھا۔

☆☆☆

تدلیں ہو چکی تھی۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، مہندر اور حیا کا

دنیا میں ایک دوسرے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ لہذا شوہر کے

مرنے کے بعد حیا کی رہ گئی تھی۔ پاس پڑوس میں پڑے

کے لیے مہر میں کب تک ساتھ رہیں۔ آج اگر مائی بخشاں وہ

گئی۔ مائی سفید جوڑا پہن رکھا تھا۔ اپنے محبوب شوہر کی دائمی

محبوب یار روحانی سکون..... یہ ابھی اسے معلوم نہ تھا کہ
مہر وہ چو نکا۔
”کہیں یہ بھر کوئی بدگمانی تو اپنے دل میں لے کر یہاں
نہیں آئی ہے؟“

مگر نہیں، اسے آج مہر و کاچہرہ اور ہی رخ پر غمراہ ہوا
دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی کج باری آنکھوں میں آج کسی
بدگمانی کی روش تک نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے نرم و گداز لبوں پہ
کوئی طعن بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ آج وہ سانول کو سراپا حلقہ
اثر میں دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے وہ ”اپنا“..... ”آپ“
بھلا بیٹی ہو۔

آنکھوں میں ان کے جذبات کی لہجے سلگتی دکھائی دیتی
تھی۔ نرم لبوں پہ پیاسی تمنا متحرک تھی۔ آج تو یار جہیں مشکل
مہتاب و آفتاب کی جھلک دیتا دکھائی دے رہا تھا۔

سانول چوکھٹ کے اس پار تھا اور وہ اس پار..... دونوں
چند ثانیے اسی طرح ہی نگاہیں چار کیے رہے۔ آنکھوں ہی
آنکھوں کے رستے جیسے ایک دوسرے کے دل میں اترتے
رہے، ایک دوسرے کو عالم محویت میں دیکھ کر سیر ہوتے
رہے۔ ایسے ہی عالم میں مہر و نے جب بے اختیار چوکھٹ پار
کرنا چاہی تو اس کے قدموں کے ارتعاش نے اسے چوکھٹ پر
ذرا لڑکھڑایا۔ وہ اندر کو گرنے لگی تھی کہ ہل کے ہل سانول
نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور مہر و نے پورے
جی جان کے ساتھ اس کے بازوؤں میں اپنا سیم تن وجود
سدا دیا۔ مہر و کے ریشمی گھنے بال سانول کے چہرے پر آن
گرے اور ایک ایسی اسے یوں لگا جیسے وہ اس تہی سکتی دھوپ
میں کسی شجر چھایا دار تلے آگیا ہو۔ جیسے آج دنیا کا خزانہ اس کی
دسترس تلے آگیا ہو۔ مہر و کو بھی سانول کی قربت میں ایک
انوکھی لذت و سرشاری کا احساس ہوا اور..... ایسا ہوا کہ اسی
وقت اس کے دل سے یہ دعا بھری کہ یہ گھڑیاں رک
جائیں، فضا تھم جائے اور وہ اسی طرح اپنے محبوب کے قرب
سے سیراب ہوئی رہے۔

بے خودی کا یہی عالم اس وقت ترغاب جانے کس
جذبے کے تحت مہر و اس کے سینے سے لگی سسک پڑی.....
سانول چو نکا اور پوچھا۔

”کیا ہو مہر و.....؟ تم رو کیوں پڑیں.....؟“

”سوچتی ہوں، کیا یہ ہمارا ساتھ انوٹ رے گا؟“

مہر و نے اپنا اٹک آلود گال سانول کے فراخ سینے پر رگڑتے
ہوئے مجبور سے لہجہ میں کہا۔ ”مجھے اپنی عالیشان حویلی سے
ڈر لگتا ہے۔“

”ہاں!“ حیانے آہستگی سے کہا۔ ”وہ بالکل ویسا ہی
نوجوان ہے جیسا کہ میں اور صفدر چاہتے تھے اور جیسا تم نے
مجھے مشورہ دیا تھا مگر..... اب اس کا کیا فائدہ؟“

”پرہی لی جی! وہ واقعی اللہ والا بندہ ہے۔ آج کی
ریا کار دنیا میں بالکل سچا اور انسانوں کے لیے ایک درد رکھنے
والا.....“ بخشاں بولی۔ ”وہ مجھ سے آپ کا حال پوچھنے کے
بعد چلا گیا تھا، پراس کی باتوں سے مجھے کچھ
ایسا لگا ضرور تھا جیسے اس کے اندر کوئی پھانس سی چبھ گئی ہو.....“

”پھانس.....؟ کیسی پھانس؟“
”بس لی بی جی! ایسے لوگ بہت ہی حساس بھی تو
ہوتے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر خود کو دوسرے کا مجرم ٹھہرانے
لگتے ہیں۔“
حیا کو اس کی کچھ بات سمجھ آئی کچھ نہیں، تاہم وہ چپ رہی۔

☆☆☆

مہر و نے کار درگاہ کے سامنے روک دی۔ اس نے
اپنا جسم بڑی سی چادر میں ڈھانپ رکھا تھا اور اسی کا نقاب سا
بنا کر چہرے پر لپیٹ لیا تھا۔
آج اسے درگاہ میں غیر معمولی سانسنا محسوس ہوا۔ اس
نے دھڑکتے دل سے خستہ حال چوکھٹ پار کی اور اندر آگئی۔
صحن میں چٹھیل کے درخت کی چھاؤں کے باعث اندر ٹھنڈک
کا احساس ہوتا تھا اور کچے صحن میں تازہ پانی کا چھڑکاؤ بھی اس
کارہن منت تھا۔ جی لعل پانی کے ٹمکنیزے سے بھرنے مسجد والے
ہینڈ پمپ کی طرف گیا ہوا تھا۔ مہر و نے دائیں جانب حجرے
کی طرف دیکھا اور اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ وہاں
اسے سانول کی جھلک دکھائی دی تھی۔ وہ فرش پر بھی کی چٹائی
پر بیٹھا تھا اور اس کے سامنے جزدان رکھا تھا۔ وہ شاید سیپارہ
پڑھ رہا تھا۔ چوکھٹ کے پاس جا کر مہر و نے ہولے سے
ٹھٹکھٹا..... تو سانول نے سراٹھا کر دیکھا اور چونک پڑا۔
سیپارے کو آنکھوں سے لگا کر چوہا، بند کیا اور جزدان کو ایک
طرف رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ مہر و نے ہولے
سے پوچھا۔

”نہیں۔“ سانول نے آہستہ سے جواب دیا۔ اپنے
محبوب کو اس دور پر دیکھ کر اس کا دل بھی بے طرح دھڑکنے لگا
تھا۔ ایک ایسی یوں لگا جیسے اس کی ریاضتیں، عبادتیں
بار آور ہونے لگی تھیں۔ اس نے اٹک بھایا کر اپنے رب
سے اس کے حصول کی جستجو اور دعا میں باغی تھیں یا پھر سکون
قلب کی التجا کی تھی۔ اس کے نصیب میں کیا آنے والا تھا،

”زورِ محبت کے آگے تو محلات کی دیواریں بھی لرز جاتی ہیں مہرہ..... یہ جو ملی کیا شے ہے۔“
”تم سچ کہتے ہو؟“ مہرونے اس سے جدا ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں مہرہو! یہ بالکل ایسا ہی سچ ہے جیسے تمہاری یہاں موجودگی ایک اہل حقیقت ہے۔“

”لیکن..... ہمیں جدا کرنے والے بہت طاقتور ہیں، زمین و آسمان کی ایک بڑے تفاوت کی دیوار ہمارے سچ میں ہے۔ کیا تم اسے گراسکو گے؟“

”ہنگ! کیا تم امارت اور ان سگی دیواروں کو کوہِ شکن اور مضبوط ارادوں سے زیادہ پختہ سمجھتی ہو؟“

”نہیں مگر..... مجھے اپنی فکر نہیں ہے، ذرتی ہوں کہیں تم امارت اور اونچی دیواروں کے نیچے نہ بادیے جاؤ۔“

”اتنا بے حیثیت سمجھتی ہو تم اپنے سانول کو..... تو پھر میری محبت کا بھر و سا بھی مت کرو۔“

”نہیں..... سانول! میرا بھروسا اور میرا اہل اعتماد تو اب صرف تم ہی ہو۔“

”بس! یہی ارادہ دل میں لیے رکھو..... ہماری محبت ایک پاکیزہ جذبے کی رہین منت ہے۔ اس میں کوئی ریا نہیں، کسی نفسی خواہش کا دخل نہیں..... یہ دودلوں کا ہی نہیں روحوں کا بھی ملاپ ہے۔“

”بے شک.....“ مہرونے کے متعش لبوں سے بے اختیار نکلا۔
”مگر مہرونہ!.....“ سانول کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔ مہرونے نے بے قراری سے پوچھ لیا۔

”مگر کیا سانول..... کیا اب بھی ہمارے سچ اگر مگر کی کوئی دیوار ہے؟“

”میں زندگی کی بعض تلخ حقیقتوں سے ڈرتا بھی ہوں..... تم ناز و نعم میں ملی بڑھی ہو اور میں تمہیں شاید وہ سب ندے سکوں..... تم نے عیش و عشرت کی جو زندگی بسر کی ہے، وہ میرے پاس تمہیں کہاں ملے گی؟“

اس کی بات پر مہرونے ایک تلخ ہنس مسکراہٹ سے کہا۔ ”ہونہہ..... ناز و نعم، عیش و عشرت..... یہ سب سونے کے پنجرے اور عیش کے قفس ہیں، جن میں ہم جیسی کوئیں قید رہتی ہیں۔ جنہیں اپنی مرضی سے زندگی گزارنا تو کیا، سانس لینے کی بھی اجازت لینا پڑتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ سانول نے حیرت سے کہا۔

”میری ایک پھولی نہیں، کوئجاں نام تھا ان کا..... جو ان تھیں۔ زمین و جانکا دھوکے معاملات کے باعث اسے کسی

ادھیڑ عمر آدمی سے بیاہ دیا گیا۔ اس پر بھی پھولی کوئجاں کو کوئی اعتراض نہ تھا مگر وہ شخص بدکار اور شرابی تھا، بیوی کو کسی نوکرائی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ معاملہ داری ایسی تھی کہ اس کی شکایت پر بابا جانی بھی اپنی بہن کے لیے کچھ کرنے سے لاجار تھے۔ یوں بھی انہیں کوئی پروا نہ تھی۔ بالآخر وہ بے چاری اسی طرح سسک سسک کر ایک دن مر گئی۔“

”اوہ..... بہت دکھ ہوا تمہاری پھولی کوئجاں کے بارے میں یہ سن کر۔“ سانول تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

وہ مہرونے کی اور بات کا بھی اظہار کرنا چاہتا تھا مگر چپ رہا۔ دونوں تھوڑی دیر تک حجرے کے اسی کمرے میں بیٹھے

باتیں کرتے رہے۔ دید کی پیاس بجھاتے رہے، بیٹھے لہجوں کی فسوں کاری کا لطف اٹھاتے رہے۔ اس کے بعد سخی لعل کی آمد پر وہ دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے جدا ہو گئے۔

☆☆☆

دن گزرتے گئے، دودھ پوانے ملتے رہے۔ ایک دوسرے کی محبت پاکر وہ اپنی اپنی تنہائیوں میں یوں سرشار رہنے لگے جیسے ان دودھ پوانوں فرزانوں نے دنیا کی سب سے بڑی دولت پالی ہو۔

اس دوران سانول کا شانہ حیا بھی جاتا رہا۔ حیا بھی عدت میں تھی۔ وہ اس سے تو نہیں ملتا تھا مگر اس کی خیر خیریت پوچھتے رہتا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ سانول ان دونوں میاں بیوی کی اس رات کی مہمان نوازی نہیں بھولا تھا۔ ان کا اخلاق،

محبت اور خلوص اور وہ بات جو حیا کے مرحوم شوہر مصفر نے اس سے کہی وہ آج تک نہیں بھولا..... پھر ایسے میں جانے کیوں سانول کو مصفر کی وہ باتیں یاد آنے لگیں۔

”دیکھو سانول! میں اپنے لیے نیکو کار یا پارسائی کا دعویٰ تو نہیں کرتا مگر کوشش یہی ہوتی ہے کہ میری ذات سے نہ کسی کو نقصان پہنچے نہ ہی کسی کا دل دکھے۔ پھر بھی بندہ بشر ہوں، خطا کا پتلا ہوں۔ اللہ کی آزمائش پر شاکر بھی رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ ٹھہرا، پھر کہنا شروع ہوا۔

”تم ایک نیک اور شریف انسان ہو مگر جب تمہیں تنگ سی..... میں دیکھتا ہوں تو مجھے دکھ سا ہوتا ہے۔ بس، میری یہ خواہش ہے کہ تمہارا کھانا پینا ہر بہن سب میں اپنے ذمے لے لوں۔ مجھے اس سے دلی سکون نصیب ہوگا۔ مجھے یقین ہے تم انکار نہیں کرو گے۔ یہی میں نے تم سے کہنا تھا۔“

سانول نے اس کی بات غور سے سنی تھی، پھر مسکرا کر بولا۔

”سامیں! اللہ آپ کو خوشیاں دے، میں جس حال میں بھی ہوں اس میں خوش ہوں۔ میرا خیال ہے مجھ سے زیادہ مستحق

2017 اکتوبر

مجھے چھوڑنے کے لیے..... واپس لوٹا پڑتا تو..... یہ حادثہ پیش نہ آتا..... تو کیا یہ سب اس کی وجہ سے ہوا تھا؟“

میں نے ان دونوں دھمی میاں بیوی کے لیے یہ کیسی دعا مانگی تھی۔ ان کا مین بڑھانے کے بجائے ایک کم کر دیا تھا؟

سانول ایسی باتوں پر یقین تو نہیں رکھتا تھا مگر وہ بھی ایک عام سادی انسان تھا۔ بعض حالات کی غیر متوقع

”پرکلیشن“ ایسی ہوجاتی ہے کہ انسان کا خیال نہ چاہتے ہوئے بھی ایسی باتوں کو سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ صفر کا اخلاق

اور اس کی قدر نوازی کو سانول ایک لمحے کے لیے بھی نہ بھولا تھا۔ دولت مند ہونے کے باوجود اس نے ایک غریب

فقیر کے ساتھ راہ و رسم رکھی تھی، اس لیے کہ وہ اسے نیک اور اللہ والا بندہ سمجھتا تھا اور اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنے کی بھی

خواہش کا اس نے بڑے خلوص اور اصرار کے ساتھ اظہار کیا تھا۔ مگر سانول نے مسکرا کر اس کی بات کو ٹال دیا تھا۔

سانول نے نمازوں اور سجدوں میں مگر کر خدا سے دعا مانگی تھی کہ وہ صفر کی مغفرت فرمائے اور ساتھ ہی اس کے دل کو بھی سکون عطا فرمائے۔

سانول کا دل اسی روز سے ایک نامعلوم سی بے چینی کا شکار بننے لگا تھا اور یوں وہ اپنی بے چینی کو اسی طرح رفع کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ کاشا نہ جا جا کر مانی بخشاں سے

صفر کی بیوہ کا حال پوچھ آتا تھا اور اس کے لیے دعا کرتا تھا۔ ☆☆☆

ان علاقوں اور ایسی برادر یوں میں زبانی کلامی طے ہوجانے والے رشتوں کو وہی اہمیت حاصل تھی جو منگنی اور نکاح کی ہوتی ہے۔ یعنی زبان دے دی تو پھر سمجھو سب کچھ بغیر لکھے

پڑھے ہی طے ہو گیا اور وہ اٹل ہو گیا۔ بانی چیزوں کو تو محض خانہ پُری ہی سمجھ کر کیا جاتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ چالاک ارباب نے

اگلے دن ہی اپنے باپ کے ذریعے پہلے تو سردار و ساہو خان کے ذریعے رئیس بنگل خان کے کانوں میں یہ بات ڈلا دی

کہ زمیندار اللہ و راہیو اس کی بیٹی مہرو کے لیے اپنے بیٹے ارباب کے رشتے کے لیے بات کرنے آ رہا ہے۔ یوں اس نے اس کی

سفاارش بھی کر دی۔ سرداری نظام تھا، رئیس بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ یوں بھی زمیندار اللہ و راہیو اس کا ہم پلہ تھا، پھر بیٹی کی بھی شادی

تو کرنا ہی تھی۔ اس نے اپنی بیوی کا حکم زادی کو یہ بات بتائی۔ اسے بھی کوئی اعتراض نہ ہوا مگر ماں بھی اسی لیے اس نے

ڈرتے ڈرتے شوہر سے اعتراض درکھا تھا۔ ”سائیں! یہ ہماری رانی بیٹی مہرو کی زندگی کا سب سے

بڑا فیصلہ ہے۔ بہتر نہ ہوتا کہ اس سے بھی پوچھ لیا جاتا.....؟“

بڑا فیصلہ ہے۔ بہتر نہ ہوتا کہ اس سے بھی پوچھ لیا جاتا.....؟“

لوگ دنیا میں پڑے ہیں۔ آپ نے ایسا کچھ کرنا ہی ہے تو ان کے لیے کر دیں۔ مجھ فقیر کی تو یوں بھی احتیاجات بہت محدود ہیں۔ کھانا کھلانے کا شکر یہ..... میں اب چلوں گا۔“

یہ کہتے ہوئے سانول اٹھ کھڑا ہوا.....

”بیٹھو، ابھی رات ہوگئی ہے۔ کل صبح میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

”مجھے صرف اپنے ٹھکانے پر ہی نیند آتی ہے جہاں میں کچے فرش پر بھی کی چٹائی بچھا کر سوتا ہوں۔ یہاں نرم

بستر میرے لیے کانٹوں کا بچھو تا نہ بن جائے۔ چلتا ہوں۔“

سانول یہ کہہ کر جانے لگا۔ اٹھائے راہ..... حیا سر پردہ پٹار کھے وہاں آگئی۔ سانول نے فوراً اپنی نظریں جھکا لیں۔ حیا نے

اسے سلام کیا، اس نے بھی ہولے سے جواب دیا اور صفر کی طرف دیکھا۔

”یہ میری بیوی ہے حیا..... اس کے لیے دعا کی درخواست کروں گا تم سے.....“ صفر نے سانول سے کہا۔

”اللہ سائیں اس کی حیا اور پردہ سلامت رکھے۔“

سانول نے دعا یہ کہا اور پوچھا۔ ”کیا یہ تیار ہے؟“

”نہیں، پیار تو نہیں ہے، پر ہماری شادی کو کئی برس بیت چکے ہیں مگر ابھی تک اس کی گود ہری نہیں ہو سکی ہے۔“ صفر

نے یہ بات اس سے ڈاڑھتے ڈرتے کہی تھی، کیونکہ اسے پتا تھا کہ اس طرح کی باتوں سے سانول ناراض ہوجاتا تھا۔ تاہم

ایسا کچھ نہیں ہوا اور سانول نے کہا۔ ”یہ سب اللہ سائیں کی رحمتیں ہیں جسے ہم انسان سمجھنے

سے قاصر ہیں۔ خوش وہی لوگ رہتے ہیں جو ہر حال میں رب سائیں کا شکر کرتے ہیں۔ انسانیت کے ناتے میرا فرض

بتا ہے کہ میں اللہ سائیں سے آپ دونوں کی بہتری کی دعا کروں گا.....“

صفر کی حادثاتی موت کے بعد یہی ایک پھانس کھائے جا رہی تھی کہ صفر اور اس کی بیوی حیا اس سے کیا چاہتے

تھے۔ اس نے بھی انہیں کوئی تعویذ گنڈا نہیں دیا تھا، بس ایک عام انسانی... ہمدردی کے جذبے تلے ان کے لیے دعا کی تھی

مگر اسی رات کو جب صفر اسے دوا گھوڑ کر اپنے گھر لوٹ رہا تھا تو اس کی کار کو حادثہ پیش آ گیا اور وہ جاں بحق ہو گیا۔ سانول

کے دل میں وہی رات بوجھ سی بن گئی تھی۔ وہ لاکھ خود کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ اس میں اس کا بھلا کھلا دوش تھا۔ مگر پھر ایک

سوال پھانس بن کر اس کے گلے میں انک جا جاتا تھا۔ ”اگر اس رات میں اس کے ساتھ نہ جاتا اور نہ اسے

منع کر دے گی۔

شوہر کی وفات کے بعد جیانے اسی کمپنی میں نوکری کے لیے درخواست دے دی تھی، جہاں مفرد ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھا مگر کیا معمولی پوسٹ پر رکھا گیا تھا، اس کے لیے یہی بہت تھا کہ نوکری تول گئی تھی۔ زندگی کی گاڑی تو کھینچنا تھی۔ طویل سفر تھا، پھر جوانی کی عمر میں بیوگی کا داغ سستے رہنا بھی تو کسی امتحان سے کم نہ تھا۔ یوں اس نے خود کو مصروف رکھنے کا بھی طریقہ نکال لیا تھا کہ اس نے معمولی ملازمت بھی قبول کر لی تھی۔

☆☆☆

”سانول! تم سے ایک بات کہوں.....؟“

اس روز مہر و دوسرا پیر دے کر ہاسٹل لوٹی تھی اور اب تیسرے پیر میں چند روز کا گلیپ تھا۔ وہ اسی دن سہ پہر میں جمیل شاہ کی درگاہ آگئی تھی۔ یہ وقت سانول نے ہی اسے بتایا تھا۔ سخی لعل پانی وغیرہ بھرنے چلا جاتا تھا اور لوگ بھی نہیں ہوتے تھے۔ انہیں تنہائی میں توڑا بہت باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ وہ حجرے میں آ جاتے تھے۔

”ہاں کہو“ سانول نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔
”میرا خیال ہے مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے۔
میرا مطلب ہے، ہمیں کہیں اور ملتے رہنا ہوگا۔“ مہرونے سنجیدگی سے کہا۔
”وہ کیوں؟“

”دیکھو سانول! یہ ہماری جاگیر کا علاقہ ہے، لوگ آتے جاتے ہیں۔ مجھے بھی کسی نے تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو..... بات آگے تک نہ چلی جائے۔ میں نہیں چاہتی کہ ابھی سے ہماری کسی قسم کی تعلق داری کی بجنگ بھی کسی کے کانوں میں پڑے۔“

اس کی بات سن کر سانول سوچنے لگا تو مہرونے ہی ملاحت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔
”ہم کہیں باہر مل لیا کریں گے، میرا مطلب ہے کسی ریسٹورنٹ میں.....“

”ہاں! ٹھیک ہے لیکن.....“ کہتے ہوئے سانول نے سر جھکا کر اپنے گریبان میں دیکھا۔ مہر و اس کا مطلب سمجھ کر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”تم میری ایک بات مانو گے سانول!“
”کہو، کیوں نہیں مانوں گا!“ وہ اس کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم اب اپنا حلیہ بدل لو..... تم ایک پڑھے لکھے نوجوان ہو۔ میزک پاس ہو، آگے بھی پڑھ سکتے ہو۔ ڈاڑھی اور مونچھیں

”حاکماں.....“ بیوی کی بات پر رئیس تیز لہجے میں بولا۔ ”ہمارے خاندانوں میں ایسے فیصلے عورتوں کی مرضی سے نہیں، مردوں کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ کیا ہم اپنی بیٹی کے لیے برا فیصلہ کریں گے؟ زمیندار اللہ وراپو اچھا آدمی ہے۔ ہم پلہ بھی ہے۔ دل کا صاف بھی، حالانکہ اس روز میں نے زمین کے معاملے میں اس سے سخت لہجے میں بات کی تھی مگر اس نے بالکل بھی برا نہیں منایا۔ بعد میں ہمیں بھی اپنے کیے پر شرمندگی ہوئی تھی کہ اس نے بات ہی تو کی تھی، کون سا زبردستی کر رہا تھا۔“
حاکم زادی چپ رہی۔

اسی روز زمیندار اللہ وراپو اس کی حوصلی آیا تو رئیس نے بڑے پرتپاک انداز میں اس کا استقبال کیا۔ زمیندار اللہ وراپو بھی ایک بھاری بھر کم شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے پہلے دوستانہ ماحول بناتے ہوئے رئیس کے گلے ملتے ہی ہنستے ہوئے اس سے کہا تھا۔
”رئیس! پہلے کی طرح ناراض مت ہو جانا یار! میں زمین کی بات کرنے نہیں آیا تیرے سے.....“ اس پر رئیس نے قہقہہ بلند کیا تھا۔

مہر و کی ارباب سے بات کی ہوئی اور مہر و چپا بھی نہ چلا۔ وہ ہاسٹل میں اپنے انگریز اسز کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ ادھر ارباب نے وعدے کے مطابق مراد خان کو چھ کروڑ کی رقم پہلے بہ طور قرض دی، جو شادی کے بعد عرصے کی صورت میں معاف ہو جانی تھی۔ مراد کا کام بن گیا۔

ماں حاکم زادی نے بھی اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہ دی کہ وہ بیٹی کو بتائے، وہ یہ سمجھ کر خاموش رہی کہ آخر کو جوان بیٹی کی شادی کسی سے کرنا ہی تھی، جبکہ اب تو اس کی پڑھائی بھی ختم ہونے والی تھی اور وہ اپنے سالانہ امتحان میں بھی مصروف تھی۔ پھر وہ خود بھی چاہتی تھی کہ جوان بیٹی ہے جتنی جلدی اس کے قرض سے سبکدوش ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

دن گزرتے رہے۔ ادھر مہر و اور سانول کی ملاقاتیں بھی چلتی رہیں۔ اس کے انگریز بھی شروع ہو گئے تھے۔

ادھر چابھی عدت گزار چکی تھی۔ مائی۔ بخشاں کے ذریعے اسے خبر ملتی رہتی تھی کہ وہ سانول نای نو جوان، چاہے تھوڑی دیر کے لیے کسی مگر اس کی خیریت اماں بخشاں سے جو جھپٹے آتا رہتا تھا۔ دونوں یہ بات جانتی تھیں کہ یہ سادہ لوح فقیر سا لڑکا جس خدا ترسی اور انسانی ہمدردی کے لیے ایسا کرتا تھا اور اس میں کسی اور جذبے کا کوئی تعلق نہ تھا مگر جانے کیا بات تھی کہ عدت گزارنے کے بعد جیانے سوچا کہ اس بار وہ خود اس سے ملے گی اور اسے اب آنے سے ہمیشہ کے لیے

کہانا کھایا۔ بخشاں مالی اب مستقل اس کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ چاہے جس وقت کرے میں بیٹھی چائے پی رہی تھی تو اس نے بتایا۔

”بی بی جی! وہ آیا ہے..... سانول.....!“
 حیا چوگی، پھر بے تاثر لہجے میں بولی۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ اس بار آئے تو اسے دوبارہ آنے سے منع کر دیتا۔“
 ”جی اچھا بی بی جی! بھول گئی تھی، جاتی ہوں.....“ یہ کہہ کر مالی بخشاں پلٹی تو حیا نے اسے پکارا۔
 ”مٹھرو! اسے اندر بلا لو.....“

بے شک رہنے دو مگر یہ پڑے اور..... اور یہ جگہ بدل لو.....“
 ”میں یہاں عبادت کرتا ہوں۔“

”اللہ کی عبادت تو کہیں بھی کی جاسکتی ہے۔ اس سے تمہیں کب روک رہی ہوں میں..... لیکن میں چاہتی ہوں تم آگے پڑھو صحت کرو، کوئی کام کرو۔ اس طرح اللہ سامنے کی عبادت بھی کرتے رہو گے تو اور زیادہ ثواب ملے گا۔ دیکھو..... دنیاوی معاملات چلانا بھی تو انسان کی مجبوری ہے نا..... تم جوان ہو، صحت مند ہو اور پہلے بھی تم کام کرتے رہے ہو..... اور کام میں بھی عظمت ہے۔“

اس کی بات سن کر سانول سوچ میں پڑ گیا۔ مہر دیکھ گئی کہ وہ اس کی بات پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا ہے تو وہ اسے اور بھی کچھ بتانے لگی۔

☆☆☆

چند دنوں میں ہی سانول کا رنگ ڈھنگ بدل گیا۔ اس نے فقیر منکوں والا لباس اتار کر اس کی جگہ عام شلوار سوٹ پہن لیا۔ بار بار شاپ میں بال وغیرہ بنوائے۔ بیکار اور گاہ میں ہی چھوڑ دیا۔ گوشت میں اس کا اپنا گھر تھا جہاں اس کے دور کے رشتے دار ایک بوڑھا آدمی رحیم بخش رہتا تھا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر خوش ہوا تھا۔ وہ تیل گاڑیاں مرمت کرنے کا کام کرتا تھا مگر سانول کوئی ایسا ڈھنگ کا کام کرنا چاہتا تھا کہ نوکری کے ساتھ اپنی پڑھائی بھی آگے جاری رکھ سکے۔ اس کے لیے اس نے جاسور و ٹھوڑی چانک میں اخبار پینٹا شروع کر دیا۔

☆☆☆

حیا کی زندگی جیسے تیسے گزر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نوکری کرے گی تو اس طرح مصروف ہو کر اس کی تنہائی بھی کم ہوگی مگر ایسی تنہائیوں کو کم کرنے کی جس قدر بھی کوشش کی جائے وہ اتنی ہی بڑھتی ہیں ساتھ ہی اسے ایک اور سچ حقیقت کا بھی احساس ہوا تھا۔ بہت جلد اسے احساس ہونے لگا تھا کہ جوانی میں بیوی کا دارغ کتنا تکلف دہ ہوتا ہے، اس پر بیوہ خوبصورت بھی ہو اور ایک بڑے گھر کی مالکہ بھی ہو تو کیسے کیسے لوگ شکروں اور گدوں کی طرح گرسنہ نظروں سے اسے گھورنے لگتے ہیں۔ حیا کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا تھا۔ اس نئی صورت حال نے اسے اور بھی پریشان سا کر دیا تھا، تاہم وہ بہت لیے دے رہے تھی۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ ایک مرد کے بغیر بھاڑی زندگی بسر کرنا کس قدر دشوار تھا! کھلی اور جوان.... عورت کا اس معاشرے میں گزارہ کس قدر تنہا اور کڑا امتحان ہوتا ہے، وہ اس سے گزر رہی تھی۔
 اس روز وہ دفتر سے گھر پہنچی، غسل وغیرہ کر کے اس نے

قارئین متوجہ ہوں



کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چاؤ دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

☆ اہلہ ریڈیو خدمات کے لیے

شمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس جاسوسی پاکیزہ، مرکز شت

C-63 فیڈبک سیشن ڈسٹری بیوٹنگ ایجنسی، لاہور

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgrp@hotmai.com

”بی بی اچھا بی بی“

حیا سوچنے لگی کہ شخص کیوں آتا ہے؟ اس نے کبھی اس سے ملنے کی خواہش کا بھی اظہار نہ کیا تھا مانی بخشاں سے..... بس! اس کی خیر خیریت پوچھتا اور خاموشی سے لوٹ جاتا تھا۔ شاید فقیر منٹش آدی ہے۔ صفر نے اس کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھا تھا یا پھر شاید اپنی گزر بسر کرنے کے لیے کچھ مانگنا چاہتا ہو..... اچھا ہے کہ میں خود ہی اس سے بات کر کے ہمیشہ کے لیے یہاں آنے سے منع کر دوں۔

مانی بخشاں جب سانول کو لے کر کمرے میں آئی تو حیا اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو حیرت زدہ ہی رہ گئی۔ وہ اسے صفر کے ساتھ ایک بار پہلے بھی دیکھ چکی تھی جب وہ یہاں آیا تھا۔ اس وقت وہ فقیروں کے حلیے میں تھا مگر اب وہ بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ڈاڑھی موچھیں تو اپنی جگہ اب بھی موجود تھیں مگر حلیہ اور لباس اب اس کا کچھ ڈھنگ کا نظر آنے لگا تھا۔ لمبے کچھڑی بال اب ترشوا کر سیٹ کر لیے گئے تھے اور اس کے خدو خال میں اب ایک سلیقہ دیکھنے میں آ رہا تھا۔ اس نے نظر چار پڑا لے بغیر سر جھکا کر سلام کیا اور بولا۔

”بی بی صاحبہ! مجھے صاحبہ بی (صفر) کے انتقال پر بے حد افسوس ہے، اللہ سائیں ان کی مغفرت فرمائے۔“

”آمین.....“ حیا نے آہستگی سے زیر لب کہا۔ پھر چند ثانیے بی غور اس کا جائزہ لیتی رہی۔ بس، حلیہ ہی بدلا تھا، باقی انداز و ہیبت تھا۔ سادہ، نیک اور سچا.....

”تقدیر سے انسان نہیں لڑ سکتا، جو خدا کو منظور..... تم کیسے ہو؟ پیٹھا جاؤ.....“ حیا نے کہا۔

”نہیں بی بی بی بی! میں اب چلوں گا۔“ وہ اسی طرح اپنا سر جھکائے ہوئے بولا۔ حیا نے دیکھا اس کے چہرے پر ایک دباؤ کی سی کیفیت کروٹیں لے رہی تھی، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو.....

”کیا بات ہے، تم کچھ پریشان سے ہو؟ کسی مدد کی ضرورت ہے؟“

”نہیں..... نہیں، بی بی بی! میں اس لیے نہیں آیا.....“ سانول کچھ کہتے کہتے رکا تو حیا نے اسے ہمہ گیر کیا۔

”ہاں..... ہاں بولو..... کیا کہنا چاہتے ہو.....؟“

”بی بی بی! کیا آپ ایسا سمجھتی ہیں کہ صاحبہ بی کی موت کا سبب میں تھا.....؟“

حیا اس کی بات پر چونکی تھی۔ بولی۔ ”بالکل بھی نہیں، بھلا تمہارا اس میں کیا قصور؟“

”مگر بی بی بی! میں ایسا سمجھتا ہوں.....“ وہ بولا۔ ”اگر

وہ اس رات مجھے درگاہ چھوڑنے نہ جاتے، یا مجھے لے کر یہاں نہ آتے تو..... شاید یہ سب نہ ہوتا.....“

حیا کو اس کی بات پر ایک جھٹکا سا لگا، وہ بی غور اس کا جھکا جھکا چہرہ دیکھنے لگی، جہاں ایک ایسے احساس کی نش سکتی محسوس ہو رہی تھی جیسے کوئی اندر ہی اندر یک رہا ہو۔ اسے چند ہی روز قبل کی مانی بخشاں کی وہ بات یاد آتی تھی جو اس نے اس سے کہی تھی۔

”پر بی بی! وہ واقعی اللہ والا بندہ ہے۔ آج کی ریا کار دنیا میں بالکل سچا اور انسانوں کے لیے ایک درد رکھنے والا..... بس! کچھ ایسا لگتا ہے جیسے وہ اندر ہی اندر کسی پھانس کا شکار ہے اور شاید اپنی بے چینی دور کرنے آتا ہے۔“

حیا کو اس کا یہ انداز متاثر کرنے لگا، وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ”تم بیٹھو گے، تو میں تمہیں بتا سکتی ہوں کہ اس میں کس کا کتنا قصور تھا۔“

سانول خاموشی سے ایک صوفے پر تنک کر بیٹھ گیا۔ حیا کو انکا ایسی ہی اس نوجوان میں ایک نامعلوم سی دلچسپی کا احساس ہوا، آگے بولی۔

”کچھ منگواؤں تمہارے لیے.....؟“

”نہیں بی بی بی جی! شکریہ اس کی ضرورت نہیں۔“

سانول نے کہا۔ حیا دوبارہ بیٹھ گئی اور بولی۔ ”جس کی جتنی اور جیسے لکھی ہوئی ہے، وہ اتنی ہی زندگی گزرتا ہے۔ باقی باتیں رہ جاتی ہیں یہ نہ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا وغیرہ..... اس لیے تم بھی اپنے دل سے اس طرح کا بوجھ نکال پیچو..... اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم بھی انجان تھے اور صفر بھی بلکہ صفر تو خود تمہیں لینے گئے تھے۔ اس کی وجہ بھی تم جانتے ہی ہو..... میرا خیال ہے اب تمہارا ضمیر ہلکا ہو جانا چاہیے.....؟“

سانول نے پہلی بار اچانک اپنا سراٹھا کر حیا کی طرف دیکھا۔ وہ شاید اس کی بات کی سچائی کا عکس اس کے چہرے کے تاثرات سے میل کھاتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ حیا کی نگاہوں کی چمک بھی پہلی بار سراٹھا کر اسے اپنی طرف یوں تکتا پا کر ذرا فزود ہوئی تھی۔

کچھ ایسی ہی حقیقت بھی تھی کہ سانول ایک آخری بار حیا سے ملنے کا اسی لیے خواہشمند تھا کہ..... وہ اس سلسلے میں حیا کے خیالات جان کر اپنی پھانس دور کر لے۔ اسے کچھ تسلی ہوئی تھی۔ بولا۔

”بی بی بی! بعض حالات میں حقوق اللہ سے پہلے حقوق العباد کا درجہ مقدم پاتا ہے، یہ اللہ سائیں کا ہی حکم ہے

کاٹ کھانے کو

ایک دوست نے دوسرے دوست کو بتایا۔
”میں نے شادی اس لیے کی تھی کہ شام کو کھر
پہنچے پر اکیلا کھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔“
”پھر اب کیا پریشانی ہے؟“ دوست نے پوچھا۔
”اب یہی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔“

اس نے جواب دیا۔

مرسلہ: وزیر محمد خان۔ غل ہزارہ

اس نے پرائیویٹ طو پر بھی تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یوں وہ جیسا کبھی تہ دل سے شکر گزار تھا جبکہ جیسا کہ اس بات کی خوشی تھی کہ سائل اب عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

مہر کو اپنی زندگی کے سب سے بڑے اور اہم فیصلے کے بارے میں بہت پہلے ہی سے ایک نامعلوم سا خوف کی بچی کی طرح اس کے لاشعور میں چھپا ڈالتا رہتا تھا کہ کہیں اس کے ساتھ بھی ویسا ہی نہ ہو جائے جو اس کی بد نصیب پھوپھی کو بچاں کے ساتھ وہ چکا تھا اور یہ خوف..... اس وقت حقیقت کا روپ دھارنے لگا تھا جب اسے ماں کے ذریعے یہ بتا چلا کہ اس کا رشتہ بھی اس کی مرضی جانے بغیر زمیندار اللہ دراپو کے بیٹے ارباب سے طے کر دیا گیا تھا۔ وہ بہت روٹی اور مال کے گلے لگ کر شہید احتجاج بھی کیا مگر جاتی ہی کہ انکار کی صورت میں باپ اور بھائی اس کا کیا حشر کر ڈالیں گے..... یہ حشر تو کسی ایک دن ہوتا ہی تھا۔ اسے بھی بتا دیا گیا تھا کہ وہ آخری پرچہ دیتے ہی فوراً ہی حویلی کا رخ کرے مگر مہر کو اب اس حویلی سے ہی شدید نفرت ہونے لگی تھی جہاں جا پر مردوں کا قبضہ تھا۔ مہر نے آگے تعلیم ہی اس لیے حاصل کی تھی کہ وہ اپنے علم کو ”ایکسپریس“ کر کے مگر وہ بھول گئی تھی کہ وہ جس سماج سے تعلق رکھتی تھی وہاں ایک عورت کو ایک پیچھے سے دوسرے پیچھے میں متید کرنا اس کا ازلی مقدر قرار پاتا ہے۔ ایسی ٹھنڈی آمیز فضا میں اسے سائل کا ساتھ بڑا جانا فزا محسوس ہونے لگا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ آخری پرچہ دینے کے بعد وہ حویلی کا رخ بھی نہیں کرے گی۔ چاہے زمین آسمان ایک ہو جائیں، وہ پھوپھی کو بچاں نہیں بنے گی..... بھی نہیں۔

اس روز آخری پرچہ تھا۔ اس نے سائل کو ایک دن پہلے ہی ٹھوڑی چمکاک والے ایک ریسٹورنٹ میں آخری پرچے والے دن آنے کا کہہ رکھا تھا۔ وہ ہاشل لوٹی اور وہاں

کہ اگر تم سے کسی بندے کو کوئی دکھ پہنچا ہے تو پہلے اس دکی بندے سے معافی مانگو..... مجھ سے بعد میں..... اب آپ کے خیالات جان کر مجھے کافی تسلی ہوگئی۔ میں اب چلوں گا..... اللہ سائیں آپ کا حامی و ناصر ہو آئیں.....“ وہ یہ کہہ کر صوفے سے اٹھنے لگا تھا کہ جیائے اچانک تڑپ کر کہا۔
”مگر..... تم نے مجھے کوئی دکھ نہیں دیا، ایسا کبھی مت

سمجھنا.....“

اس کی بات پر سائل گہرے لہجے میں بولا۔ ”بی بی! انسان کے دل میں دکھ کی شرح بھتی رہے تو دل جوئی کی پھونک مار کے بھجنا بھی تو انسانوں کا ہی فرض ہوتا ہے نا.....“
حیاس کی بات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ پائی۔ کہاں تو اس نے مائی بخشاں کو یہ کہہ کر تھا کہ اس بار سائل آئے تو اسے دروازے سے ہی رخصت کر دے مگر اب اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ایسی سچی، پُر حقیقت اور نیک گفتگو کرنے والا یہ نوجوان اسی طرح اس کے سامنے بیٹھا رہے اور وہ اس کی روحانی باتوں کی پاکیزگی میں محو رہے۔ پھر سوچ کر فوراً بولی۔
”اگر ایسا ہے تو میں یہی چاہوں گی کہ کوئی اللہ کا نیک بندہ اسی طرح میرا دکھ کم کرتا رہے۔“ سائل خاموش رہا تو حیاس نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”تمہارے پہلے والے طبقے کے مقابلے میں یہ جلیہ اچھا دکھائی دیتا ہے تم مجھے خامے پڑھے لکھے ہو مگر تمہاری باتوں سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ تم بہت با شعور اور بالغ انسان ہو..... تم نے بہت کچھ..... بڑھو والا ہے تم کوئی اچھی سی نوکری کیوں نہیں کر لیتے، بلکہ تمہیں آگے بھی پڑھنا چاہیے.....“

”نوکری تو میں کرنا چاہتا ہوں بی بی جی اور آگے پڑھنا بھی۔“ سائل نے مہر کی خواہش کو سامنے رکھتے ہوئے فوراً جواب دیا۔ حیاس نے اسے اپنے دفتر آنے کا پتا دے دیا۔ سائل اس کا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔

سائل کو جیسا کہ یہ نوکری کرنے والی تجویز اچھی لگی تھی کیونکہ مہر کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ کسی اچھی جگہ پر نوکری سے لگ جائے۔

وہ ابھی مہر کو یہ ادھوری خوش خبری نہیں سنا چاہتا تھا مگر تاخیر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اگلے دن ہی حیا کے بتائے ہوئے دفتر کا رخ کیا اور اس سے جا کر ملا۔ اس کے بعد کچھ ضروری اساتذہ وغیرہ اس سے طلب کی گئیں اور وہاں اسے فائنل اینڈ کمپلٹنگ کے شعبے میں لگا دیا گیا۔ نیز اس جاب میں آگے ترقی کرنے کے بھی امکانات روشن تھے۔ ساتھ ہی

سے اس نے فوراً ہی شہر والی رہائش گاہ بھائی نگر کا رخ کیا تاکہ وہ اپنا کچھ ضروری سامان اٹھا کر مذکورہ ریسٹورنٹ کا رخ کرے۔ مگر جب وہ بھائی نگر پہنچی تو اس کا بھائی مراد خان پہلے سے ہی وہاں موجود تھا۔ ماں ساتھ نہیں تھی۔ بھائی کو دیکھ کر مہرودھک سے رہ گئی۔

”اچھا ضروری سامان سمیٹو اور اسی وقت میرے ساتھ چلو۔۔۔۔۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔“ مراد نے کرخت لہجے میں اس سے کہا۔

”پر اداسائیں! اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو میں آخری پرچہ دے کر آئی ہوں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“

اسے گھر کا۔ ”تمہارا رشتہ طے پا چکا ہے۔ پڑھائی کے نام پر تم نے یہاں بہت عیاشی کر لی، اب حویلی چلو۔۔۔۔۔“

مہرودھت روئی چلائی مگر بے رحم بھائی نے اس کی ایک نہ مانی اور جس وقت مہرودھت آ نکھوں سے بھائی کے ساتھ جیب میں سوار ہو رہی تھی، اس کی آبدیدہ آنکھوں کے سامنے سانول ہی کا چہرہ رقصاں تھا۔ اس کے اندر سرکشی کا جذبہ انگڑائی لے لے کر بیدار ہو رہا تھا۔

جیب مراد خان ہی چلا رہا تھا اور اس کے ہمراہ ایک گن میں موجود تھا جو اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا، جبکہ مہرودھت سیٹ پر براجمان سبک رہی تھی۔

دن کا وقت تھا کہ اچانک ایک موڑ کاٹتے ہوئے جیب کا اگلا نازر برست ہوا۔ جیب کی رفتار خاصی تیز تھی، وہ الٹ گئی۔ مہرودھ کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ ہوش و حواس سے۔۔۔۔۔ بے گانہ ہو گئی۔

☆☆☆

اس روز سانول بھی وقت پر مذکورہ ریسٹورنٹ پہنچ گیا تھا مگر اسے حیرت ہوئی کہ مہرودھ بھی وہاں نہیں پہنچی تھی۔ وہ کافی دیر تک وہاں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔۔۔۔۔ اسے یقین تھا کہ مہرودھ ضرور آئے گی، آج تو ان دونوں نے ایک اہم فیصلے کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ مہرودھ اسے بتا چکی تھی کہ شادی کے نام پر اس کا سودا کیا جا چکا ہے مگر وہ اس جہنم میں قدم رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ تاہم دونوں کا ابھی کہیں بھاگنے یا فرار ہونے کا کوئی منصوبہ نہ تھا، وہ ابھی مل بیٹھ کر پہلے اس مسئلے کا کوئی حل سوچنا چاہتے تھے۔

جب مہرودھ کا انتظار کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی تو سانول کو تشویش نے آن گھیرا۔ وہ ریسٹورنٹ سے نکلا اور مہرودھ کے ہاسٹل پہنچ گیا، وہاں اسے پتا چلا کہ مہرودھ کی اپنی

شہر والی کٹھی جا چکی تھی۔ وہ دیوانہ وہاں بھی بلا خوف جا پہنچا تو ایک جانکاہ اطلاع اس کی خاطر تھی۔ اسے کئی ٹائیموں تک اپنی ساعتوں پر یقین ہی نہ آیا تھا کہ۔۔۔ کیا ہو گیا تھا؟ کیا تقدیر واقعی اتنی ظالم بھی ہوتی ہے، تقدیر کو کو سنا کر کچھ بھی اس کا شیوا نہ رہا تھا مگر۔۔۔۔۔ وہ پھر اپنی اس بد قسمتی پر کسے دوش دیتا؟ اس کا دل مانتا ہی نہیں تھا کہ جس محبوب کو اس نے سجدے فیک فیک کر حاصل کیا تھا جس کے حصول کے لیے اس نے اللہ سے دن رات دعا میں مانگی تھیں، وہ اس طرح ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا تھا کہ جیسے تھای نہیں بھی۔۔۔۔۔ جیسے وہ ایک حسین خواب تھا اور جاگتی بے رحم آنکھوں نے اسے کالج کے نازک آئینے کی طرح توڑ ڈالا تھا۔ مہرودھ ایک حادثے میں جان ہار چکی تھی اور ایسی باری تھی کہ اس کی لاش بھی باقی نہیں رہی تھی۔ انسان اپنے کسی پیارے کی لاش نہ دیکھے تو اسے اس کی موت کا یقین کب آتا ہے، شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اپنے پیارے مرنے والے کی لاش کا کچھ ضرور دیکھ لیتا چاہیے۔ بغیر لاش دیکھے اسے دفن دیا جائے تو چہرہ نہ دیکھنے والوں کی نظروں کے سامنے وہ ساری عمر رہتا ہے۔

اسے پتا چلا تھا کہ مہرودھ اپنے بھائی اور ایک گاڑی کے ساتھ اپنے گوشہ جاری تھی کہ ان کی جیب کو حادثہ پیش آ گیا۔ مراد تو اس خوفناک حادثے میں زندہ بچ گیا تھا مگر مہرودھ جیب کے اندر پھنسی رہنے کی وجہ سے اپنی جان ہار بیٹھی تھی۔ یہی حال گاڑی کا ہوا تھا کیونکہ جیب نے لٹنے ہی آگ پکڑ لی تھی۔

مہرودھ کی ماں کے لیے یہ صدمہ اس قدر جانکاہ ثابت ہوا کہ اس غم نے اس کی بھی جان لے لی۔

سانول کی دنیا ہی اندیر ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کپڑے بھاڑ ڈالے اور ٹیکسا سنبھال کر جنگلوں، ویرانوں اور صحرائوں کی طرف نکل جائے۔

وہ بہت دل گرفتہ ہو گیا۔ اب اس کا نوکری میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا نہ ہی پڑھائی میں۔ جی چاہا کہ وہ اب سب کچھ چھوڑ دے۔

حیا، جواب ایک طرح سے اس کی دفتری ساتھی (کولیک) بن چکی تھی، اس نے جو اس روز سانول کو اس قدر ملول اور آزرده خاطر دیکھا تو پوچھے بنانہ رہ سکی۔ تب سانول نے اسے ساری بات بتادی۔ حیا کو ڈر ہوا کہ سانول ایک بار پھر ٹوٹنے والا ہے، وہ ایک بار پھر وہی دیوانوں فرزانوں والی روش اختیار کرنے والا ہے تو وہ اسے تھانے۔۔۔۔۔ اسے سہارا دینے کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے لگی۔

لگے تو اسے بری طرح ہول آنے لگا۔ اسے رہ رہ کر سانول یاد آنے لگا..... مگر پھر اپنی حالت دیکھی تو رنجور ہو گئی۔ وہ بار بار ڈاکٹروں سے پوچھتی۔

”یہ..... یہ میرے چہرے کا نشان کب مٹے گا؟“ میرا جسم سیاہ پڑ چکا ہے، یہ کب تک ٹھیک ہو جائے گا؟“ ڈاکٹر اسے تسلی دیتے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہی زخم بھرے گا۔ ایسے میں وہ دونوں ہمدردیاں بیوی جو اس کے محسن تھے، اسے بتانے لگے کہ وہ زخمی حالت میں ان کے ہاتھ لگی تھی۔ انہوں نے مہر کو یہ بھی بتایا کہ وہ اس خدشے کی وجہ سے اس کے بارے میں کسی قسم کی کوئی تشہیر نہ کر سکے تھے، انہیں ڈر تھا کہیں وہ لوگ ادھر کارخ نہ کر لیں اور اسے جانی نقصان نہ پہنچا دیں۔ ایک دم ہی مہر کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ ایک تو اپنی حقیقت ان سب سے پوشیدہ رکھنے کی اور جیسا یہ لوگ سمجھ رہے ہیں، وہ وہی بنی کوئی فرضی داستان انہیں سنا دے گی۔ اس طرح وہ اپنی اصل شناخت مگر سانول کی صورت میں نئی شناخت پالے گی۔ ایک خیال اور بھی اسے سوچا تھا کہ قدرت نے شاید اسے موقع دیا ہے، کہ کیا خبر اس حادثے کے بعد لوگ اسے مردہ سمجھ رہے ہوں۔ وہ انہوں کے لیے مردہ قرار پائے گی مگر سانول کے لیے زندہ ہو جائے گی..... مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک تو وہ اسی طرح اپنی اصل شناخت جھا کر رکھے گی اور دوسرے یہ کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کرے گی کہ آخر اس حادثے کے بعد اس کے بارے میں کیا خبریں تھیں؟

بہر طور..... مہر نے ان کا شکریہ ادا کیا مگر اپنے بارے میں غلط ہی بتایا کہ وہ کون تھی اور کیسے اس حالت کو پہنچی تھی۔ وہ اسے اپنے گھر لے آئے۔ ان دونوں میاں بیوی کے دو چھوٹے بچے بھی تھے۔ عورت جس کا نام بشری تھا اور اس کا شوہر ایاز، ان دونوں نے کچھ سوچ کر مہر کو اپنے پاس رکھ لیا۔

ایک دن اس نے ان کے لینڈ لائن نمبر سے بھنائی مگر کافون ملایا اور آواز بدل کر مہر کی سیملی بن کر فون کیا اور ”مہر“ کے بارے میں پوچھا تو اس کے کسی ملازم نے ساری حقیقت بتا ڈالی۔ وہی ہو جس کا اسے اندازہ ہو چلا تھا یعنی وہ اسے مردہ سمجھے ہوئے تھے لیکن ساتھ ہی اسے یہ انفس ناک خبر بھی ملی تھی کہ اس صدمے نے اس کی ماں حاکم زادی کی جان لے لی تھی۔ اسے اپنی ماں کے مرنے کا بے حد انفس ہوا تھا۔

تاہم اب اس نے اپنا وہی فیصلہ برقرار رکھا تھا کہ وہ دنیا کی نظروں میں خود کو مردہ اور سانول کے لیے زندہ رکھے گی۔ وہ تقدیر کی اس رحم دلی پر خوشی سے گنہار ہو گئی تھی۔

وہ حادثہ آبادی سے ڈر اور ہائی وے سے ایک آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر کچے میں ہی پیش آیا تھا۔ جیپ کا اگلا ٹائر برسٹ ہونے اور تیز رفتاری میں موڑ کاٹنے کے باعث ہی یہ خوفناک حادثہ ہوا تھا۔ جیپ اٹلتے ہی سوئے اتفاق مراد زندہ بچ گیا تھا اور دروازے سے باہر جا کر اٹھا مگر خاصا زخمی ہو چکا تھا۔ جبکہ مہر وادار گاڑا اندر پھنسے رہ گئے تھے۔ گاڑے کے تو سر میں کوئی سخت شے لگی تھی جس سے وہ فوراً ہی ہلاک ہو گیا تھا جبکہ مہر زخمی حالت میں نیم بے ہوش سی کراہ رہی تھی۔ جس وقت جیپ میں آگ بھڑکی تو اسے پوری طرح ہوش آیا اور وہ جان بچانے کی تک و دو میں جلتی بھڑکتی جیپ سے باہر نکلنے کی کوشش کرتی رہی..... یہاں تک کہ اس کا چہرہ اور جسم ہی جھلس کر رہ گیا مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور پھرتی پھینسانی ہوئی کہ وہ جیپ سے باہر نکل آئی۔ زخموں سے وہ پہلے ہی زخوری اور اس پر مستزاد شدت کی دھوپ اور گرمی نے اسے بری طرح ہلکان کر دیا۔ اس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور کرتی بڑنی، گھسنتی ہوئی ہائی وے تک آئی کئی اور وہیں ایک درخت کی چھایا تلے ڈھیر ہو گئی۔ بیس اور ٹرک وغیرہ گزرتے رہے مگر کسی کی نگاہ اس بد نصیب پر نہ پڑی۔ بالآخر کافی دیر بعد ایک کار اس درخت کے قریب آ کر رکی۔ وہ بھی اس لیے نہیں کہ کار سواروں کی نگاہ اس پر پڑی تھی، بلکہ وہ کسی اور ضرورت کے پیش نظر رکے تھے۔ اس میں دو میاں بیوی سوار تھے جو کراچی سے حیدر آباد جا رہے تھے۔ تب ان کی نظر زخمی اور جھلسی ہوئی مہر پر پڑی۔ انہوں نے ازراہ ہمدردی اسے اٹھا کر اپنی کاری گئی سیٹ پر لٹا دیا اور روانہ ہو گئے۔

حیدر آباد پہنچ کر مہر کو فوراً اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ دونوں خداترس میاں بیوی یہی سمجھے تھے کہ شاید اس دیہاتی خاتون کے ساتھ کچھ بااثر لوگوں نے کسی قسم کا کوئی ظلم کیا ہے۔ اس لیے ایک تو انہوں نے حفاظتی نقطہ نظر کے تحت، فی الحال مہر کے سلسلے میں کسی قسم کی تشہیر کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ مہر کا علاج ہوتا رہا۔ وہ بھی ہوش میں آتی تو بھی بے ہوش ہو جاتی۔ اس کا دایاں گال، گردن تک جھلس گیا تھا۔ جسم کا کچھ حصہ بھی اس کی زد میں آ گیا تھا۔ قریباً تیس فیصد جسم کا حصہ جھلس گیا تھا۔ نرس وارڈ میں اس کی مختلف مراحل میں سرجری ہوتی رہی، تب کہیں جا کر مہر کی حالت سنبھل گئی۔

جب اسے پوری طرح ہوش آ گیا اور سارے واقعات کسی قلبی منظر کی طرح اس کی یادداشت کی اسکرین پر چلنے

والاروپ اختیار کر لیا۔ اللہ کی عبادت کرتی اور درگاہ کی مہمال، صفائی بھی وہی کرنے لگی۔

اس نے حجرے کے ایک کونے میں سانول کا بیکٹار لایا، دیکھا تو اس کی مجبور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بیکٹار لے کر اس نے اسے چوم کر سنپال لیا۔

کچھ دن بیت چلے۔
سندھیا لوجی میوزیم میں آج خلاف معمول گہما گہما ہی لم
ہی دیکھنے میں آ رہی تھی۔

مہر کو حادثے اور اسپتال میں زیر علاج پڑے رہتے ہوئے کافی عرصہ بیت چکا تھا، وہ اب پوری طرح صحت یاب ہونے کے بعد سانول سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔

ایک دن اس نے اس نیک دل خاتون بشری سے جا مشہرو جانے کی اجازت لی کہ وہ اپنے کچھ عزیز رشتے داروں سے ملنے جا رہی ہے۔ وہ ایک مسافر لاری میں جا مشہرو پہنچی.....